

www.urduchannel.in

قزۃ العین حید

گردش رنگین



اردو چینل

www.urduchannel.in

دانیال

مجموعات

گردشِ ناکِ چمن



نور العین، شہناز اور نامہید کے نام

گردشِ ناکِ حَمْنِ

قرۃ العینِ حید

دانیال

”گردش رنگین“ کے جملہ حقوق جناب سید مصطفیٰ احمد صاحب (۵۸-سی بلاک ۴-
گلشن اقبال-کراچی) کے نام محفوظ ہیں۔

سال اشاعت : جولائی ۱۹۸۷ء

قیمت : ۲ سو روپے

طابع : شکیں پرنٹنگ پریس کراچی

سرورق : خلیق ٹیچ

ڈاکٹر امینہ نور الدین احمد

کتابت : سید محمد احمد شہ

ناشر : ملک نورانی

حوری نورانی

مکتبہ دانیال : وکٹوریہ چیمبرز ۲

عبدالقادر لون، وڈ کراچی



ع گروش رنگ چمن ہے ماہ وسال عندلیب
غالب

خطاطی از ڈاکٹر امینہ بیگم

ناول کی تصاویر مصنفہ نے بنائی ہیں۔

۲۰۲۰ء : دیوانِ ملکہ جان کاسرورق بشکریہ اردو سیکشن، برٹش لائبریری لندن۔

۶۰۲۰ء کی آبی تصویر ایک انگلش لٹھوگراف پر مبنی ہے۔

ترتین : پیہارائے چودھری۔

ہزرت ابواب

- ۱۳ - ۱ - جل بہار
- ۳۷ - ۲ - جو تھکوں تو شاخِ کلاب ہوں
- ۸۶ - ۳ - سرخ پٹاری
- ۱۰۵ - ۴ - سرائے طغرل بیگ
- ۱۱۶ - ۵ - تختِ رواں
- ۱۳۷ - ۶ - دعاؤں کا سفر
- ۱۴۶ - ۷ - دشتِ ماریہ
- ۱۵۵ - ۸ - چورن والی جن
- ۱۵۹ - ۹ - پریوں کا کھٹولہ
- ۱۸۶ - ۱۰ - دیکھو کھیلیں دھمال تو ابہ معین الدین
- ۱۹۳ - ۱۱ - اڑھائی دن کا جھونپڑا
- ۱۹۹ - ۱۲ - مس نواب باقی اف جے پور
- ۲۰۳ - ۱۳ - پورٹریٹ اف اسے ناچ کرل
- ۲۱۰ - ۱۴ - روشن چوکی

۲۱۶

۱۵ - ہیراجنم امول تھا

۲۲۶

۱۶ - پری چہم



۲۲۵

۱۷ - ماہ وسالِ عنذیب

۲۶۹

۱۸ - ولایتی چکر

۲۸۱

۱۹ - پھول والی گلی

۲۸۷

۲۰ - نیک پروین

۳۰۹

۲۱ - تارے والی کوٹھی



۳۲۵

۲۲ - پری محل

۳۳۷

۲۳ - لال بی بی

۳۴۵

۲۴ - نور ماہ خانم

۳۵۳

۲۵ - یہ قصہ ایک نوجوان برطانوی اسکالر کی نظر میں

۳۸۸

۲۶ - گھر گھوڑا سخاس مول

۴۰۴

۲۷ - اندر جال عرف اسرار دربار پردھان پور

۴۱۳

۲۸ - تاش کا محل

۴۲۵

۲۹ - نواب بیگم کی واپسی



۴۵۷





۳۰ - ہلیتھ کلب

۴۶۴

۳۱ - جھاروتارا

۴۷۶

۳۲ - جہان مستور

- ۴۸۰ - ۳۳ - علی کا دھونا
۴۹۷ - ۳۴ - بن دیوسی
- 
- ۵۰۸ - ۳۵ - مارٹین کوٹھی
۵۲۰ - ۳۶ - بن ساگر کے باسی
۵۲۹ - ۳۷ - دریا تے نور
۵۳۹ - ۳۸ - روم و تبریز
۵۴۵ - ۳۹ - جنگل میں جگنو
۵۵۷ - ۴۰ - قطب ستارہ
۵۶۷ - ۴۱ - مدھوبن
۵۸۸ - ۴۲ - کلیانی ندی
- 
- ۶۰۷ - ۴۳ - بیتے میں میلہ
۶۱۷ - ۴۴ - گلِ عجائب
۶۲۶ - ۴۵ - خطِ ستوم
- 
- ۶۶۸ - ۴۶ - جنگلی بطخ
- 
- ۶۷۸ - ۴۷ - دریا نما
۶۸۴ - ۴۸ - پانیوں پہ بہتی موسیقی

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in





(۱)

جل بہار

”واہ۔ بڑی نقتے باز جن بندی ہے صاحب۔ ڈاکٹر منصور کا شعر می نے گلِ عجائیب کے نیچے سے گذرتے ہوئے داد دی۔“

”تسلیم۔ آپ نے آج نوٹس۔“ ڈاکٹر عزیزین بیگ نے روش پر ہلکی شاخ ہٹائی۔
”بچھلی بار جب ہم آئے موسلا دھار بارش۔ ہاتھی ڈباؤ گھاس کیا پتہ چلتا۔“ منصور نے ٹھٹھک کر کوٹھی پر نظر ڈالی۔ ”مکان بھی تم نے معقول خریدا۔ ایک برساتی اور نوا تو بے چارے شو چاؤلی کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے۔“

”یہ کون صاحب ہیں؟“

”اماں وہی چینی شاعر۔“

”میں کسی چینی شاعر کو نہیں جانتی۔“

”کوئی مضائقہ نہیں۔“

”نہ جا پانی نہ کورین۔“

”تو وہ کہنے لگا۔“

”کب؟ اچھا ابھی جب تم چین گئے تھے؟“

”سواد دہزار سال پہلے۔“

”تم سواد دہزار سال پہلے چین گئے تھے اور اب لوٹے ہو۔“

”وہ کہہ رہا تھا۔“ منصور نے تنگلے سے ٹک کر ڈھال کے نیچے ہی گومتی کا جاترہ لیا۔ ”ایک

شام وہ بے چارہ اسی طرح اپنے گھر کے پھانک پر کھڑا تھا۔ سامنے زرد دریا پر زرد سورج۔“

”کیا وہ برفان کا مرین تھا؟“

”اچھا خبر۔ سرخ سورج زرد دریا میں ڈوب رہا تھا۔ تب اس نے اپنا رباب اٹھا کر یوں گایا:
میں نے آدمیوں کی بستی میں گھر بنایا ہے۔
اگر تم اس کی وجہ پوچھو تو میں کہوں۔
میرا دل کہیں بہت دور رہتا ہے۔
اور خود ہی اپنا ساتھی ہے۔
مشرقی جنگل کے پاس کھرد میں کاہلی سے گل داد دتی توڑا کرتا ہوں،
سکون کے ساتھ میں جنوبی پہاڑوں کو ٹکلتا ہوں۔
ڈوبتی روشنی میں پہاڑی ہوا خوش گوار ہے،
آوارہ پرندوں کے جوڑے اڑے جا رہے ہیں،
ان باتوں میں کچھ گہرے معنی موجود ہیں۔
میں اس کا اظہار کرنا چاہتا ہوں
مگر اچانک وہ الفاظ بھول گیا۔

منصور خاموش ہو گیا۔ ہوا میں خشکی تیر رہی تھی۔ گو مٹی پر دور دور تک روشنیاں جل اٹھیں
پرندوں کے جوڑے بسیرا لینے درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

”باغ میں آؤ عزیزین
”باغ ہی میں تو ہوں۔ تم واپس آؤ ڈاکٹر منصور جہاں کہیں بھی ہو۔“
”مجھے ایک وکٹورین نظم یاد آگئی تھی! ”COME INTO THE GARDEN, MAUD!“

وہ مکان کی طرف لوٹے۔
”تمہیں اتنی ساری چیزیں کیسے یاد رہتی ہیں۔“
”یاد رہتی ہیں۔ بس وہ لفظ بھول گیا۔“

”مجھے بھی وہ الفاظ نہیں آتے۔“

”مگر تم وہ برساتی تمزور بنو لو۔“

”جی ہاں اتنا آسان ہے۔ آجکل کے زمانے میں۔ ابھی ماشائیں ایک ہاتھ روم جو ADD

کرنا ہے۔ وہ شاردانے میسرے کھاتے میں ڈال دیا۔“

”تو جینی شاعر اپنے دوستوں کی گاڑیاں کہاں کھڑی کرے گا؟“

”جینی شاعر یہاں کہاں سے آگیا۔؟ گاڑن روم کا سلائیڈنگ پٹ کھسکا کر بیٹھے

سفید بالوں اور شرتی آنکھوں والی ایک خاتون نے دریافت کیا۔

”ایک اچھا شاعر ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ ہر زمانے میں۔ گڈ ایوننگ مسز بیگ۔“

”جیتے رہو۔ انھوں نے جواب دیا اور نہایت مصروفیت کے ساتھ سنہری زنجیر سے

آویزاں سینک لگا کر گل رنگ آسمان کے مطالعے میں منہمک ہو گئیں۔

”میں نے وہاں وہ دیکھیں۔“ منصور نے دریچے کے قریب پہنچ کر بیچ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کہاں کیا۔“ عنبرین نے کھڑی بھری پر گرائی۔

”سنکیانگ کے ایک غار میں۔ تصویریں۔ وہ تصویریں باقی ہیں۔ ترپھی آنکھوں والی منگول

شہزادیاں۔ ریشمیں قبائیں۔ بند ریشمیں جوتے۔ ہاتھوں میں لائے ڈنٹھلوں والے پھول دوہڑا

سال سے منجمد اور منتظر۔“

”تم کو کیا معلوم کہ وہ شہزادیاں تھیں یا غریب مصیبت زدہ عورتیں جنہیں اچھے کپڑے

پہنا کر تصویر بنانے کے لئے کھڑا کر دیا گیا تھا؟“ مسز بیگ نے دریچے میں سے پوچھا

منصور نے پلٹ کر کہا ” MA'AM آپ کے گلاب بہت کامیاب رہے۔ آؤٹ سائز؛

کاغذی خوشبو سے عاری۔ دوپٹے۔ پرانے اصل گلاب وہ رہے۔ بے چارے

مغلوں کے لائے ہوئے خوشبودار“

”تمہارے ہاں ٹی روز ہے؟“

”ہاں۔ تاکہ انگلش کنٹری سائڈ کی یاد دلاتا رہے۔“

”تمہاری امی جب فلاور شو میں اپنے گلاب بھیجیں تو انہیں چاہئے کہ کارڈ پر محض گل عنڈلیب

لکھیں۔ اپنے نام کے بجائے۔“

”واہ گل عنبریں کیوں نہ لکھیں؟“

”کیونکہ عنڈلیب باؤنیکم انکا نام ہے اور HYBRID گلاب اگانا انکا مشغلہ۔ تم اپنے کچن

گارڈن کے پھول گو بھی دو بھی بھیج دینا گل عنبریں کے نام سے۔“

”تھینک یو۔“ عنبرین نے ہونٹ پچکائے۔

”تم نے اس کو ٹھی کا نام تو اب تک سوچا ہی نہیں۔“

”گلشن آفریدہ۔“ عنبرین نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔

”کیوں بھی۔ بالکل آفریدہ۔ گومی کی مناسبت سے اس کو تو جہل بہار کر لو۔ نرسنگ ہوم کا نام

ماشا ماش اللہ تم نے اچھا رکھا کہ منصور۔ شاردہ۔ عنبریں = MASHA۔ میں نے عرض کیا تھا۔

شاردہ منصور عنبرین SHAMA بہتر رہے گا اہل ہنودا سے شاما بھیجیں گے۔ مسلمان شمع۔

قومی یکجہتی بھی ہوتی رہے گی۔“

”شمع! نرسنگ ہوم ہے یا فلمی رسالہ۔؟“

”باغ عدن میں۔“ درپتے سے آواز آئی ”آدم و حوا چیسزوں کے نام تجویز کر رہے ہیں

لیکن بے چاری حوا کی رائے کس نے لی تھی۔ تمہارے اللہ میاں نے نام بھی آدم ہی سے۔“

”تمہاری امی WOMEN'S 'LIBER۔ بھی ہیں؟

”زبردست۔“

منصور نے نظر اٹھائی۔ یرندوں کی ڈارپس اور خواتین بادلوں کے نیچے نیچے سلوموشن پر

گذرتی جا رہی تھیں۔ عنبر گارڈن روم کی طرف چلی گئی۔

”یہ سارس“ عنڈلیب بیگ نے کھڑکی میں سے اطلاع دی ”سائبریا سے آئے ہیں“

”پرسوں نرسوں میں نے ایک کارٹون دیکھا۔“ منصور نے بیچ کے ستھ پر کہنی ٹیک کر بزرگ خاتون کو مخاطب کیا ”کہ کرہ ارض ہے۔ اس پر قطب شمالی کی جگہ ہمیں اور اس کے اوپر سے پرندوں کی تنکون نما ذراتیں گزر رہی ہیں۔ دو چڑیاں اس فلائٹ فورمیشن میں سے ذرا ہٹ گئی ہیں ان کا لیڈر ڈانٹتا ہے۔ خیال رکھو۔ نیچے سالم علی رہتے ہیں“

”ٹولی۔“ مسز بیگ نے قہقہہ لگایا ”میرے نانا کبوتروں اور بیٹروں کی حد تک گلی شاہ تارا دلی کے سالم علی تھے“

”ان کا کبوتر آسمان پر پہنچ کر تارا ہو جاتا تھا؟“

”ٹھہرو۔ میں ذرا قطب ستارا تلاش کر لوں“ مسز بیگ نے پھر عینک لگائی۔

”ابھی پہلے روز“ منصور نے عجزین کو مخاطب کیا ”جب میں تمہارے ہاں آیا اور گیسٹ روم کے غسلخانے کا رستہ دریافت کیا، تم نے کہا، ادھر سے چلے جائیے جدھر ائی کا اسٹوڈیو ہے۔ تو مجھے بہت عجیب سا لگا۔ زیادہ تر ائی لوگ کے لئے کہا جاتا ادھر سے جائیے جہاں ائی کی نماز کا تحت پچھا ہے۔“

”ائی نماز نہیں پڑھتیں“

”میں نے بہت کم امتیاں ایسی دیکھی ہیں جو نماز پڑھتی ہوں“

”وہ دیکھو ایک قاز جا رہی ہے۔“ مسز بیگ نے آواز دی۔

”بلوچی لوگ قازوں کو حاجی کہتے ہیں۔“ منصور نے انہیں بتلایا ”ہر سال عربستان کی

سمت پر دواز! حاجی تعلق۔“

”قطب ستارہ تو بادلوں میں دکھلائی نہیں پڑتا۔ پر زمرہ۔ زمرہ بہت تیزی سے چمک رہی ہے۔“ مسز بیگ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اور غائب ہو گئیں۔ گلوڑیا سوان سن کے لڑزاں کلڈراپ کی طرح۔

”سن سیٹ پلووار۔“

”کیا۔؟“

”تمہاری والدہ اس وقت بالکل گھور یا سوان سن معلوم ہوئیں۔ بے حد صبر رہی ہوں گی۔“
”ہوں۔“

”اب بھی ہیں؟“

”ہوں۔ میں تو سہی۔“

”زمرہ بھی غائب۔“ مسز بیگ نے پھر دریچے میں سے جھانک کر اطلاع دی۔
”میسم۔ کیا آپ شامانی ہیں؟ آپ کے اجداد تو تھے ستارہ پرست جب وہ سائبریا سے

چلے۔ اور میرے بھی۔“

”نہ شامانی نہ ٹامانی۔ اے منصور بیٹا۔ اب تم سدھارو۔ بارش گھری کھڑی ہے۔“

”یس۔ میسم۔“

مسز بیگ پھر غائب۔

”سنو۔“ عنبرین نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے بھی لامارٹینیر میں پڑھا ہے؟“

”لامارٹینیر۔۔۔؟“ وہ ہنس پڑا۔ ”مدرسہ فیموری بھی۔ انٹر سائنس کے لئے علی گڑھ جانے سے پہلے انگریزی کپڑے نہیں پہننے تھے۔ تھے ہی نہیں کھڑاؤں اور اسٹگ پاجامہ اور سر پر گول ٹوپی یہ جو تم ہندوستان میں ہر جگہ دینی مدارس کے غریب طالب علموں کا حلیہ دیکھتی ہو جاگسا۔ بھی ایسا ہی تھا۔“

”پھر تم ایسے سو فٹی کیٹ ٹیکوں کر بنے۔؟“

”لمبا قصہ ہے بائیس سال کی عمر سے برٹش اور امریکن اپر کلاس والوں کی صحبت۔ دس

سال BOSTON BRAHMINs کا علاج معاہدہ۔ لیکن تمہیں ایک بات بتاؤں؟ اپنے

اورینجن کو نہیں بھولا۔“

”اورینجن یاد رکھنا ضروری ہے؟“

”بالکل نہیں۔ اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔“

”تم ڈاکٹر نہ بننے تو کیا بننے؟“

”آبازندہ رہ گئے ہوتے تو مولوی۔ باقاعدہ ندوی یا دیوبندی مولانا۔ مگر وہ کیا ہے۔“

خارا کا پیشہ آذر تراشی — ارے بھتی وہ کیا ہے — کار مچلاں — خارا کا پیشہ — نہیں — ارے اس پر یاد آیا — ”منصور نے اطمینان سے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ ”ابھی ہمیں میں ایک صاحب ملے پیشہ انکا تکیہ کلام ہے۔ پیشہ۔ پیشہ ڈاکٹر صاحب ہر مرض کی دوا ہے پیشہ۔ سارا کھیل ہے پیشہ کا۔ دراصل مجھے اس وقت انہی کی والدہ کو دیکھنے جانا ہے۔ وہاں سے ایک اور مہاپونجی پتی کے ہاں جاؤں گا۔ ان کی بڑی بہن علیل ہیں۔ سنو عنبر۔ وہ خاتون اب تک پورے چونتیس برس ناول لکھی چکی ہیں پینتیسواں زیر تصنیف ہے۔ پچھلے ناول کا نام تھا آریس مصحف اس سے پچھلا زمرہ کا گلوبند“

اچانک ندی اور آسمان آتش بازی سے چمک اٹھے۔

”آج شب برات تو نہیں ہے؟“ منصور نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں تو۔ یہ گورنمنٹ نے لکھنؤ فیسٹول کیلئے شاہی کی جیل بہا اور بسنت کا میلہ ری والیو

کیا ہے۔ آتش بازی۔ کنکڑے بازی اور پیراکی کے مقابلے۔“

”آہا۔ میں تو لکھنؤ نہایت برسوں کے بعد آیا ہوں۔ یہاں ایک مذہبی جل تہا کی رسم بھی قدیم سے چلی آتی ہے۔ گومتی کی کشتیوں پر آتش بازی شب برات کی شام۔ لوگ باگ سجے ہوئے بچروں پر بیٹھ کر بارھویں امام کے نام عریضے گومتی میں بہا دیتے ہیں۔ کورے کاغذ پر رخصتان سے لکھ کر۔“

”اگر تم عریضہ ڈالو گومتی میں تو اس پر کیا لکھو؟“

اں — یہی کہ ماتنا خوب چلے۔“

”بس —؟“

”اور کیا۔ وہی تو آجکل ہمارا مسلہ ہے لیکن میں اس قسم کے توہمات سے سردکار نہیں رکھتا۔“

”وہابی —!“

”جو سمجھو۔ انسان کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور اپنے دماغ اور جو جملے پر۔“

اچھا بھئی اب بھاگتے ہیں۔ ”وہ بیچ سے اٹھا۔ راستے میں ذرا جل تہا ر ملاحظہ کرتے جائیں

گے۔“

”ہا ہا — گومتی کی جل تہا رکھیو۔ بارہ من کی دھوبن دیکھیو۔“

CYNICAL عینین ۱. گڈ ناسٹ —

وہ قریب کھڑی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

باغ میں جگنو چمک رہے تھے۔ آسمان پر تارے اور آتش بازی کی روشنیاں۔ عینین کھڑی اٹھا کر دریچے کے پاس گئی۔ "امی جان —"

تیس ڈیر — "!

"امی آپ بالکل بیچ اینڈ جوڈی شوکی طرح کھڑکی میں آجاتی ہیں!"

"ہاہا — بیچ اینڈ جوڈی شو —"

"امی — ہم گوتی میں عریفہ — ہمیں — وہ — امی ہم برساتی بنو الیس؟ چینی شاعر —"

"ارے بیٹا — چینیوں کے مکان تو میں نے سنگار پور میں دیکھے تھے ۱۹۲۴ء میں ایک سے

ایک فینسی نینگ — سرخ نقش و نگار — سرخ فریم والے گول دروازے —"

"امی یہ لکھنو کا گول دروازہ بھی چینیوں نے —"

موٹر سائیکل کی گرگڑاہٹ تیز روشنی

"— چینیوں نے بنایا تھا؟ ارے تم — خیریت؟"

"آلہ مقیاس الہ باد! انخون بھول کیا تھا — ثابت ہوا ڈاکٹری میں میرا دل نہیں لگتا —"

"تو میرا کون سا لگتا ہے —!"

"آدھی آدھی عمر میں اپنی پردیس میں خدائی نوار پھر کر پیشہ کماؤ۔ وہ سارا اٹھا کر مٹا میں

جھونک دو۔ پھر کہو ڈاکٹری میں دل نہیں لگتا۔ شاباش۔ بہت کامیاب بزنس پاؤںز ثابت

ہو رہے ہو تم دونوں — "سٹریٹ سنجیدگی سے بولیں۔"

"کم آؤن اولڈ گرل — آج شام یہ تھوڑا سا پیشہ نہیں کما لے گا تو کیا غضب ہو جائے گا۔"

منصور اندرجا کرفون کروان دونوں مابجولیبائی امیرزادیوں کو۔ کل صبح کلیننگ میں حاضر ہوں —"

"شینور — اس کے بعد ایک عدد PIZZA —"

”چلے گا۔“ عنبرین دوڑتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ اسے بھیگے درختوں میں اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

دریچے میں کھڑی عندلیب بیگ آہستہ سے بولیں۔

”پھول گوبھی کو گل عنبرین پکارنے والا مذاق آئندہ نہ کرنا۔ اسے کوپلیکس اسی بات

کا ہے کہ وہ ایک PLAIN JANE ہے۔“

”آئی ایم سوری میم۔ میں نے تو محض تفریحاً۔ ادا آئی ایم سوری۔ مجھے بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے۔ بیوقوفی کی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ آئندہ خیال رکھوں گا اور عنبر PLAIN JANE کہاں ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے۔“

”واقعی۔؟“

”بالکل۔ یقیناً۔“

”آئی ایم گلیڈ۔“ مسز بیگ نے مطمئن سی سانس لی۔ ”پانی گرنے لگا اندھا جاؤ۔“

”میم۔ یہیں کھڑکی میں سے کوڈی ماروں؟“

”WHAT'S THAT - P“

”سوری۔ میں بمبئی کی زبان بول رہا تھا۔ یعنی کوڈ جاؤں۔ دیکھئے یہاں سے برآمدے

تک ایک دم کتنی کچھڑ ہو گئی۔“

”ڈونٹ بی سلی۔ لوگ کیا کہیں گے۔“

”لوگ یہاں کون ہیں؟“

”اسی وقت کوئی آن پہنچا عنبرین کا پشینٹ اور وہ کیا دیکھتا ہے کہ مشہور و معروف

ڈاکٹر کا شغری مشہور و معروف ڈاکٹر بیگ کے گھر میں رات کے وقت کھڑکی کے راستے۔“

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اچانک وہ سیٹی بجائی کھڑکی میں سے غائب ہو گئیں۔ منصور نے ذرا

متعجب ہو کر کان لگائے سیٹی کی دھن مانوس سی تھی اب مسز بیگ نے اسی دھن کو نیچے

سروں میں الاپنا شروع کیا۔ ”شام ڈھلے کھڑکی تلے تم سیٹی بجانا چھوڑ دو۔ شام۔“

وہ بھونچے کا ساسر ٹھکائے پتلون کے پائینچے اچکا کر آمد سے کی طرف روانہ ہوا۔ عجیب
پجلی بڑی بی ہیں۔ بڑکی اتنی متین اور بڑدیار اور والدہ سیٹھیاں بجا رہی ہیں۔

صدر دروازے کی چٹخنی کھلی۔

ڈائیننگ روم میں داخل ہو کر ڈاکٹر منصور نے چائوں طرف نظر ڈالی۔ میز پر بڑھیا بلجین لیں
کی چادر۔ ڈل سلور۔ وسط میں رو پہلا شمع دان۔ دیواروں پر یورپین شہروں کے مناظر سٹریٹ
کی تباہی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔ ٹیکن اٹھایا۔ عنبرین گرامر گم PIZZA لے کر داخل ہوئی۔ پتلے کی ایسی
لڑنی آنکھوں والا نیپالی ملازم قابوں سے بھری کشتی اٹھائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

کھانا شروع ہوا۔ ڈاکٹر منصور کا شغری نہایت مطمئن اور ہنسی ڈوری معلوم ہو رہا تھا۔
سٹریٹ کے غیر متوقع فلمی گیت سے جو وقتی حیرت طاری ہوئی تھی زابل ہو چکی۔ مانوس امسکین
اسٹائیل کینڈل لایٹ ڈنر شائستہ، ذہین، با ذوق شگفتہ مزاج میزبان خواتین۔ بیچلر مزیدار
کھانا۔ دنیا میں انسان کو اور کیا چاہیے۔

عنبریں — ”پیزا کا ٹکڑا کاتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ تم کو ان مایخو لیسائی
مصنف کا دولت کدہ دیکھنا چاہئے۔ تم بھی جب امیر کبیر ہو جاؤ اپنا مکان اسی طرح سجاؤ۔ ساٹن
بروکیٹ کے پردے۔ اور صوفے سنہری مچھلیوں سے بھر اٹینگ۔ باپ رے۔ ایل۔ ایم۔ سی
ٹیٹ میں حرف آخر“

”ایل۔ ایم۔ سی۔ ٹیسٹ کیا ہوتا ہے؟“ سٹریٹ نے دریافت کیا۔

”بجلسٹو محمدن کونسل —؟“ عنبریں نے سوچ کر پوچھا۔

”LOWER-MIDDLE-CLASS TASTE“ منصور نے جواب دیا۔

” ان کا گھر دیکھو گی تو سمجھیں آئے گا کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ایل۔ ایم۔ سی ٹیسٹ سارے ملک میں پھیل گیا ہے۔“

” یہ کون لوگ ہیں؟ آپ اسٹارٹس؟“

” نہیں۔ پرانے جاگیردار۔ مگر عصری بد مذاتی کاشکار۔ بالکل یو۔ کے۔ پی۔“

” یو۔ کے۔ پی۔ کیا مطلب؟“ عنبر نے پوچھا ”یونائیٹڈ کنگ ڈم اٹ۔“

” نہیں۔“

” یونین کیر آلا پروڈکٹس۔“

” نہیں۔ اور سوچو۔“

” یو۔ کے۔ پی۔ یو۔ کے۔ پی۔ نہیں۔ تم بتلاؤ۔“

” آلو کے پٹھے۔ وہ۔ لال باغ سے جو سڑک حضرت گنج جاتی ہے۔ وہاں ایک زمانے

میں لال بیبیاں رہا کرتی تھیں۔“

” لوصاحب ایک اور معتمہ حل کرو۔“ عنبر نے مصنوعی الجھن کا اظہار کیا۔

” مسز بیگ غور سے سُننے لگیں۔“

” لال بیبیاں کون ہوتی تھیں؟“ عنبر نے پوچھا۔

” ان کی وضاحت کا یہ وقت نہیں۔ بات سنو۔ تو ان میں سے ایک لال بی بی جس کی سب سے

بڑی کوٹھی تھی وہ پاکستان چلی گئی وہ کوٹھی سرکاری نیلام میں ایک پنجابی شرنار تھی نے خریدنی

ایمر جنسی لاگو ہوتے ہی وہ حضرت انکم ٹیکس کے گول مال سے بچنے کے لیے راتوں رات کینیڈا

بھاگ گئے کوٹھی ان سابق زمینداروں کے ہاتھ بیچے گئے۔

” کپہنی اسٹائل بنگلہ تھا۔ اسے گرا کر ان لوگوں نے BAD-TASTE MODERN

سہ منزلہ مکان۔۔۔ پر سی محل۔۔۔ دختر بلند اختر کے نام پر۔“

” تم نے وہ پرانا بنگلہ دیکھا تھا؟“

” ہاں بھی۔ اس پنجابی بزنس مین کا لڑکا میرے ساتھ۔“

” لال بیبیاں کون چیز تھیں؟“ عنبر نے بے صبری سے دہرایا۔

”پھر بتاؤں گا۔۔ اس دفعہ وہاں اس طرح پہنچا کہ ناول نگار خاتون کی ہمیشہ خبر دکان آیا۔ سنا ہے چین سے ایک یونینکچر سیکھ کر آئے ہیں۔ باجی جان کو ARTHRITIS —

”عرض کیا بندہ نیورولوجسٹ ہے ایک یونینکچر تو تفریحاً سیکھ لیا تھا۔ بہر حال ساڑھے پانچ بجے شام وقت مقرر ہوا۔ یہ پچھلے مہینے کی چار تاریخ کا واقعہ ہے۔“

”کب کہاں۔ کیوں اور۔ کیسے۔“ عنبرین بولی ”تم جرنلسٹ کیوں نہ بنے“

”یاں ہر بات ہر معاملہ بالکل صحیح، بلاکم و کاسٹ اور پیکا ہونا چاہئے، مسزنگ نے صا د کیا۔“

”منصور تم کیا ہر وقت لیبورٹری میں بیٹھے رہتے ہو؟“ عنبرین نے پوچھا۔

”ایک حد تک۔“

”کبھی کبھی تنہا بھی تھوڑے۔۔۔“

”اس میں خطرہ ہے“

”منصور میاں میں تمہاری ہم خیال ہوں۔ انسان کو بالکل منطقی ہونا چاہئے اور واضح جو ہم ایشیائی ہیں ہی نہیں۔ ہمیں فرانسیسیوں کی طرح ہونا چاہئے۔ منطقی۔۔۔“

”اتنی۔ بات لال بی بی کی کوٹھی کی ہو رہی تھی۔۔۔“

”سنو تو سہی۔ ابھی عقل کو تنہا چھوڑنے کا وقت بھی آیا چاہتا ہے۔۔۔ میں کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ جھوٹا سا احاطہ۔ چند درخت۔ کنکر پیٹ اور شیشے کی پہاڑی جیسا مکان اور چاروں طرف سناٹا۔ میں نے عمارت کا چکر لگایا۔ ایک طرف ایک بڑے میاں تہمد باندھے اُچک اُچک کر لگی کے ذریعے امرود توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اشارہ کیا کہ ایک امرود جو بہت اوپر لگا ہوا تھا توڑ دوں۔ میں نے درخت کے گرد گھوم کر مطلوبہ امرود کا جائزہ لیا۔ انسان اچانک غیر متوقع حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ دوسرے لمحے میں تنے پر یادوں کا کرشاخ پر موجود! نیچے سے بڑے میاں ہشکار رہے ہیں۔ بیٹا بندر کو د۔

”لے کے تہر کا نام آگے بڑھ کر کو د۔“

”مسترے پن کی سبوشن تھی۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ وہ امرود توڑ کر ہی دم لوں گا۔“

چنانچہ جو تے موزے اتار کر شاخ پر پیر جمائے۔

”دحقیقت میں اسوقت اپنے بچپن میں پہنچ گیا تھا۔ دنیا میں اس گھڑی میں تھا اور وہ جہلی بڑے میاں۔ اور امرود کا بیڑ۔ اور میں ساری فکروں سے آزاد۔

”امرد توڑ کر نیچے اترا تو کیا دیکھتا ہوں وہ بزرگ میرے موزے پہن کر بگٹ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ حیران پریشان درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ تب مجھے صورت حال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ اتنے میں ایک حاتون پھیلے برآمدے میں نمودار ہوئیں۔“

”ہیردین کا اسٹیج پر داخلہ۔ کیا پہننے تھی؟“

”نیلے نعل کا جپ شوٹ“

”صورت شکل؟“

”بس ٹھیک تھی“

”غمر۔۔۔؟“

”وہ کل پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ بعد تسلیمات دریافت کیا آپ ڈاکٹر منفلو تو نہیں؟ میرے پیروں پر نظر ڈالی۔ میں نے کہا آداب بجالاتا ہوں۔ میرے موزے۔۔۔ ندامت سے بولی۔

معاف فرمائیے گا یہ ہمارے منشی جی ہیں۔ ہماری مرحوم ریاست کے پرانے منیجر۔ سینائیل ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ کچھ نہیں کہتے۔“

”منشی جی احاطے کی دیوار پر چڑھ چکے تھے وہاں سے نعرہ لگایا۔ عوج بن سق زنبہ باد“

”پانگلوں کا گھرانہ نہیں تو۔“ عندلیب بیگ نے اظہار رائے کیا۔ ”مگر کوئی بہت ہی وضعدار خاندانی لوگ ہیں۔ پرانے کارندے کی اتنی دلداری۔۔۔“

”جی۔ چنانچہ وہ ذرا شرمندہ سی موزے اتروا کر لائی۔ اب ان کو کیا پہننا لپک کر اندر گئی اور بڑھیا نخلیں ٹرکس سلپس لے آئی۔“

”جوئے کیا ہوئے؟“ عنبر نے پوچھا۔

”قبلانی بہادر لے بھاگا تھا۔ وہ بھی بہت مدتیغ اور شاندا ز تھا۔ اصل افغان ہاؤنڈ۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ سڑکوں کے آوارہ کتوں کیتوں کی شکلوں پر کیسی مسکینی عاجزی اور عزت

برستی ہے۔ ان کے ایک سپریشن بھی وہی ہوتے ہیں مفلس لاچار انسان جیسے۔ اور اعلیٰ پالتور۔“
”منصور۔ ٹریک پر واپس آؤ۔“

”اچھا تو میں وہ سیلپر بہن کر خاتون کے ساتھ اندر گیا۔ ان کی بڑی بہن ایک گلابی دیواروں والے کمرے میں شیز لونگ پر نیم دراز مصروف تصنیف و تالیف تھیں۔ وہ بھی خاصی — یعنی وہ بھی کل پیدا نہیں ہوئی تھیں بلکہ پرسوں بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ سمجھو زمانے کا سڈو گرم ہے ہوئے تھیں۔“

”لباس — ۹“

”آں — شاید کاسنی عزارے کا جوڑا“

”اللہ کے بندے اتنا لمبا قصہ بے تکان سنا گیا۔ ان دونوں بہنوں کے نام توبت ر۔
عندلیب بیگ نے پوچھا۔

”ایمیلی اور شارلٹ!“ عنبر نے شگفتگی سے کہا۔

”میں سمجھا آپ واقف ہونگی۔ مشہور ناولسٹ ہیں“

”اے مشہور ناولسٹ تو بہتیری ہیں“

”ارے صاحب۔ وہی۔ نگار خانم“

”ہاں یہ نام تو دیکھا ہے۔ ریلوے بک اسٹالز کے PAPERBACKS پر۔ سمجھتی تھی

”فرضی نام ہے“

”قلمی نام ہے جناب“ منصور نے جواب دیا۔ ”اس پر یاد آیا۔ ایک صاحب کہنے لگے

”قلمی ام تو سنے تھے۔“

”یہ کون صاحب ہیں اسقدر جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔“ عنبر بولی۔

”نگار خانم۔! واقعی ایسے نام یا فرضی ناولسٹوں کے ہوتے ہیں مثلاً اصلیت میں

عبدالواحد طباطبائی۔ فرضی نام نگار خانم۔ یا پاکستانی ایکٹرسوں اور گانے والیوں کے —

ضحیحہ خانم — فریدہ خانم — ”عندلیب بانو نے کہا۔“ عنبر تمہیں یاد ہے جب ہم لوگ اسکالینڈ

جس رہے تھے جہاز پر وہ اینگلو عورت ملی تھی۔ نور ماڈریک — نور ماہ خانم کے نام سے

پاکستانی فلموں میں ناچتی تھی۔ بتا رہی تھی لکھنؤ ہی سے لاہور گئی تھی۔ وہاں سینما میں ناچنے کے لئے نوبہاہ خانم بن گئی۔“

”آپ لوگ بھی بات کو کم سائڈ ٹریک نہیں کرتیں!“ منصور نے یاد دلایا۔

”اچھا نگار خانم کا قصہ ختم کرو۔“

”ختم؟ ابھی تو شروع ہی ہوا ہے۔ آواز دی بستنی ڈاکٹر صاحب کے موزے دھو کر انکی گاڑی میں رکھ دو۔ میں نے عرض کی میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ بیحد متعجب ہوئیں۔ آپ اتنے برسوں امریکہ میں رہے وہاں سے کار نہیں لائے؟ میں نے کہا لایا تھا نرسنگ ہوم کھولنے میں پیسہ کی کمی پڑ رہی تھی اس وجہ سے بیچ دی۔ پوچھا امریکہ میں تو آپ نے بہت پیسہ کمایا ہوگا۔ چلیے صاحب یہاں بھی وہی پیشہ پیشہ کی گردان شروع ہو گئی۔ میں نے جواب دیا جی ہاں بہت کمایا تھا مگر جوئے کی لت کی وجہ سے جمع نہیں کر پایا۔“

”جوئے کے لفظ پر وہ چپ ہو گئیں۔ پھر گویا سنی ان سنی کر کے بولیں، عجیب بات ہے یہاں سے ڈاکٹر بھاگ بھاگ کر امریکہ جاتے ہیں آپ وہاں ٹیل ہوئے ہوئے واپس آگئے۔ کہاں بوسٹن کہاں لکھنؤ۔ یہاں بھلا آپ کا کیا دل لگتا ہوگا۔ میں نے جواب دیا مجبوراً آنا پڑا وہاں کچھ گھلے ہو گئے تھے۔ اچھا۔ کیسے گھلے؟۔ میں نے ذرا ہچکچاتی ہوئے کہا اب تفصیل کیا بات آؤں کچھ قانونی کیس ہو گئے تھے میرے خلاف۔ دو ایک لڑکیاں بھی عدالت میں پہنچنے پر تلی ہوئی تھیں چنانچہ بھاگ آیا۔“

”میں نے محسوس کیا سچو لیشن فارسی FARCE میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ نگار خانم پھر چند منٹ کے لئے خاموش ہو گئیں کچھ سوچنے کے بعد دریافت کیا۔ اب تو آپ جو نہیں کہتے؟ میں نے جواب دیا بڑی عادتیں کہاں چھپتی ہیں۔ آپ تو خود اتنی بڑی نباض فطرت انسانی ہیں۔ بہت خوش ہوئیں۔ فوراً پوچھا آپ نے میرے ناول پڑھے ہیں؟ میں نے مبہم سا سر ہلا دیا۔ فرمایا آپ کو یاد ہوگا میرے ناول محبت کے چند نوار میں غزالہ جو دردِ سر کی مر لیفہ ہے۔ نینی تال بوٹ کلب میں ایک یونانی دیوتا جیسے حسین ڈاکٹر سے اتفاق ہے۔“

”میں فوراً دماغ سوچ آف کر کے سوچتا رہا کہ ان کی بہن میرے بوٹ تلاش کرنے گئی ہے یا نئے جوتوں کا آرڈر دینے۔ اتنے میں ملازم کافی دانی لے کر آیا۔ مہری جوتے“

”چاندی کی کشتی میں رکھ کر لائی ہوگی۔ نواب لوگ جو ٹھہرے۔ چھوٹی بہن کا کیا نام ہے؟“

عبریں نے سوال کیا۔

”صاحبزادی شہوار خانم۔ شوقیہ گڑیاں بناتی ہیں۔ جاپانی فلاور ڈیکوریشن وغیرہ امیر زادیوں کے مشاغل۔ گفتگو سے اٹھ گیا کہ والدین حیات نہیں آباہضور مشہ سے قبل جنوبی یوپی کے بڑے جاگیردار تھے۔ وہ علاقہ اب مدھیہ پردیش میں شامل ہو چکا ہے۔ جانے کون سا ضلع بتایا تھا۔ اس وقت میں نے اپنا دماغ سوچ آف کر رکھا تھا۔ تین بھائی ہیں۔ پندرہ بیس سال قبل انھوں نے یہاں شمال میں آگرہ وانی نیٹی نال وغیرہ میں ٹیکر کی تجارت شروع کی۔ بقول ان کے ایک فیکٹری ڈالی۔ ہم لوگ گوشت بھی ایک سپورٹ کر رہے ہیں مڈل ایسٹ۔ پچھلے سال ایک کروڑ کا ٹرن اوور ہوا۔ نگار خانم نے فر فر بتایا۔ سیاسی عزائم بھی رکھتی ہیں کہنے لگیں ڈاکٹر صاحب شکر ہے کہ اب ہندوستانی مسلمان سرکاری ملازمتوں کے بھر و سپر نہیں بیٹھے رہتے کاروبار میں لگ گئے ہیں ان میں سکت اور توانائی آرہی ہے میرے خیر خواہ مٹھر ہیں کہ اسمبلی الیکشن کے لئے کھڑی ہوں۔ کہتے ہیں کہ آپ ایک روز یوپی کی چیف منسٹر بھی بن سکتی ہیں آخر آسام کی چیف منسٹر بیگم انوارہ تیموتھیس کہ نہیں۔ دلی اور یوپی میں بھی کتنی بیگمات نامور لیڈر ہیں۔ مگر میرا اصل میدان ادب ہے۔ ابھی مجھے اردو ناول کو بہت بلندی پر لے جانا ہے۔ تاکہ وہ ڈیس ورنیز اور باربر کا رٹینڈ کے ناولوں کا مقابلہ کر سکے۔ ڈاکٹسٹ بھی میرے ناول قسط وار شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے کچھ ڈاکٹسٹوں کے نام بھی بتائے۔

کنواری بالی۔ بہو بیگم۔ بیوہ۔ خوش دامن۔“

”اے ہٹو۔ یہ ڈاکٹسٹوں کے نام ہیں؟ عندلیب بیگ نے کہا۔“

”اسی قسم کے بتائے تھے۔ پھر کہنے لگیں اب میں تنقید بھی لکھ رہی ہوں“

”میں دم بخود۔ گھڑی دیکھی۔ شہوار سے کہا کہتا بندھو ادب میں تاکہ باہر جاسکوں یا مجھے خود

پھاٹک تک پہنچائیں۔“

”میں دیکھتی ہوں صاحبزادی شہوار WHATEVER سے خلوص بڑھتا جا رہا ہے۔“
عنبریں ذرا کھائی سے بولی۔

”جی دیکھتی جائیے۔ شہوار خانم بالکل میموں کی طرح کوبلائی بہادر کوبلائی بہادر چلائی
باہر گئیں۔ میں نے باہر آکر موٹر بانیک سنبھالی۔ پھاٹک کی طرف بڑھا۔ ایک کوٹھری نظر آئی۔
اندر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ میں سمجھا چوکیدار ہے آواز دی کہ کتا بندھو اسے۔ جواب ندارد۔ روشنی
اس پر پڑی تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص۔ جھڑے کپڑے بال جھاڑھنکا لکھر بڑی داڑھی۔ سُرخ متوجش
آنکھیں۔ زنجیر سے بندھا زمین پر بیٹھا دکھلائی دیا جیسے اندھیرے غار میں چھپا PRIMITIVE
انسان۔“

”پری میٹرو انسان زنجیروں سے کہاں بندھتا تھا۔“ عنبریں نے ٹوکا۔

کھانے کے بعد وہ تینوں ڈرائیگ روم میں واپس آتے۔

”جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا انٹر سائنس میں۔ میرس روڈ پر ایک کوٹھی تھی بڑی
پُر اسرار سی۔ کیا ونڈ میں گھنا جنگل۔ بہت اندر جا کر ایک قدیم سنگلہ۔ ایک پرانی فلم ایکٹریس
اس میں رہا کرتی تھی۔“ صوفے پر بیٹھے ہوئے منصور نے کہا۔

عندلیب بانو نے سر ہلایا۔ ”جانتی ہوں۔ میں نے انکی آخری فلم سہ چالیس میں دیکھی
تھی کلکتے میں۔ عنبریں کی سالگرہ تھی۔ پارٹی کے بعد میں اور نما اور فلو مینا سکند شو۔“

”آئی جان آپ کو میرا سہ ولادت اس طرح نشر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“
”نیور مائینڈ یار WHO CARES ہاں تو میاں منصور۔ تم پڑھی سے اُتر کر

علی گڑھ جا پیجئے۔“

”بالکل صحیح ٹریک پر تھا نگار خانم یہ وہ علی گڑھ والی کوٹھی یا آئی ہمیں لگتا جیسے

اس کے اندر مس ہیوشم رہتی ہوں چارلس ڈکنز والی جن کے گھر کے سارے کلاک اور

گھڑیاں بند ہو چکیں۔ وہ پاگل مجھے گھورے جائے۔ اتنے میں شہوار بی بی دوڑی ہوئی آئیں اور
کہا۔ کوبلائی بہادر کو بندھو! دیا ہے۔

”میں نے دل میں سوچا اب تک تو ان کا شین قات درست تھا کتنے کے سلسلے میں کسی بڑھیا ایم کی روح ان میں حلول کر جاتی ہے۔

”آپ نے تو ایک انسان بھی یہاں بندھوا رکھا ہے۔ اے پاگل خانے کیوں نہیں بھجیتیں؟ میں نے برہم ہو کر پوچھا۔

”کہنے لگیں۔ کیا بتایا جائے وہی ہمارے باؤ لے منشی جو ہیں جن سے آپ کا سابقہ پڑا۔ ان ہی کا بیٹا ہے ماں باپ نہیں جانتے کہ نگاہوں سے ادھل رہے۔ درستہ کیا بات ہے ہم ان کا بہترین علاج امریکہ بھیج کر کر داسکتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ مگر ہمیں منشی جی کی دلداری منظور ہے وہ ہماری سابق ریاست کے وفادار مشجرہ چلے ہیں

”کب سے ان کا دماغ خراب ہوا ہے؟ میں نے پوچھا۔ بولیں پیدائشی سمجھئے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جنون بڑھتا جا رہا ہے۔“

”انسان کا بھی تو عمر کے ساتھ جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے اس نے نیو کلیریم کہاں بنائے تھے۔“ عندلیب بانو بولیں۔ ”اب وہ غار میں واپس جا کر خود ساختہ زنجیروں میں جکڑ گیا ہے۔“

”سٹریٹنگ! باتیں تو آپ اتنی عمدہ کرتی ہیں اور وہ سطحی نگار خانم بطور رائٹر مشہور ہیں جو ڈینس روٹنز کو انگریزی کا بہترین ناولٹس۔“

”خیر انصاف کرو بے چاری کے ساتھ۔ ڈنيس روٹنز بھی اپنے فن کا استاد ہے۔“

عندلیب بانو نے فراخ دلی سے کہا۔ ”تم خاصے اینٹی نگار خانم ہو رہے ہو۔ فرسٹ امپریشنز پر کبھی نہیں جانا چاہئے۔“

”بہر حال۔ تو میں نے کہا امریکہ چھوڑ اس غریب کو رانچی ہی بھجوادیجئے بولیں خطرناک نہیں۔“

”تو زنجیروں سے کیوں بندھوا رکھا ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ کہنے لگیں۔ دراصل کچھ مجذوب سے ہیں دورہ پڑتا ہے لوگوں کو مارنے دوڑتے ہیں۔ چنانچہ زنجیروں سے بانڈھ دیا جاتا ہے۔ آج شام پھر حالت غیر ہوئی تھی۔ پڑوس کے لوگ اور نوکر چاکران کو بابائی پکارتے ہیں۔“

”میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور بھاگا۔ ایک مہینے کے بعد آج شہوار نے پھر رنگ کیا ہے کہ ان کی باجی کو دیکھ جاؤں۔“
 ”موسٹ انٹر سٹنگ۔“
 نیپالی ملازم کافی کی ٹرے لے کر حاضر ہوا۔

”مگر اس خاندان کے لواحقین میں ایک چھوڑ ڈو دو پاگل۔ ممکن ہے یہ ان کے عزیز رشتے دار ہوں۔ منشی جی اور ان کے بیٹے باباجی۔ دراصل پاگل پن بھی ڈیکلینس کی ایک علامت ہے۔“ عندلیب بانو نے کافی بناتے ہوئے کہا۔
 ”جی ہاں اکثر پیرانے زمیندار گھرانوں میں اور راجوں نوابوں کے ہاں ایک آدھ فائر انفل ضرور مل جائے گا یا پیدائشی ایڈیٹ۔ بھئی کے قدیم پارسی خاندانوں کے پاگل تو مشہور ہیں میں جب برینج کینڈی ہاسپٹل میں —“
 ”وہ فلم ہم نے برسٹر میں دیکھی تھی۔“ عندلیب بانو نے بات کافی ڈ۔ ”ایک بریزنیلین قدیم خاندان دکھایا تھا وہ اپنی RANCH پر رہتے تھے خوب بڑا سا گھر۔ اُداس سا —
 آدھے لوگ دیوانے — اور جو دیوانے نہیں وہ پروڈ — مرد و عورت سب — اپنے بھیانک رازوں کی دوسرا تھ میں اس ستائے کے اندر اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔“
 ”شاید اسی فلم میں تو تھا ائی جان کہ انھوں نے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو بڑے بڑے بیخروں میں بند کر کے درختوں سے لٹکا رکھا تھا۔ وہیں کھانا بھجوا دیتے تھے۔ ایک مجبوط الحواس بچے کو کتے کے KENNEL میں رکھ چھوڑا تھا۔ ہو بریل —

”یہ لوگ تو مجھے ایسے خوفناک معلوم نہیں ہوتے۔ بڑی بہن خاصی AMBITIOUS اور جینٹ ہیں چھوٹی والی بھولی سی ہے۔ بس میم بننے کا شوق بہت ہے۔ کو بلائی کھان! کو بلائی کھان!“ منصور نے باریک آواز میں نعل اتاری۔

”شہوار اچھا نام ہے۔“ عندلیب بانو مسوج کر بولیں۔ ”یہ لوگ مغل ہیں یا پٹھان؟“
 ”مجھے تو خالص دیسی معلوم ہوئے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص مغل یا پٹھان ہو۔“

”ہنسی مگر ہر نسل کے کچھ لاشعوری تقاضے اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ تم نے اپنا نام اتنے فخر سے کا شغری کیوں رکھا ہے جو ہندی میں کاس گھری لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔“

”میںم دراصل ایسا ہوا کہ ہمارے پردادا بخاری تھے جب وہ رُسیوں نے سمرقند بخارا وغیرہ پر قبضہ کیا تو بہت سے مولوی مللا وہاں سے بھاگ آئے ہندوستان۔ براہِ پشاور بہاے پردادا بھی بھاگ آئے۔ ہمیں کی مسجدوں میں نمازوں کے وقتوں کی دیکھ بھال کرنے والے اور پیش امام کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے سب بے چارے مسکین لوگ بخاری کہلاتے ہیں میں نے وجہ پوچھی معلوم ہوا ان کے باپ دادا کچھ زار روس کے قبضے کے وقت بھاگ آئے تھے کچھ اکتوبر انقلاب کے بعد۔ یہاں آکر مسجدوں میں پیش امام بابانگی بن گئے۔“

”اگر وہیں رہ گئے ہوتے تو ان میں آج کوئی سائنٹسٹ ہوتا کوئی خلا باز۔“ عندلیب بالو نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میرے پردادا دہلی کی ایک مسجد میں مؤذن ہو گئے تھے۔ پیش امام صاحب نے اپنی بڑی سے اُن کا نکاح پڑھا دیا۔ میرے دادا اور والد بھی ساری عمر مؤذن اور پیش امام ہی رہے مجھے یاد ہے مغرب کے وقت حسبِ دستور محلے کے ہر دروازے پر جا کر گنڈی کھر کھڑا تے میں ساتھ ساتھ چلتا اور گھر کی بی بی دروازے کے اوٹ سے ایک روٹی اور ذرا سا سالن یا دال پیالے میں ڈال دیتی۔ ایسی مفلسی میں میرا بچپن گزرا“

”مانی گوڈ۔“ عزیز میں نے آنکھیں پھیلا کر بچہ افسردگی سے اسے دیکھا۔

”آپ پر رومانی کرب کی کیفیت طاری ہو گئی! سنتی جائیے۔ اسکول سے لے کر ایم۔ ڈی۔ بی ایس تک وظیفے لے کر اور ٹیوشن کر کے پڑھا۔ والدین میرے بچپن میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ میں اکلوتی اولاد تھا امریکہ میں بیڑھائی بھی میرٹ اسکالرشپ پر کی۔ اسی وجہ سے جب نگار شہوار جیسے چوہٹ لوگوں سے ملتا ہوں لو حیران رہ جاتا ہوں۔ جس وقت میں وہاں سے چل رہا تھا اور شہوار سیکم کو بلانی بہادر کو بلانی بہادر چلائی افتخار کے پیچھے دوڑی تھیں ایک غریب مسکین بوڑھا پھاٹک پر کھڑا تھا اس نے بڑی بجا حث کے ساتھ ان سے کچھ کہا۔ انھوں

نے زور سے ہنر دکھایا گویا وہ بزرگ ان کے کوہستانی کھان سے بھی کمتر مخلوق تھے۔
 ”قبلائی۔ تو بڑی برتر مخلوق ہے بھی جو ان کو انگریزی آواز اور لب و لہجہ اختیار کرنے
 پر مجبور کر دیتی ہے“ عنبریں نے کہا۔

”ہاں اور اس وقت مجھے تعجب ہوا کہ ایسے لوگ ہمارے معاشرے کے لیڈر ہیں۔ سطحی
 بیخس۔ نمائش پسند، اقتدار پرست۔“

”میاں تم سیلف میڈ ہو“ عندلیب بانو نے کہا۔ ”لیکن اپنے مزاج اور تجربات کی بنا پر درمند
 بہت سے سیلف میڈ لوگ اپنے مزاج اور تجربات کی بنا پر خود غرض اور سخت دل ہو جاتے ہیں
 رہیں نگار اور شہوار تو یہ اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسروں کی محنت کا پھل اس سے
 چھین کر خود کھانا اس کا تاریخی رول رہا ہے۔ مجھے یاد ہے آج سے پچاس سال قبل لندن کے
 کسی اخبار میں چھپا تھا کہ ایک اوسط درجے کا راجہ نواب اپنی ذات پر دوستوں سے چار سو یا نو
 روزانہ خرچ کرتا تھا جب کہ اس کی پر جا کی آمدنی چند پینیس یومیہ پر مشتمل تھی۔“

”دوسری بات یہ ہے کہ بھی ممکن ہے ان دونوں بہنوں کے اندر بھی کوئی نیکی اور گہرائی
 موجود ہو پہلی ملاقات میں تم نے ان کا ایک ہی رخ دیکھا۔ انسانوں کے متعلق فیصلے کرنے میں
 جلد بازی نہیں برتنا چاہئے۔“

”میں باؤس کو مؤذبانہ یاد دلانا چاہوں گی“ عنبریں نے کہا۔ ”موضوع زیر بحث یہ تھا کہ
 ڈاکٹر منصور بخاری سے کاشغری کیسے بنے۔“

”وہ۔ ہاں تو والدین کا انتقال ہو چکا تھا مدرسہ فقہوری میں مرزا منصور احمد لکھوایا گیا تھا
 وہاں سے نکل کر میں نے بخاری کے بجائے کاشغری کا اضافہ کر لیا۔ بخاری بہت COMMON
 نام تھا۔“

”تو اس طرح آپ گویا روسی کے بجائے چینی نثر ادہو گئے۔“

”جی ہاں۔ اس وقت ہندی چینی سجد بھائی بھائی بھی تھے۔“

”میراجو تا ہے جاپانی میرا کوٹ الگستانی سر پہ لال ٹوپی روسی پردل ہے ہندوستانی؛

عندلیب بانو پھر لاپٹے لگیں۔

منصور کو ”شام ڈھلے کھر کی تلے“ یاد آیا۔ بے اختیار ہنس پڑا۔ ”پہلے سوچا
یارتقدی لکھو اوں۔ لیکن یار لوگ اسے شکر قندی کر دیتے۔ خصوصاً علیگڈھ میں۔ سوچا
کاشغری ہی ٹھیک ہے۔“

”نہایت رومینٹک نام ہے۔“ عنبریں بولی۔
”ہم۔ کانوں میں سلکٹ روڈ پر سے گزرتے کاروانوں کی گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں“
عندلیب بانو نے صاڈ کیا۔

”آپ کو ادیب یا شاعر ہونا چاہیے تھا۔“
”ارے مورے بچو۔ ہونا تو جانے کیا کیا چاہیے تھا۔“

”ابھی جب میں چین گیا تو وہ لوگ سنکیانگ وغیرہ بھی گھمانے لے گئے۔ کاشغریں چینی
مولوی مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔“

”چینی مولوی بے حد کیوٹ لگتے ہیں، عنبریں نے کہا اور مگر تم چین کیسے گئے؟ ہم
ہندوستانیوں کا بوجہ اقلے چین چین ماچین جانا ذرا۔“

”بھئی میں وہ ڈاکٹر سار دیا ہی ہیں نا۔ ایکو پیچکر والے۔ ان کے ذریعے۔“
”چنانچہ آپ کاس گھری بھائی پنکچو والا بن گئے۔“ عنبریں نے کہا۔

”آداب عرض کرتا ہوں۔ اور صاحب نام کی بات تو یوں ہے کہ جب پکننگ سے بمبئی لوٹنا
اور معلوم ہوا ایک لیڈی ڈاکٹر لینیا سے لکھنؤ ٹریف لائی ہیں اور پانڈز شپ میں کلیننگ اور
نرسنگ ہوم قائم کرنا چاہتی ہیں۔ سوچا قیمت آزمانی کر لو۔ آپ کا اسم گرامی بتایا گیا۔
ڈاکٹر آئے۔ بیگ۔ آپ کا SURNAME مغربی فیشن ہے۔ اُصولاً بھی غلط۔ آپ
عنبریں بیگم ہیں۔“

”درست۔ ڈاکٹر مسعودہ خان کو مسعودہ خانم ہونا چاہیے۔“ عندلیب بانو نے کہا۔
”مگر جب بیبیاں خود کو خانم کہلاتی ہوں تو آپ فرماتی ہیں کہ یہ پاکستانی ایکٹرسوں اور گانے
والیوں کا سانام لگتا ہے۔ دراصل الفاظ سب پامال ہو چکے ہیں۔“ منصور نے جواب دیا۔

”کلکتہ کے اسکول اور کالج میں اس کا نام عنبریں بیگم ہی لکھا گیا تھا۔ یہاں انڈیا میں تو میں بیگم چل جاتا ہے۔ مگر انڈیا میں ڈیکل کالج والے بیگم باپ کا نام سمجھے۔ لہذا بیگم کرنا پڑا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو الفاظ — نام — سب یا مال ہو چکے ہیں۔ لوگ بولتے بولتے تھک گئے۔ کم از کم دس ہزار سال سے تو باقاعدہ اور متواتر بولے جا رہے ہیں۔ اسی لئے وہ شخص جو نگار خانم کے سروٹ کو اوڑھ میں زنجیروں سے بندھا چُپکا بیٹھا ہے وہ کتنا محفوظ ہے۔“

”بیگم صاحبہ فرض کیجئے ہم سب کے ناموں کے بجائے نمبر ہوتے۔ نمبر تین۔ نمبر بارہ نمبر سات۔ بمبئی کے ہسپتالوں میں وارڈ بوائے اطلاع دیتے ہیں صاحبہ گیارہ نمبر خلاص ہونا مانگتا — یعنی گیارہ نمبر بیڈ کا مریض مرنے والا ہے۔“

”خلاص ہونا مانگتا —“ عندلیب بانو نے جھڑھری لے کر دہرایا۔

منصور نے موضوع تبدیل کیا ”عندلیب آپ کا تخلص ہے؟“

وہ خاموش رہیں۔

”معاف کیجئے میں بھی نگار خانم کی طرح ذاتی سوالات کرنے لگا۔ ہم ہندوستانی مغرب

میں کتنا ہی رہ لیں خصلت تھوڑا ہی بدلتی ہے۔“

”نہیں بھئی۔“ انھوں نے چونک کر جواب دیا۔ ”تخلص نہیں ہے۔ والدہ نے مجھے عندلیب

بانو بیگم اپکارا۔ خود ان کے دادا نے ان کا نام گلرخ بانو بیگم رکھا تھا۔“

”گلرخ بانو بیگم! لگتا ہے گویا ہمایوں نامہ کھل گیا۔“ منصور نے بے ساختہ داد دی۔

عندلیب بیگم تلخی سے مسکرائیں۔

”ٹائیم جنٹلمن —“ عنبریں نے لگو ٹلاک پر نظر ڈال کر اعلان کیا۔

کیا مطلب —؟“ منصور نے پوچھا۔

”ارے کیا تمہارے امریکہ میں یہ رواج نہیں؟ ہمارے برطانیہ کے PUBS میں تو

بار میڈلس یہ دو الفاظ کہہ دیتی ہے۔“

”بھئی ہم امریکہ کی بارز ہی میں بہت کم جاتے تھے۔“

”تو جوئے میں ہارنے کے بعد جیل جانے سے قبل غصہ غلط کرنے کے لئے کیا کرتے تھے؟“

”بس پیاز کھاتے تھے۔“

”ڈاکٹر کاس گھڑی گھڑی گھڑی دیکھنے کے بجائے اب بھاگیے۔“

”ڈاکٹر کاس گھڑی۔“ منصور نے دہرایا۔ ”اور جب لکھنؤ پہنچ کر ڈاکٹر بیکٹری میں آپکا فون

نمبر دیکھ رہا تھا ابک صاحب بولے۔ یار یہ عنبرین کون شے ہے۔ بہتر روکی کسی دو کا نام؟

”ہا ہا ہا۔ پی۔ جے۔“

”پی۔ جے؟“

”پھیلٹ جوک۔!“

”بھئی اب واقعی سدھارو۔“ عندلیب بانو نے تردد سے کہا۔ ”ہم لوگ یہاں نئے نئے

آتے ہیں۔ پڑوسیوں کو معلوم ہے کہ تم عنبر کے کو لیگ ہو مگر یہ چھوٹا شہر ہے۔“

”آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں۔“ عنبر انڈینڈنٹ ڈاکٹر ہے۔ پندرہ سال برطانیہ دس

مڈل ایسٹ میں گزار کر آرہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ کنویں کے مینڈکوں سے ڈرتی ہیں۔“

وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

”اب آدھی رات کو تمہاری موٹر بائیک یہاں سے جائیگی سارے محلے پر الم نشرح کہ

امریکہ والے ڈاکٹر صاحب انگلینڈ والی ڈاکٹر ٹنی کے ہاں ڈنر کھا کر جا رہے ہیں۔ تم کو کیا پتہ

یہاں کی گھریلو بیویوں کے پاس کتنی فرصت ہے۔ یہ تمہارا بھئی تھوڑا ہی ہے۔ یا لوٹن۔“

”تب تو نگار خانم ٹھیک ہی کہتی تھیں میں وہاں سے کیوں لوٹ آیا۔“

”اچھا کل ان کے ہاں جاؤ تو اگر ساری رپورٹ دینا۔“ عندلیب بانو نے دلچسپی سے کہا۔

”اچی آپ کو بھی GOSSIP میں مزا آتا ہے۔ ابھی پڑوسیوں کی اس عادت کی شاکی تھیں۔“

”گو سبپ گیا ہے۔۔۔ مشاہدہ حیات! اگر اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔۔۔“ عندلیب بانو

نے فریسیسی انداز میں کندھے اچکا کر دنگ کیا۔

(۲)

جو جھکون تو شاخِ گلاب ہوں

”بنت کی پھوار اور سنہری دھوپ! یاد ہے امی ایسے میں گرتی کہا کرتی تھیں اسے لوی بیوی اللہ میاں ہنس رہے ہیں! امی جان! بعض دفعہ نٹا کا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں پھیر جاتا ہے۔ میرے کی لونگ۔ ابرق سے دمکتا لہریا دوپٹہ — کتنی مشاقی سے دوپٹے چنتی تھیں نٹا۔“

بارش کی تیز تر تھی پھوار نے بیٹھے دھندلا دیے۔ سو واسلف کی ٹوکریوں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے حسین بخش نے جھاڑن نکالا: ”بیٹا ذرا تمہیے۔“

”ٹھیک ہے حسین بخش — چلے چلیے — گرتی کی نکسالی اردو! سادون کی رم جھم۔ بھا دوں کے جھالے۔ ماگھ کی مہا وٹیں — کہتی تھیں تمہاری نگوڑی انگلش میں سبکے لئے وہی ایک اللہ ماری رین! ایک دفعہ بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی بولیں۔ ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں سادون بھاؤں بہن بھائی ہیں جو گلے مل کر رو رہے ہیں۔ بہن کی رخصتی پر بھائی روتی ہے۔ کیسی خوبصورت بات — ڈیم۔“

بریک۔ ایک بے نیاز کالا بجا رسا منے سے گذر گیا۔

”— امی جان! — وہ بتاتی تھیں کہ سادون میں وہ سب پردے دار بہا رکس میں ٹھس کر قطب صاحب جاتی تھیں۔ سارا گھر — وہاں بڑی چل پوں محنتی۔ وہ جھوٹے پر بیٹھ کر لاپتیں۔ اماں میرے بھیا کو بھیجوری کہ سادون آیا:“

”تمہاری گرتی کا نہ کوئی بھیا تھا جو انہیں سادون میں بلاتا نہ میکہ۔ اب کوئی اور بات کرو۔“

”امی جان۔ اینٹگلو بسکس لوگوں نے جذبات کو جرم کیوں سمجھ لیا ہے؟ میرا خیال ہے

ب آپ بھی اپنے اس انگریز مزاج کو بدلے۔ کیونکہ آپ اینگلو سیکسن نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں کبھی کبھار تھوڑے سے آنسو اعصاب کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ مانی گوش — گزنی بیجاری کتنا روئی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھی ہیں۔ سامنے مینہ برس رہا ہے۔ ادھر انکی آنکھوں سے آنسو — ساتھ ساتھ گانے کی کوشش — راجہ کوڑیا کھولورس کی بونڈیا پڑیں۔ مجھے پکارتیں — اری اولونڈیا — امیر خسرو کی پہلی بوجھ — سموسہ کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا — گلانہ تھا —! میں جبکہ کرجواب دیتی۔ ان پہیلیوں کے جواب انہوں ہی نے سکھائے تھے پھر میں کہتی۔ ننا تم کبھی تو بے سُری ہو۔“

”تمہاری ننا کو ساری عمر اُسو بہانے سے بہت فائدے ہوتے؟ بکو اس مت کرو۔“
 ”او۔ کے۔ او۔ کے۔ موم۔ ایسی عمدہ موسم بہار کی بارش ہو رہی ہے۔ کوئی جیرفل ٹونگ ہو جائے۔ مثال کے طور پر بہار کا خیال —“

”بنگال بہار کا خیال چھوڑو۔ موٹر چلاؤ دھیان سے“

”با با با — ویری گڈ — انہیں امی۔ پلیز“

”ہوں — ہوں — پھولوں والی کنتھ میں کاسنت گروا — پھولوں والی —“

”جولی گڈ — ذرا او ڈیوم اونچی کیجئے“

”حمین بخش۔“

”اونچا سنتے ہیں۔ اطمینان سے گائیے۔ دیکھیے اس وقت کار کیا پڑوائی کے جھونکے سماں جا رہی ہے — کم آؤن اولڈ گرل — اچھا جان عالم کی کوئی چیز — موقعے کی مناسبت سے۔ بقول منصور — کیا ہے کہ — یہ لکھنؤ ہے اور رت لبنت!“

”ہوں — ہوں — ہوں — اچھا نواب صاحب رامپور کی ایک بندش سونگی — نواب رضا علی خان کی — تینگ میں“

”شیور“

”ہوں — ہوں — کبھی انکو نہ مرے ہاتھ کا بھایا پانی — جب دیا میں نے — برا ہو گیا اچھا پانی۔“

پھر خاموش۔

”بھئی امی پلیز۔“

”اوگھٹا کالی گھٹا تم کے کہیں سانس بھی لے ہوا جاتا ہے میرے ڈیل سے اونچا پانی“

چینیٹ اڑاتی موٹریں۔ اسکوٹر۔ رکشائیں۔ خوش باش زرد پوش سیلانی۔

”جی اہو روتا ہے میرا تو اچھا کیا ہے، دکھ تو کر دیتا ہے پھر کالکلیج پانی“

موپڈ سوار لڑکیاں۔ خود پہنے موٹر بائیک پہ قرآنے بھرتا

”ارے منصور۔! عنبر گاڑی روکو۔ اے بیٹا۔ منصور۔“

وہ چھتر منزل کی سمت بارش کی لطیف دھند میں سے نمودار ہوتا ہے۔
پیہو بہار گائے جا ابر بہار چھا گیا شہیدینار کے سامنے گرجتا
ٹھٹھ گھڑاتا کلوز اپ کول گیٹ مسکراہٹ لبنت رت کی بجلی

”ہاتے عنبر۔ گڈ آفٹر نوٹن مسز بیگ۔ سلام حسین بخش!! اتوار منانے
نکلی ہو ڈاکٹر صاحب اور میں تمہاری طرف آرہا تھا۔“

”اتوار نہیں کچھ اور۔ ایک پشینٹ کا فون آیا تھا۔ اسے دیکھنے فرنگی محل
جا رہی تھی۔ شاہ مینا صاحب کے نزدیک پتہ چلا کہ سیاستی ہو گیا۔
پاٹے نالے پر کر فیو لگا ہے۔ گھر لوٹی۔ امی نے کہا۔ ماما بدل پساری۔“

”عجیب اول جلو نام ہے۔ یار کہیں ماما تیں بدلی جا سکتی ہیں!!“
”بس تو امین آباد سے واپس آرہے ہیں۔ تم بتاؤ شہوارہ بیگم سے مل آئے؟“

واٹ اے ہینڈ سم فیلو۔ گویا آلا آرے۔ آلا۔ ذرا موٹر سبھال برج پالا۔
ٹاؤر برج اٹھا۔ مورنما بجا چلا آتا ہے پھلیوں کا پھریرا اڑاتا
ہیکلی۔ کلایڈ۔ ڈسی۔ ٹیمز۔ زائندہ رود۔ نوسر۔ یس سر۔
وہ تو گومتی کے تپ پر۔ بھیکے گل مہر کے ساتے میں موٹر بائیک پر بیٹھا
گویا آلا آسمان کو دیکھتا ہے

”بارش تھمی اور کنلوے موجود۔ عنبرین چلو ہم بھی سیلی گارڈ میں جھگٹا“
چونہ اور رت رنگی ہے جو گندے کے رنگ کی۔ سرسوں کے پھول من،
پہ گھٹابن کے چھا گئے۔ اچھا ہوا کہ ایسے سمے تم بھی آگئے۔ کرتی نہیں
لسنت کا درشن تو رے بنا۔

”عنبرری یکس۔ جلد تمہیں ان فسادوں کی عادت ہو جائے گی۔“
”یس۔ اف کورس“

تختہ گل کے کنارے ایک ہری پنج۔
حسین بخش، مودب، مہذب، افیونی باورچی
امی جب پچھن برس قبل لکھنؤ آئی تھیں افیونی داستان گوچوک میں نشئی
زیر عشق سناتے تھے پچھن اور جوڑد تو سرشار کا لکھنؤ۔
مزید ستر پچھن عہد نواب سعادت علیخان وزیر ہند۔ ۱۸۰۱ء
میں اپنی تیس روز تیب کا

بچپن سال پہلے والی امی ابھی موجود ہیں۔ بیلی گارد کی طرح شکستہ۔ وقت کی گولہ باری چھیلے۔ بیلی گارد کے کاسل غدر میں گولوں سے پھلنی ہو گئے۔ کھنڈر سامنے موجود۔ جی لہوروتا ہے میرا تو اچنبھا کیا ہے۔ دکھ تو کر دیتا ہے پتھر کا کلیجہ پانی۔ چار ٹوہریالی۔ اور شادابی۔ تناور درخت۔ گلاب کے تختے۔

”عزیز۔ کل رات ندوۃ العلماء کے سامنے زبردست آتش بازی ہو رہی تھی۔ جل بہار دیکھتا گھر پہنچا تو ٹورزم والے شریش چندر صاحب کا فون۔“

”نہایت نفیس آدمی ہیں۔“

”فرما رہے تھے لکھنؤ فیسٹول شروع ہو چکا۔ آپ اب تک تشریف نہیں لائے۔“

”ضرور تشریف لے جاؤ۔ تم تو بڑے زبردست CULTURE-VULTURE ہو۔ شہوار بیگم کو بھی ساتھ لے جانا مینا بازار۔“

”ہلو۔ عزیز۔ کیا بات ہے؟“

”ان پر ڈپریشن کے دورے اسی طرح پڑا کرتے ہیں۔ کل رات سے ان کا یہی عالم ہے۔“ امی کی شکایت۔

”ہائیں! بلکہ عزیز!!۔۔۔ یہ کیا سن رہا ہوں؟ تم بھی تو اس افسانوی ساحل پر رہتی ہو۔ بسنت رت میں چھتر منزل اور فرح بخش کے جھروکوں سے بیگمات گومتی کے میلے کا نظارہ کرتی تھیں۔ بادشاہ اور خواص و عام سب زرد پوش۔ موروماہی نما بچروں پر سوار۔ میرا شامنت کا بھیس بدل کر اسی کنارے پر۔۔۔ والدہ دیکھو لکھنؤ کی وضع داری۔ ایک بزرگ لڑکھڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہاتھ میں بسنتی روماں!“

ایک نجف الجتہ بڑے میاں آہستہ آہستہ چلتے آن کر خالی پنج کے قریب رکتے ہیں۔ سفید جھاگ ایسی دوپٹی۔ سفید انگرکھا۔ سفید مونچھیں بارعب چہرہ۔ حسین بخش لپک کر انھیں سلام کرتے ہیں۔ جھاڑن سے بیخ پونچھ اپنی اینٹ پر واپس بڑے

میاں یا علی کہہ کر بیچ پر فردکش۔ چھڑی کی موٹھ پر دونوں ہاتھ دھرے
انگر کھے میں بلبوس ایک پیرڈ کر دار۔ مڑ کر دیکھا ایک دوبار جیب سے کوئی چیز
بند مٹھی میں نکالی۔ بسنتی رومال کی اوٹ کر کے مٹھی منہ تک لے گئے نجانے کس
چیز سے شغل کر رہے ہیں۔ شاید یہ بھی انیم کھاتے ہوں۔ انگلیوں میں عقیق
اور فیروزے کی نقرئی انگشتریاں۔ اب دوسری جیب سے خاکِ شفا کی تسبیح۔
شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔

” میم — یہ صاحب یقیناً ایک تباہ حال و شیقہ دار ہیں —“ منصور کی
امی سے سرگوشی۔ ”حسین بخش نے بھی انکو بڑے ادب سے سلام کیا“
حسین بخش بینک میں بھلا بتاؤ اس شہر کے ڈیکٹیٹنس کی کوئی حد ہے۔
ایک پھٹے حال نواب صاحب۔ ایک انیمجی باورچی — کاخ سعادت علیخان
کے باغ میں دونوں سرنگوں — یرقان زدہ موسم — اللہ اللہ۔

”عنبر —! چیرپ!“

” بن غازی میں شاردانے جان کھالی۔ لکھنؤ چلو وہاں میرا سارا خاندان
ڈاکٹر ہے نرسنگ ہوم کے لیے تمام سہولتیں مل جائیں گی۔ تو بہ تو بہ۔ مجھے
سیدھے کلکتہ واپس جانا چاہیئے تھا۔ مزے سے رہن اسٹریٹ میں پریکٹس
کرتی۔ افوہ ذرا اس طرف جا کے دیکھو۔ ہزاروں ہزار RIOT POLICE

” ایسا تو اور کہیں نہیں ہوتا بیٹا لکھنؤ کے بھی چند محلے ہیں جن کے لیڈروں
کے لیے حضور یہ روزی روٹی کا سوال ہے۔ جب بڑی بہیا آئی ہے۔“
”سنہ اٹھارہ حسین بخش؟“

”ایا ہی رہا ہوگا جیسا۔ ہمارے آبا بتلاتے تھے۔ حضور پہلے شیعہ اور سنت
جماعت دونوں کے تعزیرے ایک ساتھ تال کٹورہ پھول کٹورہ کی کربلاؤں میں

جاتے تھے۔ بڑی بہتیا سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے ایک بڑے مولانا صاحب نے فرمایا سنی ڈھول تاشے بجاتے ہماری ان کربلاؤں میں آتے ہیں ہماری سوگواروں میں خلل پڑتا ہے۔“
 ”مگر وہ تو ماتمی نقارے ہوتے ہیں حسین بخش۔“
 ”جی بھیا۔ تو سنت جماعت اپنے تعزیے ماہ نگر لے جانے لگے۔ پھر وہ چاریاری جھنڈا کھڑا ہوا۔“

”سر اینٹی مکڈونل کی دو کرامات۔ پہلی اردو و ہندی۔ دوسری شیعہ سنی؛ ایک اور فرنگی SCAPEGOAT۔“
 ”ڈو کو منسٹری پروف موجود ہے بھئی۔ دستاویزی شہادتیں۔ تبوت۔ لفٹنٹ گورنریو۔ پی سر اینٹی مکڈونل کے رول کے۔ باقی یہ کہ فرنگی کی حرکتیں تو اودھ میں ڈیڑھ سو سال سے اسی قسم کی تھیں۔ یہ سلطنت ہی انھوں نے کھڑی کی تھی مغل دلی کے مقابلے پر۔ اودھ پر اصل حکومت اس ریڈیٹنسی سے کی جا رہی تھی۔“
 ”یہ معاملہ تو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ ایرانی پارٹی۔ تورانی پارٹی۔ جاسٹھ کس نے تاراج کیا؟“
 ”مسز بیگ۔ کپنی نے لکھنؤ میں شیعہ مہرہ آگے بڑھایا۔ دلی کے سنی مہرہ کے مقابل میں اور اسے مذہبی غلو اور عیاشی۔“
 ”سنی مہرہ پہلے ہی پٹ چکا تھا۔ اس غریب کو شہ دینے کی اب کیا ضرورت تھی اور بے چارے مغل بادشاہ تو بالکل اینٹی شیعہ نہیں تھے سوائے۔“
 ”اگر موصوف نے دکن کی سلطنتوں کو ملیا میٹ نہ کیا ہوتا تو نہ شہ آجی مرہٹہ زور پکڑتے نہ مغل ایپا ئیر ٹومٹی۔“
 ”تم کیا ہو۔“

”کیا مطلب کیا ہوں۔ آدمی ہوں“
 ”نہیں اسوقت کچھ شیعہ سے لگ رہے ہو“
 ”سبحان اللہ! کل تم مجھے دبا بی سمجھی تھیں! انسان کے خیالات پر سائن بورڈ لگاتے
 جاؤ۔ شاباش۔ بندہ حنفی المذہب تو رانی پیدا ہو لیکن معاملات کو انکے صحیح تناظر میں دیکھنے
 کا قایل“

”اضافیت کی ایک حقیقت یہ ہے کہ فریم ان ریفرنس مختلف ہوتے ہیں“
 ”بنیادی حقائق ہر پرسپیکٹو سے یکساں ہیں۔ انفرادی مشاہدہ اپنے پرسپیکٹو کے لحاظ سے
 مختلف لیکن SPACE-TIME CONTINUUM ———“
 ”یہ تم لوگ کس گڑبڑ جھالے میں لگ گئے“

”منوعہ ترین! کمپنی کی حکومت نے انگریزوں کی شاہی حرم میں پہنچائیں اور کنگ
 نصیر الدین حیدر کو محرم کی مصروفیات میں لگا دیا۔“
 ”اینگلو امریکن پارٹی سے تو بٹیا تم بھی فیضیاب ہوئے۔ بلکہ بوسن ٹی پارٹی سے! —
 در نہ کسی گلی محلے میں پڑے طبابت کر رہے ہوتے حکیم منن صاحب! لیکن لکھنویں تم نے
 فرنج پارٹی والے کے اسکول میں پڑھا اذرا سکے بعد ———“
 ”میم میں نے ———“

”امی ژرنال کلا دما تین کو بہت ایڈما کر کرتی ہیں“
 ”فیس ٹینگ مین — کیوں نہ کروں“
 ”میم وہ ایک سو بچران فورچون تھا اور اس نے ہندوستان میں رہنے والی یورپین
 قوم کی تعلیم کے لیے دولت چھوڑی، جو اس نے اودھ میں بٹوری تھی ———“
 ”تمہارے فوجی سرداروں نے کتنے اسکول کالج قائم کیے؟ خواہ مخواہ کی قوم پرستی مت کرو۔“

دور سٹرک پرنفردوں کی آوازیں۔

”عنبر یہ بلوائی نہیں معلوم ہوتے۔ ٹھیر میں دیکھ کر آتا ہوں“

”نیم۔۔۔ ایک نیتا امریکہ کا دورہ کر کے لوٹے ہیں۔ جلوس ایرپورٹ سے آ رہا ہے“

”یہ کون سی پارٹی ہے؟“

”پتہ نہیں لیکن پرسوشن بہت لمبا ہے۔ کچھ امیر الامراء۔ چند چکلے دار۔ باقی سوجنزان فوجوں“

”وہ بیچ پر بیٹھ گیا۔“ جی۔ توجزل کلاڈ مارٹین۔۔۔“

”ہمارے لورٹیو ہاؤس میں ایک مرتبہ لیون اور کیل کٹا لاما مارٹین سے۔۔۔“

اب جا کر انکے ولایتی پن کی وجہ سمجھ میں آئی۔ ”قطع کلام معاف منبر بیگ لیکن آپکے والد

بچہ روشن خیال رہے ہونگے جو آپکو اس زمانے میں انگلش اسکول۔۔۔“

”بالکل ولایتی۔۔۔“

”آج تم مسلمان لوگ کا بڑا دن ہے؟ والے ٹاپ ہے؟“

”قطع“

”واہ بیکر صاحب WOGS کا ہماری سوسائٹی کو موڈرٹائز کرنے میں بڑا کونٹری بیوشن

رہا اور میں سمجھتا ہوں سعادت علیخان نواب وزیر اودھ ہندوستان کے پہلے WOG تھے۔

ایک طرف بسنت کا میلہ شروع کرتے ہیں دوسری طرف انگریزیت۔

”اور یہ ریڈینسی۔۔۔ ماسک بال۔ گریٹ ڈنر۔ بوزویل جیسے بانکے وگ لگائے وہ سامنے

والی سیڑھیاں اتر کر کوچ پہ سوار ہو رہے ہیں۔

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر

کوچ پہ ناز کی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن“

”بیٹا تمہیں میرا نشا خوب یاد آئے“

”بیلی گاڑ بھی انکی یاد نہ دلائے؟“

”معاف فرمائیے گا حضرت —“ نزدیک کی بیچ سے آواز آئی: ”سیدانشا کے اشعار اس طرح ہیں سہ

کوئی شبِ نیم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسی ناز پہ جلوے کی دکھائے گا پھین

نسترن بھی نئی صورت کے دکھائے گارنگ

کوچ پہ ناز کی جب یاؤں رکھے گا بن ٹھن

کس قیامت کا سبک سیر ہے اسکا راکب

حاضری نکھائے جو سکلکتہ تو لندن میں ٹفن

”بہت بہت شکر یہ - عنایت“ منصور نے کہا۔ بڑے میاں نے جھک کر تسلیم عرض کی۔ منصور اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ

کر کے اپنا تعارف کرایا۔ ”ناچیز کو مرزا منصور احمد کہتے ہیں۔ جناب کی تعریف؟“

”ننگ اسلاف کا نام پوچھ کر کیا کیجئے گا۔ غریب خانہ و کٹوریہ اسٹریٹ پر

ہے۔ واپس جا رہے تھے۔ کرفیو پاس پاس نہ تھا۔ دو گھڑی سستانے کے لئے

ادھر آنکے — آپ صاحبان کی بصیرت افروز گفتگو کان میں پڑی —“

”میں چین میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا۔!“ عنایب بیگم نے کہا۔

”ماشا اللہ — ماشا اللہ —!!“

”تسلیم“

”نواب صاحب فی الحال تو بلبلیں نالہ زن ہیں“ منصور انکے پاس جا بیٹھا۔

”آج کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ نہ محرم نہ شبیں نہ بارہ وفات“

”ہسبات“ گمنام نواب نے آہ سرد کھینچی ہاتھ بگفت آہ شدہ لکھنؤ خراب!

جب ادبار آتا ہے عقلوں پہ پتھر پڑ جاتے ہیں۔ وہ پتھر اہل اسلام ایک دوسرے

کو مار رہے ہیں۔ حاکم شام کے متعلق چار الفاظ پر مشتمل ایک فارسی فقرہ

پاٹے نالے پر ہمیشہ آفت ڈھاتا ہے۔ آج صبح کسی لڑکے نے وہ دہرایا:

”پریڈیٹنٹ اسد کا پاٹے نالے سے کیا تعلق؟“

”سیکیم صاحبہ نے بہت ٹوک کی لی! ماشا اللہ!!“ عندلیب بانو کے تجاہل عارفانہ پر موضوع تبدیل کیا۔ ”جنرل کلاڈ مارٹن بہترین مرغ باز بھی تھے۔“ پان کی ڈبیا نکالی۔ بولے

— ”یورپین سیاحوں کو لکھنؤ میں ماسکو اور ڈریڈن کی جھلک نظر آئی۔“

درختوں کے سائے طویل ہوئے۔ اور سلسلہ گفتگو۔

آغا میر۔ انشا۔ مصحفی۔ بیر تقی میر۔ کرنل ڈیم گارڈنر۔

منصور نے کہا۔ ”انگریز کے اقبال کی ایسی ہی ہے رسی۔ آدھی تہ ہے

اسمیں فرانسس کی ٹوپی۔ اُردو داں فرنگی اسکی سوسائٹی میں شامل تھے اور وہ

بیہرک لکھتا تھا۔ یاں وقت سلام اترے ہے ابلیس کی ٹوپی“

”ابیلے لوگ تھے“

”کون۔؟ انگریز۔؟“

”نہیں صاحب۔ لاجول ولاقوہ۔ سنا ہے ابک زمانے میں پیرس یورپ کا لکھنؤ

کہلاتا تھا“

”ماشا اللہ۔ یہ ہے اصل وطن پرستی۔ سن لیجئے۔ مسز بیگ۔ لیکن جو واقعہ ہے کہ لکھنؤ پر

فرینچ کلچر کی چھاپ بھی مقرر پڑی۔ فرانسس کی ٹوپی۔ فرانسس کی ٹوپی۔“ منصور نے

مفکرانہ انداز میں ناک کھجائی۔ ”اس پر یاد آیا کیسے پتے کی بات۔“

”جو گندرنے کل کہی۔“ مسز بیگ بولیں۔

”اودھ اور لکھنؤ میں اتنی جاذبیت تھی کہ فرات ہے تو وہ گومتی۔ سین اور تیز ہیں

تو وہ گومتی۔ فرانسس، انگریز، یوریشین۔ سب نوابوں کے تمدن میں مدغم۔ بقول شخصے

سرشار نے ڈینیوب کے اُس پار بھی لکھنؤ آباد کر دیا۔ دیکھنے میں چھوٹی ٹی ندی۔ مگر نیل

کا حکم تھی ہے۔ مثال کے طور پر مسز بیگ دوپلے اور نپولین کی بوٹ شپ ڈالی ہیڈ کو

گومتی میں غوطہ دیا گیا تو وہ بصورت گشتی نما لکھنوی ٹوپی نمودار ہوئی۔“

”سبحان اللہ“

”ہمارے ایک دوست کا ارشاد ہے کہ اہل فرانس جب نگارستان لکھنؤ میں محافلِ رقص و سرود دہا کرے تھے تو خوشدلی سے اپنے ٹوپ مجرے والیوں کے سروں پر رکھ دیتے کبھی ٹھمکی لگا کر وہ بانگی ٹوپیاں اربابِ نشاط خود ادرھ لیتے۔ اس طرح وہ کارچوب سے سچ کر انکی پوشاک میں شامل ہو گئیں۔ ایک بار موسیٰ کے باغ میں۔“

عندلیب بانو نے تعجب اور دلچسپی کے ساتھ بات کا کافی ”تمہارا مطلب ہے منصور — کہ ناچ گرنے کی کشتی نما ٹوپیاں فریج اور کین کی تھیں؟“

”دی۔ مادام۔ اور آپ کو وہ واقعہ تو معلوم ہو گا کس طرح نواب حامد علیخان دانی رامپور کی مجلسیں مرتع ٹوپ کی وضع پر مہاتما گاندھی نے کھا دی کیپ رائج کی!“

”خیاط فلک اس کی ٹوپ اس کے سر پر رکھتا جا تا ہے۔ نواب نے ایک اور آہ بھری۔“

دو پور میں ہتی سبزے پر اکڑوں بیٹھ کر حلیم پینے لگے۔

عندلیب بیگ ہنس پڑیں: ”ہمارے ہانکے دنیا کے اولیں ہتی تھے۔ چریسے۔ مدکیسے: ہمارے بادشاہ اور شہزادے۔“

”آپ بھی آخری شاہانِ مغلیہ اور تاجدارانِ اودھ کے متعلق وہی روایت رکھتی ہیں۔ عیاش۔ نکمے۔ وایات۔ زحمت نہ ہو تو ذری انہی مجبور یوں پر غور کیجئے۔ نواب صاحب نے فرمایا: ”غلام قادر روھیلہ۔“

”مسلمانوں نے مسلمانوں پر کم ظلم ڈھاتے ہیں؟“ مسز بیگ بخشے والی نہیں۔

”روھیلوں سے جان بچا کر شہزادہ سلیمان شکوہ مملکت اودھ میں پناہ لیتے ہیں۔ شاہ عالم کے فرزند۔ اکبر شاہ ثانی کے برادر خورد۔ نواب آصف الدولہ چھ ہزار ماہانہ انکا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں وہ اپنا دربار آراستہ۔“

”چراکھی ہے سلاطینوں نے وہ تو بدھاڑ۔ کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑا“

عندلیب بیگ نے سودا کی گواہی دی اور سلیمان شکوہ کے متعلق نواب صاحب کو یاد دلایا

”لکھنؤ میں اپنی عیاشیوں کی بدولت رستوگیوں کے مقروض“
 بیگم صاحبہ ایک دیک لگے شاہ بلوط کو متواتر ٹھونکیں مارتی کھٹ کھٹ بڑھیا سی
 لگیں۔ منصور نے گناہ بزرگ کو معذرت طلب نگاہ سے دیکھا۔

”سیلمان شکوہ سے قبل انکے بڑے بھائی تشریف لائے تھے دئی سے۔ مرزا جہاندار
 نواب وزیر نے انکو بڑی تکریم سے مارٹن کوٹھی میں ٹھہرایا انہوں نے فوراً لہو لعب فیتق و فحور
 چھوٹے ہی وزیر ہند میربان کی منظور نظر قاصد بھگت پر عاشق گورنر جنرل دارن سٹینگر سے
 درخواست کی ہمیں بھگتہ دلوا دیجئے۔ اس فرمائش پر سٹینگر بھی چھینپ گیا۔“

”جی بیگم صاحبہ۔ انہیں نواب جہان آبادی خطاب عنایت کیا شاہزادے نے۔
 نادر گرامی شہزادہ عالی قدر۔“ گناہ بزرگ نے ملائمت سے کہا۔ ”وہ سب بنا رس میں“

”پھر سیلمان شکوہ کے بھتیجے دئی سے وارد ہوتے۔ مرزا جہانگیر۔ وہ شراب میں
 ڈھت لکھنؤ کی گلیوں میں گھوڑا دوڑاتے بلڑ مچاتے چوک کے کوٹھے سے دمڑی کو بھگالے گئے۔
 یہ تو آپ لوگوں کی حالت تھی۔ انگریز آپ کا ملک آپ سے کیوں نہ چھینتا“

”جن دنوں طوائف الملوکی چالو تھی طوائفوں سے ملوک کا بہت رابطہ رہا، یار عنبر“
 منصور نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہاری والدہ لورٹو ہاؤس کے بعد کیل کٹا یونیورسٹی؟“
 ”شوق بہت تھا مگر شادی ہو گئی۔ یونیورسٹی نہ جاسکیں۔ البتہ ایک فیملی فرینڈ تھے۔
 کاسی تھے۔ میٹا برج سے تعلق رکھتے تھے۔ انکی لائبریری گویا انکے قبضے میں تھی تم خواتین
 کلکتہ کی علمی روایات سے واقف نہیں ہو اور تم بھی عجیب سے ڈاکٹر ہو۔ اسکیمو پوٹیری۔“
 ”ہا۔ ہا۔ ویری فنی! ڈاکٹر اور سائنٹسٹ ہی تو اکثر لٹریچر اور آرٹ میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔
 تم کو اپنے مکان کی آرٹسٹک سیننگ کی اتنی فکر کیوں ہے؟“

خاموشی۔ بچت باد بہاری کی آنکھیلیاں۔ آم کے پیڑ میں چھپی ایک شاما گانے لگی گویا
 اب تک اپنے کیوں کی منتظر تھی۔ بوند باندی شروع ہوئی۔ اچانک بجلی کڑکی۔

”یہ نہیں برق اک فرنگی ہے۔“ منصور سید انشا پر لوٹا
 ”رعد و باراں خٹون جسگی ہے۔“ پرنس نے پھر بات شروع کی۔
 ”سلطنت خداداد میسور کو انہوں نے خاک کیا۔ دلی پہ وہ چھاتے۔ مرہٹوں کا انہوں نے
 زور گھٹایا۔ سعادت علیخان کی خوش انتظامی۔ اودھ پر بہن برسا دیا۔ ع چاندنی چاندی کا پتھر
 دھوپ سونے کا ورق! — مگر جان کھینی کی ٹوٹ۔“

چھینٹا پڑا۔ پھر دھوپ نکل آتی۔ چڑیاں بارش میں خوب نہالیں۔ اب چوہیں پروں
 سے صاف کرنے میں مصروف تھیں۔

”سنا ہے نواب وزیر جان بلی کو مستقل DEFY کیا کیے۔ لائق اور بیخوف حکمراں تھے
 — انکا جامہ دار کا فرغل ایک میوزیم میں اسطرح رکھا ہے جیسے انہوں نے ابھی اتار کر
 کھنٹی پر ٹانگ دیا ہو۔ ہم نے سوچا ہم اسے پہن لیں تو کیسے لگیں۔“
 ”آپ وہ فرغل نہیں پہن سکتے مرزا صاحب آپ بالکل مختلف انسان ہیں۔ وقت
 کے ارتقا کا تقاضا ہے۔ آپکی شخصیت مختلف ہو چکی ہے۔“
 ”سنا ہے بلی نے زہر دلویا۔“

”انکی علالت کی اطلاع بلی گار دی بھی گئی فوراً ڈاکٹر ولسن کو یکر پہنچا۔“

ریزیڈنسی کے موڈل میں ایک DR. JUDAH'S HOUSE موجود ہے۔ وہ
 کون سے ریزیڈنٹ کے فرزیشن تھے۔

میں عنبرین JUDAS TREE کے نیچے بیٹھی ہوں۔ جو ڈز نے رومن سپاہیوں
 سے کہا تھا۔ میں یسوع کو چوموں گا۔ تم سمجھ
 ڈرپ - ڈرپ - ڈرپ - بلی گارد کے درختوں سے خون

”کہتے ہیں ڈاکٹر نے انجکشن کے یہاں گلے میں فیہ باندھ کر سعادت علیخان
 وزیر ہند کا کام تمام کیا۔“

تختہ گل یہ تتلیاں اڑتی پھر رہی ہیں - درختوں پر بیٹھی چڑیاں چیمچہائیں -

”جان سیلی عمدہ بیگم پہ جان دیتا تھا۔“

”کون عمدہ بیگم؟ جن کی بہن فیروز پور جھرک کے نواب شمس الدین۔“
 ”محترمہ آپ نے ہمیں اچھٹے میں ڈال دیا۔ جاگٹھ سے چلیں تو فیروز پور
 جھرک جا پہنچیں! یہ وہ عمدہ بیگم نہیں ایک حسین لاوارث لڑکی تھی کلاڈمارٹن
 والی سیلی بیگم نے پالا تھا۔ جوان مری۔ جاہنار کا جان سیلی نے مقبرہ بنوایا۔
 روز بایں پہ جاتا۔ اسکے بالوں کی ایک لٹ لاکٹ میں لٹکائے رکھتا۔ نو ساں
 لکھنؤ میں رہا۔ کمپنی کی جزیں مضبوط کر گیا۔ نایاب محظوظات سمیٹ چلتا بنا
 ”انڈیا آفس میں محفوظ ہو گا وہ ذخیرہ۔ یہاں برباد ہو جاتا۔“
 ”جی۔ بیگم صاحبہ۔“ وہ کانپ سے گئے۔ بستی رومال سے چہرہ پونچھا۔
 جیب سے گول گھڑی نکالی۔

”آپ ہی آپ سے پکارا تھا دل بھی جیسے گھڑی فرنگی سے منصور نے اہستہ سے کہا۔“

”بیگم صاحبہ۔ شیعہ مہرہ تھانہ سنی۔ جلی رسی کا بل نکالنا مقصد تھا۔ اکبر شاہ ثانی
 نے لارڈ مائر اگورنر جزل کو دربار میں کھڑا رکھا۔ دتی کارینڈنٹ بادشاہ کا موروثی لقب
 چھیننے کو کہہ رہا تھا۔ لاٹ صاحب نے اسی پر اکتفا کیا کہ ان غریب کو نیچا دکھانے کیلئے مرحوم
 وزیر ہند سعادت علی خان کے بیٹے نواب وزیر غازی الدین حیدر کو لندن سے ہر میجسٹری دی
 بنگ کا خطاب دلوا دیا۔“

”لکھنؤ کے ریڈیڈنٹ نے سلیمان شکوہ کو حکم دیا اب آپ فرمانروائے اودھ سے نذر قبول
 کرنے کے بجائے ان سے برابری سے ملایکھیے۔ اب وہ آپ کے خاندان کے وزیر نہیں خود
 بادشاہ ہیں۔“

”جب ہم یہاں پڑھتے تھے“ منصور نے کہا: ”شاہ نجف کے چراغاں کی تام

ساتویں آٹھویں محرم کو برقی تمقوں سے امام باڑے کے پھاٹک پر ایک نام انگریزی حروف میں جگمگانا تھا
 HIS MAJESTY KING GHAZI UDDIN HYDER اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی خوشی اور THRILL محسوس ہوتی تھی حالانکہ نہ وہ بادشاہ باقی تھے۔ نہ انکی سلطنت۔“

”نواب آصف الدولہ کی مانند نصیر الدین حیدر سائیس اور انجینئرنگ کے شائق تھے لکھنؤ کا ہر فرد و بشر مسلح تھا۔ پچھے تیروکان سے کھیلتے تھے۔ آپکے نزدیک اہل لکھنؤ نازک مزاج مرغ باز ہی رہے۔“

”آخری مغل بادشاہ اور اودھ کے فرمانروا اگر عیش پرست ظالم اور لغو تھے، محمد شاہ محض رنگیلیے، واجد علی شاہ صرف ناچا گایا کرتے تھے، تو سارے ہندوستان میں دولت اور تجارت کی یہ فراوانی کیسے رہی؟ سلطان عالم جب میٹا برج لے جاتے گئے ہیں اودھ کا بچہ بچہ اشکبار تھا۔ بھلا کوئی جابر اور نکتہ بادشاہوں کے لیے روتا ہے؟“

”وزیر اعظم حکیم مہدی منتظم الدولہ نے انگریزی اسکول کھولا۔ میٹھو کا چھاپہ خانہ۔ ہسپتال۔ آپکے خیال میں بس یہاں یا امراد جان آدا تھیں یا بشیر میں اور کبوتر۔“
 ”ایسی ثقہ، پر تکلف آزاد خیال سوسائٹی کا دراصل آج آپ تصور نہیں کر سکتیں آپکے پیمانے مختلف ہیں۔ فرسی من لاج کے ممبر انگریزی داں مسلمان امرا آتے دن ولایت جاتے تھے۔“

”نواب صاحب۔ چند امیروں وزیروں کے لندن ہو آنے سے پوری سوسائٹی موڈرن نہیں ہو جاتی۔ ورنہ سرسید کو اتنی جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔“

”غدر نے اس پورے معاشرے کو نیست و نابود کر دیا۔ اب ہم آپکو کیا بتلائیں۔“
 ”معاف فرمائیے گا نواب صاحب۔ یہ بادشاہ اور شہزادے لوگ آپکے اجداد تھے لیکن میری والدہ مرحومہ کی ایک ججن بی سے ملاقات تھی۔ جنہوں نے اپنے منہ بولے ماموں سے

آپکے اس عمر طلائی، اس جہانِ انسا نہا کی تفصیلات سنی تھیں۔ وہ بزرگ اس زمانے کے لکھنؤ میں موجود تھے۔“

”گویا آپکا راوی بھی ضعیف نہیں!“

نواب مخدوم علیا دختر میر جواد اللہ۔ ملکہ نصیر الدین حیدر۔ مادام پمپا دوڑثانی۔ سوتیلے پپا انکے علی بخش میراٹی راستے سے لڑکیاں اٹھواتے تھے۔ رہیں قمر چہر گارڈز۔“

ایسے دل گرفتہ، تباہ حال نرم مزاج سے اجنبی کے لیے اس قسم کا جارحانہ انداز بھی دیمینز لب میں شامل ہے؟ اس بوڑھے آدمی کا سارا سرمایہ اسکا ماہی ہے۔ جسکا منافع بقدر اشکِ لب لبُل سے ہر ماہ ملتا ہوگا۔ بطور وثیقہ۔ نہ یہ کرکٹ ہے نہ کرکٹ بلکہ بلیٹ کے نیچے گھونسہ۔ اسکا پاسٹ اسے مطمئن، متفخر کرتا ہے اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ اسے بھی رن ڈاؤن کیے جا رہی ہیں۔ ”آج کے مورلز مختلف ہیں؟“ منصور نے پوچھا۔

ہوا چلی — دور دور تک پھولوں کی کیاریوں میں رنگ بزرگی لہریں پیدا ہوئیں۔ نواب صاحب نے ارشاد کیا ہے

”اپنے گیللاس شگوفے بھی کرینگے حاضر آ کے جب غنچہ گل کھولینگے بوتل کے دہن پتے بل بل کے بجادینگے فرنگی طنسور خود نسیم سحر آویگی۔ بحانے ارگن حوض صندوق فرنگی سے مشابہہ ہونگے اسیں ہووینگے پریراد بھی سب عکس نکلن“

منصور آگے کو جھکا بغور سن رہا تھا۔ نواب صاحب۔ ارے بھی عنبر یہ صندوق فرنگی انشا اللہ خاں نے CAMERA OBSCURA کو تو نہیں کہا تھا

خود انیسانِ فرنگ ايجاد کر چکے تھے کہ کیا عجب ہے جان سہلی صاحب نے ایک عدد ولایت سے منگوا لیا ہو۔“

”وہ کون چیز جناب والا؟“

”کیمبرے کی ابتدائی صورت قبلہ۔ یہ شعر یقیناً اسی کے متعلق ہے۔ صدوقِ فرنگی اور اسیس پر یزاد عکس نکلن۔“

”برسٹل میں اسکا موڈل دیکھا ہے۔ سمجھئے کمرے کے برابر گنڈ۔ اسکی چوٹی پر ایک عدد گھومنے والا لینس۔ نیچے فرش پر دودھیا شیشے تماشائیوں کے لیے چوگردگیلری۔ تیز دھوپ میں گنبد کے باہر کا منظر اور چلتے پھرتے لوگ اس LENSE پر REFLECT ہوتے تھے۔ اور اس کا الٹا عکس دودھیا شیشے پر۔“

”نیچے صاحب میرا نشانہ کا شعر آئینہ ہو گیا ! کیا عجب ہے کہ بلی گار میں مصحور انگریزوں نے اسی شے کے ذریعے ہماری افواج کی نقل و حرکت کا معائنہ۔ واللہ مرزا صاحب۔ آپ نے کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ اب جا کے صدوقِ فرنگی کے جوہر کھلے۔“

”جوہری محلے میں نواب صاحب۔“ منصور نے چرخِ فساد زدہ شہر کے رخ گھمائی۔
”میرا نشانہ تو جھوٹی ٹولے کے نزدیک رہتے تھے، نواب نے پھر کئی کاٹی۔
حسین بخش بولے۔“ میرا نشانہ جس مکان میں آکر رہے تھے وہ ماشار اللہ سے
اب بھی آباد ہے۔ مرزا محمد عسکری کا دولت خانہ۔“

”مرزا عسکری غالب والے مرزا خانی کو تو ال دلی کے پوتے۔ دادا انکے مرزا انور بیگ فوجِ آصفی میں افسر تھے۔ انھوں نے یہ مکان ایک ٹیلے پر بنوایا تھا۔
جھوٹی ٹولے کے نزدیک۔ میرا نشانہ دلی سے آن کر وہیں ٹھہرے تھے اور مصحفی۔“
”وہ کمرہ بھی میرا نشانہ والا اسپرٹح موجود ہے نواب صاحب۔ ہمارے بڑے

ابا مرزا محمد عسکری صاحب کے ہاں کھانا پکاتے تھے۔
 ” وہ بھی پیسے کی دال پر اشرفی کا بگھار لگاتے ہونگے ! “
 ” نواب صاحب۔ ایک مرتبہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کی ایک
 ضیافت میں سرجنی نائیڈو بھی شریک تھیں۔ کہنے لگیں اور کچھ ہونہ ہوا آپ
 لوگ کپڑے بہت اچھے پہنتے ہیں کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں۔ سر رضا علی نے
 بلبل ہند کو جواب دیا۔ سلطنت تو کھو چکے۔ کھانا بھی اچھا نہ کھائیں ؟ !! “
 ” اسی چٹور پن کی وجہ سے تو سلطنت کھوئی “ مسز بیگ نے لقمہ دیا۔

” شاہی سا لکھنؤ و مینس جیسا شہر تھا۔ دریا کے دونوں طرف محلات اور جوئیلیاں۔
 — جوئیلی علی نقی خاں بہادر کی ! “ منصور نے ندی کی سمت اشارہ کیا۔
 ” جی ہاں بلی گار د کے پھاٹک سے ریڈیڈنٹ اپنے بجرے پر سوار ہوتا اور
 برطانوی جھنڈا اہراتا یہیں سے بنگال نکل جاتا۔ گو متی جو پور کے آگے گنگا سے ملتی
 ہے۔ وہاں سے سیدھا نکلتے۔ اس کنارے پر قلعہ بھی بھون سے لیکر لامارٹینر کالج
 تک محلات اور باغات کا سلسلہ۔ گو متی کے دونوں کناروں پر آبادی کیوجہ
 سے ریڈیڈنسی کا دفاع مشکل تھا۔ اس وجہ سے ایام غدر میں انگریزوں نے یہ ساری
 عمارتیں کھدوا ڈالیں۔ صرف چھوٹی بڑی چھتر منزل باقی بچیں۔ حضرت محل والدہ
 برجیس قدر نے تعلقہ داروں سے کمک حاصل کی۔ مردانہ لباس پہن کر خود ہاتھی
 پر بیٹھیں انکی زنانہ فوج بھی بے جگری سے لڑی۔ “

” سن لیجئے مسز بیگ۔ زنانہ فوج ! “ منصور نے کہا۔ ” ملکہ حضرت محل کی۔
 ” جون سنہ ستاون کے پہلے سہفتے میں ہماری فوجوں نے اودھ پر برطانوی
 حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ریڈیڈنسی کے اندر پانچ ہزار فرنگی مع جن بیچہ پناہ گزیں
 تھا۔ ۳۰ جون کے روز بیگم حضرت محل کے لشکر نے یلی گارد کا محاصرہ کر لیا۔
 ستائیس دن تک انگریزوں کو یہاں محصور رکھا ہم لوگوں نے ! مسلسل گولہ باری۔

درو دیوار چھلانی ہو گئے۔ بڑیس قدر کو لال بارہ دری میں تخت پر بیٹھایا گیا۔ ان کے ایک پوتے کلکتہ میں رہتے ہیں۔ ایک لندن۔ ایک علیگڑھ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ایک پڑپوتی کلکتہ میں ایڈوکیٹ ہیں۔

”نواب صاحب ابھی تو بلی گار دکا محاصرہ ہی جاری ہے۔“ متصور نے ادب سے یاد دلایا۔

”جی۔ تو خورشید منزل کے سامنے تین جنرل آکر ملے اور اپنی فوجیں لیکر برطانوی ریڈیٹنسی کی طرف بڑھے۔

”یہی بسنت رت۔ نورو۔ ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء۔ جب سر کولون کیمپ ہل کا فارغ لشکر لکھنؤ میں داخل ہوا۔ اکبری دروازے سے لیکر دکشا تک یہ ہسپتال شہر کھڈوا ڈالا۔ اسکے ملبے سے سڑکیں بنوائیں۔ قیصر باغ میں ایک بارہ دری تھی جس میں واجد علی شاہ جن ہتھاب کے لئے رولق افروز ہوتے تھے۔ اسے کھڈوا ڈالا کیونکہ آخر پریا کے کلکتہ نہ دھارنے کے بعد عوام وہاں جمع ہو کر زار و قطار روتے تھے۔

”حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی نے فرمایا تھا۔۔۔ شب کو سوئیچے ایک سلطنت میں صبح کو اٹھیں گے دوسری سلطنت میں۔ روشنی اور پانی سب انکے قبضے میں ہو گا۔ جب چاہیں گے بند کر دیں گے۔ لوگ قبروں پر جا کر کہیں گے تم لوگ امن میں ہو کاش ہم بھی تم میں ہوتے۔۔۔ قہر کا سرپوش ہندوستان پر ڈھانپ دیا گیا ہے لوگ مثل پھیلندوں کے کبھریں گے۔

”حضرت مولانا نے غدر کے بعد کبھی برف نہیں کھایا۔ انگریزی کا غز پر نہیں لکھا۔ ولایتی شکر استعمال نہیں کی۔ انگریزی بوٹ نہیں پہنے۔ ریل پر سفر نہیں کیا۔ درست اس سے فرق اس وقت کچھ نہیں پڑا۔ گاندھی جی نے مدتوں بعد یہی سب کیا۔ فرق پڑا۔ غدر کے بعد حضرت مولانا نے کسی مشرک کی صورت نہیں دیکھی انہوں نے ایک اور پیش گوئی کی تھی کہ انگریز بکریوں کی طرح بھاگیں گے۔ بھاگے۔ یہ بھی

فرمایا تھا ٹوپی والے جایش گے۔ پگڑی والے آئیں بے۔ آئے۔ اور اب۔
 نجیبوں کا عجیب کچھ حال ہے اس دور میں یارو۔“
 ”نواب صاحب۔ کوئی تاریخی شہر ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں رہا۔ جتنا
 کنارے اسوقت آٹھویں دلی آباد ہے۔ یا شاید نویں۔ غنیمت ہے جو
 ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں۔“

پولس فائرنگ کی مدہم آواز پر نواب صاحب کرا ہے۔ ”میرے بزرگ تو محرم کی ایک
 ”مشرکہ تہذیب بنا گئے تھے۔“ انہوں نے بسنتی رومال سے آنکھیں خشک کیں۔
 ”ردوں کی تہذیب۔“ والدہ عمنہیں نے زیر لب کہا اور آہستہ سے منصور کو مخاطب
 کیا۔ ”تمہیں مومک ٹرٹل یاد ہے؟ جو مستقل آہیں بھرتا اپنی المناک کہانی سناتا اشک
 بہاتا رہتا تھا۔ میں بھی بہت جلد ایس کی طرح آنسوؤں کی جھیل میں پینے لگوں گی
 یہ گراف دکھو۔ عہد آصفی میں تیرہ دن۔ پھر چالیس۔ زارینہ کیتھرین ثانی کے دور میں سوا
 دو مہینے۔“

”زارینہ کون۔؟ یہاں مسز بیگ آپ نے ہمیں بھی گڑ بڑادیا۔“

”بادشاہ بیگم۔ ملکہ غازی الدین جدر۔“

”اوہ۔ وہ زارینہ۔ لیکن دولت اور فرصت کی فراوانی بولسٹونی کل ٹورے کو جنم دیتی ہے
 لکھنؤ کی اسنوبال کرتی رسوم اعزاداری کتنی غریب پرورش ثابت ہوئیں اور انکا فال آؤٹ
 آجنگ سارے ہندوستان کی شیعہ سنی اعزاداری میں نظر آتا ہے صاحب۔ آج کا ذاکر
 اور سوز خواں ہر سال لکھنؤ چوچنورا اور مروجے سے نکلتا ہے تو سیدھا لندن اور ٹورانٹو۔
 میرا نیس آج موجود ہوتے توجب قطع کی مسافت شب راتیں البرٹ ہال میں پڑھا کرتے۔“
 جھکی۔ لفاظ۔ مسز بیگ نے سوچا۔ بزرگ نہایت ممنویت کے ساتھ منصور کی تقریر
 سماعت فرما رہے تھے۔

”اعلیٰ شاعری، خطابت، فلسفہ کائنات، آداب مجلس، فنکاری، صنایعی،

پچھڑی، یونیم دی تھنگ — پیور میوزک، پیور ڈرامہ۔ مرثیوں کی گریگورین گونج۔
 ویسٹرن اسٹیج پر گریک کورس آیکو متاثر لڑتا ہے۔ یہاں گھر گھر بال بکھرائے سیاہ پوش
 نوحہ خواں عورتیں ہاتھ میں شمعیں اٹھائے تنگے پاؤں چلتی کسی یونانی ٹریجڈی کی نقل نہیں
 کر رہیں لیکن پام سنڈے، ایش ونس ڈے کو رس کرسٹی کے جلوس درست مجرم غلط۔
 ” اور بطور کلائیکس نالہ دیکا۔ چھریاں۔ زنجیریں — HIGH CULTURE —
 بولتونی کل ٹورے۔“

”جی ہاں۔ یہ البتہ“ وہ منہ لٹکانے کا موش ہو گیا۔ پھر ایک پوائمنٹ یاد آیا پچھلے سال
 میں نے یہاں ایک کاتھولک ہائی کورٹ جج کو نہایت نفیس مجلس پڑھتے سنا۔ اور
 کٹن لال فیض آبادی کی انجمن نوحہ خوانی — اعلیٰ تہذیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ
 دوسرے بھی اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے ہم نے برطانوی تمدن اپنایا۔ شاہی کی کچھر کا
 فال آؤٹ — اودھ کے اکثر دیہات میں سنی عوام جم کے ماتم کرتے ہیں —
 ”جی ہاں بھیا۔ اور ہمارے کے ہاں دیہات میں ہندو عورتیں دسے روتی ہیں۔
 اور انڈیا بھرے میں سنت جماعت کے تعزیے سب سے زیادہ شاندار سلیس۔ پٹے بازی۔
 خلیفاؤں کے اکھاڑے“

رورینک روڈ پر پھر نعرے خلیفہ منصور دیکھ کے آؤکس پہلوان کا اکھاڑہ نکل رہا ہے۔“

”تمہیں یقین نہیں آئے گا عنبر یہ خلیفہ کیو با سے واپس آئے ہیں۔ میسران باتدیسر
 منتظم الدولہ نے دونوں کے ماہی مراتب کا بند و بست ایک ہی دن کیا۔ فرگٹ اٹ۔
 حسین بخش کوئی دہا سنا ہے۔“
 ”آج کتلوا کی رات — اماں کھلاویں دودھ بتاسہ — پیاسے گئے حسن
 حسین — رن ماچلی تروریارے —“
 ”تضادات کی سرزمین۔ ہندوستان —“ عنبریں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہم لوگ —“ منصور نے جواب دیا، ”عرصہ دراز مغرب میں گزار کر لوٹے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ تضادات عجیب لگتے ہیں۔ اجیر شریف میں بے شمار تلک دھاری آر۔ ایس۔ ایس درکر جلوس سے نکل درگاہ پر حاضری دیتا ہے“

”CRAZY COUNTRY“ یار

”ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد لکھنؤ میں تعمیر کی جا رہی ہے۔ شہر کے تاریخی مقابر اور مساجد کھنڈر ہو گئیں۔ امام باڑوں کے لیے شاہان اودھ کے ٹرسٹ موجود ہیں لیکن حسین آباد اور شاہ نجف والوں نے انکے بیرونی حصے سستے کرائے اور پگڑھی پراٹھا دیے۔ اب وہ باہر سے سلم معلوم ہوتے ہیں سارے ہندوستان کے اوقاف کی مالیت ایک کھرب ہے۔ کروڑوں سالانہ کی آمدنی متولی خورد برد —“

”اوقاف کے معاملات —“ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا، ”ہمیشہ سے دگرگوں چلے آتے ہیں۔ حافظ جی فرما گئے ہیں۔ ع کے مے حرام دے بہہ زمال اوقاف است!“

”حافظ جی کا الیکشن جب ہوا ہم بجنور میں تھے۔ ڈاکٹر فخر احمد انصاری کے ہاں ملازم تھے۔ انکا انتقال ہوا تو حافظ محمد براہیم صاحب کے پاس چلے گئے۔ کانگریس سرکار بنی۔ ہم بٹلر پولیس لکھنؤ۔ حافظ جی کے ایک چمڑا سی سے ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا“

”واہ میاں حسین بخش۔ خوب فلور کروں کی۔ دل بدلی!“

”بھیا۔ یہ بڑے آدمیوں کے معاملے ہیں۔ ہم غریبوں کو جہاں دو روٹی کا سہارا۔ بٹلر پولیس کے مطبخ میں ہمارے خالو موجود تھے ہمیں مشاپچیوں میں بھرتی کروادیا“

”بٹلر پولیس!“ پیر مرد نے ایک اور آہ بھری۔

”ابا جب ٹھا کر نواب علی کے ہاں کام کرتے تھے لاٹ صاحب بٹلر کو بہت دفعے چاہ پانی مہاراجہ علی محمد خاں کے وہ کپے دوست تھے تبھی اپنے پولیس کا نام —“

”جان کچنی کے انگریز نوابوں کی ٹریڈیشن کا اس صدی میں آخری نواب —“

گننام بزرگ نے گویا فٹ نوٹ لگایا۔

”بجنور میں کانگریس کی چہل پہل دیکھی یہاں ٹیلر سلیم لیگ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔“
 ”جہاں امرائے شرقیہ اور عمائدین بنگالہ نے۔“ نواب نے کہنا شروع کیا۔
 ”ایک بار پھر۔ سنہ سینتیس میں۔“

”بس ذرا جغرافیہ میں گڑ بڑ ہو گئی، کھٹ کھٹ بڑھیا نے ٹھونگ ماری۔“
 ”دیوبندی مولانا لوگ کانگریس کے ساتھ تھے“ حسین بخش بولا کیے۔

”دیوبندی اور فرنگی محلی“ منصور نے جذبے سے کہا۔ ”ایک بار مولانا آزاد نے کانڈھی جی سے فرمایا تھا یہ بوریہ شین غلام جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں مسلمانوں میں ان سے زیادہ انقلابی جماعت اور کوئی نہیں۔“
 گویاں چلنے کی آواز آئی۔

”امیر احمد خان راجہ محمود آباد اور راجہ صاحب سلیم پور لیگ لے دو لوں بڑے لیڈر شیعہ مگر لیگ میں حضور شیعہ سنی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب مسلمان ایک۔ پھر ایک سنی لیڈر کانگریس سے لیگ میں آگئے ایک شیعہ لیڈر لیگ سے کانگریس میں گئے۔“
 ایک غبی سی دھو بن چڑیا گھاس پر بیٹھی بڑے غور سے یہ گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جب وہ ادھر سے ادھر آتے اور یہ ادھر سے ادھر گئے۔“

”ادوہ میرا تو سر گھوم رہا ہے،“ عنبریں نے فریاد کی۔

”سیر بیڈن لو۔ ٹن۔“ ریڈیو کی اشتہاری آواز میں منصور۔

”توپٹیا ان دونوں کا آپس میں جھگڑا تھا۔ پھر حضور دہ تبر اندر صحابہ ابھی ملیں۔“

فرنگی محل کے مولانا لوگ اس ٹنٹے میں نہ ادھر نہ ادھر۔ شیعہ سنی دونوں انکی عزت۔“

”فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ۔“ نواب صاحب نے پھر بات کی۔

”شہنشاہ اورنگ زیب نے قائم کیا تھا۔ اور اسمیں ہمارے زمانے تک۔“

شیعہ سنی ما بعلم ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ریاستوں کے خاتمے تک شیعہ ۷

والیان ریاست اسے گرانٹ دیا کئے۔ صاحب! اینٹی مگ ڈونل اور جیمز سنن کیا کر پاتے اگر خود ملت بیضا عقل سے معری نہ ہوتی“

”عبرین بیگم لکھنؤ کا شاہی کیریکٹر تو مسلمانوں نے آزادی کے بعد یہ شیعہ سنی جھگڑے بڑھا کر خود اپنے ہاتھوں سے ختم کیا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا آلکار بن کر“ منصور نے افسردگی سے کہا۔ ”۸ ربیع الاول کا چُپ تعزیه — کیا منفرد لرزہ خیز نظارہ تھا۔ سیاہ رنگ کا پہاڑ کا پہاڑ — آہستہ آہستہ متحرک۔ ہزاروں کا جلوس۔ سب خاموش ہندو مسلمان سب تنگے پاؤں۔

اور وہ حضرت قاسم کی شادی CELEBRATE کرنے کے لیے تینوں شاہی امام باڑوں کا زبردست چراغاں۔۔۔ آصفی۔ شاہ نجف۔ حسین آباد۔ ذوالجناح اور اور مہندی اور سونے چاندی کی ضربیوں اور علموں کے پرودشن — شاہی کے زمانے کی وردیاں پہنے پنجشاخے اٹھائے امام باڑوں کے اہلکار۔

”ہر تعزیے پر لکھنؤ کے کاریگروں کی حناعی ختم تھی مینہار چوڑیوں سے تعزیہ بناتے تھے۔ مالی گھاس سے۔ دُھن روئی سے۔ کھار مٹی سے۔ مصری سے بنتے تھے تعزیے۔ آزادی کے برسوں بعد تک یہ نظارے موجود میں فیض آباد روڈ پر مقیم تھا۔ عاشور کی صبح سویرے سے ماہ نگر کی سٹی کربلا کی طرف تعزیے جانا شروع ہوتے۔ ایک سے ایک شاندار۔ عزیزوں کے معمولی۔ سب ماتمی تاشے کے ساتھ۔ تاتا بندھا رہتا — ”اجاڑ سہ پہر تک تعزیوں کی تعداد میں کمی آجاتی۔

”مجھے یاد ہے آخری سال جب میں نے اپنے برآمدے سے وہ منظر دیکھا دیران راستے پر چھوٹا سا سبز رنگ کا نہایت HUMBLE کاغذی تعزیہ۔

”چند غریب مسکین تہد پوش سنی اسے لیے جا رہے تھے۔ اس شام میں

امریکہ روانہ ہو رہا تھا۔ وہ منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ خزاں آلود پتوں پر سے گزرتا سنان سڑک پر آخری تعزیہ، منصور نے ایک گہری سانس لی اور سگریٹ جلایا۔
 ”تجارت اور گلف کی کمائی سے مسلمان ذرا پیسے تھے کہ پھر گھمسان کارن پڑا،“
 ”نیا سرمایہ دارستی ہے۔ کارگریک مفلس شیعہ،“ سٹریٹ نے یاد دلایا۔

”ابھی بہار میں بریلوی اور دیوبندی مولوی ایک دوسرے سے دھواں دھار مناظرے کرتے دکھلاتی دیے۔ ویسٹ میں کیا ہائی چارج اور کوچرچ والے لڑتے ہیں؟“
 ”ہم لوگ ہاریرین ہیں۔ اس سب کو نینٹ کے تمام باشندے۔ انگریز ہمیں ٹھیک پہچانا تھا“
 ”کم اڈن امی“

”یہ میں نہیں کہہ رہی، سر سید لکھ گئے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں“
 دھوبن چڑیا قریب آ بیٹھی۔ ”سُننیوں کے تعزیے۔ درگا ہوں اور سترکوں کے سامنے ہندوؤں کی بھیڑ۔ ماشا اللہ۔ لیکن اس خوشگوار رقت خیر منظر نامے کے باوجود کسی ایک قسم کا فرقہ دارانہ فساد آج تک رکا ہے؟“ سٹریٹ نے سر ہلایا۔

”ہر قسم کے پائیدار بلوے مناسب اجرت پر ہمارے ہاں سے کروائیے۔ ٹن“

ایک مچھول سے پرند نے غنڈوں جیسی سیٹی بجائی۔
 ایک سیانا کو آسم کی ہنسی جھلا کر حاضرین کو صر سچاؤ تک کرتا ہوا اڑ گیا۔
 ”یہ لوگ کتنے مزے سے بسنت منا رہے ہیں۔ سینٹ سالم علی کی اُمت“
 عنادل چمن کا پر اب حوض چھپا رہا تھا۔ آسمان کی سمت سر نہ ہونڈا کر ایک ایک گھونٹ پر گویا اپنے خالق کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ ننھی چڑیاں پانی پینے میں جُٹ گئیں۔

”اے دشمنوں۔ میں نبی نوں فرزند چھوں۔ میں تین دن نوپا سوچوں۔ تمہارے

ایک پانی نوگھونٹ مانگوں چھوں۔ اے حسین عجب آپ اوپر بہارا پستا دے چھے۔
اے سید الشہدا۔

”زینبؓ پکاری رہیا چھے اے مارا ماں جایا بھائی انے ضحیٰ ناسورج انے پونم
ناچاند۔ سیکیند کہے چھے۔ اے باواجی صاحب کہاں چھو۔ اے باواجی صاحب۔
اوٹھو۔ اوٹھو۔ مارا اوپر ظلم تھتی رہیو چھے۔ اے حسین۔ عجب۔
”اے حسین۔ کربلا سے شام نی طرف گرم ریت نی زمین پر چلی رہیا چھے۔ نہ پاؤں
میں جوتی چھے ناموزہ چھے۔ اے حسین عجب آپ اوپر بہارا پستا دے چھے۔ اے
سید الشہدا“

عنبریں زار زار رو رہی تھی۔
میں جوڈ نکے درخت تلے بیٹھی ہوں۔ اور میرے پیروں کے نیچے دشتِ ماریہ کی
پتی ریت ہے۔ موسم بہار کی ایک سہ پہر ہندی کنارے سبزے پر موجود ایلس کے مانند
میں کہاں کہاں۔ ہر گلستان صحرا۔ ہر دریا نہر علقمہ۔

منصور مڑ بڑا گیا ”سوری عنبر میں ایک گجراتی۔“
عندلیب بیگ دھیمی آواز میں بیٹی کو ڈانٹ رہی تھیں۔ ”اپنی نانی کی روٹی نواسی۔
انکی رقیق القلبی کا انجام بھول گئیں؟ یہ آدمی شواؤف ہے۔ بھگیتا۔ ہمیشہ اٹلگو میل
نوشکی کرتا ہے۔“ منصور کو پکارا ”سنی۔ مجھے یقین ہے تم کو بنگالی ٹائل بیلام نوے مرثیے
بھی آتے ہونگے۔ مگر اب اینسین گورج سے نکلا جائے۔ کافی ہوئی۔ چلو ذرا ریڈیٹنی کی
شیکسپیرین ایکوٹن آئیں“

بیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک وسیع ایوان میں داخل ہوئے۔ نواب صاحب نے

” اوپر آسمان کو دیکھا۔“ چھتیں گر جاتی ہیں تاکہ فلک حقہ باز صاف نظر آئے۔“
 میوزیم میں سیلانی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک گائیڈ آگے بڑھا۔
 ” ارے یہ ہمیں کیا بتلا میں گے “ نواب صاحب نے اداسی سے کہا۔ منصور
 نے دس کانوٹ نکال کر اٹکے حوالے کیا۔ وہ سلام کر کے پیچھے ہٹا۔ مسز بیگ نے
 طویل سنہری زنجیر میں آدینزا چشمہ لگایا۔ دیواروں پر سچی تصاویر دیکھنے میں
 منہمک ہوئیں۔

” لکھنؤ ریڈیٹنسی کا محاصرہ۔ “ غنبریں نے کہا ” انگلینڈ نے اسکی ایک
 عظیم الشان قومی لیجنڈ تیار کر ڈالی۔ ناول۔ تصویریں۔ نظمیں۔ برطانوی بہادری
 کی حکایات۔ اور ہم نے کیا بنایا ہے؟ ۱۹۵۷ء میں گومتی کے کنارے ایک
 عدد بھڈا مینار۔ حضرت محل کے جانبازوں کی یاد میں بھونڈا بھڈا۔ اب ہم محض
 KITSCH کے استاد ہیں “

کالج کے چند لڑکے منہ کھولے غنبر کے گرد جمع ہو گئے۔ انکی سمجھ میں نہیں
 آیا وہ کیا کہہ رہی ہے۔

” میڈیم کیچ کیا۔؟ “ سیاہ فریم اور موٹے شیشوں کی عینک لگاتے ایک
 پڑھا کو لڑکے نے گردن بڑھا کر سوال کیا۔

چوڑی دارپا تاجامہ اور لمبی قمیصیں پہنے کالج کی لڑکیاں، منہستی ہونی اندر آئیں۔

” قبلہ آپ نے غور فرمایا۔ مغلیہ تہذیب کس طرح اپنے آپ کو RE-ASSERT
 کر رہی ہے؟ سارے ہندوستان کی لڑکیاں ہماری نانیوں دادیوں والا لباس
 پہن رہی ہیں۔ انکے ماں باپ ہونٹوں میں، مغلیں، کھانا کھاتے ہیں اور غزلوں
 پر سر دھنتے ہیں “ وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ایوان میں گئے۔

” بس اتنی سی بات پہ خوش ہوتے رہو کہ مجلس چالو ہو گئیں۔“
 ” غنبر نیچ میں مت بولا کرو۔ نواب صاحب ہندوستان کے اشرے

مغرب کے نوجوانوں کے ہاں ایک ملبوساتی انقلاب آچکا ہے خود ہندوستان میں اس ریولیوشن کا ذمے دار کون ہے؟ — مسلم سوشل پکچرز؟
 ”مسلم سوشل پکچرز“ غنڈیب بیگ نے استہزاسے دہرایا: ”مجاہد-مشاعرہ-قوالی اور برقعہ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔ ہندی مسلمانوں کا ایسیج کیا ہے؟ ایک قدامت پرست بیک ورڈ جاہل کمیونٹی۔“
 ”جب تک ملاحادی ہے یہ IMAGE برقرار رہے گا۔“

”بس۔ مولوی کے پیچھے پڑے رہو ازرائیل میں ایک کٹر مذہبی یورپین یہودیوں کا فرقہ ہے۔ جب ازرائیلی فوج کی لڑکیاں مارچ پاسٹ کرتی نکلتی ہیں وہ انکی طرف سے پیٹھ موڑ کر دیوار کی طرف منہ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ انکے نزدیک عورتوں کی یہ آزادی شریعت موسوی کے خلاف ہے۔“
 ”درست۔ لیکن میرے ملاحاد میں کچھ زیادہ ہیں۔ میں خود ملاحاد کا بیٹا ہوں۔ مان لو میری بات — عزیز بیگم!“

”بات میرا آثار سے شروع ہوئی تھی!“ نواب صاحب محفوظ ہوتے۔
 ”لیکن قبلہ ملاحظہ فرمائیے۔ مغلیہ کلچر اپنے آپ کو نہایت نامعلوم طور پر۔“

”مرزا صاحب۔ خاقانی ہند خواجہ عزیز لکھنوی کی پڑیوتی عزیز بالو وفا کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔ میں جمال فطرت حسن ہوں مری ہر اداسے حسین تر۔“
 ”میں جمال فطرت حسن ہوں مری ہر اداسے حسین تر۔“ منصور نے دہرایا۔
 ”جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں جو اٹھوں تو ابر بہا رہوں!“
 ”سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ اُف غضب کر دیا۔“ ڈاکٹر نے بیاختہ داد دی۔
 ”واہ جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں۔“

”ستہ جیت رے،“ عزیز نے کہا ”عزیز بالو کی خاندانی مجلس کی تصویریں لے گئے۔ پکچر کے سیٹ بنانے۔ چیزوں کی فطری اور تاریخی سیٹنگ۔“

وہ چاروں چند شکستہ ستونوں پر بیٹھ گئے۔ حسین بخش ہاتھ باندھے ایک طرف کو کھڑے رہے۔ غالباً انکے پرکھ اس طرح دست بستہ اسی جگہ کرنل سلیمان کی ڈنر ٹیبل پر ڈیوٹی بجالاتے ہوں گے۔

”بیگم صاحب ہم لپک کے بھیآ کے لیے بالائی خرید لاویں چوک سے —
کرفیو تو فرنگی محل کی طرف لگا ہے۔“
”بیھیے آرام سے۔ خود بالائی کو جی چاہ رہا ہے۔ بھیآ کے لیے آویں۔“

”فرنگی محل میں کرفیو لگا ہے۔ پہلے میلہ لگتا تھا۔ مرزا صاحب آپ کو وہ —
آتش کا شعر یاد ہے — ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام
چھانے ہوئے میں کوئے فرنگی محل تمام
”نواب صاحب معاف کیجئے گا۔ یہ ہمارے معاشرے کا زوال تھا۔
علمائے دین کا گڑھ اور انکے مکانوں سے سٹے ہوئے بالاخانے۔“

”بیھیآ فرنگی محل میں حیدر جان جو تھیں جنکا امام باڑہ ہے۔ ایک بار
ایک راجہ نے ان سے کہا بی صاحب ایسا ملہار کا تھے کہ بارش ہونے لگے۔ انہیں
نے دعا مانگی جناب امیر سے۔ مولا میسری لاج رکھ لیجئے — پھر جو میگھ ملہار
گایا انہیں نے۔ جہا جم پانی گرنے لگا۔ راجہ نے انعام میں ہاتھی دیا۔ وہ انکی
ڈیوڑھی پر بندھا رہتا تھا اور حضور جلی خورشید کو تو ہم نے بھی دیکھا ہے۔“
”جلی خورشید!“ مسز بیگ نے دہرایا۔

”بیگم صاحب آپ نے بھی انکا نام سنا ہے؟ کلکتے تک انکی شہرت تھی۔
بہترین شہسوار تھیں۔ اور کنکوے بازی کی استاد ہر سال میڈیکل کالج کے
پیچھے جئاتوں کی مسجد کے پاس جو میدان تھا — گو مٹی کنارے۔ وہاں کے اوپر

پتنگ بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ شہر کے عالی مقام لوگ ان سے کنگوے لڑانا
مقرر سمجھتے تھے۔“

”ہمارے ایک دوست ہیں۔ پروفیسر سر یو استوا۔ ہندوستان کے نامی
گرامی ریاضی دان۔ سرانے معالی خاں کے باشندے۔“

”وہ بھی پتنگ بازی میں؟“ عنبریں نے پوچھا۔

”تھے لڑکپن میں۔ جلی خورشید کے کمالات کنگوے بازی کا بڑے ذوق
و شوق سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔“

”جی بھیا۔ جلی خورشید کے کنگوے میں تلوکانوٹ باندھ دیا جاتا تھا۔
اس زمانے میں تلوکانوٹ! وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ میدان میں آتی تھیں۔
سب سے آخر میں۔ کوئی ان سے جیت نہ پاتا تھا۔ لوگ پتنگیں ٹوٹنے بارہ بنگی
تک دوڑے جاتے تھے۔“

”۱۹۳۷ء کے الیکشن کی سرگرمیوں میں لکھنؤ کی نامی طوائیفوں نے حصہ لیا تھا۔ جلوسوں میں وہ
شامل ہوئیں۔ قومی نظئیں وہ پڑھتیں۔“

”ارباب نشاط میں فیلوٹریولرز تک تو پیدا کیں اس شہر نے۔ سنا ہے
آزادی سے سات آٹھ سال پہلے ایک کامریڈ حسن کہلاتی تھیں۔ بہت سے نامور
کامریڈ لوگ انکے ہاں جمع ہو کر اپنے جلسے کرتے تھے۔ اچھا۔ تو جلی خورشید۔“
”ارے بھئی منصور۔ اب بخشو جلی خورشید کو“ عندلیب بیگ جھنجھلا میں

وہ گناہ بزرگ کی طرف متوجہ ہوا جو پھر تیس پھرنے لگے تھے۔

انہوں نے جیب سے بادام اور پستے نکال کر دوستوں کو پیش کیئے۔

چھڑی کے سہارے ذرا دقت سے کھڑے ہوئے۔

”اب اجازت۔ جان صاحب کا اللہ بلی!“ کھنڈر کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

عمر نے کہا: ” آپ کو کار پہ پہنچا زیتی ہوں۔ لیکن کرفیو۔ جب تک ہمارے ہاں تشریف لے چلیے۔“

” عنایت۔ ابھی ہم ذرا ٹہلتے ہوئے بریگڈیر نقوی کے ہاں جاویں گے۔“
 ” ہم لوگ بھی قریب ہی رہتے ہیں۔ تشریف لائیے۔ خاصہ تناول کیجئے۔“
 مسز بیگ کیلنٹ بجد لقمہ ہو گئیں۔ منصور انکی شخصیت کی رنگارنگی کو دھیان سے نوٹس کر رہا تھا۔

” عنایت۔ پھر کبھی حاضر ہونگے۔“

جھک کر تسلیمات بجالانے کے بعد سر نہیوڑائے بلی گارد کے پھاٹک کی سمت روانہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے۔ مکرخمیدہ۔ بے نام و نشان۔

بارش کی ایک بوند ٹپ سے منصور کے ہاتھ پر گری۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا: ” مجھے لگتا ہے ان بے چارے کو حال ہی میں کہیں دیکھا ہے۔ کہاں یاد نہیں جھلک سی دیکھی تھی۔“

” کلنک میں آئے ہوں گے۔“

” بٹیا ہم تو نواب صاحب کو پہچان گئے تھے۔ ظاہر نہیں کیا۔ انکے باپ نے جلی خورشید کی خاطر اپنی بہت بڑی جائیداد بیچ ڈالی تھی۔“

” جائیداد کیا چیز ہے حسین۔ بخش ہم وہ لوگ ہیں جو موسم بہار کو بھی رہن

رکھتے ہیں۔ زمینداری ابولیشن میں باغات بچ گئے۔ چنانچہ آجکل آم کی فصلیں دو دو تین تین سال کے لیے گروی رکھ کر ایک بار پھر گلچھڑے یا مقدمے مسلمان زمینداروں کی خاندانی مقدمہ بازئیوں نے پنڈت موتی لعل نہرو اور سر تیج بہادر کو مالامال کر دیا تھا۔“
 ” بھیا۔ کانپور میں آغا میر کے پڑپوتوں نے تلوٹو کے نوٹ جلا کر ایک لاٹ صاحب

کے لیے چار بنائی تھی۔ اب یہ عرب اربوں روپیہ عیاشی میں پھونک رہے ہیں۔“

عمر نے ہمارے اندر یہ بنیادی کموریاں کس وجہ سے ہیں؟

” کمزوریاں بہ یا اللہ پہ توکل —“

” اوہو! مگر آپ تو مار سے عاقبت اندیشی کے ابھی سے چنوں پر اکتفا کر رہی ہیں!“
” چنے بہ نہیں تو۔!“

” ابھی میں نے چند چنے چنے۔ ارے یہاں تو نواب صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ مانی کو ڈر دوسروں کو پیش کرنے کے لیے بادام ایک جیب میں۔ پیٹ بھرنے کی خاطر چنے دوسری میں۔ اسمیں سوراخ رہا ہوگا۔“

” دو پہر جب یہ باغ میں آن کر بیٹھے اس بیخ پر جیب سے مٹھی میں کچھ نکالا اور مال کی اوٹ میں نوش کرنے لگے۔ میں انہیں سمجھی۔ مجھے دیکھتے پا کر فوراً تسبیح سنبھالی۔“
ڈاکٹر نے ایک چٹا ٹکڑا کر تھیلی پر رکھا اور اسے بغور دیکھا۔ گویا کائنات صغریٰ۔ شام ہو رہی تھی۔ بیلی گارڈ سنسان ہو چلی۔

” محمد علی شاہ بادشاہ“ منصور کی آواز گونجی ” نصیر الدین جیدر۔ غازی الدین جیدر۔ سعادت علی خان۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ” کچھ نہیں۔! میں ذرا بدیت کے ساؤنڈ افیکٹ سننا چاہتا تھا۔“ وہ ہنس پڑا۔
تین چار ابا بلیں پر پھٹھٹاتی دریا کی طرف اڑ گئیں۔

” مرض کر وہ ایک رومن تھیٹر ہے۔ چہروں پر ماسک لگانے چند سیاہ پوش طویل القامت بادشاہ یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔ اللہ آؤ ہم زمین پر بیٹھ کر شاہوں کی موت اور معزولی کی غمگین کہانیاں سنائیں۔“

FOR GOD'S SAKE, LET US SIT UPON THE
GROUND AND TELL SAD STORIES OF
THE DEATH OF KINGS, HOW SOME
HAVE BEEN DEPOSED; SOME SLAIN IN

WAR SOME POISONED BY THEIR WIVES:
SOME SLEEPING KILLED; ALL
MURDER'D : FOR WITHIN THE
HOLLOW CROWN THAT ROUNDS THE
MORTAL TEMPLES OF A KING KEEPS
DEATH HIS COURT AND THERE THE
ANTIC SITS SCOFFING HIS STATE AND
GRINNING AT HIS POMP ALLOWING
HIM A BREATH, A LITTLE SCENE TO
MONARCHISE, BE FEARED AND
KILLED WITH LOOKS, INFUSING HIM
WITH SELF AND VAIN CONCEIT, AS IF
THIS FLESH WHICH WALLS ABOUT
OUR LIFE, WERE BRASS IMPREGNABLE,
AND HUMOR'D THUS COMES AT THE
LAST AND WITH A LITTLE PIN BORES
THROUGH HIS CASTLE WALL, AND
FAREWELL, KING!

”میںم — بوٹن کے ایک پرائیویٹ کلکشن میں ایک تصویر دیکھی تھی کہ مینی اسٹائل۔
لکھنوی مشور نے اون دی اسپوٹ بنائی تھی۔ کہ جان عالم تخت پر راجہ اندر کی کو سیٹوم۔
سامنے مصنوعی پرنگتے ایکڑسین۔ مقام: بارہ درہی قیصر باغ۔ ہینڈم آدمی تھے۔
” ایک اور تصویر اسی آرٹسٹ کی — جان عالم انگریزی شاہی پوشاک

پہنے گھوڑے پر سوار قلعہ چھٹی بھون کے سامنے اپنی فوج کا معائنہ کر رہے ہیں۔“

”کو مک اد پیر اکاسین۔“

”گر نیڈا د پیرا۔ فلک شگاف ٹریڈ می سے گونجتا۔“

”بھیا۔ جان عالم کے بول سماعت فرمائیے۔ کبھی بولے چھن۔ کبھی بولے چھن۔“

کبھی بولے چھن ترے گھونگرو۔ ہے یہ شوم پن کہ صدا کی پن نہیں کرتے پن تیرے گھونگرو۔“

کھنڈر خاموش رہا۔

”چنانچہ یہ چنا۔ جوان بادشاہوں نے جان کمپنی کو ادھا دیا۔“ اس پارخانہ بدوشوں

کی خیمہ گاہ میں اٹھتین ٹمٹانے لگیں۔ منصور نے اس طرف دیکھا: ”گو وہ تھے لکھی بنجار سے اور

کھیپ بھی انکی بھاری تھی۔“

”انشاء اور شیکسپیر کے علاوہ مجھے یقین ہے تمہیں سارا نظیر بھی ازبر ہوگا پر اب گھر۔“

”بیگمات ادوہ کا خزانہ اور شاہان ادوہ نے جو کر ڈروں روپیہ کمپنی کو اسکی جنگوں کی

خاطر قرض دیا۔“

”کمپنی اپنے مہربانوں کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ مگر وہ منڈوہ کب کا ٹوٹ چکا۔ چلو اٹھو۔“

”ادوہ توں۔ جو دہ لکھو گئے اپنی اولاد اور لواحقین کی آئندہ پیڑھیوں کے لیے بطور

وثیقہ ابدی۔ اب تلک کہیں ہزاروں کہیں بوجہ افزائش سل بقدر اشک۔ لیکن چونکہ

معاملہ وراثت کا ہے منزیگ۔“

”وراثت کا معاملہ میں خوب جانتی ہوں۔ زیادہ بورت کرو۔“

”کمپنی وائٹ ہال ساؤتھ بلاک نی دہلی۔ قرضدار اور قرضخواہ دونوں سلامت۔

لہذا قرضخواہ اپنے بوسیدہ دوشالے اوڑھ کر ہر ماہ وثیقہ آفس۔ سلطان عالم کی

پولٹیکل نیشن البتہ محض انکے پڑپوتوں تک جاری رہے گی۔“ اس نے ساکت گومتی پر لنگاہ

دوڑائی: ”جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔ میاں حسین۔ اختر پیا کا کوئی۔“

”گیا دل بھی چھن جو نہی بولے چھن۔ یہ لگی لکن کوئی ڈالے گن تو میں مانوں گن۔“

”نہیں کچھ اور۔“

”برائے میر مجھ سا زندہ میخانے میں گر آئے۔ گرے ساغر۔ لندھے شیشہ۔ ہنسنے ساقی۔
بچے دریا۔ ہمارے ابا مرحوم کے لڑکپن تک شاہی کی رعیت زندہ تھی۔ جو سلطان عالم
کی یاد میں گاؤں گاؤں رہیں اور اندر سبھا کرتی روتی پھرتی تھی؛ بوڑھے خانساں
کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملائیں۔

انہوں نے بھی ماسک لگا رکھا ہے۔ کوک اویسرا۔ نہیں۔ گریڈ اویسرا کے
آخری مُغنی۔ نجانے یہ کون ہیں۔ اور گننام نواب۔ اور منصور کا شعری۔ میں عنبرین اس
اندھیرے میں موجود سارے وجود سے خوفزدہ ہوں۔ جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔
نانی اماں۔ تاریخ کا قرض خواہ دیشقہ دار۔ حینی دی لک سب ٹکسالی۔ گمشدہ سکوں
کی طرح تاریکی میں چمکتے۔ اس نجیب گردی میں نکنت اور جینل تصویریں مٹ گئیں۔ جھومر
ٹیکے لگا۔ تے امی حضور، ابا حضور، ہائے اللہ کہتی ایک طرسیں، مضحکہ خیز ”نواب“، ”افیونی
ملازم“، فلم اور ٹیلی ویژن کے اسٹاک کردار ٹیکنولوجی کی بدولت باقی رہیں گے۔ مستقبل کو
دیے ہوئے ادھ لٹوں کی جعلی نقلیں۔

”بھیا شہری زمین سونے کے بھاؤ تک رہی ہیں۔ بہت سے دیشقہ داروں کی
حالت بھی سُدھ گئی“

”بیشک۔ اس روز ایک اعلیٰ صاحب کو دیکھنے گیا۔ کڑھ ابوتراپ۔ مجلسرانگی ادھی
گر چکی۔ اس سے ملتی اپنے نئے ایرکنڈیشنڈ مکان میں صاحب فراس مولانا تراپنی کے
کیسٹ سماعت فرما رہے تھے۔ باہر نکلا تو پرانے مکان کی شکستہ چھت میں جڑے مٹکے
نظر آئے صحیح و سالم۔ اگلے وقتوں کے ایرکنڈیشنڈ کیا انجینئرنگ تھی ڈیڑھ سو سال میں
دوسری منزل کے بوجھ تلے نہ وہ چٹے نہ ٹوٹے۔ آج تک موجود۔ گذشتہ سے پیوستہ؛“

”ارے مورے بھیا۔ وہ مٹکے لکھنؤ کے کہاروں ہی نے گھڑے۔ ہمیں تو اللہ میاں
نے ڈھالا۔ ہم باقی نہ رہیں گے؛ آزادی کے بعد گئی یک بیک جو ہوا پلٹ۔ کتنے ریسوں

نے اپنی املاک رستوگیوں کے ہاتھ بیچ دیں مگر ان پچھرا کو جوں کے اندر تشریف لے جائیے اب بھی کتنے قدیم کتبے ایسی طرح آباد ہیں۔ ماشاء اللہ۔ خدا کی شان ہے۔“

”بیچ خدا کی شان ہے واقعی۔ ان ادراقی مصوّرگیوں میں اُبتلی خلقت۔ بھینوں کے طویلے۔ اوپن ایئر بم پوس، اس پر یاد آیا عبیر کہ تمہیں اس لفظ کی وجہ تسمیہ معلوم ہے؟ ٹامیوں نے۔“

”افوہ بھئی۔ اب اس مضمون پر ریسرچ مت شروع کرو۔“

وہ دونوں ہنستے ہوئے بیٹھیاں اترنے لگی۔

”بیگم صاحب۔ بھیا کی بات پر ہمیں ٹھا کر صاحب دھان پور کا دھیان آگیا۔ وہ مرحوم اللہ جنت نصیب کرے جہاں کوئی انوکھا لفظ سنا ہمیں پکارے۔ حینی ذرا لغت تولانا۔ آزادی ملتے ہی بٹکر سلیس والے تو روانہ ہوئے۔ ہم ٹھا کر صاحب کے پاس جاپلنگ ڈ آگئے۔ انکے اکلوتے بھتیجے دلن میاں انکے وارث تھے۔ بلا کے ذہین۔ اور شریر۔ اپنے تایا کی طرح کتابیں پڑھنے کے وہ بھی شوقین۔ مگر مجال ہے جو انور سٹی کے امتحان کی تیاری کبھی کی ہو، اور غضب کے کھلاڑی۔“

”ایک باری بیگم صاحب۔ ایک مس صاحب امریکہ سے آئیں۔ انگریز چلے گئے تھے اور امریکن اور روسی آنے لگے تھے۔ تو یہ مس صاحب کا بلٹن میں ٹھہریں۔ دلن بھیا انکے ساتھ ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ انکی ہوئی بڑھ دے پارٹی۔ دلن بھیا کے ایک جوڑی دار تھے۔ کنور سینڈی۔ ان سے ایک شرط بندی۔ پھر جا کر میسا سے بولے۔ ہم آپکے جنم دن پر آپکو سب سے بھاری تحفہ دینگے۔ سادن کا مہینہ۔ برتی بارش میں رات کو جا کر بنا رسی باغ سے ایک ہاتھی چرایا۔“

”پورا ہاتھی چرایا۔ اور پکڑے نہ گئے؟“

”کالج کے زمانے کی شرارتیں بیگم صاحب۔ کنور صاحب سے شرط جیت لی۔ راتوں رات گج راج اپنے ٹھکانے پر واپس!“

”ادھر ٹھا کر صاحب مرے۔ ادھر زمینداری گل۔ ایک لاکھ کی مالیت پر چھ ہزار معاوضہ۔ وہ بھی چالیس اور بیس سال کی قسطوں میں۔ بڑے بڑے لوگ راتوں رات کنکال ہو گئے۔ سچ مچ انکے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گذر بسر کے لیے ساہوکاروں کے ہاتھ بانڈیکشت بیچ ڈالے۔ پھر زیور بکے۔ اسکے بعد گرتے مکانوں کی اینٹوں کڑیوں کی نوبت آئی۔ بہت جگہ ایسا ہوا بیگم صاحب جیسے چار بھائی تھے دو بھائی تلے میں اپنے حصے کی اینٹوں دروازوں کی قیمت پیشگی وصول کر کے ہجرت کر گئے۔

”ہمارے دن بھیتا کے کوئی آگے نہ پیچھے۔ راجہ صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی کھل کھیلے، بانڈ، کوٹھیاں موٹریں، کتابیں بیچ بیچ رنگ رلیاں منایا کیے۔ ہم سے کہتے خمینی ذرا آج فلاں چیز کے دام لگا آنا۔ نخاؤں مھر کا بازار بنا ہوا تھا۔ کیسے کیسے نام و نشان وہاں کوڑیوں کے مول بکے۔ دن بھیتا کے پاس جب کچھ نہ بچا ایک روز لاہور سدھارے۔

”انکے جانے کے بعد ہمیں اپنی مرضی کا کام نہ ملا۔ بی بی مرگئیں۔ ہم نے امین آباد میں سیخ کباب کا فونچہ لگا لیا۔ اسی فٹ پاتھ پر ایک پنجابی شرنار تھی پوری کچوری بیچتا تھا۔ اس نے اتنا بچا یا کہ جا کے لندن میں ریٹورانٹ کھول لیا۔ ہم نے جتنا لکایا اس سے دو گنا خرچہ اکلوتی بیٹی تھی۔ چیمپی۔ آنکھ کا تارا۔ اسکا سیاہ کیا۔ وہ خاوند کے ساتھ ڈھا کہ چلی گئی۔ برابر خط لکھا کرتی۔ دسمبر سنہ ستر میں اسکا آخری کارڈ آیا کہ اباما راری یہاں بھی شروع ہو گئی ہے پھر اسکا کچھ پتہ نہ چلا۔ ہم نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ کس سے فریاد کریں؟

”لڑکے آوارہ نکل گئے۔ بہت کوشش کی تھی کہ لکھ پڑھ جاویں۔ منصور بھیا ٹھیک کہتے ہیں۔ امیر غریب سب۔ ہم لوگوں کی آنکھیں ہی نہیں کھلتیں۔ ہمارا کیا حشر ہوگا؟ ہم تو قریب گور بیٹھے ہیں مگر یہ اٹھ دس کروڑ؟“

”وہ سب کے سب نہ آپکے دن بھیا جیسے ہیں نہ آپکے لڑکوں جیسے۔ چلیے گھر چل کر ڈنر تیار کیجیے“

”ہماری کیا اوقات بیگم صاحب کہ ان معاملوں میں زبان کھولیں مگر دوڑ بھی تو ہمیں سے مانگنے آتے ہیں۔ کسے دوڑ دیں؟ ان لڑنے لڑوانے والوں کو؟

— زمیندار بھی پرانے گئے۔ دوسرے بھیس میں نئے آگئے۔
 ”آپکوان پُرانوں سے اتنی اُلفت کیوں ہے؟“
 ”اچانک کھایا تھا۔“

”اتنی سجداری کی باتیں کرتے کرتے آپ پھر بوقوفی پر اتر آتے ہیں۔ اصلیت میں انہوں
 نے آپکا نمک کھایا تھا۔“
 ”سُنیے بیگم صاحب۔ لال جھنڈے والوں نے بھی تو کچھ نہ کیا۔“

عبر اور منصور گیٹ پر ملے۔ عندلیب بیگ سڑک پر جانے کے بجائے پھر باغ کی سمت
 مڑ گئیں۔ حسین بخش جو دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے تیز تیز چلتے آ رہے تھے روربنک رڈ
 کی رونق اور ٹریفک پر نظر ڈال کر حیدر لہجوں کے سکوت کے بعد بولے۔ ”کتنا کچھ بگڑا۔ اور
 کتنا کچھ بنا۔ بیٹا۔ آزادی سے پہلے یہاں کچی سڑک تھی۔ دیران۔“
 ”بگڑا زیادہ۔ بنا کم۔ سب کچھ بگڑ کر از سر نو بنا چاہتے۔“
 ”عبر تم نکلائیٹ تو نہیں؟ کلکتہ۔“
 ”بنیاد پرست کہہ لو۔“

”آہا! تخریب یا تعاون کے بجائے تطہیر! مشکل یہ ہے کہ کچھ اور بنیاد پرست بھی ہیں
 جو چاہتے ہیں کہ مثلاً شاہ پیر محمد کاشیلہ دوبارہ چھمن ٹیلہ کہلاتے۔ شاہان اودھ ہم موڈرن
 لوگوں سے زیادہ ذہین تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب اور کھن جی دونوں کو ایک چوکھٹے
 میں فٹ کر دیا تھا۔ انکی تخلیق کردہ رواداری اتنی دیر پا نکلی کہ لکھنؤ میں آج تک ہندو
 مسلم فساد نہیں ہوا۔ ایودھیا والی خانہ جنگی بھی واجد علی شاہ کو معزول کرنے کے لیے
 ایسٹ انڈیا کمپنی نے کروائی اور نہایت دور اندیشی سے مزید جھگڑے کا بیج بویا۔ مگر اس
 پلورسٹ سوسائٹی کے لیے میٹر سلاطین ہند نے ہوشمندی۔“

حسین بخش کھنکارے۔

”اور سیکولرزم کا ثبوت۔ جی میاں حُسنی آپ کچھ کہہ رہے تھے؟“

”کچھ نہیں بھیا۔ ہم بیٹا کو بتلانے والے تھے۔ ادھر جنرل مارٹن کی بیڑھی کوٹھی تھی۔ جس میں شہزادہ سلیمان شکوہ دئی سے آن کر رہے تھے۔ اسے گرا کر ٹرانسپورٹ آفس۔ آزادی کے بعد۔ ست محلہ بھی گزر گیا“

”ذرا قریب کے محفڈر جا کر دیکھو۔ مجازی امیروں کے گنہ جاکے دیکھیے!“

”نواب کیواں جاہ والا قدر۔ ٹھمریوں والے کدر پیا ان کا محل چو لکھی۔ اب غلے کا گودام۔ ارے اسے ہی محفوظ کر لیتے کہ جنگ میں بیگم حضرت محل کی آخری کین گاہ تھی۔“

”اور۔“

”رؤشن الدولہ کی کچھری نیا کورٹ بنانے کی خاطر توڑ ڈالی مگر وہ اتنی مضبوط نکلی کہ اسے گرانے ہی پر بہت لاگت آئی۔ بیگم کوٹھی بھی گئی۔ چھوٹی چھتر منزل سٹہ کی برسات میں گری۔ بارہ دری فیصر باغ۔ بادشاہ باغ۔ لال بارہ دری، سب برباد“

”اور۔“

”راجہ ٹلیکت رائے کا محل۔ آصف الدولہ کے وزیر تھے“

”کلکتے میں گریں مجھے جھجھو جھونٹے دے کر کہتی تھیں بڑھیا اپنے برتن بھانڈے سمیٹ لے راجہ کا نیا محل بنتا ہے پرانا محل گرتا ہے اڑا اڑا دم“

”نئے محل تو بیٹا بے حساب بن گئے۔ پر ہمیں بڑے بھاری جھونٹے لگے۔ سنا ہے افریقہ میں کوئی قبیلہ ہے جب آدمی بہت بوڑھا ہو جاتا ہے اسے مرنے کے لیے ایکلا چھوڑ دیتے ہیں۔ خود نہیں مارتے۔“

”کیمبرج یونیورسٹی کی روشوں میں جو بحری صدیوں پہلے جمائی گئی تھی اسے جہازت کی سی احتیاط کے ساتھ صاف کیا جاتا ہے“

”بیٹا وکٹوریہ اسٹریٹ چوڑی کرنے کے لیے پرانا نچاس پھوڑ دیا سات آٹھ برس پہلے تک وہاں ہر اتوار کو کھنوکھن کی قدیمی شان دکھلائی دیتی تھی۔ دوپٹی ٹوپیاں انگرکھے چوڑے عرض کے پائیچامے پہنے، پٹے رکھائے وضعدار شریف لوگ چڑیوں کی مارکیٹ میں آتے۔ جلیسہ کالج کے گیٹ کے پاس پیل کا درخت تھا۔ بوڑھے بہیلیے، چڑ پیار

اسکی عمر چار پانچ سو سال بتلاتے تھے۔ اسکی چھاؤں میں پرندوں کا بازار لگتا۔ کبابی، بریانی اور بالائی والے۔ کبوتر، بیڑیں۔ ہریل، اھیل مرغ اور اسکا نام لیجے بلبلس۔ طوطے، مینائیں، لال، چرکوتے۔ کالے جادو کے لیے اُٹونگ تو وہاں مل جاتے تھے۔ بیڑ باز نئے سینرن کے واسطے بیڑیں خریدتے۔ کبوتر اور مرغ باز۔“

”بقول امی کبوتر اور بیڑیں ہی لکھنؤ کو چمک گئیں۔ انہیں اس تذکرے سے چڑھے ہے۔“
 ”عنبر تمہاری امی چڑیوں سے چڑتی ہیں، وہ تو نوڈرڈ و ایجر۔ اچھا۔ خیر دوسری بات یہ کہ ان کبوتر بازوں میں موڈرن تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل تھے۔ ہم خود اکثر انوار کے روز سیر کے لیے وہاں جاتے تھے، یہ تو اسپینش مل فایٹ کی طرح اہل لکھنؤ کا گویا قومی مشغلہ تھا۔“

”پرانے نجاس کے ساتھ وہ پیل بھی گیا۔ اس درخت کے سوگ میں لوگوں لے گھروں میں دو دن تک چولہے نہیں سلنگے۔ کھانا نہیں پکا۔ وہ بازار مونا ہو گیا۔“
 ”یعنی پارلیمنٹ آف برڈز ٹوٹ گئی۔ منطق اشرف المخلوقات! عنبر بیگم! یہ محض مرغبازی نہیں ایک پوری تہذیب کی موت تھی۔ افسوس ہم امریکہ میں تھے ورنہ بہت دُند مچاتے۔“

”پیل کٹنے پر سرنہ کٹے؟“

”بیٹا لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد سنہ سینتالیس تک میں تو ہوا انہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ پیل سرکار نے خود کاٹا تھا۔ اب سندھی پنجابی شرنار تھیوں کی اولاد کبوتر بیچتی ہے۔ انکا لہجہ لکھنؤی ہو چکا ہے مگر وہ پرانا ماحول ختم ہو گیا۔ اور بھیا یہ ابھی سات آٹھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے جب تاریخی عمارتیں گرائی جارہی تھیں ہمارے شیعہ سنی اپنے بھیانگ فسادوں میں جُٹے ہوئے تھے۔ مہینوں کر فیوگارتہا۔ شیعہ سنی اپنی پالی ٹکس لڑاتے یا لکھنؤ بیجانے کی کوشش۔ انہیں فرصت کہاں تھی؟“

”شیش محل والوں نے اس کا دروازہ سوختہ لکڑی کے بھاؤ بیچ دیا۔“

”عنبر تم نے تم تار سے والی کوٹھی پہلے دیکھی تھی؟ سفید، جارحین محل۔ رصد گاہ

ابھی خیال آیا کھنوکے عوام اسٹیٹ بینک کو اب بھی اسکے پرانے نام سے یاد کرتے ہیں ورنہ دراصل اب آپکا دو تھانہ تارے والی کوٹھی کہلانا چاہیے۔ کیونکہ آپ علوم فلکیات و نجوم “ربکو مت”

ڈوبتے سورج کی روشنی میں ٹہلتے ہوئے وہ چاروں ریڈیڈنسی کے مختصر انگریزی قبرستان کی سمت نکل گئے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ برگد کے نیچے پہنچ کر مسز بیگ نے مرمی قبروں کا جائزہ لیا۔ پھر عینک لگائی اور کتبوں کے نام اور تاریخ وفات اناؤنس کرنے لگیں۔ میڈلین انیز۔ ۱۸۸۷۔ ایما فنز جیرلڈ۔ ۱۸۴۵۔ لفٹنٹ جیمز گرہم۔ ۱۸۷۵۔ ولیم رٹلیج۔ ۱۹۱۲۔ ایمیلیا جین۔ ۱۹۱۲۔ درختوں کے پتے بارش کی بوندوں کے ساتھ قبروں پر ٹپ ٹپ گرا گئے۔

”کر بچین عقیدہ ہے کہ قیامت ایسٹر کے روز آئے گی۔ ساری قبریں اپنے اپنے مُردے آگلی دیں گی“ مسز بیگ نے کہا۔

وہ تینوں ایمیلیا جین ۱۹۱۲ کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

بھگی ہوئی ہوا درختوں میں سرسرائی۔

ایسٹر مورنگ۔ روز قیامت۔ ایمیلیا جین مٹی جھاڑتی قبر سے برآمد ہوتی ہیں۔ سعیدیس کے کاؤن سے کیڑے مکوڑے جھٹکتی ہیں۔ افسوس کرتی ہیں۔ یہ کاؤن انہوں نے حضرت گنج سے خریدا تھا اور اسے پہن کر ”یور وینیز اولی“ کے چھتر منزل کلب میں والتس ناچا کرتی تھیں۔ نیلی گومتی کے کنارے بلوڈینوب۔

قبر سے نکلیں تو کفن پوش نواب مریم سلطان بیگم دکھلائی پڑیں۔ ملکہ غازی الدین حیدر۔ ڈاکٹر جیمز سٹورٹ کی دختر بلند اختر۔ ایمیلیا جین نے بخوشی ان سے مصافحہ کیا۔ گواک نیٹو بادشاہ کی کوئن تھیں مگر اپنی وصیت کے مطابق

کیسوقلک قبرستان میں دفن کی گئی تھیں۔ دونوں میدان حشر کی طرف چلیں۔
وہ انگریز نثر و صحافت محل کہ کلمہ گو میں اپنے اپنے مزاروں سے نکل کر
اہل اسلام کے گرو میں لگ رہی ہیں۔

”قمر چہرہ اور عمدہ بیگم وغیرہ کا حشر عیاسیوں کے ساتھ ہوگا یا مسلمانوں کے؟
عبر نے آواز بلند ذرا تردّد سے دریافت کیا۔

”ہماری قیامت ایسٹر کے روز تھوڑا ہی آئے گی“ منصور نے کہا۔ ”یا کیا پتر
دونوں ایک ہی روز پڑیں چاند کے حساب سے!“
مسز بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کلکتے میں بے چاری فلو مینا
کی قبر اسطرح بھگیتی ہوگی“

”اُمّی جان چلیے گھر چلیں۔ آپ کار لے جائیے۔ ہم لوگ پیدل آتے ہیں“
وہ ایمیلیا جین ۱۹۱۲ پر سے اٹھیں۔ سر جھکائے سڑک کی طرف روانہ
ہو گئیں۔ حسین بخش چھتری لے کر انکے پیچھے پیچھے دوڑے۔

”فلو مینا کون تھیں؟ کل شام بھی تمہاری والدہ نے انکا ذکر کیا تھا“ منصور
نے سگریٹ پھینک کر لفٹینٹ جیمز گرهہم ۱۸۷۵ پر سے اپنی ہلیٹ اٹھائی۔

”ہماری GOAN آیا۔ اُمّی جب پیدا ہوئی تھیں تب سے اس نے انھیں
پالا پوسا تھا۔ بے انتہا وفادار۔ پورے پچاس برس اس نے ہم لوگوں کی خدمت کی۔“
وہ دونوں برگد تلے سے نکل کر خاموش راستے پر آگئے کچھ فاصلے پر ”اولڈ روز“

رنگ کی ساڑھی میں بلبوس ایک آہستہ خرام خاتون روربنک کولونی کے دو منزلہ
سرکاری مکانات کی سمت جاتی دکھلائی دیں۔ ندی میں سورج اسی آہستگی
سے ڈوب رہا تھا۔

”مسز جو رڈن۔“ عبر نے ریجیدہ آواز میں کہا۔ ”غروب آفتاب واحد وقت

ہے جب نئے اسکائی اسکریپرز سے دور لکھنؤ کی پرانی اسکائی لائن شفقت اور گومتی کی اس سرخی میں ڈوب کر ٹامس ڈینیل کے فریم میں واپس چلی جاتی ہے۔ اس وقت مسز جورڈن چہل قدمی کر کے اپنے خاموش فلیٹ کی طرف آتی ہیں۔

”مسز جورڈن! — کچھ کھٹی سی جی!“ منصور نے کہا۔ ”رائٹ — انکے شوہر کر سچین کالج میں پڑھاتے تھے۔ یہ آئی۔ ٹی میں۔ لاولڈ جوڑا تھا۔“

”مسز جورڈن کا انتقال ہو گیا۔ شاردانے آئی۔ ٹی سے انٹر کیا تھا۔ وہ بتلا رہی تھی۔ دو دیورانی جٹھانی تھیں۔ یہ انکو مکس جورڈن تھیں دوسری میوزک جورڈن وہ پیانو سکھلاتی تھیں۔ اس وقت ہندوستانی استانیاتین چارہی تھیں۔ اب سارا اسٹاف INDIANISE کر لیا گیا ہے۔ لورٹو کانونٹ سے بھی ساری یورپین NUNS واپس گیتس کیرالا کی آگئی ہیں۔ محض لامارٹیز میں ابھی گور سے استاد باقی ہیں۔“

”عنبر میرا خیال ہے ہم فرنگیوں کے جانے سے واقعی اداس ہیں۔ کم از کم نو سٹیبلجیا کی حد تک تو ہیں۔ ورنہ ایک انڈین کر سچین تنہا پنشن یافتہ استانی کو ریڈیڈنس کے انگلش قبرستان کے پاس سے چپ چاپ گزرتے دیکھ کر تم غمگین کیوں ہوتیں؟“

”ہم انگریزوں کے جانے سے اداس نہیں۔ مگر انڈو برٹش تمدن میں جو لفاٹس تھیں انکی جگہ پر جو گنوارپن —“

”گنوارپن جمہوریت کی اولیں اسٹیجوں میں ناگزیر ہے۔“

”او کے۔ او کے۔ میں تصور ٹا ہی کہتی ہوں کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں پہلے زیادہ تر ریسٹوں کے لڑکے پڑھتے تھے اسوجہ سے وہ بہت بڑھیا بانی کلاس جگہ تھی۔ اب اس میں کسانوں اور جو لاہوں کی ہزاروں ہزار اولاد تعلیم حاصل کر رہی ہے اس وجہ سے ہمیں افسوس کرنا چاہیے۔ ڈیم اٹ۔“

”جی نہیں۔ بنیادی طور پر آپ بھی ELITIST ہیں۔“

”ابھی تو تم مجھے نکل سٹیٹ بتا رہے تھے!“

”تم بھی مجھے کبھی وہابی سمجھتی ہو کبھی شیعہ۔!! نہیں۔ تم زبردست اسنوب ہو۔ میں کہ ایک غریب ملا کا بیٹا ہوں۔ کسی گوان آیا نے میری پرورش نہیں کی نہ میری والدہ نے لورٹو ہاؤس کلکتہ میں پڑھا۔ میں SNOBBERY کے مختلف رنگ خوب پہچانتا ہوں“

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔

”اور سناؤ۔ نکار خانم کیسی ہیں؟“

”مہر تیس کہ شطرنج کے کھلاڑی دیکھوں کھانا کھاؤں۔ میں بھاگ آیا“

”شہو آ رہت خوبصورت ہے۔ تم کو کیسی لگتی ہے؟ بتاؤ۔ بتاؤ نا۔“

”عین۔ خفقانی مت ہو۔“ منصور نے چڑ کر دوسرا سگریٹ جلایا۔ ڈاکٹر

کے اعصاب مضبوط ہونے چاہئیں۔“

”بس۔ تم بیورٹری میں ڈٹے رہو۔ میں خفقانی ہوں؟ ڈاکٹر انسان نہیں؟

پتھر کے بت ہیں؟ تم کیوں چین اسموکنگ کرتے ہو؟“

وہ پھانگ پر پہنچ گئے۔ منصور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”پہلے ذرا گھر سپر کلب“ کول گیٹ مسکراہٹ مفقود۔ ”بھئی کی ایک ٹرنک کال

کا بھی انتظار ہے“

”امی تو تمہارے لیے ہی سامان لینے ماتا بدل کے ہاں گئی تھیں“

”سواری۔ اگلے ہفتے۔ آج تو اتنا وقت بیلنگا رد میں آپ ہی لوگوں کے

ساتھ گزار لیا۔ اگلا سینچر۔ او۔ کے؟ کھانا بھی۔ خداحافظ۔“
فلش گورڈن — رت بسنت کی بجلی کی طرح غائب۔

مسز بیگ کو ٹھی کے پھاٹک پر منتظر تھیں۔
”ہلو اولڈ گرل“۔ عنبر نے کھوکھلی آواز مصنوعی بشاشت سے ماں کو مخاطب کیا۔

”منصور۔؟“

”چلا گیا۔“

”کیوں؟“

”پرسوں آپ ہی نے اس سے کہا تھا اس کا روز روز آنا اور گھنٹوں بیٹھنا
ٹھیک نہیں۔“

”یہ بات نہیں۔ تم نے اسے اپنی نکتوں سے جھٹلا دیا۔ بات بے بات اس
سے الجھتی کیوں ہو؟ مرد ٹر سی جھگڑاؤ لڑکیاں پسند نہیں کرتے۔“

”میں لڑکی ہوں؟ بوڑھی پھونس خود ہی تو کہتی ہیں کہ عورتوں کو سکند فڈل
نہیں بننا چاہیے۔ ابھی ان بے چارے اتنے مہذب مسکین بزرگ سے تکرار کرنے
لگیں۔ چلیے اندر چلیں۔“

عذیب بانو پھاٹک پر کہنیاں ٹیکے کھڑی رہیں۔

”اُمی۔ اب کیا سوچ رہی ہیں بھئی؟“

”حسین بخش نے جلی خورشید کا قصہ چھیڑ دیا۔“

”تو۔۔۔؟“

”مجھے حجن بی کا خیال آ گیا۔“

”چھوڑیے۔ اب حجن بی کو کہاں تک یاد رکھیے گا؟“

”موتے دم تک۔ جیسے ممانہیں نہ بھول سکیں۔“

”بے چاری حجن بی کا کیا تصور تھا اُمی۔“

دوستو۔ دوسرے کنارے پر مسلمان بجا روں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ انکی عورتیں بڑے شوخ خوبصورت رنگوں کے عزارے پہنتی ہیں۔
”انکی جھونپڑیوں کے مقابل آرٹ کالج اور ندوۃ العلماء۔ اور ان دونوں دیناؤں سے انکا کوئی تعلق نہیں۔“

”میدرڈ میں۔۔۔ جب میں ایک چمسی ڈانس کرا سکیج بنا رہی تھی تم سے کہا تھا۔ آٹھ سو سال پہلے اگر یہ خانہ بدوش انڈیا سے یورپ نہ بھاگتے وہاں آج بھی ہنڈرے اور ڈوم اور کنجری کہلا رہے ہوتے۔“

”آئین اکبری میں ہے کہ کنجری قبیلے کی عورتیں ناچتی گاتی ہیں اکبر نے انکو کچنی پکارا۔“

”مجھ بجا رن کے لیے یہ پڑاؤ بھی جان لیوا نکلا۔“

”باؤچی ٹولے کے حسین بخش کافی نہیں تھے“

”جو آج وکٹوریہ اسٹریٹ کے دھیتے دار بیٹھ گئے۔ جھوتوں کے رکھوالے۔“

”اندر چلیے۔ بجدوں کے چراغ بجھتے جاتے ہیں۔ ہوا اتنی تیز ہے۔“
”اس موسم کی ہوائیں آندھی بن کر آتی ہیں۔ سنو۔ عنبر۔ گننام نواب صاحب نے عزیز بانو کا وہ کون سا شعر پڑھا تھا۔ جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں۔“
”اس وقت سے پتہ ہے میں کیا سوچ رہی ہوں؟ میں سوچ رہی ہوں۔ میں شاخ گلاب کی طرح جھکی تو سہی۔ ابر بہار کی طرح اٹھ کیوں نہ پائی۔“



(۳)

سُرخ پٹاری

”بیٹے۔ اس روز باہر سے باہر ہی چلے گئے۔“
”جی میں نے عنبر سے معذرت۔“
”اچھا ذرا کچن کا چکر لگاؤں۔“

ڈاکٹر کا شغری دریاچے میں جا کھڑا ہوا۔ شفق کی روشنی میں ہرا بھرا باغ بے حد
دل فریب معلوم ہو رہا تھا۔ نالیوں میں بہتا شفاف پانی کبھی نقرنی نظر آتا کبھی ازغوانی۔
بڑی بڑی مینائیں گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ عنابی اور سفید ٹائیلوں کے فرش
پر کھٹ کھٹ کرتی، طوطے کے رنگ کی ساری میں ملبوس عنبریں بیگ کمرے میں
داخل ہوئی۔

”ہلو منصور۔“

”ہاتے طوطا پیری!۔“ اس نے امریکن انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ ”بارہ بنگالی
بیرسٹر بڑا بے وقوف تھا جو ایسی خوبصورت کوٹھی اتنی سستی بیچ گیا!“

”وہ پانڈی پجری آشرم جا رہا تھا سنیا س لے کر۔“

”عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ آشرموں میں جا بیٹھتے ہیں۔“

”جب میں نے اسے خرید اس پر بیڈ ٹیگوریت چھانی ہوئی تھی۔ جھلملیوں والی
کھڑکیاں اندھیرے اداس کمرے۔ ایک زونگ باغ میں نے کھڑکیوں میں سلائیڈنگ
پٹ لگوائے۔ کمروں کو روشن اور ہوا دار کیا۔ افوہ بڑا خرچہ بیٹھا۔ تم کہتے ہو برساتی

بنوالو۔“

”اب اس وکٹورین بنگالی ماحول کی جگہ تمہارے ہاں یوروپین کولونیل ٹچ آگیا،
یہ بھی اچھا لگتا ہے۔“
”کولونیل؟“

”ٹروپیکل درخت اور کوٹھی کا اسٹائل۔ اسکے لئے تم کچھ کر نہیں سکتیں۔ نہ کرنا
چاہیے۔ شمالی افریقہ میں یوروپین کولونیل چھوڑو۔ رومن ایمپائر تک کی جھلک موجود ہے۔
اور انڈس کی — اور —“

”یہی تو سارا پروفلم ہے۔ جھلکیاں بے شمار۔ آدمی ایک۔“
”سلیقے سے موزیک اور اسٹینڈ گلاس دریچے بھی تو بنائے جاتے ہیں۔“
”یہ کوٹھی اس ابریا کے لیجنڈری رومینٹک منظر میں شامل تھی۔ لال بارہ دری۔
چھتر منزل۔ روشن الدولہ کی کچہری۔ قیصر باغ۔ لیکن یہاں بد مذاقی کے بل ڈوزر چل گئے

”اسکاٹ لینڈ میں میں اپنی بے دنڈو میں بیٹھتی اکثر ایک آدمی بیگ پاپ بجاتا
سنان پہاڑی راستے پر سے گذرنا دور دھند لکے میں کھوجاتا تھا — میں آل آواز
کو دوبارہ سننا چاہتی ہوں۔ مگر ملکہ پچھراج کو بھی انکی اپنی سینگ میں۔
”اڈنبرا اور بیگ پاپ۔ ہندوستان کی مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکرز پر بانگوں کا
سلسلہ — فجر اور مغرب کی لرزہ خیز اذانیں — ہر دو ارگے ہو؟“
”ہوں ہوں۔“

”گنگا دیوبی کے مندر کی جل بہار۔ کیرالا کے سفید۔ چرچ۔ رنگین چھتریاں لگاتے
پلوں پر سے گذرتے گریس فل لوگ۔ سردوں پر رومال باندھے موپلا عورتیں۔
، چیز کا ایک ڈسکر سے سمبندھ اور مناسبت ہے۔ لیکن یہاں کیا سہو رہا ہے؟ چھتر منزل
کو ڈرگ ریسرچ انیٹیوٹ بنا کر برباد کر دیا۔ روشن الدولہ کی کچہری گرانی جا رہی ہے۔
قیصر باغ کے پھاٹک تو کھنڈر ہو گئے اور شیڈیم کے سامنے وہ نیلا پیلا سوراخوں والا پھاٹک
تعمیر کیا گیا ہے بقول تمہارے BAD-TASTE MODERN — دنیا کا گلوب پچوں کے
یارک میں لگانا چاہیے تھا۔ سعادت علیخاں اور زور شید زادی سے اسکی کیا —“

”میرے انگٹے میں تمہارا کیا کام ہے۔ لاؤ ڈاسپیکر پر۔“ عندلیب بانو نے اندر آتے ہوئے جواب دیا۔

”دیکھو شام کس تیزی سے گزر رہی ہے“ منصور چند کیسیٹ نکال کر دریچے میں واپس گیا۔ ”یہ میں نے ڈسک از فالنگ کا ترجمہ کیا ہے“

”بل ڈور۔“ عنبریں نے دہرایا۔

”لندن برج از فالنگ ڈاؤن فالنگ ڈاؤن مائی فیئر لیڈی۔“ منصور نے کہا۔

”عنبر۔ تمہاری باتیں سن کر میرا چہرہ گر گیا۔ ایسے منفی بیانات جاری نہ کرو۔ تمہیں اپنے ڈپریشن کو شکست دینی چاہیے۔ اسی بات پر ڈول بہادر تھا یا سے کہو کافی لائے مع چوکولٹ کیک۔“

”بہادر۔“ عندلیب بانو نے پکارا۔ پھر عنبریں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”تم روز بروز زیادہ ری ایکٹری ہوتی جا رہی ہو۔“ یہ بہادر سنگھ چیتھڑے لگائے نیپال کی گھاٹیوں میں پتھر ڈھوتا تھا اس وقت گویا اپنی سینگ میں صحیح اور مناسب تھا۔ امکان ہے اسکی بہنیں فارس روڈ پر بیچ دی گئی ہوں بھتی میں۔ مینی اسکرٹ پہنے سُرُخ تپوں کے نیچے کھڑی پتھر کی سلاخوں سے جھانکتی اداس نیپالی لڑکیاں۔ ان پتھوں کی ہی سینگ ہونی چاہیے؟“

”ہاں۔ جواب دو عنبریں! منصور نے جوش سے مطالبہ کیا۔“

والدہ پھر غائب۔ باہر کار اسٹارٹ ہوئی۔

”امی کے پاس بہت سے دقیانوسی ریکارڈ بھی موجود ہیں۔ کسی روز سننا۔“

”مائی نیپیمس گوہر جان آن کیل گٹا۔“ منصور نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں۔ اسی ٹاپ کے گوہر جان۔ سردار منصور میں کج۔ دلاری۔“

منصور نے ایک کیسیٹ لگایا۔ ”لو سنو۔۔۔ تمہاری ملکہ پکھراج اپنی ٹرو سیننگ میں“

”ہر شاخ میں تنگو نے انداز لوبھوٹے“

عبر نے آواز اونچی کی۔

”ہو ابخت سبز۔ ملا رخت سبز“

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔!“ منصور نے داد دی۔

”چلے میگسار سوتے لالہ زار۔۔۔ مے پردہ دار شیشے کے در سے جھانکی۔۔۔“

”ما تم جیلٹلمن۔۔۔!“ عبرتس نے خوشدلی سے اعلان کیا۔

”صاحبزادی شہوار خانم کا فون“

”کہدیکھے حسین بخش ہم یہاں موجود نہیں۔۔۔ سنو عبرتہ جو سامنے والے امم کے

درخت ہیں انکے ایٹ موسفیر کو نہ چھیڑنا“

”ہرگز نہیں!“

”وہ ریلکھت بڑی بناتش نظر آئی۔ منصور نے شہوار کو انور کیا۔

”ہو ابخت سبز۔۔۔ ملا رخت سبز۔۔۔ آفت گئی خزاں کی۔۔۔“

”بالکل یہی جینگل کی SETTING رکھو۔۔۔ جھٹ پیٹے وقت بن دیوی آل بھرمت

میں سے گذرا کرے گی۔ کبھی اپنی جھلک دکھلا کر اچانک غائب ہو جائے گی۔ بن دیوی جو

انسانوں سے ڈرتی ہے۔۔۔ یہ ایک رگ ویدک شاعر نے کہا تھا۔ ڈھائی ہزار

سال پہلے“

”باپ رے۔ تم کو اتنا انٹرنیشنل لڑ پچرا زبر ہے! ڈھائی ہزار سال سے کم بات

نہیں کرتے۔ واقعی نگار خانم تم کو بہت بھاؤ دینگے۔“

”وہ دیکھو — بن دیوی کی جھلک — پہلی ساری میں —“

”وہ ہمارے مالی کی بیوی ہے۔“

”نیورما اینڈ۔ تمہاری مالن کا نسلی اور ما بعد الطبیعیاتی تعلق اس رگ ویدک بن دیوی کے تصور سے بالکل فرط بیٹھتا ہے۔ ادرسٹنگ ایکدم پرفیکٹ۔ بورسے لے آم کے درخت۔ گومتی کا کنارہ — گودھو لے کا سٹے۔ مالن کا نام امبیکا تو نہیں؟“

”نہ۔ رم کلتا۔“

”خیر۔ رام کلی بھی چلے گا؟“

”سوال یہ ہے بارہ درسی قیصر باغ ہلدی کے رنگ میں کیوں پوتی؟“

”چند سال قبل ایک میجر العقول کلرا اسکیم بنانی گئی تھی۔ اسکے تحت“

”جب بیٹ صاحب پوئی گورنمنٹ کے چیف سکرٹری تھے؟“

”ان نامجمود رنگوں سے موصوف کا کوئی تعلق نہیں۔ کوئی موڈرن آرٹ والا ماڈن

پلانر — معاملات کچھ اندھا دھند میں کچھ پیچیدہ۔ وکٹوریہ پارک کا نام بیگم حضرت محل

پارک رکھا گیا۔ بیگم کا مجسمہ نصب کرنے والے تھے۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا ایک مسلم

شخصیت کا بت نہیں لگوانے دینگے۔ چنانچہ وکٹوریہ کی چھتری خالی پڑی ہے۔“

”امیر الدولہ لائبریری میں“ مسز بیگ کی آواز آئی ”کنگ غازی الدین حیدر

کا مر میں بت تو مدتوں سے موجود ہے — جب میں لڑکپن میں یہاں آئی کبھی تبھی

دیکھا تھا۔ اور نصیر الدین حیدر کا بھی۔“

”آپ —؟“

”برہما بیکری گئی تھی۔ تمہارے لیے چوکولٹ کیگ۔ اور میاں سارے مسلم ملکوں میں

تو مسلمان شخصیتوں ہی کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں —“

”اکثریت کی بت پرستی کی وجہ سے ہندی مسلمان حد سے زیادہ محتاط ہے —

امی ذرا سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“

”ماں! تو سمجھتی کیوں نہیں؟“ منصور نے فلمی مکالمے کی نقل اتاری۔
منسربگ کھکھلا کر ہنسیں۔ اسی انداز میں ایک اور پامال فلمی ڈائیلاگ دہرایا۔
”اچھا بیٹا جا۔ اجلدی سے ہاتھ منہ دھولے۔ میں تیرے لئے چاولاتی ہوں۔“

ان دونوں میں کتنا زبردست RAPPORT قائم ہو گیا ہے۔ لوگ جبریلین گیب کی بات کرتے ہیں! عنبر نے کیک کا ڈبہ ماں کے ہاتھ سے لیکر میز پر رکھا۔
بہادر ٹرے لے کر حاضر ہوا۔

”منصور تم کافی اینٹی مسلم بھی ہو۔“ عنبر نے کافی بناتے ہوئے اظہار خیال کیا۔
”میں نے اب تک جو کچھ کہا اسمیں کوئی پوائنٹ غلط ثابت کرو۔ کرو غلط ثابت اتہی بات کہتا ہوں۔ سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے۔ کیا تم خود ہی پرسوں نہیں کہہ رہی تھیں شیعہ سنی فسادوں میں دونوں فریق ہندو منسٹروں کے پاس ایک دوسرے کی شکایتیں لیکر جاتے ہیں ان سے فیصلے کی درخواست کرتے ہیں۔ کتنی شرمناک صورت حال ہے۔ بنارس میں شیعہ فریق دوسنی قبروں کا معاملہ سپریم کورٹ تک لے گئے ہیں قبریں اس جگہ سے اکھیڑنے کا مطالبہ۔“

”جعلی ہیں وہ قبریں۔“

”اگر مزار اکھیڑنے کی قانونی مثال قائم ہوگی تو بھیا تک ممکنات کا ابھی سے اندازہ کر لو۔
پھر شکایت نہ کرنا۔“

”دس از ڈریڈفل۔ ویسٹرن آدمی چاند پر پہنچ گیا یہاں مبریں۔“

عنذلیب بیگ نے مایوسی سے ہاتھ پھیلائے۔

منصور بہت مضطرب انداز میں پیالی آئینڈان پر رکھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

افسوس کہ عنبر FUNDAMENTALIST نکل گئی۔

اور ایسی فری تھنکر ماں کی بیٹی۔

وہ کمرے کے اشیائے آرائش پر بے دھیانی سے نگاہ دوڑاتا رہا۔ ایسی

چیزیں جو عموماً ماہر ولایت پلٹ کے کھر میں موجود ہوتی ہیں ایفل ٹاور وغیرہ۔ ایک کونے میں دھری ایک گول پٹاری نے منوجہ کیا۔ وہ قریب جا کر اسے غور سے دیکھنے لگا پچھلے چند ماہ میں وہ کئی بار یہاں آچکا تھا لیکن لاکھ سے رنگی وضع قدیم کی اس پھولدار پٹاری کو نوٹس نہیں کیا جو ایک کشمیری اسکرین کی اوٹ میں رکھی ہوئی تھی۔

”دلی میں —“ اس نے آہستہ سے کہا — ”میری دادی اماں کے پاس اسی طرح کا ایک پٹارا موجود تھا — جامہ دانی۔ جانشین پر رکھی رہتی تھی۔ یہ پٹاری آپنے نجاس سے خریدی ہوگی؟ یا شیش محل — میر عبد اللہ۔“

”نہ نجاس نہ میر عبد اللہ۔“

”اس پر یاد آیا — امراؤ جان میں میر عبد اللہ کو دیکھا؟ ایک سین میں باقاعدہ نیلا جو عہ پہنے —“ منصور نے پھر پٹری بدلی۔

”یہ پٹاری بھی ANTIQUE ہے تو سال سے زیادہ پرانی —“ عندلیب بانواٹھ کر کشمیری اسکرین کے پاس آئیں۔ شکستہ پٹاری لاکر دیوان پر رکھی۔ گنبد نما دھکن احتیاط سے کھول کر کپڑے کی چند گڑیاں نکالیں۔

”یہ بھی تو سال قبل بنائی گئی تھیں۔ یہ ان گڑیوں کی پٹاری ہے۔“

”نو کیڈنگ —“؟“ منصور نے بڑے اشتیاق سے ایک گڑیا اٹھائی۔ شکر پارے کی آنکھیں۔ ناخنوں اور ہتھیلیوں پر سُرخ تول کی کتریں۔ کالے دھاگے سے بنی لانی چوٹی گوٹے کا موباف۔ پوتھ کا چھوٹی گوٹ کا دلی والا گزارہ۔ ریشمی شلوکہ اور دو بیٹہ۔ زری کی جوتی۔ ناک میں چاندی کا بلاق۔ گلے میں پوتھ۔ کلاسیوں میں موٹی کی چوڑیاں۔ اسے رکھ کر لوکیلی مونچھ چو گوشہ ٹوپی اور گلدک کے پٹنے والا ایک گڈا اٹھایا۔ عبرتاً تانہ انداز سے بولی —

”SEE THIS IS WHAT CIVILISATION IS ALL ABOUT.“

یہ میری گرنی کی پٹاری ہے۔ میری گریٹ گرنیڈمدر نے یہ گڑیاں میری GRANNY کے لئے بنائی تھیں۔“

سنوار کر عندلیب بانو نے انکو دیوان پر ایک قطار میں بٹھال دیا۔ اور پٹاری میں ہاتھ ڈال کر ایک برقعہ نکالا۔ چھوٹا سا سوتی مثل کاک برقعہ۔ بوسیدہ — ”میری والدہ مرحومہ کا برقعہ۔ اس زمانے میں نو دس سال کی لڑکی پردہ نشین ہو جاتی تھی۔“
 - نہایت احتیاط سے اسے جھاڑا۔ تخت پر بچھا کر اسکی ٹکنیں درست کیں۔
 پلکیں ساری کے کونے سے چھوئیں گویا آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے اسنے نکال رہی ہیں۔

برقعہ لپیٹ کر واپس رکھا اور ایک خالی عطر دان پٹاری سے برآمد کیا۔
 ”میرے گریٹ گریٹ فادر نے یہ عطر خود کشید کیا تھا۔“ عنبر نے ایک خالی شیشی پیش کی۔ عطر کب کا اڑ چکا تھا۔

”بہت ہی بڑھیا۔“ منصور کی سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہے۔ تو بوس پرانے دیسی عطر کی خالی شیشی کی اسے پہچان نہ تھی۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ بالکل اتفاقیہ اور نادانستہ وہ ان ماں بیٹیوں کی نجی زندگیوں کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اجنبیوں کا اپنی زندگی میں اس طرح جھانکنا انکو پسند نہ آئیگا۔ کسی کو پسند نہیں آسکتا۔ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا اور قالین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب لگے ہاتھوں گومتی کی جل بہا رہی دیکھ لو۔“ اڈنبرا میں وقت گزاری کے لئے ایک آرٹ اسکول جو این کر لیا تھا۔ عنبر میڈیکل کالج میں AMBER کہلاتی تھی میں آرٹ اسکول میں ANDY، المالاحاب تھا۔ بیٹی اتنی کٹھن پڑھائی میں مصروف۔ والدہ شوق فضول میں مگن۔ ایک تجرباتی تھیٹر میں بھی کام کیا۔ اس زمانے میں لالیغیت کے تھیٹر کا بڑا زور تھا۔ پھر لوگ اس سے بھی بور ہو گئے۔“

ڈیم سبل تھورن ڈائیک کے سے وقار کے ساتھ اطاف گلشن سے گذرتی، دو میٹرھیال
 اتر کر وہ اپنے مہمان کو ایک نیم تاریک کمرے میں لگتیں۔ اتنے روشن اور پر فضا خالص

انگلش اسٹائل گارڈن روم کو انہوں نے اپنا اسٹوڈیو کیوں نہ بنایا۔ منصور نے اچھی سے سوچا، اور تصویر خانے کے دریچے داکے۔ یہیں سے جھانکتی وہ اس شام گلوریا سوان سن معلوم ہوئی تھیں۔

منزبگ نے ایزل پر سے پردہ سرکایا: ”لو بھئی۔ جل بہار چھتر منزل کے سامنے شاہی کے بجرے“

پچھلے سے عنبر کی آواز آئی: ”منصور یہ قالین دیکھو میں بے طہران میں خریدتا تھا“ وہ دیوار پر آویزاں کاشانی قالین کی طرف مڑا۔ بغیر آئینوں کے شلو کے اور گھردار شلو اردوں میں ملبوس سردوں پر رومال باندھے تین فریبہ ایرانی عورتیں گادنگیوں کے سہانے بیٹھی قلیان، سگریٹ اور شربت سے شغل کر رہی تھیں۔ پس منظر میں گنبد اور محرابیں۔

”غالباً حرم سرا“ عنبر نے کہا۔ ”یہ والا مرا کو۔“

مراقبتی قالین پر ایک عرب شہسوار ایک حسینہ کو سامنے بٹھائے اڑا جا رہا تھا۔ تعاقب میں غنیم یار قیب۔ اوپر تاروں بھرا آسمان۔ چاند مینار کجھور کے درخت۔

”عورت کے متعلق اقوام مشرق کے رویے ان قالینوں سے عیاں ہیں۔ اب میں انکے سامنے ایک سوویٹ خلا باز لڑکی کی تصویر لگاؤں گی!“ عندلیب بانو نے اعلان کیا۔

”آپکو WOMEN'S LIB کی قیادت کے لیے میدان میں آنا چاہیے!“
 ”میں لیڈر ٹائپ نہیں۔ حالانکہ حالی بیٹھے میرا جی گھبراتا ہے۔ باہر دسیوں مشغلے تھے۔ یہاں تصویریں کہاں تک بناتے جاؤں۔ پھر انکا کیا کروں“
 ”نمائش۔“

”نمائش۔؟“

”جی۔ قاعدہ ہے کہ مصور تصویریں بنانا ہے پھر انکی نمائش کرتا ہے۔“

”میں بہت بے قاعدہ مصوٰر ہوں“
 ”آپکی تخلیقات؟“ منصور نے ذرا خائف ہو کر چند CERAMICS کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اطاعتی پذیرائی میں واپس آئے۔
 ”لیڈیا میں —“ عندلیب بیگ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولیں: ”میں نے چند ایک
 سر بھی بنائے تھے: تانے میں دکھلاؤں؟“
 ”اُئی پھر کہیں۔“

آرٹسٹ اپنے بارے میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن عنبر منصور کو اپنی طرف
 متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ مسز بیگ سے گفتگو میں لگا رہا۔

یہ دونوں میرے خلاف GANG UP کر رہے ہیں اس نے چوڑکرا کر ایک رسالہ اٹھایا۔

”ادرجو وہ تو سال سے مسلمان بچیاں گڑیاں کھیل رہی ہیں۔ اے بیٹا وہ بھی تو پتلے
 پتلیاں ہوئیں۔ بس یہی تو کہتی ہوں۔ NO LOGIC — کیا تم بوری ہو رہے ہو؟“
 ”ہمیں تو نمیم۔“

”جب سے لکھنؤ آئی ہوں۔ گوشہ نشین تبارک الدنیا۔ اس دریچے میں کھڑے ہو کر
 دن میں پرندہ شناسی۔ رات کو آخر شماری۔ A LONELY OLD WOMAN تم ایک
 ہنجیال مل گئے تو اتنی باتیں کر ڈالیں۔“

”اُئی آپ کو گوشہ نشینی پہ کس نے مجبور کیا ہے؟ اللت کلا اکیڈمی والے لال بارہ درسی
 میں آپکی نمائش کرنا چاہتے تھے آپ نے انکار کیا۔ وہ کون بھاٹیہ اُئی۔ آپ نے
 اسے بھگا دیا۔“

”کرن بھائیہ کون؟“ منصور نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”عینر کی ایک مینٹنٹ ہے۔ بمبئی کے ایک زمانہ انگریزی دیکھی کی کورسپونڈنٹ
 ایک روز میری تصویریں دیکھ کر بولی۔ میرا انٹرویو کر کے ایک تصویریں فچر چھاپے گی اس
 رسالے میں دراصل اس پر اس چیز کا بہت رعب پڑا کہ میں نے پندرہ سال ولایت میں
 رہ کر تصویریں بنائیں۔ مضمون لکھ کر لائی۔ وہ شروع اس طرح ہوتا تھا۔ شرمیلی
 عندلیب بیگ جنکی تصاویر کی نمائش اڈنبرا، لندن، پیرس اور برسلز میں ہو چکی ہے۔
 ”بیٹا۔ میں نے یہ تم سے کب کہا تھا میری تصویروں کی نمائش آج تک کہیں نہیں ہوئی۔
 میں محض سنڈے پینٹر ہوں۔ بولی چھوڑیں انسٹی جی۔ فرک کیا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں
 پر رعب پڑ جائیگا۔ کون لندن پیرس پوچھنا چھ کرنے جا رہا ہے۔ میں نے کہا میں اس غلط
 بیانی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ وہ چھوڑی اڑی رہی۔ مجھے غصہ آ گیا اسکا مضمون بھٹاڑ
 کے پھینک دیا۔“

گیلری میں فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ عینر نے جا کر بات کی۔ منہ پھلائے لوتی۔
 ”پھر شہوار خانم! مارے شان کے خود بات نہیں کرتیں۔ پہلے انکی آیا سنی کوالاٹ
 کرتی ہے۔ پھر خود تشریف لاتی ہیں۔ پوچھ رہی ہیں تم یہاں آگے ہو یا نہیں۔ کیا
 جواب دوں؟“

”ٹھہرو۔ میں نپٹتا ہوں۔“

چند منٹ بعد وہ واپس آیا۔

”کیا ہوا؟ نگار خانم پھر علیل ہیں؟“

”نہیں بھئی۔ کل شہوار کہہ رہی تھی THE MESSAGE کا کیسیٹ منگوا یا ہے۔“

”دہ آگیا۔ اب کل دل جا کر دیکھ لوں گا۔ یوں تو پچھو دیکھنے کو ملے گی نہیں۔“

”کیوں؟“ مسز بیگ نے سوال کیا۔

”مسلمانوں نے اسے انڈیا میں BAN جو کر دیا ہے۔“

”اے بیٹا میں تو اسے دیکھ چکی ہوں بن غازی میں۔ ہمیں BAN کروانے کی کیا بات تھی پہلی مرتبہ طلوع اسلام پر فلم بنی۔ ساری دنیا کو دکھانے کے لیے۔ اور اتنی لاجواب — سچ ہے۔ سر سید احمد خان نے تو سو سال پہلے کہا تھا کہ مسلمان عقل کے دشمن ہیں۔ منصور بیٹے اسے دیکھ کر تو انگلیں ٹپیں بہت سے انگریزوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور سنو تو۔ ایک پکے مسلمان ڈائریکٹر نے اسے بنا یا۔ نہ ہمیں تمہارے پروفٹ دکھلائے گئے۔ نہ انکے چاروں کیلٹ۔ آوازنگ کی نمائندگی تو کی نہیں گئی پروفٹ محمد کی۔ علمائے ازہر نے اس فلم کی تعریفیں —“

”کی ہونگی یہاں تو اس پچر کو دیکھے بغیر اردو اخباروں نے اسکے خلاف جو شیٹلے اڈیٹوریل لکھے۔ نمائش سے پہلے ہی BAN کروا دیا۔ اب ہم کس کس بات کے دسے روئیں؟ منصور نے جواب دیا۔

”حضرت ابوطالبؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت بلالؓ کو تو دکھلایا ہے — ”عجز نے اعتراف کیا۔“ اور جتنی تو دکھلاتی ہے فلم میں۔ آنحضرتؐ کی“

”اوٹنی؟ مسلمان مصوروں نے تو براق کی ان گنت تصویریں بنا ڈالیں۔“
عندلیب بانو فوراً اٹھ کر اسٹوڈیو میں گئیں وہاں چند منٹ کھٹ پڑ گیا گئیں۔
اسلامک آرٹ پر دو ضخیم کتابیں اٹھائے واپس آئیں۔
طویل سنہری زنجیر والی عینک ناک پر جوائی۔ ورق گردانی شروع کی۔
”چھوڑیے ائی۔ منصور میوزک سننا چاہتا ہے۔“

”قصص الانبیاء، معراج نامہ، سب میں آدمؑ تا محمدؐ پہنچنے والوں کی باضابطہ صورت گری موجود بغداد اسکول — یہ دیکھو اور دیکھو — خمسہ نظامی — اور یہ رسول اللہؐ براق پر سوار — جنت کا منظر جبریلؑ شتر سوار جوڑیں — ”جوش کے ساتھ دوسرا ورق — ”یہ — شاہرخ مرزا کی فرمائش پر معراج نامہ مصور۔ یہ نوائی کی الجواہر میں رسول اللہ صحابہ اور حضرت بلالؓ۔“

” اور یہ لو — رشید الدین کی جامع التواریخ — انبیاء اور رسول اللہ کے آٹھ پورٹریٹ مع حضرت ابو بکرؓ — سلطان مراد دوم کا زبدۃ التواریخ — اور سلسلہ نامہ — سولہویں صدی — میوزیم آف ٹرکش آرٹ — استانبول۔ صفویہ ایران میں اس قسم کی تصویریں بنائی گئیں تو تعجب نہیں — ایران میں آج بھی گھر گھر رسول خدا اور حضرت علیؑ کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مگر عثمانیوں کا ترکی نقاب پوشی کی روایت ترک مصوروں نے شروع کی۔ سلطان اہمداؤل کا دور۔ ثالثاً نامہ۔ مصور قلندر چھتیس تصاویر یہ دیکھو۔ رسول خدا اور حضرت خدیجہؓ کی پہلی ملاقات۔ درمیان میں حضرت جبریلؑ۔ مسز بیگ نے ٹرکش آرٹ کی ایک اور ضخیم کتاب نکھولی — ”چودھویں صدی کے ایک نابینا ترک کی حیات نبویؐ — سلطان مراد سوم کے حکم سے مصور کی گئی۔ سنی اسلام کے روحانی پیشوا خلیفۃ المسلمین کے حکم سے۔“

”یعنی علمائے دین اس تصویر کشی کے مخالف نہ تھے۔“ منصور نے کہا۔

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سیر النبیؐ کو ہر عثمانی سلطان کے عہد میں السطریٹ کیا گیا — مراد سوم والی کتاب میں آٹھ سو چودہ تصویریں ہیں — عمل احمد نور بن مصطفیٰ — چھ جلدوں میں — اب تم کو احمد نور کے دو سید خولصورت MINIATURES دکھلائی ہوں — ’آغازتوت‘ — یہ دیکھو — پرورقٹ اف اسلام۔ دائیں طرف بی بی خدیجہؓ — بائیں طرف زوہر علیؓ۔“

”حضرت علیؑ کے روئے مبارک پر نقاب نہیں ہے۔“ منصور نے ریمارک کیا۔
 ”ان تصویروں کے ڈیکور اور رنگوں کی اپنی سبیلزم ہے۔ یہ تینوں ہاتھ باندھے ایک صف میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیونکہ خدیجہؓ اور علیؑ اولین ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کا نیلا لباس پاکیزگی کی علامت —
 ”لباس تینوں کے ترکی حضرت علیؑ کا لبادہ سبز۔“

”لکھتے ہیں سبز رنگ اس چیز کا مظہر ہے کہ علیؑ بڑے ہو کے قرآن شریف کی MYSTICAL تفسیر کرنے والے ہیں۔ دلیچے کے باہر سنہرے آسمان کے نیچے اڑو کے

گلابی شگونے عشق الہی کے آغاز کا سہیل۔ بادام کی سفید کلیاں حکمتِ قرآن کے KERNEL بہت باریک نکتہ ہے۔۔۔۔۔“ منصور نے کہا۔

”جنت سے آئی ہوئی ندی باہر باغ سے گذر رہی ہے۔ گویا رحمتِ خداوندی۔۔۔۔۔ دیوار پہ نلوار کا نشان انسان کے دل کو اپنی محبت سے گھائل کرنے والی سیف اللہ۔“

”سبحان اللہ!“

”گلابی قالین اور کاسنی دیوار پر ستاروں کے PATTERN مومنوں کی روحیں!۔۔۔۔۔ لکھا ہے قرآن میں معرفت الہی کو روشن ستارے سے نشیبہ دی گئی ہے۔

”اب ایک اداس منظر اور اسکی سہیلزم۔۔۔۔۔ رسولِ خدا کی وفات۔

”سربانے نقاب پوش فاطمہ۔۔۔۔۔ سر پر شعلہ نور۔۔۔۔۔ سرخ پوشاک انکے خونبار دل کی ترجمان۔۔۔۔۔ آنکھوں پر رومال رکھے علی گریہ فرما رہے ہیں۔ حسن حسین دوزا فوٹیٹھے رو رہے ہیں۔۔۔۔۔ درو دیوار پر پر بنے آڑے ترچھے غیر واضح خطوط ماحول کے الم اور دلوں صدمے کے گہرے اثر کی علامت“

”گویا الیکٹریک ڈیوگرام کی لکیریں۔۔۔۔۔ کمال ہے۔“ منصور نے متحیر آواز میں کہا۔

”کمرے کے باہر دھندلا آسمان۔۔۔۔۔ دیپچے کے شیشوں پر بارش کی بوندیں آنسوؤں کی طرح بہ رہی ہیں۔۔۔۔۔“ مسربگ نے کتاب بند کی۔ ”سعدی اور جامی وغیرہ کو اسٹریٹ کرنے کے لئے بھی بے شمار انبیاء کی تصویریں بنائی گئیں۔ ترک، ایرانی اور مغز مصوروں نے مشہور صوفیاء کے پورٹریٹ۔۔۔۔۔“

”امی اب مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟“ عنبریں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مذہبی مصوری اسلامک آرٹ کی غالب روایت نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اسکے خلاف ہے۔ تو بس ختم ہوتی بات۔ چھوڑیے اس قصے کو۔ مسلمان بت شکنی کے لئے بدنام، مگر ایک بار آپ نے خود ہی بتلایا تھا کہ شروع کے عیسائیوں نے بت شکنی کے جوش میسر

یونان دروم کے بہترین محسّے توڑ ڈالے۔ باز نطیم کے پادریوں نے بہت لڑائی جھگڑے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان پڑھ عوام کو جیزس کے متعلق سمجھانے کے لئے تصویریں بنائیں جائیں۔ مسلمان علماء نے اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ چلیے اب کھانا کھائیں۔“

آماں PAGAN - بیٹی مولون -

ڈنر کے بعد ڈرائنگ روم میں واپس آ کر اپنے خود کی تلاش میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ”وہ رہا۔ یوحین کی تحویل میں، مسز بیگ نے بتایا۔
عبر نے بگ شیلف پر رکھے پورٹریٹ کے نزدیک سے سہلیٹ اٹھائی۔
”میری ایک سہلی تھی، مسز بیگ قریب آ کر بولیں۔
منصور نے نقرنی فریم والے دستخط شدہ پورٹریٹ پر نظر ڈالی۔“

EUGENE PETERSON, CALCUTTA, 14-9-1928

اطلسی ایوننگ گاؤن - نازک صراحی دار گردن میں موتیوں کی طویل دھڑکی مالا۔ تیز روشنی میں چمکتے مصنوعی لہروں والے بال۔ باریک پنپل سے بنائی ہوئی بھنویں۔
”ہولی ڈو ڈو؟“

”ٹوٹی ڈوڈ! یعنی ٹالی گنج۔ کلکتہ!! سفید روسی۔ فلمی نام اندر آدیوی۔ بے چاری
خود کو کسی روسی گرینڈ ڈیوک کی اولاد بتاتی تھی۔“

”ANASTASIA SYNDROME.“

”پر سھوسی راج اس کے ہیر و سہوا کرتے تھے؟“

”پر تھوسی راج۔ ہ راج کپور کے باپ؟“

”بالکل وہی۔“

”آپ تو پٹاری سے ایک سے ایک عجائب و غرائب نکال رہی ہیں۔ اور نہایت۔“

’بس۔ اتنا آج بھر کے لیے کافی ہے۔“

” منگ پلٹے؟ منصور نے ٹھٹھک کر ایک تاب کی طرف اشارہ کیا۔
” ہاں لیکن نقلی۔“

خود پہن کر منصور اب ایک منگل کیمپو دیکھنے لگا جو چین پیٹرن کی تصویر اور منگ پلٹے کے درمیان ایک نقلی یونانی مورتی کے سہارے رکھا تھا۔ عندلیب بانو نے بہاد کو پکارا۔ وہ اندر آ کر کافی کے برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔
”یہ تو اورینٹل معلوم ہوتا ہے۔“ منصور نے کیمپو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل اصلی۔“

”امی نے آج اس گھر کو پورا کنڈکٹڈ ٹور کر دیا۔“

”بس ہو شیم کا گھر ہے مگر اسکی گھڑیاں ابھی بند نہیں ہوئیں، مسز سگ بولیں۔“
”اسے اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں؟“

”ضرور۔“

عاج کی بیضوی سطح پر منقش کسی گننام تیموریہ شہزادی کا مینا تور۔ منصور نے احتیاط

سے اٹھایا۔

”اسے دیکھ کر تو وہ کسٹن گڈھ کی بنی ٹھنی یاد آتی ہے۔“

”آپ آرٹ کرٹیک بھی ہیں؟“ عنبریں نے رواں تبصرہ کیا۔

”ہماری صحبت میں رہیے گا ہمارے فضائل کا آپ کو علم ہوگا۔ لیکن مسز سگ ہمیں واقعی راجستھانی اسکول کا سائچ ہے۔“

”شاید کسی جے پوری مصور نے بنائی ہو۔“

”واہ واہ۔ سیاہ کاکلیں۔ آپ رواں کا دوپٹہ۔ جانے کیا کیا زیور۔ آپ کو

ان کہنوں کے نام معلوم ہیں؟ بیٹھی قلیان نوش کر رہی ہیں۔ واہ صاحب۔ بڑا نقشے باز نقاش تھا۔ بہت خوب اس قسم کے نوادر کی نقلیں آجکل فائبر اسٹار ہٹوں کے آرکیٹرز میں

بھاری قیمتوں پر بکتی ہیں۔ یہ تو اصلی ہے سید بیش قیمت ہوگی۔“
 ”بڑی قیمتی تصویر ہے بیٹے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بہادر یہ ڈبہ لیتے جاؤ۔ کاغذ سمیٹو۔“
 بہادر کیک کا خالی ڈبہ اور برتنوں کی کشتی اٹھا کر باہر چلا گیا۔

”کہاں سے خریدی —؟“

پردوں کی ڈوریاں کھینچتے ہوئے عندلیب بیگ نے سادگی سے جواب دیا: ”یہ میری والدہ مرحومہ کی تصویر ہے۔“

منصور چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر ان بزرگ خاتون کو دیکھا جو دریچے کے پردے برابر کرنے کے بعد اب دیوان کے کٹن درست کر رہی تھیں۔ عینبر کانی ٹیبل پر بگھری اسلامک آرٹ کی کتابیں ترتیب سے رکھنے میں مشغول تھی۔ ایک لحظے کے لئے منصور کو یہ منظر ایک تابو سا لگا۔ تو یہ دونوں شہزادیاں تھیں۔

اسے وہ بیگم صاحبہ یاد آئیں جنکو پنڈت نہرو نے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے وی۔ آئی۔ پی۔ روم میں قیام کی اجازت دے دی تھی وہ تب سے اپنی اولاد، عملے اور ساز و سامان کے ساتھ وہیں مقیم دوسرے مدعیان وراثت اور حکومت ہند سے مقدمہ لڑ رہی تھیں کہ خود کو واجد علی شاہ کی پڑپوتی بتاتی تھیں۔ امریکن اخباروں میں انکے انٹرویو چھپتے تھے۔

لیکن عندلیب بیگم کن غیر مرئی طاقتوں سے اپنا مقدمہ لڑ رہی ہیں؟ دفعتاً وہ روکی گرنیڈ ڈیوک کی اولاد یوحین پیٹر سن عرف اندرا دیوی کے مانند نہایت پراسرار نظر آئیں۔

اس روز بلی گارڈ میں ان غربت زدہ و شیعہ دار نے غیرت کے مارے اپنا نام نشان بتانے سے احتراز کیا تھا۔ یہ ماں بیٹیاں دولت مند تھیں لیکن انہوں نے بھی آج تک اپنے رائے لکشن وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ صاحبزادی شہوار کے برعکس جو اٹھتے بیٹھتے اپنی سابق جاگیکے افانے — اس نے کمیوکی لپٹ پر لکھا نام پڑھا — نواب بیگم۔

یعنی نواب گلرخ بانو بیگم۔

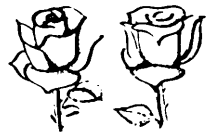
وہ دل میں مزید خائف اور نادام ہوا۔ اس شام جب مسز بیگ نے اپنی والدہ کا نام گلرخ بانو بیگم بتایا اس نے مذاقاً کہا تھا — ”گو یا گلابدن بیگم کا ہمایوں نامہ کھل گیا۔“
 بدیمیزی کی بات۔ مہذب ہیں۔ خاموش رہیں۔ میسر می چو بھی ملاقات میں انکے ساتھ یہ بے تکلفی! میں ایک ایل۔ ایم۔ سی۔ مولوسی کا بیٹا۔ یہ قدیم ارسلو کریٹ — ایسوجہ سے
 عنبر اتنی بڑی SNOB ہے۔ وہ بھی اس روز والے گننام نواب صاحب کی گمشدہ دنیا سے
 تعلق رکھتی ہے۔ —

منصور نے کیمیکو کو منگ تاقاب کے نزدیک احتیاط سے واپس رکھا اور دونوں ہاتھوں
 سے اپنا خود سر پر جمایا۔ ماں بیٹیوں کو گڈ ٹاپ رکھ کر صدر دروازے کی طرف جاتے ہوئے
 ایک بار پھر مغل کیمپو پر نظر ڈالی — نواب بیگم صاحبہ بک شیلٹ پر اپنی جگہ متمکن تھیں۔ ملکہ
 حضرت محل کی طرح — پچوان کی مہنٹل نراکت سے سنبھالے۔
 یہ فلک کی حقہ بازی۔

نازنین کچ کلاہ کی شیبہ کو پھر غور سے دیکھا۔ اور چونکا۔ کشتی نما کپ جو دوپلے سے
 چلی تو لکھنو پہنچ کر — اسے سلی کار دالی گفتگو یاد آئی اور وہ بہت حیران ہوا۔
 کہ خیاط فلک کس کی ٹوپی کس کے سر پر رکھتا جاتا ہے۔ سی و دوپلے۔



www.urduchannel.in





سرائے طغرل بیگ

دنوازیبگیم و ماہر دیا تو بیگیم دختران مرزا عثمان - نریگی قلعہ مخفی - حضرت شاہجہاں آباد۔

سرائے طغرل بیگ میں مشعلوں کا دھواں اور بارود کا دھواں۔ بھٹیاروں اور بار برداری کے جانوروں کی دہشت زدہ چیخیں۔ ایک زخمی لنگڑا کتا اپنے مردہ آقا کے پاس بیٹھا پنچوں سے زمین کُرید رہا ہے۔ شاید قبر ہونا چاہتا ہے۔ دالان کے ایک گوشے میں ایک دوسرے سے بندھے مردہ مولوی مجاہدین۔ سرائے کے پچھوڑے بنے کے گھونسلوں کی طرح درختوں سے لٹکتے مزید مقتول مجاہدین۔ رات جب بھگڑ چلا وہ لاشیں گول گول گھومنے لگیں۔ تلنگوں کی کمپن ان کو بتیال سمجھ کر بہت ڈری۔ اندر سرائے میں سرشام بھیروناچ گیا۔ پھر وہ اپنے میل پر بیٹھ کر دوسرے شمشاؤں کی سمت نکل گیا۔ جن کے مردوں کی راکھ اپنے انگ پر مل کر سما دھی لگائے گا۔ زبیر لگاؤ تو تُو۔ لاش۔ زبیر لگاؤ تو تُو۔ ابدی مسرت۔

دین! دین! چلا کر لڑنے والوں کو گورے خاکیتوں نے جام شہادت پلایا۔ اب وہ گورے کسی MESS کی بار پر بیٹھے وکٹوریہ کا جام صحت نوش کر رہے ہیں جو اب کوئین ایپریس اف انڈیا ہے ہون سن شہزادوں کے بریدہ سر حضرت بادشاہ کو پیش کر چکا۔ سرائے طغرل بیگ میں صرف چند جاندار باقی ہیں۔ ایک وہ گھائل کتا جو مسلسل رو رہا ہے۔ ایک زخمی بھشتی جو کٹوڑا لیے کھسک کھسک کر نیم جاں مولویوں کو پانی پلا رہا تھا۔ (چند منٹ قبل وہ بھی مر گیا) او ایک سردنور میں چھپی دو بچیاں۔ تنور کے گرد ان کا کنبہ لاشوں کی صورت میں موجود ہے۔ ماں باپ جوان بھائی بچھا۔ ماموں۔ سب۔

وہ خانم کے بازار سے نکل کر آگرے کی طرف بھاگ رہے تھے سرائے طغرل بیگ میں تنگنوں اور خاکبوں نے آلیا جنگل میں چھپے مجاہدوں نے چار پانچ لال منہ والے ٹھنڈے کیے گوروں نے سب کو بھون ڈالا۔ دو پچیاں اس سرد تنور کے اندر چھپ گئی تھیں۔ وہ بلک بلک کر روتی، ماں باپ اور بھائیوں کے لاشے بھانک کر دکھتیں اور پھر چین مار کر سر اندر کر لیتیں۔ اونٹ بیل خچر سرائے سے بھاگ نکلے تھے۔ ایک روز ناہوا لنگڑا کتابا بی تھا اور دو لڑکیاں۔ حسین گوری جٹی مغل زادیاں۔

روتے روتے ہلکان ہو گئیں۔ بھوک سنانے لگی۔ بڑی نے چھوٹی سے کہا —
”چھوٹو۔ میں کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈتی ہوں تنور سے اچکل۔ چاروں طرف مڑ دے۔ ہیبت زدہ ہو کر پھر سر بھیا لیا۔ چند منٹ بعد ہمت کر کے باہر کودی۔ سلاطینوں کا زار دراہ تنگے لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ بھٹیاریں غائب۔ شاید ڈاکو بنیں بن کر سامنے پیپلوں پر جا بیٹھیں۔ چولہے سرد۔ پونم کا چاند بھانسیوں والے درخت کے عین اوپر نوحست سے چمک رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتا سناٹا۔

اچانک سیلوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹناہٹ۔ باہر ایک رتھ آ کر رکا۔ زنانہ سنسی کی آواز جو اس ہولناک رات میں کسی چڑیل کا تہقہہ معلوم ہوئی۔ پھانگ جھلک کی وجہ سے آپسے آپ بند ہو گیا تھا۔ درز میں سے ہری کین لالینوں کی روشنی اندرائی۔ عورت پھر سنسی۔ بڑی لڑکی کی ذرا ہمت بندھی۔ ”چل مہر۔ چل کر دکھیں۔“ چھ سالہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنور سے باہر کھینچا۔ گود میں اٹھا کر لاشیں پھلانگتی پھانگ کی طرف چلی۔ کواڑ ڈرا سا کھول کر دکھا ایک گوری دہی عورت نظر آئی۔ کشمیری شال میں لپیٹ۔ رتھ کا پردہ ہٹا کر ایک موٹھیل بلم بردار سے بات کر رہی تھی۔ پیچھے دو بیل گاڑیوں پر پھولداری اور لوگر چاکر۔ دیکھتے دیکھتے بیرونی چبوترے پر جھاڑو دی گئی۔ دسترخوان بچھا۔ کٹن چنے گئے۔ سنا ہے جس طرح حضرات میں نظر آتا ہے — پہلے بھشتی چھڑکاؤ کرتا ہے پھر شاہ جنات کا تخت۔ ایک وردی پوش ملازم نے ٹفن باسکٹ کھولی۔ ٹفن کے بند ڈبے۔ ڈبل روٹیاں۔

بوتلیں بھری۔ چھپے۔ ماچس سے انگیٹھی سلگائی گئی۔ جتھے بھرا گیا۔ چاند کی روشنی میں وہ حسینہ
رکتھ سے اتری۔ بھاری پشواز۔ ناک میں بلاق ٹھٹھک ٹھٹھک چلتی، آن کر گدیے پر بیٹھ گئی۔
کھانا شروع کیا۔ پیل کی پل میں بھیروکا شمشان اندر کے اکھاڑے میں تبدیل ہوا۔ نوعمر لڑکی
بچی کو گود میں اٹھائے پھانک سے نکل کر ڈرمی ڈرمی چوتھرے کے نیچے پہنچی۔ اوپر دیکھا۔ اور
التجاکئی —

”اللہ کے واسطے کچھ ہمیں بھی دو۔ بڑی بھوک لگی ہے“

حسینہ نے ایک فرنگی ڈبہ اس کی طرف بھینک دیا۔ بھگڈر کا زمانہ۔ ہر طرف بھکاریوں
اور بھوکوں ننگوں کی مہبت تھی۔

”اس میں کیا ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”کھالے خنزیر نہیں ہے۔ ہم بھی مسلمان لوگ ہیں“ ایک سُرخ مونچھ والے آدمی
نے جواب دیا۔ اور غور سے لڑکی پر نظر ڈالی۔ ”اوپر آجا۔ تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ تیرے ساتھ
والے کہاں ہیں؟“

”اندر سرائے میں“

”یہ سرائے ہے یا بھوتوں کا ڈیرا۔ سناٹا پڑا ہے“

”سب سنا جو رہے ہیں۔ گھوڑے بیچ کر“ لڑکی نے سراٹھا کر جواب دیا۔ رکتھ پر لہرائے
فرنگی سیرق پر ننگا پڑی۔ سُن سی رہ گئی۔ چند گھنٹے قبل بالکل ایسا جھنڈا سنبھالے گوروں نے
دھاوا بولا تھا۔ وہ بچی کو اٹھائے اٹھائے پھر پھانک کی طرف مڑی۔ بچی نے فرنگی ڈبہ مضبوطی
سے پکڑ رکھا تھا۔ ”آپا۔ آپا۔“ بھوک۔ اس نے نحیف آواز میں فریاد کی۔

بڑی بہن نے سُرخ کوٹ اور اونچی سیاہ ٹوپیاں ڈانٹے تلنگوں کو اپنی طرف تانکتے
پایا۔ لڑکھڑا کر بچی سمیت چوتھرے کی سیڑھی پر گر پڑی۔

ایک کالکتا زمین سونگھتا جنگل سے نمودار ہوا۔ گھاس پہ بکھری مٹن چاپ کی ہڈیوں
پر لپکا۔ ایک اردلی نے اسے پتھر مارا۔ وہ چپس چپس کرتا تارکی میں غائب ہو گیا۔

پوربیا رکھبان چو ترے کے کنارے سہما بیٹھا تھا۔ وہ چلا آیا۔ ”دیارے دیا۔ گجب کر
دیہن کھان صاحب۔ کاجا نہیں بھیرو کا کتا ہو۔ اڈکا مار بھگا مین۔“

”ابے تیرے بھیرو جی تو کو کہتا ہے بیل پہ سواری کرتے ہیں۔“ سرخ مونچھوں والا
چچک رو آدمی بولا۔ وہ کتنا لمبا تھا۔ تار کا تار۔

”چودھری۔ امی دوسرے بھیرو ہوں۔ سنکر بھگوان کے سیوک۔ جہاں انیا چار ہوا بتاتے
ہو اپنے کالے کتے پہ سوار ترنت ہواں پہنچ جات ہیں۔“

”ابے گھاٹرانا اتیا چار تو سوچکا اب تک کیوں نہ آتے۔“ طویل القامت چودھری
نے جواب دیا۔

”کو دن پوربیا نہیں تو۔“ مہ جیس بھیرو ہنسی۔

ہری کین لالین مدھم پڑ رہی تھی۔ مشعلیں روشن کی گئیں۔

دیوار کے نیچے ایک بچو نے آنکھیں چمکاتیں۔ لڑکی نے سنبھل کر بچی کو گود سے اتارا۔
اسکے گھٹوں سے لیٹ گئی۔

اب ایک سپاہی حینہ سے مخاطب ہوا۔ ”راستے میں کپتان سنکر کے گوبندے نے
خبر دی تھی کہ طفل بیگ کی سرکا مورچہ حیت لیا۔ سب کا صفایا ہو گیا۔ تو یہ چھو کریاں کیا
آسمان سے ٹیک پڑیں؟“

”چڑیلیں ہیں گی۔“ نندو نے اظہار خیال کیا۔ ”چودھری جی ہاتھ جوڑیں۔ پڑاؤ کرنا ہے
تو چلاو گئے گاؤں۔“

”چپ اتحق بیٹھا پڑتے جا رہا ہے۔ یہاں اب بھی باغی چھپے ہوئے ہیں تجھے چڑیلیں
نظر آرہی ہیں۔“ ایک سپاہی نے بندوق کندھے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ حینہ گھبرا کر
اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو پیادے رفل تان پھانگ کی طرف بڑھے۔ ایک نے ہوا میں فائبر کیا پھوٹا
بچی بہن سے لیٹ کر چینی۔ بڑی کے منل خون نے جوش مارا۔ خنٹناک ہو کر گرجی۔ ”یہ مردوں
کی سرائے ہے مردہ خورو۔ اندر جا کر لاشوں پر گولیاں چلاؤ۔ کتو۔ بیزبند کے بیٹو۔“
سپاہی سرائے کا ایک چکر لگا کر ذرا نادم سے واپس آئے۔ پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ سرخ

مونچھ والا چوتھرے کے کنارے بیٹھا زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کر لالکارا —
 ”عقل کے دشمنو۔ سارے مورچے جیتے گئے۔ دلی فتح ہو چکی۔ اب مردوں سے لڑنے کا کیا فائدہ“
 پھر اس نے جینہ کو ڈانٹا۔ ”ارسی تو کیوں گھبرا گئی۔ منی۔ آرام سے بیٹھ۔ — رب کا
 شکر ادا کر کوئی قافلہ آتے کوئی جاتے تو اپنے لیے مرغ مسلم لکھو اگر لائی ہے۔ ذرا اس لونڈیا کو
 دیکھ۔ جنگل بیابان آدھی رات ہو کا عالم اور یہ مصیبت کی ماری، لاشوں میں گھیری تجھ سے
 دونوں کی بھیک مانگ رہی ہے۔ ساتھ ایک ننھی سی جان — آجا بیٹی — دونوں اوپر
 آجاؤ — شاباش — اس نے ہاتھ کا سہارا دیکر دونوں بہنوں کو چوتھرے پر کھینچ لیا۔ منی
 نے ایک پلیٹ اس کی طرف سرکادی۔ سرخ مونچھ پھر چوتھرے کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور فلسفیانہ
 انداز میں آہستہ آہستہ بولا۔ ”خوب کہا بہت خوب! مردوں کی سراتے — لاشوں کے
 قافلے ایک دروازے سے آتے ہیں۔ دوسرے سے غائب بیچ میں جو ہے سو نظر بندی
 — لیکن بھٹیاریں کو دیکھو! کراتے کے لئے میلوں سے جھگڑتی ہے“ پھر اس نے بڑی
 لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بیٹی۔ ڈرمت۔ جب تلک میں زندہ ہوں تم دونوں کا بال بیکانہیں
 ہونے دو لگا — لو پانی پیو۔“ اس نے فلاسک سے پانی انڈیلا۔ دونوں بہت زدہ
 لڑکیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ مشعلوں کی روشنی میں وہ علاؤ الدین کے
 چراغ سے نمودار ہونے والا جن سالگ رہا تھا۔ سرخ مونچھیں سرخ چہرہ۔ کانوں میں منڈیاں
 کشمشی رنگ کا بڑا سا پگڑ۔ پیازی اور سفید دھاری دار چونہ۔ عمر و عیار کی داستاؤں والا چینی
 تُو رانی جن۔ ناک نقشہ منی نامی اس پر ہی چہرہ جیسا۔ گوجیک نے صورت بگاڑ دی تھی۔ وہ جتنی
 مغرور اور سچ معلوم ہوتی تھی وہ اتنا ہی درد مند اور شفیق۔ عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔ درویشوں
 جیسی —

چھوٹی بچی نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ دونوں بھوک سے نڈھال تھیں۔ لیکن
 بڑی بہن نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ کیا پتہ دقتی یہ پر ہی روج جاتی ہو۔ اور یہ سرخ
 نام شخص جنات۔ لیکن وہ تو بڑی نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ”بسم اللہ کرو بیٹی۔ کھاؤ۔ کیا اتنا پڑی
 یہاں کیسے آتے تم بد بخت لوگ —“

”کل رات شہر سے بھاگے اس سر میں آن کر چھپے تھے مرزا بھوڑے کے ساتھ۔“
 ”مرزا بھوڑے کی کون ہو؟“ چکن روسٹ کی ٹانگ چباتے ہوئے مُٹی نے پوچھا۔
 ”اکا انکے عرض بیگی تھے رانی صاحبہ۔“

’رانی صاحبہ‘ پر ’مُٹی‘ مسکرائی۔ ننھی مہر و بڑی رغبت سے ڈبوں والی فرنگی نعتیں
 چکھنے میں جُٹ چکی تھی۔

دلنواز حیرت سے اس بدرمیں کو دیکھا کی۔ لال جوہلی میں جہاں پناہ ہوئی دیوالی دسہرہ
 رکھنا بندھن مناتے تھے رجا ڈول کی دانیوں کی آرتی کی ٹھالیاں لیے تھم تھم کرتی دیوان خاص
 میں آتی تھیں۔ اس نے تو کینچینوں کو بھی دور سے دیکھ رکھا تھا۔ جب قلعے میں مگرے ہوتے
 تھے اور آکا انکا ذکر کرتے تھے۔ جیسے بوستہ چونے والی۔ مگر اس شاندار حسینہ کو کوئی چونے
 والی کہے گا؟ یہ قوم اجتہ سے بھی نہیں تھیں قطعی رانی تھیں۔ آدھی رات کو لاؤشکر سمیت سفر میں
 بے خطر مصروف۔

ورنہ نُوْر۔ آسمان سے من و سلوے لیے اتر آئیں۔

”کھاؤ نامیری بچی۔“ سترخ مونچھ نے دوبارہ بڑی شفقت سے کہا۔ ”میرا نام
 چودھری فتح محمد ہے۔ یہ میری بہن ہے مُٹی ڈورومت۔“

ایک سیاہ فام تنگ دلنواز کی ڈانٹ سے جلا بھٹنا کھڑا تھا۔ بندوق کی نالی اسکی طرف
 کر کے اسے تنگ کرنے کے لیے بولا۔ ”تھوڑھٹ پٹ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

دلنواز مہر و کے اوپر جھک گئی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی ”میری بہن کو نہ مارنا۔ مجھے
 مار دے۔ چل۔ چلا گولی۔ چلانا بکار۔“ وہ ہیجانی آواز میں رونے چلانے لگی۔
 مہر و نے اسکا ساتھ دیا چودھری نے اُٹھ کر تنگے کا گلا دیا۔ ”بدعاش تیرا کوٹ مارشل نہ
 کر ڈاؤل تو میرا نام بدل دینا۔“

”چھوڑ دیو چودھری۔“ رتھ بان نے التجا کی۔ ”ای کا لاپانی چڑھاتے ہن۔ کپتان رنکر
 کا سموچہ رسالہ ناچت رہا۔ اکی دلی ہو جیت لہن۔ انہیں کے سنگ ای ہو ملڑ چاوت ہے۔“
 دار دلی تنگے کو کپڑ دھکا کر پر سے لگیتے۔ چودھری دسترخوان پر واپس آیا۔

”تو یہ یہ چھو کر یاں تو دباں جان ہو گئیں، مٹی نے منہ بنا کر کہا۔

”چپ رہ مٹی، سن بیٹی۔ کیا نام ہے تیرا۔“

”دنواز بانو بیگم۔“

”ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔ دنواز بیٹی۔ تو سبانی ہے گھرا مت۔ کسی کی مجال نہیں جو تجھے ٹھہری

آنکھ سے دیکھے۔ سن۔ میں چودھری فتنے کہلاتا ہوں۔ چودھری فتح محمد۔ بڑے بڑے بد معاش

مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میری اماں اللہ بچنے چودھراتین کی گدی سنبھال چکا تھیں مٹی میری

ہمیشہ ہے۔ ہم لوگ کرنل ہیٹ کے ساتھ بھرت پور گئے ہوئے تھے۔ کرنل صاحب مٹی پر

بہت مہربان ہیں۔ نہیں سمجھی؟“

”جی نہیں۔“

”سن لڑکی۔ یہ میدانِ حشر ہے۔ سارا ہندوستان میدانِ حشر ہے۔ جہاں سر چھپانے کو

جگہ مل جائے غنیمت جان۔ رب کریم رنگارنگ وسیلوں سے اپنے بندوں کو رزق پہنچاتا ہے

ہمارے لئے بھی وسیلے اس نے مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم راضی برضا ہیں۔ اس زندگی کو چھوڑ

نہیں سکتے۔ کہاں جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دھاڑی اتارا۔ ہم سب کو اپنے اپنے لکھے

پورے کرنے ہیں۔ دانے دانے پر مہر ہے۔“

دنواز کے لئے کچھ نہ پڑا۔

”ہمارا اٹبر رنگی کے زمانے میں کشمیر سے دئی آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ کشت و خون

انوکھی بات نہیں۔ کشمیر میں بھوک بہت تھی اور قتل و خون بھی۔ شاہجہاں آباد پہنچ کر پیٹ

تو بھرے اسے تو اب تک بھوک کیوں بیٹھی ہے؟“

دنواز نے ڈرتے ڈرتے ایک مٹن چاب اٹھائی۔

”آرام سے کھا۔ ابھی فرنگیوں نے تیرے گنبے کو تہ تیغ کیا ابھی تو انکی دی ہوئی رزق۔“

دنواز نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”ہاتھ کھینچنے سے کچھ نہ ہونے کا بچی۔ فرنگی کا بخشا ہوا آب و دانہ اب ہم سب کا مقدر

ہے۔“ چودھری نے ایک لقمہ بنا کر چھوٹی بچی کے منہ میں دیا۔ اس نے جمائی لی پوٹہ تر ہوا تو

مہر و کو فوراً نیندا آگئی۔ چودھری نے بڑے اصرار سے دنواز کو کھانا کھلایا۔ ”اچھا تو نے منوڑی کشمیرن کا نام تو سنا ہوگا۔ کئی سلاطینوں سے منی کی یاد اللہ تھی۔“
 دلی فتح ہو چکی۔ سلاطین بھی ہیبتِ ماضی میں شامل ہوئے۔ اس لفظ پر دنواز پھر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ مرزا بھوڑے، انکا خاندان، اپنا کنبہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اور وہ سب چند قدم کے فاصلے پر اس وحشت سرا میں مرے پڑے تھے اور وہ اسی جگہ بیٹھی ولایتی کھانا اڑا رہی تھی۔ اس نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی۔

جاندار غروب ہو چکا تھا۔ زور سے ہوا چلی۔ پچھلے جنگل میں پیڑوں سے لگتے نیچے چڑھتے گیڈر بولے۔ چند دل چلاتے ہوئے اوپر سے گزرے۔ دونوں بہنیں منوڑی کشمیرن کے نزدیک گدیوں پر غافل سو رہی تھیں۔ صبح سویرے کو آگواہار سے منوڑی کی آنکھ کھلی تو دیکھا روشن آسمان پر گدھ اور چلیں اور کوئے منڈلا رہے ہیں وہل کر اپنے بڑے بھائی کو پکارا۔ چودھری ایک طرف کو بیٹھا وظایف میں مشغول تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے بھی اوپر دیکھا اور فوراً غلے کو آواز دی۔ ”بندوبست۔ ایک دم کو ٹیک مارچ۔“

تندو سبیلوں کو چارہ کھلانے کے بعد اب تو دجینا کر رہا تھا۔ نوکر چاکر اور سپاہی گڑھیا کے کنارے ہواک میں مصروف تھے۔ فوجی حکم سنتے ہی جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگے۔ چودھری فتح محمد نے بہن کے قریب آکر اس کے کان میں کہا۔ ”منی دیکھنا بچیاں نہ جاگ جائیں چیلوں اور گدھوں کو دیکھ کر انکا دم نکل جائے گا۔“ انگلی کے اشارے سے غلے کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ کرنل بیٹریٹ کے کیا ڈنڈے کے ملازم چودھری کو منڈا قار سالدار صاحب پکارا کرتے تھے۔ کہنے والے بوں بھی کہتے تھے کہ چودھری فتح محمد نے اگر دھاڑی کا جنم نہ لیا ہوتا تو یقیناً کوئی بڑا آدمی بنتا۔ سپہ سالار طویایف الملوکی کے زمانے میں کسی ریاست کا بانی یا مدبر وزیر یا صاحبِ علم و فضل۔ لیکن قسمت میں بدلتھا کہ پہلے بہن کے پیچھے بیٹھ کر سازنگی بجائے اور اب چاؤڑی دالیوں کے معاملات کا تصفیہ کیا کرے۔ اکل مال اصغری کی لاڈ لیک کے انگریز افسروں سے راہ درسم رہی تھی۔ بہن منوڑی عرف منی

عرصے سے سفر و حضر میں کرنل جارج ہیرٹ کے ساتھ رہتی تھی اسکے بڑے بھائی کی حیثیت سے چودھری کو کرنل کا تقرب حاصل تھا۔ اس اعلیٰ افسر کا ذاتی اسٹاف اس سے ڈرتا تھا۔ لیکن چودھری بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ خدا ترس اور دلیر — اماں اپنے بیٹے کی شادی دستور کے مطابق برادری کی ایک لڑکی سے کر گئی تھیں۔ وہ نیک بخت اپنی لڑکیوں سمیت طاغون کا شکار ہوئی۔

دعائیں مانگتا کہ پروردگار عالم منوری کو ایک چاندی بیٹی عطا کرے تاکہ اس قدیم ڈیرے دار گھرانے کی نسل معدوم نہ ہو۔ مگر خدا کی مرضی کہ منوری لاؤں ہی رہیں۔ شاید یہ بھی اچھا ہوا۔ کرنل باپ ہونا تو وہ لڑکے کو کر شان بنا کر کلکتے کے یوریشین بینیم خانے میں ڈال دیتا۔ وہ غریب دوسرے دو غلے چھو کروں کے ساتھ فوجی بینڈ بجاتے عمر گزار دیتا۔ لڑکی جان بازار کلکتہ کی یوریشین لال بی بی کہلاتی۔ خود کو میم بھتی ماں اور ماموں کو منہ نہ لگاتی۔

کوئچ کے انتظامات کا جائزہ لیتا چودھری چھو لدا ریوں کی بیل گاڑی کی طرف گیا۔ مینیس گاڑنے اور چولہے کھودنے کے کدال اور پھاوڑ سے نکالے۔ دو آدمیوں کو حکم دیا فوراً سرائے کے عقبی جنگل میں گنج شہیداں تیار کریں۔ ایک لٹھ بند کو نزدیک کے گاؤں دوڑایا کہ چند کلمہ گو مدد کے لئے پکڑ لائے۔ ایک ناشتہ دان بھرا اور بھانگنا سجاوا بہن کے پاس واپس آیا۔ لڑکیاں اب بھی بے مدد سو رہی تھیں آہستہ سے بولا۔ منوؔ تو اللہ کا نام لے کر گھر جا — میں شہیدوں کو دفن کر کے ہی دلی پہنچوں گا — کوئی شکر ممل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ پیدل — اگر زندہ سلامت نہیں پہنچا تو کہا سنا معاف کیجو اور ان دکھیاری بچیوں کا زندگی بھر خیال رکھو — فی امان اللہؔ

منوری کی مدد سے دونوں خوابیدہ لڑکیوں کو رتھ پر چڑھایا۔ منوری کو میدان جنگ فتح و شکست کی خونریزی اور پرخطر حالات میں فوجوں کے ہمراہ طویل فاصلے طے کرنے کی

عادت تھی۔ اس نے لڑکیوں کو رتھ کے غالیچے پر لٹایا۔ خود شہزاد سمیٹ کر بیٹھی۔

نندو نے ہم بھولا کا نعرہ لگا کر سیلوں کو چابک رسید کیا۔

چودھری فتنے سر جھکاتے پگڑی کے شملے سے مونچھیں پونچھتا سرائے طفرل بیگ
کی طرف لوٹا۔

قافلہ روانہ ہوا۔

آگے آگے کمپنی کا پرچم لہراتا رتھ۔ چڑھتے سورج کی کرنیں رتھ کے سنہرے کلس سے
ٹکراتیں تو وہ جگمگا اٹھا۔ نندو نے رفتار تیز کی۔ برطانوی پرچم صبح کے خوشگوار جھونکوں میں
پھٹھٹانے لگا۔ گا ہے بگا ہے جلی ہوئی لاشوں کی سٹرانڈ سیم سحر میں مل جاتی۔

رتھ میں جتنے سیاہ بیل، جیسے ہم آج کے کالے بھینے، جھن جھن کرتے خراب آباد
دہلی کی سمت دوڑنے لگے۔





(۵)

تختِ روان

دارالسرور رام پور۔ بینظیر کا میلہ۔ ۱۸۸۱ء۔ حضرت امیر مینائی نے فرمایا اس
امیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور خبر ہے میلے میں اس مہ تھا کے آنے کی
مئیہ شکوہ آبادی اور جلال لکھنوی اس جشن جانفرا کے متعلق مثنویاں لکھ رہے ہیں
جان صاحب بولے بدرمیز پھر بوا میلہ ہے جشن کا پھر بینظیر باغ میں میلہ ہے جشن کا

نواب مرزا داغ دہلوی نے مثنیٰ بانی حجاب کو کلکتہ اطلاع بھیجی۔
آگیا بے نظیر کا میلہ دل پابند وضع کھل کھیلا
میلے والوں میں دھوم تھی میری خوش جمالوں میں دھوم تھی میری

اخبار صولت پر ویزی مراد آباد کا اڈیٹر رقم طراز ہے۔

”خوش جمالوں کے پرے نہر پر جمع ہیں مجبوروں پر سیر کر رہے ہیں۔“

ہر غیرت ناہید کی پریمی تائیں اندر کے اکھاڑے کا سماں باندھ رہی ہیں فیوں سارا آتش بازی
سے متور باغات میں خیال کے انار ٹھمری کی پھلجھڑیاں وادے کی ہوائی گلریز ہواؤں کے
ہمدوش در جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے۔

حضور نواب کلب علی خاں بہادر دام اقبال کے مہمانان گرامی میں مہاراجہ ہو لکر آف
اندور، مہاراجہ ڈگ بچے سنگھ آف بلرام پور (اودھ) اور ہزبائی انس نواب صاحب
سہراب نگر رامپور میں ہتوز تشریف فرما ہیں۔

”کل رات یکتائے روزگار مودھو طہلی کی سنگت میں (قدر پیا) کی ایک بندش (ہٹو چھڑو
نہ موری نیندا چٹ جات) دئی کی بی دلتواز اس شوخ و شیریں کار شہر آشوب نے
اس ادائے دلبری سے ادا کی کہ دریا بدل نواب صاحب سہراب نگر نے مالا مرادید کی

اپنے گلوئے مبارک سے اتار کرنی انور بی صاحبہ کو عطا کی۔ دو سالہ مودھو پیلچی کو عنایت فرمایا۔ کیوں نہ ہو۔ سچ جیسے پکھا دج میں دھوم مودھو کی

”راپور دربار کی جادسی، جھوسن اور بی مٹی کلکتے کی بی تھنی، لکھنؤ والی مشاعرہ خوش نوا ہنگین جان، دلی کی امیر جان میلے میں جلوہ آراہیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ اس سال اس جشن دل افروز کی جان بی دنواز ہی ہیں کہ بحیثیت جانشین منور می کشمیرن اپنی خالہ کا نام منور کر رہی ہیں میلے کے ٹھیسٹر میں ”کوہ قاف کی برسی“ بنی ہیں۔“

گاؤ تیکے سے ٹیک لگائے دنواز بغور سن رہی تھیں۔ چودھری فتنے ملاح کے نزدیک بیٹھے پان بنانے میں مصروف تھے۔ کشتی نہر کے کنارے روشن گیس لیمپ کے نیچے رکھی ہوئی تھی نیند کی ماسی مہرونے اخبار ہاتھ سے لکھ کر جمائی لی۔ ”آگے چلو“ دنواز نے ملاح کو حکم دیا۔

بجرا چل پڑا۔ اگلے لیمپ کے نیچے پہنچ کر پھر رکا۔ مہرونے اخبار اٹھایا۔

”ناظرین باتمکین۔ آج کی بات معلوم ہوتی ہے۔ عذر کو فرو ہوئے محض آٹھ سال ہوئے تھے نواب یوسف علی خاں تاظم نے دلی کی پھول دالوں کی سیر کی تقلید میں اس فرح بخش میلے کی بنا ڈالی۔ مرحوم دربار مغلیہ کی شان و شوکت کو اپنے دربار گہر بار کے آداب و رسوم کے ذریعے دوبارہ زندہ کیا۔ جان عالم کے دور تعیش کی تجدید فرمائی۔ دلی اُڑ چکی۔ لکھنؤ مٹ گیا۔ مگر خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آفتاب برطانیہ کی ضیا پاشی کی بدولت راپور اور دیگر نیٹور یا ستوں کی رونق ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ فلاکت زدہ شعراء، علماء و فضلاء اہل صنعت و حرفت، باکمال گویئے اور رقاصائیں قدر شناس والیان ریاست کی سرپرستی اور جو دستا سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ فی الوقت سات سونامی گرامی گویئے اور نت کار راپور دربار میں ملازم ہیں۔ ہمارا کار سپانڈنٹ مقیم راپور کوسی ندی کے پار سے رقم طراز ہے کہ حضور نواب صاحب یوسف علی خان جنت مکانی نے شاہان مغلیہ کی تقلید میں جو ”محکمہ ارباب نشاط“ قائم کیا تھا وہ بھی دن دوئی رات چوگنی ترنی کر رہا ہے۔ نواب مرحوم کے عہد حکومت میں اس محکمے کی افسر اعلیٰ داروغہ محبوب جان خود ایک بلند پایہ

مغینہ تھیں۔ تباہی ہونے کے بعد نواب صاحب مرحوم کے ہمراہ حج کرا آئی تھیں۔ شہر رامپور میں ایک وسیع مسجد انھوں نے تعمیر کرائی۔

”مٹی بھی چاہتی تھی کہ کوئی کار خیر کر جائے۔ افسوس۔ بے وقت موت نے مہلت نہ دی۔“
چودھری فتنے نے مضمون سنتے سنتے آہ سرد بھری۔ ”آگے پڑھو بیٹی مہرود۔“

”بس ماموں جی۔ اتنی کم روشنی میں سمجھائی نہیں دیتا سر میں درد ہونے لگا۔“
بجرا جگمگاتی تہرکا چکر لگاتا رہا۔ کچھ دیر بعد دنواز نے کہا ”ماموں جی — یقین نہیں آتا — انہی آنکھوں نے پھانسیوں کے کھڑکھڑاتے جنگل دیکھے۔“

”ان مینوں کے یہی پرکھے۔“ چودھری نے جواب دیا۔

”دکھیا رابا دشاہ رنگون میں پوریہ نشین رہا۔“

”چیپ“

نواب کے مہمان انگریزوں میموں سے لدی ایک کشتی پاس سے گزر رہی تھی۔
دنواز نے پروا نہ کی کہتی رہیں۔ ”فرزند دلہند دولت انگلشیہ مزے اڑا رہے ہیں۔ جاں عالم کے دور تعیش کی تجدید۔!!“
”کہ عالم دوبارہ نیست۔“ چودھری فتنے نے مختصر اگہا۔

”بسھی مزے کر رہے ہیں سو ان کے جو کاتے پانی میں قید ہیں یا جن کے عزیز دار پر لنگ گئے ہم بھی تو عیش کر رہے ہیں۔ اپنے پیاروں کو بے گور و کفن چھوڑ کر۔“ مہرود بولی
”اگر ماموں جی نے اپنی جان پہ کھیل کر انکی تدفین نہ کی ہوتی۔“

بجرا کنارے پر پہنچ گیا۔ نواب صاحب شہر اب نگر کی معتمد خاص خان پوری لیمپ کے نیچے منتظر تھی۔ دنواز کھلی دار پانچاڑے کے پاتینچے سنبھال کر کنارے پر اتریں۔

”بی صاحبہ۔“ خان پوری نے قریب آن کر سرگوشی کی۔ ”سرکار کل صبح واپس تشریف

لے جا رہے ہیں۔ آپ سے قطعی جواب طلب فرمایا ہے۔“

دنواز چیپ کی کھڑکی میں سر ہلایا۔

خان سبزی فوراً میلے کی بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ دلتوازا اور مہر و فینس میں بیٹھیں۔
 ”یہ کیا آیا۔ تم نے تو تھیلی پر سرسوں جمالی۔“
 ”نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ مجھے تو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا۔ بائیس
 سال ذلت کی زندگی بسر کرنے کے بعد اللہ مجھے عزت بخش رہا ہے۔“
 ”اماں متوڑی زندہ ہوتیں کبھی یہ رائے نہ دیتیں۔ سنا ہے کہ یہ نواب لوگ جس
 حرم سے خفا ہوتے ہیں اسے کوئے کہنی بنا دیتے ہیں۔“
 دلتوازا نے باہر جھانکا چند دالیان ریاست فلٹون میں سوار ہو رہے تھے۔
 ”ان موڈوں کو دنیا جہان میں اور کسی بات سے غرض نہیں۔ ہر وقت ایک ہی دُھن
 — عورت — عورت — توبہ — توبہ — مہرو نے منہ بنایا۔“

”ابھی تم پڑھ تو رہی تھیں۔ برطانیہ سر یہ سلامت ہے اخبار چینی لکھتا ہے۔ پہلے
 ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کر لیا کرتے تھے اب اس سے بھی فرصت۔“
 ”تمہارے والے بھی ایسے ہی ثابت ہوں گے اور کوئی نظر میں سمائی اور تمہارا بیٹہ کٹا۔“
 ”مہرو، منوڑی، وہ گرگ باراں دیدہ، بھی یہی کہتیں۔ اصل وارث تو ان کی تم ہو
 میں اس منصب کے لائق نہیں۔“

”مگر آپا۔ ہفتہ دس روزی صاحب سلامت اور بڑھوتے تم کو نکاح کا پیغام
 ”مہرو نواب صاحب بڑے نیک نام رئیس ہیں۔ پابند شرع۔ دو بیگمات محل میں
 موجود ہیں۔ تیسری میں ہوں گی۔ اپنے مذہب کے مطابق متوعات تک تو رکھتے نہیں۔“
 ”پردے میں دم پخت ہو جاؤ گی ساری عمر کے لئے۔ اور چوتھی جو آگئی تو۔“
 ”منظور۔ اب مجھ سے رئیسوں کے سامنے کھڑے ہو کر مبارکبادیاں نہیں گائی جاتیں
 بہت ہولیا۔ بائیس برس۔“

منوڑی کشمیر نگوڑی ناٹھی مرین۔ منہ بولی بیٹی دلتوازا کو اپنی جائیداد کنٹیر کا
 وارث قرار دے گئی تھیں۔ ان کا اور ان کی ماں اصغر کی واسطہ زیادہ تر فرنگی فوجی

افسروں سے رہا تھا۔ چاؤ ڈی میں اصغر کشمیرن کی طرح منوڑی بھی برادری کی چودھراتن بن چکی تھیں۔ سرخ مونچھوں والے رواقی برادر بزرگ تھے دھاڑیوں کے سردار کی حیثیت سے عرصے سے چودھری فتح محمد کہلا رہے تھے۔ دنوازا اور مہرو کی اسی شفقت سے نگرانی کرتے تھے جس شفقت اور دلسوزی سے انھوں نے سرائے طفعل بیگ کی اس ہولناک رات ان بہنوں کی دستگیری کی تھی۔ چاؤ ڈی میں ماموں جی کہلانے لگے تھے کہ دنوازا اور تہر دا نہیں ماموں جی کہتی تھیں۔

دنوازا بھی منوڑی کی طرح ٹھاٹھ باٹ سے سفر کرتیں۔ اب بہلی اور تھ کے بجائے آگ گاڑیاں چل رہی تھیں۔ نامہ بر کو تڑپا تیر ہو کر ٹیلی گراف کے تاروں پر جا بیٹھے تھے۔

نواب کلب علی خان کے رامپور سے دئی واپس پہنچے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ نواب صاحب سہراب نگر کے چیف سکریٹری کا تار ملا۔ ہزبانی نس یا دفرماتے ہیں فوراً پہنچئے۔

اس مبارک و مسعود سفر میں نہ خاں صاحب اور ساژندے ہمراہ تھے نہ خادمہ البیلی۔ البتہ ماموں جی۔ سہراب نگر ایک مین لائن پر پڑتا تھا۔ اسٹیشن پر چیف سکریٹری صاحب اور خان پری استقبال کے لئے موجود۔ کپارٹمنٹ کے دروازے سے سینس تک سفید کٹاؤ کے کام کی سرخ قنات لگانی گئی۔ دنوازا نے بسم اللہ کہہ کر دایاں قدم پلیٹ فارم پر رکھا۔ قنات کے باہر چودھری فتنے پگڑی کے شملے سے خوشی کے آنسو بار بار پونچھا کئے۔ فینس کے بعد دو آپرے درمیانی پردے دار کوچ میں دنوازا اور خان پری۔ اگلی میں چیف سکریٹری۔ پچھلی میں اہلکار اور چودھری فتنے کیا شاندار قافلہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج سرخ پہاڑیوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا۔ غمخیز پردے کی اوٹ سے جھانکا سپاٹ چیل میدان میں سڑک پر سے گذرتی تینوں گھوڑا گاڑیوں کے طویل محرک سائے ایسے معلوم ہوئے جیسی سیاہ ہر چھاتیوں کی تصویریں۔ جو انگریزی کتابوں میں دیکھی تھیں۔ دنوازا نے سوچا یا گویا شیریں خسرو پر ویز سے بیاہ کرنے جا رہی ہو۔ یا لالہ رخ کا کارواں۔

بھورے ٹیلوں کے پیچھے چند مقابر نظر آتے۔ پھر ایک وسیع، کافی آلود تالاب اُس پار سہراب نگر کا بازار۔ اُفق کے قریب ایک پہاڑی پر پھیلی قلعے کی عمارتیں۔
سرسبز باغات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھنڈی سڑک پر پہنچ کر حکام اعلیٰ اور برٹش بیڈیٹنٹ کی کوٹھیوں کے سامنے سے گذرئی کوچ شاہی گیٹ ہاؤس کے پھاٹک میں مڑ گئی۔
کوٹھی پر سپرہ لگا دیا گیا تھا۔ دست بستہ عملہ برآمدے میں مستعد کھڑا تھا۔

دوسرے روز۔۔ نماز ظہر پڑھ کر سرکار جامع مسجد سے واپسی میں تشریف لائے۔
دننواز اور ان کے ماموں جی سے سہمی تر کلفت گفتگو کے بعد قلعے چلے گئے۔ خان پری روز آتی۔
خان پری اور اس کا شوہر نسا گرت تھے۔ اور سرکار کے جاں نثار ملازم۔ ہزبائی نس کی والدہ ان دونوں کو نجف اشرف سے ہمراہ لیتی آئی تھیں۔ خان پری کے شوہر کو سرکار کے باڈی گارڈ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ خان پری جب بے نظیر کے میلے میں دننواز سے ملی تھی اسے بی صاحبہ کہتی تھی اب انکو خانم کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ چند روز بعد سرکار کہے گی۔
چودھری فتح محمد اپنے کمرے میں بیٹھے دن بھر بوستان خیال پڑھا کرتے۔ دننواز اپنی خواہگاہ میں وکٹورین چھس کھٹ کے اوپر نیم دراز اپنے بوستان خیال کی سیر میں مگن رہتیں اور خان پری کی راہ دیکھا کرتیں

یہ گرت سحرت نو عمری میں ہندوستان آگئی تھی۔ صاف اردو بولتی تھی۔ سرکار کی شرافت اور کریم النفسی اور قلعے کی سازشوں کے قصے سناتی۔ ہزبائی نس دوسرے والیان ریاست کے برعکس نہ عیاش تھے نہ ظالم۔ دننواز خانم کا حسن، اور شریفانہ انداز و اطوار ان کو بے حد پسند آئے تھے۔ ایک لکھنوی سوزخاں کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ ایک جمعرات رامپور کی ایک نجی مجلس اعز میں اس لائٹانی فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہزبائی نس سہراب نگر گانے سے زیادہ ان کی سوزخاں پر رتیجھے تھے۔

سرکار اپنی بیوہ بہن کو بہت مانتے تھے۔ اہم معاملات میں ان سے صلاح مشورہ لیتے۔۔ دونوں بیگمات، سبینر اور سکند ہزبائی نس مدنیغ نواب زادیاں تھیں شہزادی

خاتم کی اپنی بھادوں سے بالکل نہیں ہستی۔ خاص کر چھوٹی بھادوں سے۔ اس وجہ سے وہ قلعے سے باہر اپنے ذاتی محل میں رہتی ہیں اور بے حد خوش کہ بھتیان پر سوت لارہے ہیں

دلتواز خانم کے لئے علیحدہ محل آراستہ کیا جا رہا ہے۔ ہیروں کا تاج بنوایا گیا ہے۔ ان کا ذاتی اسٹاف منتخب ہو چکا ہے۔

ایک شام خان پری نے قلعے سے آن کر اطلاع دی: عقداگلے جمعے کو ہوگا۔ دلتواز خاموش رہیں۔ رئیسوں کی شادیوں میں جا کر گیا بہت تھا۔ یہ معلوم نہ تھا اس قسم کی سچوئیشن میں خود کیا کرنا یا کہنا چاہیے۔ چودھری فتنے بھی کچھ نہ بتا سکتے تھے ان کے ڈیرے اور خاندان میں سات بیٹھیوں سے کسی لڑکی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ اب دلتواز نے دن بھر عبادت کرنا مناسب جانا۔ جو نیر بیگم صاحبہ۔ ہیروں کا تاج۔ شکرانے کی ختمی نفلین پڑھتیں ختم تھا۔

مبده کی شام۔ پانچ کا عمل رہا ہوگا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سنانی دیں۔ چند سکنڈ بعد بیڈ روم کا بھاری نمٹلیں پردہ ہٹا کر خان پری نمودار ہوئی۔ بوستان خیال کی پری۔ تنگ موریوں والی گھیر دار شلوار۔ کمر میں پٹکا۔ چرمی پیٹی میں اڑس اٹنا سا مریض خنجر۔ نمٹلیں جیکٹ۔ سر پر بگڑی نماد و پٹ۔ کوہ قاف کی گسی پری کی اماں۔ مسکرا کر بولی ”خاتم سرکار نے گاڑی بھجوائی ہے۔ اندھیرا پڑے ٹھنڈی سڑک پر ہوا خوری کر آئیے گا۔ اور یہ سرکار نے ایک خط آپ کے نام بھیجا ہے۔“

ٹپکے سے خریطہ برآمد کیا۔ خریطے سے سر بھر لفاظ نکال کر پیش کرتے ہی واپس مڑی۔ ”اے بی بھالگی کہاں جاتی ہو۔“ دلتواز نے دریافت کیا۔

”سرکار نے فرمایا ہے آپ کو پرچہ دے کر فوراً شہزادی خاتم کی خدمت میں جاؤں ایک خط ان کے نام ہے۔ جمعے کے روز وہ لڑکی والی، مین گی۔ آپ کی طرف سے۔“

”اچھا۔ دلتواز نے کہا۔ پھر چھینیں

”شہزادی خانم باغ باغ ہیں۔ چھوٹی بیگم برسوتن آرہی ہے۔“
”اچھا۔“

”نندبھاوج کا رشتہ ہی ایسا ہے۔ خانم۔ ایک دوسرے کی دشمن ہوتی ہیں۔“
”اچھا ہاں ہاں ٹھیک کہتی ہو خان پری۔“

ماس نندوں کی شکایتوں سے پڑ ٹھمیریاں دادرے بہت گائے تھے۔ مگسراں
رشتوں سے بھرا پڑا کنبہ کب کا تہ تیغ ہو چکا۔ بالاخانوں کے مادری نظام میں رشتوں
کی نوعیت مختلف تھی۔

خان پری رخصت ہوئی۔ دلتواڑ نے سرکار کا مراسلہ لفافے سے نکالا۔ القاب
نہ تمہید۔ نمبر وار چند اطلاعات — ۱۔ مہر مبلغ ایک لاکھ سکہ رائج الوقت۔ ۲۔ بہرائی نس
نواب دلس محل خطاب۔ (صاحب ریڈیڈنٹ بہادر نے تھرڈ بہرائی نس کے مرتبے
کی منظوری دیدی ہے)۔ ۳۔ شادی کے بعد محض اپنی ہیشیر مسماۃ تہر وادراپنے ماموں
چودھری فتح محمد سے گا ہے لگا ہے ملاقات کی ہماری طرف سے اجازت ہے۔

”عس کو دوبارہ پڑھا۔ چہرے کا رنگ بدلا۔ گردن خواص دروازے پر پہنچ چکی تھی۔
”ذرا ٹھہرنا۔ مجھے بھی سرکار کو ایک خط بھیجنا ہے۔ بے حد ضروری۔ فوراً جواب کر
ان کے ہاتھ میں دو۔“ پہلے قلعے جاؤ۔ پھر شہزادی بیگم کے ہاں چلی جانا۔“ دلتواڑ
نے حکم دیا۔ وہ اسی لمحے سے اپنے آپ کو بہرائی نس سمجھنے لگی تھیں۔

”خانم قلعہ اڑھانی میل دور ہے۔ کب گئی اور کب آکر شہزادی خانم کے گھر پہنچی۔ وہ
تو اسی طرف رہتی ہیں۔“ خان پری نے جواب دیا۔ اس نے ایسی ایسی بہت دیکھی تھیں۔ آپ
خط لکھ رکھیے۔ باہر گھوم آئیے۔ آٹھ بجے تک آکر لے جاؤں گی۔ سرکار نوبے خاصہ تناول فرماتے
ہیں۔ اس وقت میرا وہاں ہونا لازمی ہے۔“

خان پری کے جاتے ہی دلتواڑ خط کا جواب لکھنے بیٹھیں۔

”سرکار۔ شرط عس کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ چودھری فتح محمد میرے ماموں
نہیں ہیں۔ میرے ماموں جان مرزا اٹھاسپ نقتبند اور میرے والد مرزا عثمان بیگ غدر

میں شہید ہوئے۔ اپنے بزرگوں کی روجوں کو شرمانا نہ چاہتی تھی۔ آج تک کسی پر اپنی اصلیت ظاہر نہ کی۔ حتیٰ کہ آپ کو بھی نہ بتلایا۔ نکاح نامے پر میرے والد کا نام مرزا عثمان بیگ لکھوایئے گا۔ اس بد بخت بندی کی داستان رنج و مہن یوں ہے — اپنا قصہ قلم بند کر کے خط لفافے میں رکھا۔ چودھری فتنے نے اندر آکر کہا: ”بیٹا گاڑی بہت دیر سے تیار کھڑی ہے“

کوچ کوٹھی سے نکل کر مال روڈ کی طرف روانہ ہوئی۔ شام ہو چکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں نے درختوں کو سنہرا کر دیا تھا۔ سڑک خاموش پڑی تھی۔ گاڑی کے اندر بھی خاموشی طاری تھی — چودھری فتنے اندر بیٹھے تھے خان پری کا طویل مونچھوں والا مسطح کُرد شوہر کوچ بکس پر متمکن تھا۔

گاڑی ایک میل دور نکل آئی۔ دنواڑے نے باہر جھانکا۔ پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے عجیب و غریب فخر و مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

سامنے وہی مقبرے نظر آئے جو ریلوے اسٹیشن سے آتے ہیں۔ دُور سے دکھائی پڑے تھے۔ سب سے اونچے گنبد پر گھاس اُگ آئی تھی۔
”کوئیل کا مقبرہ۔“ چودھری فتنے نے بتایا۔

”اے بیٹے۔ چھوٹی مٹی مٹی کوئیل اور اس کا اتنا بڑا مقبرہ بیسیوں کے بھی کیا چونچلے ہیں!“
بیٹی یہ کوئیل چڑیا نہیں ایک بنگال تھی۔ سرکار کے پردادا کے حرم میں داخل تھی ایک روز انھوں نے اسے سوتے میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔“

”ہے۔ ہے۔ کیوں؟“

”شک ہو گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا بی قصور تھی۔ پچھتائے اور مقبرہ بنوایا۔ ہماری والدہ خدا ان کو بخشنے شاہی کے لکھنؤ میں رہ چکی تھیں ان سے کتنے واقعات ایسے سنے اور خود دیکھے ایک کینز تھی صبح دولت — غازی الدین حیدر کی ملکہ بادشاہ بیگم نے اسے انتہائی اذیت دے دے کر ہلاک کر دیا۔ بیگم سمر کو اپنے یورپین شوہر اور ایک کینز کے متعلق شبہ ہو گیا تھا اس بے چاری کو قتل کروا کے اپنی مسہری کے نیچے گاڑا۔“

”تم تو بیٹا انگریزی راج کی امی جی میں جوان ہوئی ہو۔ دلی میں رہتی ہو۔ نیویوریا ستوں کے حالات اب بھی وہی ہیں جو پہلے ہمارے بادشاہوں کے ہاں تھے۔ انگریزی قانون یہاں لاگو نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔“

”یہ بھی تو ایک چھوٹا سا لکھنؤ ہے۔“ دنوا نے باہر جھانک کر کہا۔

”ارے یہ کیا خاک لکھنؤ ہے ہم لوگوں نے غازی الدین حیدر سے لے کر جان عالم تک کا زمانہ دیکھا ہے۔ جب بھی میجر ہارٹلے کے ساتھ اماں لکھنؤ جاتی تھیں۔“

”بیٹا اماں اتنی کسبیوں کو جانتی تھیں انکے دیکھتے دیکھتے لکھنؤ کے بادشاہوں کی ملکائیں بن گئیں۔ سلطان محل۔ پھول محل۔ بادشاہ محل۔“

”مجھے سرکار درس محل کا خطاب دینے والے ہیں۔“ دنوا نے کہا۔

”مبارک ہو۔ بھو ڈیرے دار کی لڑکی حسینیٰ نصیر الدین حیدر کی جاہ و حشمت والی نواب خورشید محل۔ اور آجاگر۔ بیبا جان۔ مندر۔ سندر۔ ڈوم دھاڑی کر ڈرتی ہو گئے۔“

”آپ کی والدہ حرم سلطانی میں نہ پہنچ پائیں؟“

”کیا ہوتا کیا نہ ہوتا سب مقدر کا کھیل ہے۔ جارن والٹرز کا نیور کا ایک انگریز فوجی تھا۔ اس کی لڑکی نصیر الدین حیدر کو بھاگتی۔ نواب مخدرہ علیا۔“

”ماں والٹرز صاحب کے مرنے کے بعد علی بخش طلبی سے واسطہ رکھتی تھی۔“

”بادشاہ نے اس کا نکاح علی بخش سے کروا دیا۔ نواب مخدرہ علیا کی وفات کے بعد انکے سوتیلے باپ انکی زبردست جاگیر پر قابض ہو گئے۔“

”ایک بار جب اماں میجر کے ساتھ لکھنؤ جا رہی تھیں انھیں اٹھوانے کی کوشش ناکام۔ کہاں کا شاہی حرم۔ سب مقدر کا کھیل۔ بیٹی یہ گونج کیسی سنائی دے رہی ہے۔ زمین آسمان جھنڈا اٹھے۔ تو سن رہی ہے؟“

مقبوروں کا چکر لگا کر کوچوان کبھی ٹھنڈی سڑک پر واپس لایا۔

دور نعلے کی طرف سے توپیں سر ہونے کی آواز آئی۔ بوم۔ بوم۔ بوم۔

دنواز مسکرائیں۔ شادی کی خوشی میں گولے باد ہوائی آج ہی سر ہونے لگے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ سہراب نگر۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔
لیکن کوچوان کو کیا ہوا کہ فوراً گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور گاڑی موڑ کر تیز رفتار سے ریڈیٹنٹ کی کوٹھی کی طرف بڑھا۔
سات۔ آٹھ۔ نو۔

گاڑی کوٹھی سے کچھ دور بربرک گئی۔ گرد رسالدار کوچ بکس سے کود کر پھاٹک کی طرف دوڑا۔ ریاستی فوج کا ایک شہسوار دستہ قلعے کی سمت بھاگا جا رہا تھا۔ چودھری گاڑی سے اتر کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ دنواز تعجب اور دلچسپی سے باہر بھاگتی رہیں کچھ دیر بعد رسالدار سر جھکائے آہستہ آہستہ کوچ کی جانب آیا۔ چودھری سے کچھ کہا۔
چودھری نے سراٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ زیر لب کچھ پڑھا۔ کھڑکی کے نزدیک آئے۔
دھیرے سے بولے۔ "اللہ کی مرضی۔ بیٹی سرکار جنت کو سدھارے۔"

دنواز چند سیکنڈ تک چودھری کو تنکٹی نہیں پھر کہا۔ "کیا۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ افواہ ہو گی۔" منتظر تھیں کہ بوڑھا بھی اس خبر کی تردید کرے۔ وہ خاموش رہا۔ اب اس اطلاع کا اثر شروع ہوا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چکر۔ گھوڑا گاڑی طوفان کے تھیسڑے کھائی گول گول گھومتی سرپٹ دوڑی۔ چودھری باہر کھڑا بکے جا رہا تھا۔ بیٹی یہ دنیا مردوں کی سرائے ہے۔ وغیرہ۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ یا میرا دماغ چل گیا۔ یہ کیا بک رہا ہے۔ بڈھا کنجر۔ کل جببھا۔ کم ذات۔ دو ر پار کوئی مرتا ہے تو گولے دعا کرتے ہیں؟ تو میں تو میرے بیاہ کی خوشی میں سر کر رہے ہیں۔ سلامی کی گیارہ توپ۔ اور یہ بکتا ہے کہ خدا نخواستہ سرکار کے دشمن۔ چودھری فتنے نے کوچین سے کہا گیٹ ہاؤس واپس چلے۔ سوچا اب یہاں سے جلد از جلد بھاگنا چاہیے۔ کل صبح تنک جانے کیا ہو گیا نہ ہو۔ فرنگی نے ان ریسیوں کو مطلق الغان کر رکھا ہے۔ نیپوریاستوں کے معاملات بہت دیکھے تھے۔ دلی عہد کی اپنے سوتیلے بھائیوں سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ ریڈیٹنٹ ابھی

تعلقے میں موجود ہے۔ فوجیں حرکت میں آچکی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔ خان پیری کا شوہر کوچ بکس پر واپس گیا۔ چودھری جی گاڑی کے اندر مقابل کی سیٹ پر بیٹھے۔ دروازہ بند کر کے پردے برابر کیے۔ دلنواز سر تھامے بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر بعد بولیں۔ ”ماموں جی میں نے گنا۔ گیارہ توپ۔ ہماری گیارہ توپ کی سلامی ملکہ کی طرف سے مقرر ہے نا۔“

چودھری نے ملائیت سے کہنا شروع کیا ”بیگم! بیٹے۔ سن یہ جو ریاست تھی نا۔“
”تھی کیا مطلب۔ اللہ رکھے ہے۔ ہماری اسٹیٹ سہرا بنگر۔“

”بیٹی! رسالدار صاحب ریڈیٹس سے سناؤنی لائے ہیں۔ خان پیری کو تیرے پاس بھیجنے کے بعد سرکار نے دیوان صاحب اور ریڈیٹنٹ صاحب کو طلب فرمایا۔ ان سے گفتگو کرتے رہے۔ اچانک طبیعت بگڑی۔ محل کا فرنگی ڈاکٹر فوراً پہنچا۔ سب جتن کیے۔ مگر سرکار کا اوپر سے بلاوا آچکا تھا۔ بیٹا وہ تو ہیں سرکار کے مرتبے ہی ولی عہد کی تخت نشینی کی خوشی میں داعی گیتن۔ نئے رئیس کو سلامی دی گئی تھی۔“

دلنواز غور سے چودھری کو دیکھتی رہیں۔ گیس کے لیمپ میں ہوا بھرتے جاؤ تو وہ رفتہ رفتہ روشن ہوتا ہے اسی طرح بوڑھے دھاڑی کے الفاظ ذہن کے دھندلکے میں جا جا کر ہوئے۔

چودھری اب خوفزدہ آواز میں سرگوشی کر رہا تھا۔ ”بیگم! بیٹی۔ کوٹھی واپس پہنچتے ہی اسباب باندھے۔ صبح تڑکے یہاں سے بھاگ نکلیں۔ تا نگہیکہ کریں گے اسٹیشن پر جو ریل گاڑی ملی اسی میں بیٹھ جائیں گے۔ سن رہی ہے؟ مجھے سب حالات یہاں کے معلوم ہو چکے ہیں دوپائٹیاں ہیں۔ ایک چھوٹی بیگم اور ان کے لڑکے کے طرفدار دوسری شہزادی بیگم کی پالٹی۔ تجھ سے نکاح کرنے پر سرکار کو شہزادی بیگم نے آگیا تھا۔ دونوں پالٹیوں میں بہت خون خرابہ ہوتا ہے۔“

دلنواز چپ رہیں۔ چودھری سمجھانے میں مصروف تھا ”اس ریاست نے سارے طور طریقے شاہان اودھ کے اپنا رکھے ہیں۔ وہ بہادر لوگ موت سے بہت ڈرتے تھے۔ سن رہی ہے؟ مردوں کی سرائے میں رہتے تھے اور موت سے ڈرتے تھے۔ جب ایک

شاہ اودھ کا انتقال ہوتا اور اشت کے جھگڑوں کے ڈر سے اس کا بیٹا فوراً تخت نشین ہو جاتا دوسرے دن وزیر اعظم دربار میں حاضر ہو کر عرض کرتا۔ ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے۔ جہاں پناہ اس کی تجہیز و تکفین کے لئے کچھ امداد فرمائیں۔ نیا بادشاہ خزانہ عامرہ سے ایک رقم عطا کرتا۔ باپ کی لاش چور دروازے سے نکالی جاتی غسل میت تک محل میں نہیں دیا جاتا تھا۔“

بُت بنی سنائیں۔ چہرہ جذبات سے عاری۔ آنکھیں خشک۔

بوڑھا کبوتر گیس کی لالین کی طرح سنسناتا رہا۔ ”یہاں بھی کل صبح دربار میں حاضر ہو کر دیوان بہادر عرض کریں گے ایک غریب الوطن مسافر کا۔۔۔۔۔ وغیرہ۔“

کوچ اب تالاب کے کنارے سے نکل کر بازار سے گذر رہی تھی۔ دفعتاً دنوازانے کھڑکیوں کے پردے کھینچے۔ سر باہر نکال کر کوچمین کو پکارا۔ ”گاڑی روکو۔۔۔“

بڑی بھیانک سی آواز تھی۔ کوچمین نے گھبرا کر باگیں کھینچیں۔ دنوازا دروازہ کھول کر بھرے بازار میں اتر آئیں۔ دوکانوں پر جمع لوگ سرکار کی اچانک موت پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ انھوں نے چونک کر اس بازاری عورت کو دیکھا جو اگر سرکار یوں چٹا پٹ نہ ہوتے تو دو روز بعد ان کی علیا حضرت بننے والی تھی۔

دنوازانے ایک بھٹکے سے دوپٹہ سر سے اتارا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی تالاب کے کنارے پہنچ گئیں۔ چودھری اور رسالدار پیچھے پیچھے دوڑے۔

چودھری فٹے ہانپتے کانپتے تالاب پر پہنچے۔ اطمینان کی سانس لی۔ بیگمآں بیٹی آرام سے منڈیر پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ چودھری کو دیکھ کر سرکار کا پرچہ اور اپنا خط شلوکے کی جیب سے برآمد کیا۔ یہ خطرات کے نوجے خان پری نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے والی تھی۔ قبہہ لگایا۔ چودھری نے تاسف سے سر ہلایا۔ صدمے نے بے چاری نچی کے دماغ پر اثر کر دیا۔ دھیرے سے بولے۔ ”بیٹی رنج نہ کرو۔“

”رنج۔۔۔“ دنوازانے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لوڑھے کو دیکھا۔ ”چودھری! رنج

ہے اس بات کا ہے کہ سرکار نے آخر دم تک مجھے تمہاری بھانجی سمجھا۔ میرا یہ خط ان سب نہ پہنچا۔ دونوں پرچوں کے یرزے یرزے کیے اور انھیں ہوا میں اچھال دیا۔

چودھری فتح محمد سن سے رہ گئے۔ دل ٹوٹ گیا۔ اس عورت کی میں نے جان پائی تھی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی تھی۔

”جاؤ پوت دکھن —“ شدو نے آواز لگائی۔
 ”وہی کرم کے پھن —“ چھوٹی بہن شمو نے چلا کر کہا۔ دونوں بچے بالا خانے کے مختصر سے صحن میں ڈھوپ چھاؤں کھیلنے پھر رہے تھے۔ جاڑوں کا سورج کبھی بادلوں میں چھپتا کبھی تیزی سے چکنے لگتا۔ شملے میں برفباری ہوتی تھی۔ ہوا کے سرد دھبوں کوں سے اڑکھلتے پھر بند ہو جاتے۔ دنوڑا اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ مہر و باورچی خانے میں ابیلی سے شہ تیار کر داری تھی۔ شدو اور شمو ”اونچا نیچا ٹیلہ“ کھیلنے لگے شدو ایک مونڈھے پر چڑھ کر چلایا خیر سے بدھو گھر کو۔“

”آئے۔ جان بچی لاکھوں —“ شمو کھکھلا کر ہنسی۔

”خالہ بن گئیں خیلہ —“ شدو نے نعرہ لگایا۔

”خیلہ جان بیلا —“ شمو لپکاری۔

”خالہ بن گئیں خیلہ —“

”خیلہ جان بیلا —“ بیلے میں بے میلہ — جمنابی پہ کھیلا اونچا نیچا ٹیلہ —“
 شدو نے کوڈو کو ڈکرا اپنا شروع کیا۔

دور اچوت افسر چودھوڑی صافے باندھے بر جس اور فل بوٹ دانے زینے میں دار ہوئے۔ چودھری فتنے دروازے کے پاس مونڈھے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے راز اٹھے تپاک سے آداب تسلیمات کر کے ان کو لال کمرے میں لے گئے۔ شدو برآمدے

اور صحن کے چکر لگا کر الاپا کیا۔ ”خالہ بن گئیں خیلہ۔ تیلے میں ہے میسلہ۔ جتنا؟
پہ کھیلا۔ اونچا نیچا۔“

چودھری فتنے لپکے ہوئے باہر آئے آہستہ سے کہا۔ کبخت غل نہ مچا۔
”ماموں جی۔ ماموں جی۔ کھیلا اور ٹیلہ کی تک نہیں ملتی۔“

”شاعری کر رہا ہے نالائق۔ چودھری نے نیچی آواز میں ڈانٹا۔ ”چل سارنگی سنھیا
استاد جی آتے ہوں گے۔ خردار جواب آواز نکالی۔ شمشو بیٹی۔“ انھوں نے پیاراً
کہا۔ ”گھنگر دے آ۔“

”ماموں جی۔“ مہرونے باورچی خانے سے جھانک کر کہا ”آج آپ ہی بنا دیئے
استاد جی نے آج کی چھٹی لے رکھی ہے، ماموں جی بگڑی کے شملے سے چہرہ صاف کر۔
باورچی خانے میں گئے سیرگوشی کی۔“ اسی مہرو۔ خدا کا شکر ادا کر۔ بیگماں کی سائی آگئی
بات پھیل گئی تھی بیگم بننے سہرا بنگر چلی گئیں۔ بھجن لال کی دوکان سے مٹھائی منگوا
ہوں۔ جل پان۔ نیلم گڈھ مہراج کے آدمی ہیں۔ بہت بڑی اسامی ہے،
وہ پھرنی سے لال کمرے کی طرف دوڑ گئے۔

بچے اسی طرح کھیل میں مصروف رہے۔ ”جاؤ پوٹ دکھن۔ خالہ بن گئیں خیلہ
ایلی کٹنی چولے کے پاس بیٹھی روغنی نکیاں بنا رہی تھی مسکرا کر بولی۔ ”جو تہ
کہتی ہو تمہارا بچے نگوڑے وہی دہراتے ہیں۔“
باہر آکر مہرونے میٹے کے کان کھینچے۔ ”خاموش۔ بد ذات زبان گڈی سے
کھینچ لونگی۔“ دونوں بچوں کو مارتی بیٹی دینواز کے کمرے میں گئیں۔

آپا آرام کرسی پر ہیں نجی بیٹھی تھیں۔ ”اپنی اولاد کو بہت نفیس تربیت د
رہی ہو بھومی۔“

”آپا تم بھی توجب سے منوس نگر سے لوٹی ہو اٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ۔ جاؤ پو
دکشن۔۔۔ وہی بچوں کے کان میں پڑتا رہتا ہے۔“

”تم نہیں بکتی رہتیں خیر سے بدتھو۔“

”چلو خیر۔ معاف کرو۔ اٹھو۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ خیلا جان بیلا۔“
”پھر وہی۔“

مہرونے قہقہہ لگایا ”توبہ۔ توبہ۔ اب نہیں۔ میری اچھی آپا۔ اٹھو کپڑے بدلو۔ کنگھی
چوٹی کرو۔ ایسا بھی کیا سوگ۔“

”کس دل سے کروں کنگھی چوٹی۔ سرکار دکھیا کی میت۔“
”پھر وہی صبح صبح۔“

”کر بلائے معلیٰ کے راستے میں ہوگی۔ اتنا لمبا سفر۔ اجنبی مسافر۔“
”باؤلی ہو گئیں۔“

”ریل گاڑی۔ جہاز۔ اونٹ۔ اونٹ پر لدا سیاہ تابوت۔“
مہرونے ہر کو کچھنی۔

”خبردار۔ آپا۔ آئندہ جو تم نے نام لیا۔ پھرے پُرے گھر میں۔“
”یہ بھی رین لیبر اے بتو۔ چلاؤ مت۔“

ماموں جی دروازے میں آئے ”یہ مٹی کے ڈیرے والیاں ہیں یا بھٹیاریں۔؟
باہر مہاراجہ صاحب نیلم گڈھ کے افسر آئے بیٹھے ہیں۔ ذرا چپ رہو کم بختو۔ قریب آکر
اہستہ سے بولے۔“ بیگمیں بیٹی مبارک باشد۔ اگلے مہینے کی اکیس تاریخ کو لوڈ راج کا بیاہ
ہے۔ تیار می شروع کر دو۔“

لال کمرے میں مہاراجہ نیلم گڈھ کے آدمیوں نے دستور کے مطابق تقریٰ تنہالی میں
بیجانے کا مٹھیں کیسہ اور پان پیش کیے۔ دلنواز نے کانپتے ہاتھوں سے بڑھ اٹھایا۔
راچوت رخصت ہوتے۔ اپنے کمرے میں واپس آئیں۔ کچھ دیر چپسکی بیٹھی رہیں۔
پھر طنبورہ اٹھا کر ریاض شروع کیا۔

”مبارک ہو۔ مبارک ہو۔“ مہر و ہنستی ہوئی اندرائی ”لاؤ کئی دو۔ تمہارے پڑے دھوپ میں ڈالوں۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے۔ پشوازیں کون سے صندوق میں رکھی ہیں؟“

”دیکھ لو۔ میں تو سہرا بنگر۔ جاتے وقت سب کپڑے یہیں پھینک گئی تھی!“

پھر آتسو۔

”پلک متنی —“

”خاموش۔ بڑی بہن سے بدزبانی کرتی ہے مردار۔“

مہر نے ایک صندوق کھول کر پشوازیں نکالیں ”ساڑیاں بھی لیتی جاؤ۔ نگوڑے ہندوؤں کی شادی ہے۔ پہن کر اندر کے اکھاڑے والی بننا۔“

— بنارس ساڑیاں برآمد کیں۔ قالین پر رکھتی گئی۔ مہل میں پٹا ایک بندل

نکالا۔ ”یہ کیا ہے آپا —؟“

آپا نے الاپتے الاپتے سراٹھا کر دیکھا ”رامپڑ میں رضائی نہیں بنوائی تھی؟ ادھبلا پڑی ہے۔ نکال لو۔ لے جاؤ گی ساتھ۔ وہاں بھی تو بڑی سردی ہوگی۔“

مہر نے زرد اور اودمی چٹا پٹی کی گوٹ کی حسین رضائی کھول کر قالین پر پھیلائی

”واہ — کیا چیز ہے۔ ابھی البیلی کو ڈھننے کے ہاں بھیجتی ہوں۔ کل پرسوں تک

ڈورے بھی ڈال دے گی — تم مہاراجہ پر ڈورے ڈالنا!“

باہر ماموں جی پچوں کو بتانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ اندر آپا ریاض کر رہی تھیں

زندگی اپنے پرانے ڈھرے پر واپس آگئی تھی۔ مہر و اطمینان کی سانس لے کر اٹھی پشوازیں

اور نامکمل رضائی اٹھا کر صحن میں چلی گئی۔

طائفے کے ساتھ بی دلنواز چہم چہم کرنی نیلم گدھا سیشن پرائز میں۔ کیلے کے پتوں اور

اور گیندے کے پھولوں سے سجے پلیٹ فارم سے گذرنی کھلی فٹن میں ننگے سر بیٹھی شہر کے

بازاروں سے گذرتی رنگ بھون بھونیں ہر طرف بیاہ کی پہل پہل تھی بھوپا بھوپنی کے تماشے۔ جا بجا پنڈالوں کے نیچے بھگت باز، قوال، دھاڑی بچے اور بھانڈو لوگوں کو مخطوط کر رہے تھے رات کو شہنائی نوازوں کی روشن چوکیاں گشت کرتیں۔ نخت رواں پر کھڑی مطربا ہیں ہمیشہ دلبر سجان مبارک باشد، گاتی پھریں۔ شادی کا جشن سات دن تک جاری رہا۔ آخری روز صبح منہ اندھیرے حسب دستور بھیرویں پہنتم ہوا۔

مہر دین رسیوں کی شا دیوں میں کھڑے ہو کر مبارکباد لیا گاتے گاتے تھک گئی ہوں اسی لئے میں نے ”ہاں“ کر دی۔

در بارہاں میں سنگھاسن کے سامنے کھڑی بی دلتوا اور ان کی ساتھ والیاں بھیرویں الاپ رہی ہیں۔ پیا آؤں کی بھٹی بیریاد رو جو ٹھاڑی ہوں۔

پیا کر بلائے معنی کے گورستان پہنچ گئے۔

عشق بازی میں کرامات نہ ہو کیا معنی جس کو دل چاہے ملاقات نہ ہو کیا معنی درو جو ٹھاری ہوں۔

کرامت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہیروں کا تاج بنوایا گیا تھا۔ درو جو ٹھاری ہوں۔

آٹھویں رات مہاراج نے برٹش ریڈیٹنٹ ہسٹریل انڈیا ایجنسی اور بمبئی پریزیڈنسی سے آئے ہوئے انگریز حکام اعلیٰ کو ڈنر پر بلایا۔ دلتوا نے ساتی گرمی کی۔ اس شام انھوں نے کانوں کے بالی پتے اتار کر دلائیٹی آویزے پہنے تھے۔ پیشانی پر بالوں کے پھتو، قرمز رنگ کی بنا رسی ساڑھی۔ مہاراج دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کام کنڈلا خطاب عنایت کیا۔ سمرات بکر ماجیت کی راج نرنکی کام کنڈلا۔

ڈو بجے صبح تک خود کام کنڈلا فرانسسی شراپیں کافی مقدار میں اڑا بھکی تھیں سکھیاں میں سوار ہو کر رنگ بھون کے مہان خانے واپس پہنچیں۔ طویل راہداریاں طے کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوئیں۔ سنگی جانی والے تابدانوں سے چھپتی چاندنی نے کمرے میں اجالا بکھر رکھا تھا۔ کونے میں لیمپ روشن تھا آفتدان میں آگ دہک رہی تھی۔ رنگ بھون کے اسٹاف کی ایک داسی اندر وسیع ڈریسنگ روم میں مچو خواب تھی۔

دلنواز نے دوشالہ صوفے پر پھینکا۔ ایک دم سردی سی محسوس ہوئی پڑاٹے کی گوٹ کی رام پوری رضائی جو دئی سے چلتے وقت مکمل کرائی تھی پلنگ پر بڑی نظر آئی۔ لباس تبدیل کرنے سے پہلے رضائی اوڑھ کر آتش دان کے قریب بیٹھ گئیں۔ منٹ بھر ہاتھ تاپے۔ صحرا کی رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ آگ کے اور قریب ہو کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں پہنچے کا پرسی بند اتارنے میں مشغول ہوئیں۔ کوئی ایک کے سرد کی وجہ سے پتہ بھی نہ چلا رضائی کا ایک کونہ آگ میں جا گرا۔ روٹی بھڑک اٹھی۔ پل کی پل میں دلنواز عرف بیگمال کشمیرن کا تین چوتھائی چہرہ اور جسم ٹھلس کر رہ گیا۔

العظمتہ اللہ۔ جو چند منٹ قبل کام کناڈا تھی اب شمشان کے شعلوں میں لپیٹی ایک چڑیل۔ ہیبت رت کی سرد موتوں میں بھیرا اپنے بیل پر سوار صحراؤں سے گذرنا جاتا ہے۔ مہاکال جو پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔

ہمارا جی صاحب نیلم گڈھ کے انگریز سرجنوں اور حکیموں کے طویل علاج معالجے کے بعد شفا یاب ہو کر دلنواز دئی لوٹیں اس وقت تک ان کا قلب بالکل لوٹ چکا تھا۔
تایب ہو گئیں۔ (اس کے علاوہ اور کبھی کیا سکتی تھیں کسی بگڑے دل نے کہا۔)

مقتح کی طرح نقاب مسکاد تو بھیا تک صورت۔ ہیبت طاری ہوئی ہے۔ گھر کے باہر نقاب گھر کے اندر گھونٹ۔ جس میں سے نصف چہرہ جو چلنے سے بچ رہا تھا نظر آجاتا ہے۔
آدھی گوری پاروتی۔ آدھی بھدر کالی۔ جوگے مایا۔

آتشزدئی کے حادثے کے وقت چالیس کے اوپر تھیں لیکن عجم عشاق میں کمی نہ آئی تھی۔ چند سال بعد بحیثیت جانشین منوڑی کشمیرن برادری کی چودھرائن کی مسند پر رہا جئیں۔ انھوں نے مصلے اسنبھالا۔ دھن یوں کا گرو نہ کیجیے۔ جھوٹ و چن مت بول رے۔ گھونٹ کا پٹ کھولا تو ایک خوفناک صورت۔ تجھے پیالیں گے۔

بیری والے پیرچی کے آنگن میں ایک بیرٹپ سے برقعے کے دامن پر گرا۔ پیرچی نے ٹھا کر انھیں عنایت کیا۔ فرمایا: ”یہ جنت کا درخت ہے۔ اسی کے پتے اُبال کر مُردے نہلاتے باتے ہیں۔“

— ایک غریب الوطن مُرا فراس شہر سے جانے والا ہے۔ اسکے سفر آخرت کے لئے حضور کی امداد درکار ہے — دنوآز نے سر جھٹکا۔ پیرچی بیران کی ہتھیلی پر رکھ کر دیا تھے —

”یہ بشارت ہے۔ خداوند کریم شاید تم کو معاف فرمادے —“
دنوآز نے بیعت کی۔ ایک مسکین سا مُرید پیرچی کی چلیں بھرنے پر مامور تھا۔ مرشد نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر حاضر ہوا۔ ”کل پاک صاف کپڑے پہن کر بعد نماز جمعہ آجانا — اور تم بھی —“ انھوں نے دنوآز کو حکم دیا۔

بروز جمعہ پیری والے شاہ صاحب نے شربت کے پیالے پر مسماءِ دنوآز بانو بیگم بنت عثمان بیگ شہید کا عقد اس لاؤ لارنڈو سے مرید سے پڑھ دیا۔ شرع محمدی پوری کی۔ بعد نماز مغرب اپنے مہول الحال شوہر کے ہاں پنڈت کے کوچے منتقل ہو گئیں۔
اب وہ ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتیں۔ موٹے ٹھوٹے کپڑے پہنتیں۔ سنت رسولؐ کا اتنا خیال کہ لباس میں دس دس پیوند — شوہر ایک مطب میں نسخے باندھتے تھے۔ ان کی قلیل تنخواہ میں گذر کرتیں۔

ایک روز ڈولی کر کے چاؤڑی پہنچیں۔ مہر دو کو سمجھا یا بچا یا کہ وہ بھی تو بہ کرے۔ وہ ہرگز نہ مانی۔ چودھری فتنے کچھ نہ بولے۔ چپ چاپ بیٹھے۔ تسبیح پھیرا کیے۔

دنوآز نے انھیں گلی کاستھاں روانہ کیا۔ منشی رام سرن وکیل کو بلا کر اپنی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ مہر دو کو بخش دی۔ کچھ رقم سید کے مدرسے کے لئے علیگڑھ منشی آرڈر کر دی۔ قانونی لکھا پڑھی کے بعد ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عازم بیت اللہ تھیں۔ پراہیک دھیلابھی اپنے لیے نہ رکھا۔ گناہ کی کمائی سے حج جائز نہیں۔ چند روز بعد خاوند

نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا۔ دونوں بمبئی روانہ ہوئے۔

کشمش رنگ کا بڑا سا پگڑا باندھ لائیں ٹیکتے۔ جو دھری فتح محمد دکھیا خدا حافظ کہہ اسیشن پر آئے تھے۔ پگڑی کے شملے سے اپنے آتسو پونچھا کئے۔ کہا تو اتنا کہا — ”بیرٹ سہراب نگر سے چلتے وقت تو بار بار دہرائی تھی جاؤ پوت دکھن وہی کرم کے لچھن — آگ میں جلی تب بھی یہی رٹا کی۔ اب بتا۔ تجھ سے بڑا خوش قسمت کون ہے؟ بیٹا میں تیر ماموں نہ سہی پر جب کعبہ شریف کا پردہ تھام کر اپنے بزرگوں کی مغفرت کی دعا کرے گی؟ بد بخت کی بخشش کے لئے بھی ہاتھ اٹھا لہجو —“

میاں بیوی تھر ڈکلاس کے دھکے کھاتے بمبئی وارد ہوئے۔ بھنڈی بازار۔

حاجیوں کا مسافر خانہ افلاس زدہ آسامی اور بنگالی مسلمانوں سے پٹا پڑا تھا۔

جننی دیرمیاں ٹکٹ وغیرہ کی دوڑ بھاگ کرتے یہ ہال میں بیٹھی دوسری پردہ نشینوں کی طرح برقعے میں ملفوف دیوار کی طرف منہ کئے رہتیں کھانا بھی اسی طرح کھاتیں۔

سرائے طغرل بیگ سے روانہ ہونے والی کلمہ گو ڈیرے دار کے رتھ میں گویا بم دونوں کی سواری کے بیٹھے جتے ہوئے تھے۔ بمبئی سے جدہ کے لئے لنگر اٹھانے والا مشرک فرنگیوں کا دغانی جہاز سیفینہ نوح تھا کہ بنت مرزا عثمان شہید کو سلامتی کے کنارے کی سمت لئے جا رہا تھا۔ لال تلخے کی پروردہ بچی دلنواز یا نو بیگم پچیس سال قبل معدوم ہوئی۔ چاؤڑی کی دلنواز عرف بیگماں اب غائب۔ ایک نقاب پوش عزیز بد قطع عورت اپنے مفلس شوہر کے ہمراہ لیتیک اللہم لیتیک پکارنی مکہ معظمہ جا رہی ہے۔

دُعَاؤُنْ كَا سَفَر

مکہ اور شہرب کی گلیوں میں میاں بیوی نے کئی برس گزار دیئے۔ مدینہ منورہ میں آبی بی بی کے مزار مقدس کے نزدیک جانے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔ جلتی ریت پر دو روٹی بٹھی دھاڑیں مار مار کر رو دیا کرتیں۔ یا خاتونِ جنت میری شفاعت کروا دیجیو۔ یا بی بی مجھے بخشو! دیجیو۔ یا بنت رسول اللہ! اس گناہ کا رکنیز پر کرم کیجیو۔ یا میری شہزادی — میاں بیوی نجف اشرف کربلائے معلیٰ کا ظہین اور بڑے پیر کے روضے کی زیارات سے مشرف ہوئے۔ مکہ شریف میں شوہر ایک میتی عطار کی دوکان پر نوکر ہو گئے تھے۔ ایام حج میں متمول ہندی مسلمانوں کی خدمت کرتے۔ اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی۔ بڑی عسرت اور قناعت کی زندگی دونوں کی تھی۔ حرم شریف میں بیٹھ کر نفلیں پڑھا کرتے دنو آزا اپنی قسمت پر رشک کرتیں اور اللہ کے کرم پر متحیر رہتیں اس غفور الرحیم نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

سدا کے روگی شوہر مر گئے۔ چند مہینے عثمانی حکومت کے ایک ترک افسر کے ہاں ماما گیری کی۔ خانم بہت نک چڑھی تھی اس سے نہ پٹی۔ ترکمن کی نوکری ترک کی۔ فاقوں کی نوبت آگئی۔ حج کے زمانے میں گداگری اختیار کرنا گوارا نہ تھا۔ ماں جانی کی محبت نے جوش مارا ابھی کا ایک دولت مند مہین کنبہ حج کر کے واپس جا رہا تھا۔ خدیجہ بانی سبٹھانی نے ان کے حال زار پر ترس کھا کر جہاز کا ٹکٹ خرید دیا۔ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

بائیس^{۲۲} خواجہ کی چوکھٹ پر واپس پہنچیں۔ تسیجوں اور دینی کتابچوں کا بکس یمنی عطار کے تیار کردہ چورن کی شیشیاں مع نسخہ جات ساتھ لائی تھیں۔ برائے

تجارت - ریوے اسٹیشن پر اتر کر تاکہ کیا - سیدھی پہنچیں قتلی قبر - معلوم ہوا پیری والے شاہ صاحب کا وصال ہو چکا - ان کا زر پرست اور ڈھونڈی بھتیجا سجاد سے پرہٹھا تھا - ڈوڑھی کے اندر گئیں - پیرانی اماں کے ہاتھ چڑھے - چند روزہ قیام کی اجازت چاہی - ساہبان کے ایک کونے میں بڑا سفر کی تکان کی وجہ سے ایسی بے خبر سوئیں کہ دوسرے روز دوپہر کو آنکھ کھلی - ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں - گھر والوں کو قیام عربستان کے واقعات سنائے - ان کی واضح بیرونی محسوس کی - بڑی ہونے کھانا سامنے رکھا - چند لقمے زہر مار کر کے برقعہ اوڑھا - ڈولی بلانی -

فانوس اور ہانڈیاں روشن ہو چکی تھیں جب اپنے سابق بالا خانے پر پہنچیں - جو دراصل منواری کشمیرن کا بالا خانہ تھا - پھر دنو از عرف بیگماں کا کہلایا - اب مہر و کا کمرہ کہلاتا تھا - کبھی کی جائیداد بادشاہوں اور حکمرانوں کی حکومتوں کی طرح کچھ سہہ نہیں کل کس کے قبضے میں ہوگی -

سنہ ستادون کی فتح کے بعد لال قلعہ انگریزوں نے خانی کروایا - سینکڑوں عورت سلاطین زادوں کی مجبواؤں نے چاؤڑی آباد کی - وہ بھی عبرت کی جانتھی کہ چاؤڑی میں کچھ عرصہ قبل شاہجہاں آباد کے اصل حاکم مرہٹہ سردار عدالت لگاتے تھے - یہ بھی مقام عبرت -

حیثیت نام تھا جس کا -

سابق مغنیہ اور قاصدہ دنو از عرف بیگماں ڈولی سے اتر کر اپنے مانوس زینے پر گئیں - محض آٹھ سال قبل یہ ساری عمارت ان کی ملکیت تھی - نیچے دوکانیں - اوپر وسیع مکان - بازار کے رخ طویل بالکنی - جس پر چھپیں پڑی رہتی تھیں - اندر ایک پردے دار کوٹھری میں مہر و کی بہو رہتی تھی - مہر و کا نوجوان لڑکا شند و اب طائفے کا منجر تھا - مہر و کی لڑکی شتمو کے جمال جہاں سوز اور گلوکاری کی وہی شہرت تھی جو آج سے تیس بیس سال قبل اس کی ماں اور خالہ نے حاصل کی تھی -

زینے پر پہنچ کر دلنوازا چانک بہت گھبراہٹیں نیچے روسائے شہر کی بگھیاں —
— اوپر لال کمرے میں محفل شعر و سخن جاری —

دلی کی مقبول ترین معینہ مہر و اپنی ذہانت اور حاضر جوابی کے لئے مشہور تھیں۔ فن طباطبائی میں طاق — ابھی چند روز قبل جب صاحب گورنر جنرل کشور ہند کلکتہ سے انٹرویو لائے۔ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے ان کا بیچ کیا گیا میزبانوں میں مہر و بھی شامل تھیں۔ ان کے ہاتھ کا پکا بڑا نور مخلی موٹی پلاؤ حضور و ایسے بہادر نے نوش فرمایا۔ کھٹک کی ماہر دلنوازا اور مہر و اور انکی ہم پیشہ بہنیں گویا اس سوسائٹی کی گیشا گرنہ تھیں۔ کہ جاپان کی طرح یہاں بھی گھریلو بیویاں سوشل تقاریب میں شامل نہ ہوتی تھیں نہ ہندو۔ نہ مسلمان۔ سوائے کلکتہ بمبئی کی چند فرنگی چال ہندو پارسی اور سیامانی بوہری جو ختی خواتین کے۔ بھرت ناٹیم کی ماہر دیو داسیاں جنوبی ہند کی قدامت پرست ہندو سوسائٹی کی گیشا تھیں۔

اس وقت، ۱۸۹۲ء میں، دیو داسی راج رتنم کو مدرائے میں اور بی مہر و جان کو دلی میں یہ بتلایا جاتا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب اسی ہندوستان میں اعلیٰ نسب شریف زادیاں اڑیسی کچی مڈی موسنی آتم بھرت ناٹیم کھٹکلی اور کھٹک ناچیں گی محفلوں میں گائیں گی۔ بن ٹھن کے مشاعروں میں غزل سراہونگی آدم زاد آسمان میں تھگلی لگائے گا۔ کھٹک کی تکار کرنے والی نرتکی سماج کی تھنکا رکے بجائے سرکاری اعزاز حاصل کرے گی تو دیو داسی راج رتنم سوچتیں یہ آدمی بھنگ پی گیا ہے اور مہر و اس سپیش گوئی کو شاہ بڑے کی گپ گردانتیں۔

چمپا کھلی — گلاب کھلا — موتیا کھلی — مہر و داغ کی غزل سنا چکی تھیں کہ مہری نے پیچھے سے آکر سرگوشی کی — ”بیوی ایک بڑھیا نیچے دروازے پر کھڑی ہے۔ حج کر کے لوٹی ہے۔ تم سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہے۔“ خوشی کے مارے مہر و کا

دل دھڑکنے لگا۔ آپا اگتیں۔ حاضرین جلسہ سے اجازت طلب کر کے مسرور و مضطرب زینے کے دروازے پر پہنچی۔ آپا کا آدھا سوختہ چہرہ اندھیرے میں نظر نہ آیا۔

مہر و نونے بے اختیار آگے بڑھ کر بہن کے گلے لگنا چاہا۔ دننواز ایک قدم پیچھے ہٹیں، مہر و وقت بھری آواز میں بولی ”سلام آپا۔ عمر دراز۔ اندر تو آؤ۔“

بولیں ”جس روزان سیرٹھیوں سے اتری قسم کھائی تھی اب اس پلید جگہ قدم نہ رکھوں گی۔ اب تو یہ گنہہ گار پاؤں حرم شریف، مدینہ منورہ، کربلائے معلیٰ“ گلاڑندہ گیا۔

سنبھل کر واعظانہ انداز میں پھر بات شروع کی ”مہر و بندسی۔ بس انتنا کہنے آئی ہوں کوچ نگار ابجنے سے پہلے پہلے اب بھی توبہ کرے۔ جانے کس گھڑی

ملک الموت تیری روح قبض کرنے آجائیں۔ بڑھا پا دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔ جب تجھے مسافر بنا کر گور میں اتاریں گے یا رشتنا تیرے مٹھی بھر مٹی ڈال کر واپس چلے جائیں

گے۔ گور کا گڑھیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیر اور تو۔ اور تو اور۔ بنو۔ سہمرا دہی ساتھ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ تختوں تلے منوں خاک کے نیچے نقد دم اکیلی۔ منکر نکیروں کو کیا جواب

دے گی۔ ہنس۔ ہاں۔ اور جب بروز قیامت تو سر سے مٹی جھاڑنی قبر سے نکلے گی۔“ مہر و حق دق آپا کا منہ تک رہی تھی۔ زینے کی تاریکی میں تجن بی کے اس غیبہ متوقع

اور ناگہانی ہیبتناک وعظ نے اٹنا اثر کیا۔ موت سے وہ بے حد خوفزدہ تھی کہ چھ سال کی جان نے پورے خاندان کی لاشوں کے ساتھ سارا دن اور آدھی رات بتائی تھی معاً

طیش آگیا۔ بڑی بی نے آتے کے ساتھ کیا بدشگون کی تقریر بھرا ڈی۔ ملک الموت آئے دشمنوں کے پاس ”اے آپا بیگمات۔“ اس نے ہاتھ نچا کر کہا ”اچھی بہنا ہو۔ نہ سلام نہ

دعا۔ نہ خیر خیریت۔ آٹھ برس بعد لوٹیں تو چھوٹے ہی گور گڑھا کرنے لگیں۔ اے تم تو اب فوارے پر جا کر پادریوں سے مناظرے کرو۔ اے ہاں مردے شونی ملانی نہیں تو۔“

ذرا اپنا غصہ دھیمہ کیا۔ بولی ”اچھی یہ تو بتلاؤ۔ کب آئیں۔ کہاں ٹھہری ہو۔“

جین بی چپ کھڑی تسبیح پھیرا کہیں۔

”آپا۔ اے آپا۔ اے بی کیا بہری بھنڈا بھی ہو گئیں؟ کس حال میں ہو؟“

— پھر تاؤ آیا — ” باقی یہ کہ بوا میری فکر نہ کر جس پاک پروردگار قادر مطلق نے مجھے اس کو ٹھے پر پہنچایا اسی سے روزِ محشر جواب طلب کر دوں گی۔ اسے بی ہم تو معصوم بچیاں تھے۔ اس پالنہار نے ہمیں یہاں کیوں پھینکو ادیا؟ اپنی مرضی سے تو ہم یہاں آئے نہ تھے — پہلے ہمارے ماں باپ بہن بھائی سارے کنبے کو اس اللہ پاک نے تنگنوں خاکوں کی تلواروں سے ذبح کر دیا۔ پھر چند گھنٹوں بعد اس میرے رب کریم نے مجھے اور ہمیں ایک کچھنی کے حوالے کر دیا۔ آپا بیٹھ جاؤ کب تلک کھڑی رہو گی۔“

صحن میں سے ایک مونڈھا گھسیٹ کر زینے میں سرکا دیا۔ حجن بی لٹس سے مس نہ ہوئیں۔ مہر و نے تھک کر کواڑ سے ٹیک لگالی۔

دفعتا پھر گویا ہوئیں۔ ”مان جا ہر و۔ قیامت سہرہ کھڑی ہے۔ کہیں تیرا حشر منوری کشمیرن کے ساتھ نہ ہو۔“

”قیامت؟ اجی قیامت اس روز طغرل بیگ کی سر ایس آکر گذر گئی اب اور کیا آئے گی۔ آئی تو دیکھ لیں گے۔ رہیں اماں منوری۔ تو اچھی یہ تو بتاؤ اس رات اگر ہم دونوں بھوک سے بلبل کر جان نہ دیدیتے تو یا جنگلی جانور ہم زندوں کو نوج کھاتے یا کوئی مواسکھ تنگنا جاٹ اٹھائے جاتا۔ اُپلے تھمواتا بھنگی کے ہاتھ پڑ جاتیں۔ جھاڑو ٹوکر اکر داتا آج کسی گاؤں کھڑے میں پڑے جھینک رہے ہوتے یا دلی پہنچتے تو جامع سید کی سیرٹھیوں پر بھیک مانگتے۔ ارے اماں منوری تو فرشتہ رحمت تھیں۔ کیا ہمیں لاشوں اور گیدڑوں اور مردہ خور جنگلی کتوں کی دوسرا تھ میں چھوڑ آئیں؟ ہم کو جو عیش آرام عزت دولت یہاں —“

”شیطان بے پناہ مانگ مہر و کفر نہ بک تو بہ کر —“

”بیوی خان بہادر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔“

”آئی ہوں۔“ چند سال قبل مہر و نے سب سے کہہ دیا تھا آپا کلمتہ شریف میں

انتقال ہو گیا۔ لوگ انہیں بھول بھال چکے تھے مگر اے لووہ تو سامنے موجود ہیں بھوت کی طرح۔

ہندی میں بھوت کے لغوی معنی ماضی کے ہیں۔ اردو میں بدروح۔ لغوی طور پر ہرگزرمی ہونی چیز بھوت ہے۔ بھوت کال یعنی ماضی میں شامل۔ بھوت کو بھگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپا کو کس طرح اپنے آپ سے اتارا جائے؟ بے چاری دکھیا ماری میرے وجود کا حصہ ہیں۔ سگی بہن۔ مگر اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بھوت ہیں۔ ججن بی نے ہار نہ مانی۔ لولیس! اور جو میرا آپا جل گیا سارا۔ وہ از غیبی مار نہ تھی؟ گوان کو محسوس ہوا کہ مہر کی منطلق کے آگے ان کی تاویل ذرا کمزور پڑ رہی ہے۔ برفعہ پھیلا کر فریش پری بیٹھیں۔ مہر و مونڈھے پر تنگ گئی۔ عثمانی سائن کا کلی دار پانجامہ اور طلاکار جو نیاں پہنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے شوخی سے بحث کرتی وہ اصل ”مونڈھے والی“ معلوم ہو رہی تھی۔

”وہ حادثہ تھا آپا۔ بڑے بڑے نیک نمازی پرہیزگار اللہ والے حادثوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اے لوا بھی پرسوں سے پتے روز اخبار میں چھپا تھا کہ حاجیوں کی ایک اگن لوٹ میں آگ لگ گئی۔ سینکڑوں حاجی جل کے راکھ ہو گیا۔ تمہیں کتنا سمجھایا۔ ذرا سا چہرہ مجلس گیا تو کیا ہوا لوں سنیاں نہ لو۔ تمہارے گانے کے قدر دان تم کو اس طرح سراہتے۔ وہی آؤ بھگت ہوتی۔ مگر تمہاری تو اس بیری والے بوبک نے مت کاٹی۔ دنیا چھڑوادی۔ ایک فقے کے پتے باندھ دیا۔ برسوں پردیس کی خاک پھانکی۔ چلو اللہ توبہ اللہ معاف کرے حج کرائیں اچھا کیا۔ مبارک ہو روز حشر ہماری سفارش بھی کر دینا۔ مگر اب تو گھر لوٹ آؤ۔“

”مہر و۔۔۔ ماموں جی کیسے ہیں؟“

”ان کو تو عمرے بھی چار ساڑھے چار سال ہو گئے۔“

”اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے۔“

”گھر واپس آ جاؤ اور یہیں بیٹھ کر سب کے گناہ بخشواتی رہو۔ جم جم آؤ۔ ہم سب

ہاتھوں چھاؤں کریں گے بھانجی بھانجا ہو تمہاری خدمت کو حاضر ہیں۔“
 دن تو اڑ چپ رہیں۔ اس لمحے ان کے قدم ڈگمگائے۔ باورچی خانے سے لذیذ کھانوں
 کی لپٹیں آرہی تھیں۔ عربستان کی پھینکی سیٹھی غذا کھانے کھاتے عاجز آگئی تھیں۔ یہاں
 دو وقت کی روٹی کا سہارا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تنہائی
 میں بزرگان دین سے ایک طرف گفتگو کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اپنے مرحوم پیر صاحب سے
 لو لگائی۔ بند پوٹوں کے سامنے پیری کا درخت سرسرا یا جنت کا پیر جس کے پتوں میں ابلے
 پانی سے آخری بار نہلائی جائیں گی۔ سفید کھڑکھڑانے لٹھے کا تھکان۔ فینچی۔ تختے گھڑے
 کوری چٹائی۔ آن واحد میں سب کی جھلک نظر آگئی۔ آنکھیں وا کیں۔ پیری گوندنی میں
 تبدیل ہوئی۔ ایک چڑ بانک عورت سامنے مونڈھے پر براجمان تھی۔ گوندنی جیسی سونے
 میں پیسی۔ رات کی آرائی جیسی معطر کام کٹڈلا۔ بیباک۔ جیباختہ۔ انھوں نے اس
 اجنبی زن فاجتہ کو مخاطب کیا۔

”نہیں مہر و اب چل چلاؤ ہے۔ جنے کس وقت بلاوا آجائے۔ سات حج کرنے کے
 بعد اب یہ دلہیز نہ پھلانے کی“

”رہو گی کہاں؟ وہ تمہارے لگھ بھگت تو گئے مر۔“

”مہر و بندری ان کا وصال ہو گیا۔ بد زبان۔ بے ادب۔ کافر نی۔ پہلے تو ایسی
 گستاخ نہ تھی۔“

”اب بات یہ ہے آپا۔“ مہر و نے بڑے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا ”تمہاری
 دعا سے اب میرے ہاں بڑے بڑے انگریزی داں عالم فاضل آیا کرتے ہیں۔ دوچار
 مہربان سید کے مدرسے کے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ شعر و شاعری کے چکر میں وہ بھی آجاتے
 ہیں۔ اس وقت بھی اندر بیٹھے ہیں۔ تو یہ لوگ آپا بیگم آپس میں ولایتی فلسفہ بگھارتے ہیں
 — چار باتیں میرے کان میں بھی پڑ جاتی ہیں یوں کہتے ہیں کہ نہ حضرت آدم نھے نہ اماں
 تو — شروع میں بند رہتا۔ یوں کہتے ہیں کہ یہ جنت جہنم عذاب نواب جزا
 سزا سب ڈھکوسلہ ہے۔“

”اللہ بخٹے آکا نوشتہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے۔ یاد ہے ایک مشاعرے میں وہ غزل انہوں نے پڑھی تھی۔ بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ عہم کو معلوم ہے حنت کی حقیقت لیکن —“
 ”ہائے مہر و نہختی — ہر طرح سے ماری گئی۔ گناہ فلک کی گردش نے کرائے۔ دین اسلام خود بڑی صحبت میں بیٹھ کر کھویا۔ نوح اگر مجھے معلوم ہونا انگریزی پڑھ کر یوں ایمان غارت ہوتا ہے کا ہے کو علی گڑھ چندہ بھیجتی —“

”آپا اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم ہی کہو ہو کہ اس کے حکم بنا پتہ نہیں ہلنا: اتنے میں مہر دو کو پکا ترانا انگریزی قرآن کا ایک جٹیلین لال کمرے سے نکل کر صحن میں آہنچا ”اچھا اللہ محمد کے حوالے —“ جن بی نے کہا اور گھر آکر فوراً نقاب میں منہ چھپا لیا۔ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ زینے کی نیم تاریکی میں غائب۔

جس وقت چلتی قبر پہنچ کر بیرمی والے مکان پر اترتی ہیں اطمینان کا سانس لیا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ گھر والے کھانا کھا چکے تھے۔ جن بی سیلپر گھسیٹی داخل ہوئیں۔

”آو بیٹھو“ پیرانی اماں نے رکھانی سے کہا۔ وہ مرموم پیر جی کی پوتھی اور سب سے کم سن بیوی تھیں۔ جب نو سال قبل جواں سال دلنواز آگ میں جلنے کے بعد پیر جی سے بیعت کرنے آئی تھیں۔ تب سے پیرانی اماں ان سے بے آگ جلتی تھیں۔ یہ نکاح کر کے عرب چلی گئیں انہوں نے شکر ادا کیا۔ خیر۔ بڑے میاں خود ہی اللہ میاں کو پیارے ہوئے۔ مگر اب جو یہ دوبارہ آن ٹیکیں ان کو بٹھلا کر کون کھلائے گا۔ تعویذ گنڈے کی آمدنی لفظ۔ بھتیجا جعلی پیر۔ نوسکھ اور انارٹمی۔ اللہ ماری تینوں سوتوں کی اولاد اور پوتوں پوتیوں کی پلاٹین کا پیٹ پالنا۔ تنٹیا مریج بہوئیں۔ اوپر سے ان بلائے بے درمال کو سہیڑوں۔
 ”اے بی جہاں گئی تھیں وہاں کھانے کو تو نہ ملا ہوگا۔ کہاں گئی تھیں؟“
 ”آئیے کھانا کھا لیجئے“ ایک بہو نے آواز دی۔ بھاری قدموں سے جو لے پائیں

ہونے پچھلے سالن سامنے رکھا جنگیری سے روٹیاں نکالیں۔ مہر کی التجائیں یاد آئیں۔
- آپا نہ جاؤ، کہاں در بدر کی ٹھوکریں کھانی پھر وگی۔

دوسری صبح سے جتن بی اپنا وجود کارآمد ثابت کرنے کے لئے کمر بستہ ہوئیں۔
مسالے پیسے — چینگڑ پولوں کو نہلایا دھلایا۔ بڑیاں توڑیں۔ سیروں آٹا گوندھ ڈالا۔
ہفتہ بھر اس طرح گذرا۔ اب پیرانی اماں اور ان کی بہوؤں نے انکو باقاعدہ ماما چھو چھو
سمجھ لیا۔ ہر وقت کی دُوبدو۔ بیگیاں پندرہ روزہ میں اس دانٹا کھل کھل اور مشقت سے
چہیں بول گئیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ٹھانی۔ اب تک ہمت نہ پڑی تھی کہ درد
جا کر تھیں اور چورن سچیں۔ اور رات کو سوئیں کہاں؟ اب اللہ کا نام لے کر اعلان کر دیا
”پیرانی اماں لو میں چلی۔“

”اے بی کہاں جاؤ گی گئی کوچوں کی خاک چھاننے۔“ پیرانی اماں نے اخلاقاً کہا۔
”نہیں بس اب چل ہی دوں۔ جمجرات کی جمجرات حاضر ہوں گی۔“ جتن بی نے ہونٹ
پچکا کر جواب دیا۔ ”بو عجب بند بہیں چھوڑے جانی ہوں۔ پھر آکر لے جاؤں گی۔“

پیرانی اماں چپکی بیٹھی جھالی کرتا کہیں۔ بیگیاں نے دالان کے کونے میں رکھے
اپنے ٹرنک میں سے دو درجن رنگ برنگی سیخیں نکال کر کلائی میں ڈالیں۔ چورن کی
شیشیاں صدری کی جیبوں میں ٹھونسیں۔ بیٹھی ایڑی کی سلیم شاہی گھسیٹتی مکان سے
نکلیں۔ کچھ فاصلے پر ایک شاندار خانقاہ کے صحن میں سرو کے درخت سرسرا رہے تھے۔
بیرونی احاطے میں میرزا جان جاناں منظر کا مزار نظر آیا۔ سوچا معلوم کر دوں شاید زنا خانے
میں ماما گیری مل جاتے۔ نہیں۔ اگر یہاں بھی گت بنی تو؟ بہتر یہی ہے کہ چورن اور تیسوں
سے جو چنڈا آنے روز ملیں نابنائی سے خریدوں نان قلبیہ اور کسی درگاہ کے کونے کھدے سے
میں جہاں فقیر نیاں سوئی ہیں سوزنی بچھا کر وہیں پڑ رہا کروں۔ اللہ رزاق ہے۔

لیکن نہ آدم نہ خوا۔ شروع میں محض بندرت تھا؟ تو بہ۔

دشمنِ ماریہ

گلرخ بانو عرف نواب فاطمہ بنت مرزا دلدار علی برلاس نظر فروش ساکن گلی شادآزارا دلی

گلرخ بانو بیگم نام دادا نے رکھا تھا جو تازہ وارد ولایتی مغل تھے۔ نواب فاطمہ نانا نے جن کے ایرانی قزلباش اجداد نوجواں کے زمانے سے شادگانگ آگرہ میں رہتے آئے تھے۔ پیدائشی سبز قدم تھیں کہ نہ ہیاں ددھیاں سب پر لگتا تھا بی بی کی جھاڑو پھر گئی۔ جو غدر پڑ مارے جانے سے بچے ان کو — نٹھو نٹھو — دباؤں نے چن لیا۔ پانچ سال کی تھیں بیٹھے ہیں ماں اور آٹھ سالہ اکلوتے بھائی نے قضا کی۔ دلی کے صاحبِ جہنیت عطر فروش اور کبوتر بازی کے دلدادہ باپ نے بوڑھی پڑوسن کی مدد سے پالنا شروع کیا دوسری شادی کی فکر میں تھے کہ نپ دق کے ننگا سہو گئے پلنگ پر پڑے رہے۔ اب ننھی منی نواب فاطمہ باپ کی تیمارداری میں لگ گئیں۔ وہ لیٹے لیٹے خوش الحانی سے سوز اور مرانی پڑھا کرتے۔ اور روتے۔ دوکان اپنے عزیز ترین دوست مرزا سبط احمد کے سپرد کی بی بی کا انگریزی علاج ہرگز نہ کروا یا کہ الکحل آمیز ادویہ کیسے پیتے۔ یونانی جاری تھا جب حالت دفعتاً بگڑی۔ پنجتن پاک کی گواہی چہار دہ معصومین کا واسطہ دیکہ بچی مرزا سبط احمد کے سپرد کی۔ مرزا صاحب کشتہ زلی کی عدالت میں پیش کیا تھے۔ مرتے وقت مرزا برلاس نے یوں کہا بھائی سبط نواب فاطمہ تمہارے توالے۔ یہ مکان دکان بھی تمہاری امانت۔ بچی سیانی ہو جائے تو ایک نیک شریف اثنا عشری کھر مغل زادہ دیکہ کر اس کا عقد کر دینا مکان دکان اس کے جہیز میں دینا۔ جو نقد می تمہارے توالے کر رہا ہو اس سے اس کے کپڑے لیتے گھنہ بنا دینا۔ کچھ اس کی مرحومہ ماں بنا گئی ہے۔ ۱۔

مرحومہ کے زیورات کا صندوقچہ بھی تم کو دینا ہوں۔ نواب فاطمہ کی شادی سے پہلے نہ کھولنا۔ کبھی شوق میں عید بقر عید نوروز پر زیور پہننا چاہا۔ بچہ بے گنوا دیگی۔ بس اس کی شادی کے وقت ہی کھولنا۔ زیوروں کی فہرست صندوقچے کے پیش تختے میں موجود ہے۔ جو نقدی کم کو دینا ہوں میری تجہیز و تکفین فاتحہ۔ اور مجلس کے بعد جو بچے بنک میں نواب فاطمہ کے نام سے اکاؤنٹ کھول کر ڈال دینا باقی جب تک تمہارے ہاں رہے اپنے گھر جانے سے پہلے، اس کے اوپر جو خرچہ آئے اس رقم میں سے منہا کرتے جانا“

مرزا دلدار علی تاجر آدمی حساب کتاب کے پکے۔ ایک ایک بات اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے متعلق اپنے دوست سے طے کر کے سارا انتظام بچتہ کر کے مرے بچی کے ولی نود عدالت کے پیش کار قانونی آدمی مرزا کی وفات کے فوراً بعد رونی سپیٹی چھاڑیں کھائی آٹھ سالہ نواب فاطمہ کو اپنے ہاں لے آئے۔ چلتے وقت نواب فاطمہ کی گڑیوں کی سرخ پٹاری بھی ساتھ لے لی۔ صندوقچہ زیورات گڑیوں کے نیچے چھپا دیا۔ بچی کو ایکے پر بٹھال کر اپنے گھر پہنچایا۔ گھر پہنچتے ہی زیورات کا صندوقچہ پٹاری سے نکال اپنے آہنی ٹرنک میں مقفل کر دیا۔ اس رات نواب فاطمہ روتے روتے بھوکے سو گئی۔ چراغ کی روشنی میں سبط احمد کی بیوی نے صندوقچہ ٹرنک سے نکالا اور پھلی کو ٹھہری کا کچا فرش کھو دکر اس میں دفن کر دیا۔ بو اس زمانے میں لوگ بنکوں میں زیور کہاں رکھیں تھے۔

نیچے کے بعد مرزا سبط احمد مرزا دلدار علی مرحوم کے مکان کا سارا اثاثہ دو چھکڑوں پر لا کر اپنے گھر لے آئے۔ مکان کرائے پر اٹھا دیا۔ خوشبو خانے کے بیٹھنے اور کنٹرہ سب اپنی تحویل میں لئے دوکان پر قبضہ کر اپنے بیٹھے کو اس پر بٹھا دیا۔

نواب فاطمہ ان کے گھر میں دن رات رویا کرتی۔ زندانِ شام میں مسلسل گریہ فرماتی بناب سکیئہ کی ایک بے زبان کینز۔

مرزا سبط احمد کی بیوی نے کہنا شروع کیا۔ کیا نحوست سمیٹ لاتے بھجنت کے آنسو ہی نہیں تھمتے دور دقان کا لامٹہ۔ باپ کی موت اور اچانک اپنا گھر چھوٹ جانے کا ایسا دہا کا لڑکی کے دل پر بیٹھا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے پتے کی طرح لرزنے لگتی۔ گھنٹوں گم سم پتی

یا پھر رونا شروع کر دیتی۔ ”کچھ ہاتھ بھی بلا شہزادی گلکرسخ، مرزا کی بیوی ایک روز اسکے آگے آئے گا کو نڈارکھ کر بولیں۔ اب وہ دن بھر کام کرتی اور روتی — اس گھر میں آئے ایک مہینہ گزرا تھا برتن دھوتے میں ہاتھ سے چینی کا ڈونگا کر ٹوٹ گیا۔ مرزا صاحب کی بیوی نے چلانا شروع کیا ”بھن پیری۔ منحوس ددھیال ننھیال ماں باپ بھائی سب کو چٹ کر گئی جب سے یہاں آئی ہے تین تو میری مرغیاں مرگئیں۔ بچوں کو بخار نہیں چھوڑتا۔ لوصاحب آج اتنا قیمتی ڈونگا چھن سے توڑ ڈالا۔ کام کی نہ کاج کی ڈھائی من اناج کی۔“

”اتنا تو کام کرتی ہے صبح سے نختی سی جان۔“ ہونے کہا۔

”تو بیوی تم ہی اس کا خرچہ اٹھاؤ۔ میرے بس کاروگ نہیں۔“

اب اٹھتے بیٹھتے مرزا کی بیوی نے لڑکی کے کان میں بات ڈالنا شروع کی۔ انکے باوا ہمارے مقروض مرے۔ ہم وہ نقصان بھی سہیں اور صاحبزادی کو بھی پالیں — نواب فاطمہ مقروض کا مطلب نہیں سمجھتی تھی اس نے بہو سے کہا ابا کو تو دق ہو گئی تھی۔ بہو اصل حالات سے ناواقف تھی اس نے جواب دیا شاید تمہارے ابا نے ہمارے سسر سے قرضہ لیا ہوگا۔ پیسہ لیا ہوگا ادھار۔ وہ ادا نہیں کر سکے۔ ساس نے دور سے دیکھا۔ بہو سے بولیں ”یہ بیٹیھی اس کے کان میں کیا بالاپرورہی ہو ایس؟“

دو تین مہینے گزر گئے ایک روز بیٹیکا صاحب نے نواب فاطمہ سے کہا ”بیٹا بات یہ ہے کہ ہمارا تبادلہ ہو گیا ہے لاہور۔ تم کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ سرکاری قانون یہ ہے کہ جو بچہ جس شہر کا ہے اسی جگہ رہے۔ اس لئے ہم تم کو ایک دوست کے ہاں پہنچائے دینے ہیں وہاں تم بڑے آرام سے رہو گی۔ اپنا سامان باندھ لو۔“ نواب فاطمہ پچھلے چند مہینوں میں کچھ سن سی ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں صرف اتنا آیا بچا کہہ رہے ہیں ہم تم کو ایک اور جگہ پہنچاتے ہیں سامان باندھ لو۔ فرمانبرداری سے اٹھ کر دالان میں گئی۔ پر تھپی پر چڑھ اپنی لال پٹاری اتاری۔ اس میں اپنی گڑیاں ٹٹول کر دیکھیں کہ حفاظت سے ہیں — طمان ہو گیا کہ موجود ہیں۔ مع ابا کے عطر کی ایک شیشی۔

مرزا کی بیوی نے اس کے روزمرہ کے چند کپڑے اسکی پٹاری میں ٹھونس دیئے۔ بڑھیا کپڑوں کا صندوق وہ پار کر چکی تھیں۔ دری چادر تکیہ اور رضائی مُتلی سے باندھی نواب فاطمہ کے گھر سے آیا ہوا سارا قیمتی سامان ایک کمرے میں مقفل کر رکھا تھا۔ پٹاری اور بستر سنبھال وہ اپنے نئے سفر کیلئے تیار ہوئی۔ مرزا صاحب نے اس کو ایکٹے پر بٹھالا اور پلیماروں کی طرف چل دئے۔ ایک واقف کار شیخ عبدالباسط گوٹے والے سے بات کر چکے تھے۔ ایک یتیم دیسیر لڑکی ہے۔ رونی کپڑے پر اپنے ہاں اوپر کے کام کے لئے رکھ لیجئے ثواب ہوگا۔ شیخ صاحب نے خلال کرتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا تھا بھو ادیجئے۔

پیشکار صاحب اب نواب فاطمہ کی جائداد پر بلا شرکتِ غیر سے قابض تھے۔ قانون داں آدمی۔ سب کام نگریم سے کیا تھا۔ مکان دکان زیورات عطریات کا اسٹاک سب ملا کر نواب فاطمہ کوئی تینس ہزار کے ترکے کی مالک تھی اس زمانے کا۔ اللہ اکبر آج کا سمجھو چپاس لاکھ جو اس سے چھین گیا۔

شیخ عبدالباسط صدر بازار اپنی دکان پر جا چکے تھے۔ ایک باؤلا سا چھوکر امداد ڈیوڑھی پر کھڑا ناک کھجھار ہاتھا۔ مرزا صاحب نے اُسے آواز دی ”ادھر آے۔ لونڈیا کو اندر یہ ہونچا دے۔ شیخ جی سے کہنا پیشکار صاحب آئے تھے۔ یہ دونوں ننگ سنبھال“ نواب فاطمہ خود کو دکر ایکے سے اتر آئی۔ اُسے گاڑیوں پر سے اترنا چڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پیش کار صاحب نے کوچوان سے کہا۔ چل بھئی سیدھے کچھری آج دیر ہو گئی اور پیچھے مر کر نواب فاطمہ پر نظر ڈالے بغیر جلدی سے ایکے آگے بڑھوا لیا۔ جیسے اچانک خوفِ خدا سے ڈر گئے ہوں۔

مسروٹے ریلوے کے قلیوں کی طرح پٹاری بغل میں دبائی بستر اس پر رکھا اور بولا آجا میرے پیچھے۔ و دزنانی ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں پہنچی مدو پر دے کی وجہ سے ڈیوڑھی پر رک گیا۔ نواب فاطمہ بستر ادھکیلتی ہوئی دالان میں لے گئی۔ پھر پٹاری

اٹھا کر لائی۔ کسی نے اس کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔ ایک لڑکی پلنگ پر بیٹھی، بال کا ڈھرہ ہی تھی۔ مراد آبادی کٹورے سے پانی پینے کے بعد سر اٹھا کر دیکھا۔ صحن میں ایک ننھی بچی لال رنگ کی پٹاری سنبھالے سہمی کھڑی ہے اور مٹر مٹر چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پچھلے تین ماہ میں یہ دوسری اجنبی جگہ تھی۔ جہاں قسمت کے بھیرنے اسے لا ڈالا تھا۔

شیخ جی کی بیوی باورچی خانے سے اٹھ کر آئیں۔ بچی نے تیز سے سلام کیا۔

”ارسی کہاں سے آئی ہے۔ پہلے کہاں تھی؟“

”پیشکار صاحب کے ہاں“

”وہاں کام کرتی تھی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ کپڑے انھوں نے ہی بنا کر دیئے؟“

پھر آنکھوں میں آنسو۔ ”ابانے بنوائے تھے“

”کب مرے ابا تیرے؟“

”ابھی مرے ہیں رمضان شریف میں“

”کیا کرتے تھے؟“

”عطر بھیل بیچتے تھے“

”اور تیرا کوئی نہیں؟“

”نہ“

”جی جس کا کوئی نہ ہو اس کا خدا ہے“ شیخ صاحب کی بیوہ بہن نے پن کٹی پر سے

سر اٹھا کر ارشاد کیا۔ ”ادھر آ۔ ذرا میرے سر میں تیل لگا دے۔ ابھی طرح۔ یہ پٹاری

چھوڑ۔ رکھ ادھر۔ کیا اس میں خزانہ لے کر آئی ہے ہیرے کے زیور ہیں جو اس سے چھٹی

کھڑی ہے۔ کیا ہے اس کے اندر؟“

”کپڑے اور گڑیاں۔“

سب نے قہقہہ لگایا۔ نواب فاطمہ کے دل پر چوٹ پڑی۔

”لا اپنی گڑیاں دکھا۔ کس نے بنائی تھیں؟“
”انہ نے۔“

”اے ہے چھوڑو بختی کی پٹاری۔ اسے کام پر لگاؤ۔ پہلے تیل ڈال سر میں پھر ذرا لپک
لر مسالہ تو پیس دیجیو۔ شاہاش۔“

سوٹھی سی جان نواب فاطمہ جو اب نوابن جھوکری کہلاتی ہے رونی کپڑے پر شیخ
عبدالباسط گوطے والے کے ہاں ملازم ہے پیسٹکار صاحب نے یلٹ کر اس کی خیر
نہ لی۔ نہ شیخ جی نے کبھی اس کے متعلق کچھ پوچھا۔۔۔ دلی شہر میں ہزاروں یتیم
بچے رلتے پھرتے ہیں۔۔۔ جب نواب فاطمہ کے ساتھ یہ مصعب ہوا۔ اس کے ولی نے
امانت میں خیانت کی۔ اس کی جائیداد پر قابض ہوا اس کو دکھیا کو خبر ہی نہ تھی کہ اس کے
ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ مگر دن بھر کے کام سے تھک کر جب رات کو سونے لیٹی تو گلی شاہ نانا
اور اپنا گھر اکثر آنکھوں کے سامنے آجاتا ایک ایک چیز کو یاد کرتی۔ سہ درے میں نعمت خانے
کے برابر گلاب کے پودے کا گلمہ رکھا تھا۔ صحن میں جنبیلی اور ہارسنگھار کی کبیریاں
مرزا دلدار شوقین نفیس طبع آدمی تھے۔ مکان مشہد مقدس اور کربلا تے معنی کی تصاویر
اور طغروں سے سجا رکھا تھا۔ منٹے سے امام باڑے کی سیاہ چھت گیری میں بہتر شہدائے
نام کارچوب سے کڑھے ہوتے تھے۔ سامنے دالان میں اماں کے جہیز کا ایرانی فالین
پچھا رہتا۔ چاندنی کے چاروں کونے پر بھرت کے میر قزاق۔ وسط میں مسند۔ پلنگوں پر نفیس
سوزنیاں۔ چھت پر کونروں کے گامک۔ وہ ایک ایک چیز کا تصور کرتے کرتے سو جاتی کبھی
رات کو وہ محرم کا زمانہ یاد کرتی پہلی سے اربعین تک کے نوچے جو آبا پڑھا کرتے تھے اور
ایک بار وہ سب آگ کاڑھی میں بیٹھ کر لکھنؤ گئے تھے محرم کرنے۔ دھندلا سا یاد تھا۔
اور ایک بار نانا آبا کے ہاں شاہ گنج آگرے اور شہید نالٹ کا روضہ۔ اور خوب دال بوٹھ
اور پیٹھے کی مٹھائی کھانی تھی اور نوچے جو آبا پڑھتے۔۔۔ یاروچہ ہ خون۔ کہ ہ
دیدہ چساں ہ روز و شب۔ چراہ در غم کلام ہ غم سلطان کربلا۔ نامشس نچیکر ہ حسین۔

زنشرا دکہ ہ ازعلیٰ — مادشش کہ بود ہ فاطمہ — جدشش کہ ہ — مصطفیٰ — چوں شد ہ
شہید شد — بہ کجا ہ دشت مار یہ —

عموماً وہ قانی کا یہی نوحہ دہراتے دہراتے سو جاتی ہے۔ فجر کی اذان کے ساتھ کلمہ پڑھتے ہوئے اُبٹھ بیٹھتی ہے۔ آنگن کے کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکالتی ہے مُنٹے مُنٹے ہاتھوں سے چرخ کی رسی کھینچتی ہے۔ تب جا کر ڈول اوپر آتا ہے۔ شب کُشتہ شد ہ نہ۔ روز۔ چہ سنگام ہ ز سر چشمہ فنا۔

نواب فاطمہ ڈول سے پانی نکال کر اپنا لوٹا بھرتی ہے۔ منڈیر بر بیٹھ کر وضو کرتی ہے اتنی دیر میں گھر والے نماز کے لئے اُٹھ جاتے ہیں۔ خود نماز کے بعد وہ بہو کے ساتھ مل کر گھر بھر کا ناشتہ تیار کرتی ہے۔ جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر آنگن میں دھری بل پر ڈھیروں مسالہ پیسنے میں جُٹ جاتی ہے۔ تھوڑا بڑھی میں آکر سودا سلف دیتا ہے وہ خود ہاتھ ٹھاکر اس سے لے لیتی ہے۔ اب وہ نو سال کی ہو چکی ہے۔ اس کے لئے چھوٹا سا برقعہ سلوا دیا گیا ہے۔ میلے کپڑے۔ اچھے بال۔ پٹاری خالی پڑی ہے۔ دو جوڑوں سے کتنی بھر سکتی ہے۔ گرٹیاں گڈے البتہ اس میں حفاظت سے رکھے ہیں۔ جب کبھی فرصت ملتی ہے نکال کر اُن سے کھیل لیتی ہے نقلی موتیوں کا ہار اور چند چوڑیاں بساط خانے سے شیخ صاحب اپنی پونی خوشبو کے لئے لائے تھے اُسے پسند نہ آئیں اس نے نواب فاطمہ کو دیدیں وہ سینت کر پٹاری میں رکھ لی ہیں۔ عید پر پہننے کے لئے۔ اس کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں تھیں وہ شمر کے ہوتوں سوتوں نے اتار لیں اپنے گھر سے چلتا کرنے سے پہلے۔ دیکھو کلام مجید میں بار بار آیا ہے کہ یتیموں کا مال غضب کرنے والے کتنے بڑے گنہگار ہیں۔ خاتینوں مناقوں ریاکاروں اور حاسدوں کے کرکوت دیکھ کر قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر ایمان لانا پڑتا ہے ہوا۔

آغائے تازہ ولایت۔ دادا کی یونی کلر خ کارنگ پیکٹا پڑنا تھا۔ گھنے سیاہ بال ستواں ناک سر مگیں آنکھیں کیا پری رُو مغل بچی تھی کہ اس افلاس اور مصیبت میں بھی پاند ساروشن ہونا جا رہا تھا۔ تیرہ سال کی ہو چکی۔ شیخ عبدالباسط کی بیوی نے طے کیا اگلی

ربیع الاول ہند چھو کرے کے ساتھ دو بول پڑھو ایں گی۔ کنواری جوان لڑکی گھر میں کھانا گناہ۔ وہ خود شیخ صاحب کی طرف سے ان کی بہوئیں اپنے اپنے شوہروں کی طرف سے چوکنی ہو گئی تھیں۔

گوٹے والوں کے اس دولت مند مذہب پرست گھرانے کی فریبہ مطمئن بیویاں چوڑے پانچوں کی شلواریں پہنے کڑوں پر موٹے موٹے طلائی بٹن لگائے ٹھوس پیلے سونے کے شیردہاں کرٹے کلابیوں میں پھنسائے دن بھر پان چباتیں اور مرغن کھانے نیار کرتیں۔ شیخ صاحب کی بیوی۔ بیوہ بہن۔ دو بہوئیں اور ایک پونی عنوشیہ جو نوابن سے دو تین سال چھوٹی تھی سب کی سب ہر وقت کھانا پکانے میں جُٹ رہتیں۔ گھر کے مرد زیادہ تر دکان پر رہتے یا مردانے میں۔ نہایت خوش باش اور بے فکری مستورات کھانے کھلانے نذر نیاز، شب برات، گیارہویں شریف، بنی بنی کی صحنک امام جعفر صادق کے کونڈے، ساون کے پکوان، موسمی کھانوں، گھر باؤتقریبوں میں ہمہ تن مصروف اور مگن۔ کوئی شادی ہوتی اس کی ریت رسمیں ہفتوں مہینوں جاری رہتیں۔ نوابن دن سے لے کر رات تک کام کرتے کرتے ادھ موٹی ہو جاتی ابھی اس کے کان میں بھنگ نہ پڑی تھی کہ نیم پاگل مدوسے اس کا بیاہ ہونے والا ہے۔ ایک دن معلوم ہو گیا۔

بڑی بہو کپڑے دھوپ میں ڈال رہی تھیں گوٹے لچکے سے لیے بادے کا ایک پرانا دھرانہ سُرخ دوپٹہ نکال کر ایک طرف کو رکھا۔ ان کی لڑکی عنوشیہ نے کہا اماں لاؤ ہمیں دو۔ ہم گڑیا کے دوپٹے بنائیں گے۔

”رہتے دے“ ہاں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نوابن کا بیاہ سر پر آ رہا ہے۔ بگلوڑی دلہن بن کر کیا اوڑھے گی؟“

قریب کھڑی نوابن دھوپ میں لال پیلی مرچیں سکھا رہی تھی دھک سی رہ گئی۔ میرا بیاہ کس سے ہو رہا ہے؟ رات کو کھٹولی پر لیٹنے سے قبل اس نے عنوشیہ سے پوچھا ”مدوسے اور کس سے؟“ عنوشیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”مدو سے؟“ نوابن نے بھونچکی ہوا کر دہرایا۔
”تو اور کیا تیرے لئے جیدر اباد کا شہزادہ آئے گا؟“ یہ کہہ کر غوشیہ نے تختوں کے
چوکے پر لوٹ لگانی اور خوب سنہنی۔

اس رات جب سب سو گئے نوابن کھٹولی سے اٹھی۔ تاروں کی چھاؤں میں دبے
باؤل چلتی جا کر کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ ایک بھوری بلی پھت پر سے کودی۔ بے مروت
بے رحم زرد زرد آنکھوں سے اُسے گھورتی ہوئی اندھیرے میں غایب ہو گئی۔ دو ایک کتا
رویا۔ بڑا خوفناک سناٹا طاری تھا۔۔۔ سارا دلی شہر سو پا پڑا تھا اس وقت اس نے
محسوس کیا کہ ساری دنیا دشتِ ماریہ ہے اور اس میں وہ تنہا کھڑی ہے۔ اور اس سے
زیادہ ستم رسیدہ ہونا ممکن نہیں ہے اس لمحے اس نے طے کیا کم از کم ایک دن قبل
بتائیں گے کہ نکاح ہو رہا ہے بس رات کو چپکے سے آکر اسی کنویں میں کود جاؤ گی
یہ طے کر کے اُسے ذرا سکون سا محسوس ہوا اور وہ واپس آکر اپنی کھٹولی پر پڑ گئی۔



(۸)

پہوڑنِ والی حجن

گرمی جاڑے برسات دہلی کی گلیوں میں، اور چاندنی چوک میں پھیری والے بھانٹ
بھانٹ کی صدا میں لگاتے۔ قدرت کا بنا جلیبا کھا لو— گل گلاب بہدانہ— قند میں بسنا
بہدانہ— شاہ مرداں کی لالہ لڑباں— تیس ہزار می باغ کے پونڈے ہیں لے چل—
ان آوازوں میں ایک کمن لڑکے کی مسخنی آواز بلند ہوتی— اجی تسیجیں آئیں
مدینے پاک سے— چوڑن لے لو کتے شریف کا—

اس باریک صدا پر کراسی کر خنداری آوازیں غالب آجاتیں— اوئے میاں۔
شبدی گوہر کے باغ کا دانہ قند میں بنا— کھانڈ کا کھلونا ہے پیسے کا— کھانڈ کی لکڑی
ہے پیسے کی— چاٹ ہے— ہندوستان کے میوے کی— چاٹ ہے ہندوستان
کے لٹکے کی— ساس کے چوڑے کا گٹکا—

بچہ پھر پھپھڑوں کی پوری طاقت سے چلاتا— مکہ شریف کی چوڑن— آپ زمر
میں پسی چوڑن— لکڑ ہضم— پتھر ہضم— چوڑن—

ایک برقعہ پوش بڑی بی تھیلا سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ رہنیکا کرتیں۔
موسم گرمی میں صدا میں بدل جاتیں— بھول والے پکارتے— بہار ہے
موتیا میں— جی مدن بان ہے موتیا کے کٹوروں میں— پانچوں کپڑے معطر ہوتے
ہیں جنیل میں— گڈھی ہے چپاکی— بڑے کٹھے ہیں رائے میل جنیل کے—
بہشتی کٹورا بجاتے— کوئی طالب اللہ پلا دے سبیل— کوئی طالب حسین کا
پلا دے سبیل— ٹھنڈا ابھر کے لائے ہیں پانچ کورٹی میں— تیرے پاس ہے تو
دے جا— نہیں تو پنی جارہ مولا— پیاسو سبیل ہے شہیدوں نام کی—

— ملکہ شریف کی چوڑن — آب زم زم —
 — رنگت کے گھڑے ہیں لال تر بوز — جاہن نون والی —
 — بوندا باندی بھڑبڈلی کے — جھرنے کا بتا شہ گور ہے —
 — دیاسلانی بے آگ روشمی — بے آگ مہتاب —
 — مرمرا بے بانس متی کا — سنگھاڑے ہیں شمس تلاء کے ہرے دودھیاء،
 — خاک شفا کی تسبیح —

رات پڑے بڑی بی اور بچہ کسی سایبان کے نیچے جا بیٹھتے۔ بچہ نابنائی سے کھانا خرید لانا۔ سر جوڑ کر دونوں کھاتے اور وہیں پڑ کر سو رہتے۔ بھادوں کے بھالے نے ستایا تو چوڑن والی جن بی نے ایکے پر بیٹھ کر سلطان جی کا رخ کیا۔ وہاں ایک پھانگ لے کونے میں ہا دن دستے میں چوڑن کو ٹھتیں پستیں۔ دود و پیسے کی پڑیاں زائرین خریدے جاتے رات کو چند قدم پر سنگ سرخ کی اس سرائے میں جا پڑتیں جہاں پانچ سو سال ادھر ابن بطوطہ نے قیام کیا تھا۔

پیرانی اماں کے گھر سے نکل کر جن بی نے اللہ توکل تسبیح بیچنی شروع کی تھی مگر آواز لگانے سے بے طرح جھینپ رہی تھی تبھی دوسرے روز ہی سے یہ یتیم بے خانماں بچہ ایک وفادار کنتے کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔ جن بی نے اسے غیبی امداد مانا۔ اسے صدالگانا سکھلایا۔ اور گویا باقاعدہ اپنی بزنس شروع کر دی۔

سلطان جی آئے ایک مہینہ گذرا تھا۔ لونڈا دلی کی گلیوں کا روڑا محبوب الہی کے آستانے پر دل نہ لگا — ایک روز جب فجر کی اذان پر جن بی کی آنکھ کھلی۔ دیکھا لڑکا غائب۔ ساتھ ہی جن بی کا حریطہ ندر جس میں انھوں نے اپنی ساری پونجی کا اندوختہ کیا تھا۔ گھبرا کر جامہ دانی میں سے کھنتی لگائی۔ صرف ایک روپیہ ملکہ کے چہرے والا ٹھن سے گرا۔ اپنا بے بضاعت سامان باندھ اللہ اللہ کرتی سر و آہیں بھرتی پھر باہر نکلیں طے کیا مہر و کے گھر واپس چلی جاتیں۔ راستے بھر سوچا کیس۔ گاڑی ایک قبرستان سے

گذری دفعتاً خوف خدا نے پھر آن دلوچا۔ فرشتوں کے گرز۔ تھوہڑ کی بھیجا۔ آب زقوم۔
ہمیشہ ہمیشہ۔ جب تک اللہ گنہگار مومنین کو پوری سزا نہ دے لے۔
بلیم آروں میں پہنچ کر کرایہ ادا کیا۔ اور انزگتیں۔ صدا لگانے کی ہمت نہ پڑی۔

ارے اسی نغمہ آراں کی پری تانیں بڑے بڑے گنی جنوں کو مسحور کرنی تھیں۔
راگ سے روگ کاٹتی تھیں۔ کوہ قاف کی پری کہلاتی تھیں۔

اس وقت حلق سے ایک نجیف آواز نکلی۔ مدینے شریف کی پورن۔

ایک چڑی مارے بچروں کی بہنگی اٹھائے چلانا ہوا آیا۔ ٹوسیاں طوطا بے پالنے کو۔
نرچکے ہے بہر آسن طوطے کا۔ کالا کو اچھوٹے۔ چھوڑ دیں جل جو گنے کو۔ چھڑا دو۔ دو
جالوریں۔ بسیرا دیں۔

اے میرے مالک پروردگار عالم مجھے بھی کہیں پناہ دلو اے جتن بی نے ہل ہلا
کر دعا مانگی۔ بچروں میں بند پرندے بے پناہ شور مچا رہے تھے جتن بی نے پھس
اہل دنیا کو مطلع کیا ”سبج ہے کربلائے معلیٰ کی تسبیح ہے خاک شفا کی“۔ لیکن آواز
مفقید چڑیوں کی فریادیں ڈوب گئی۔ آخر تھک کر گلی کے کنارے کھڑی ہو گئیں۔ برقعے
سے ریلوے سگنل کی طرح ہاتھ باہر نکالا۔ کلابی میں رنگارنگ تسبیحیں۔ مجسم سوال۔
تین چاردن اس طرح گذرے۔ کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو دروازوں پر
جا کر دستک دیتیں۔ ”خاک پاک کی تسبیح۔۔۔۔۔ پورن کے شریف کی۔“
رات کو ایک خالی دوکان کے برآمدے میں جا پڑئیں۔ جمعات کے روز پھیری پرنیکلس
حویلی حسام الدین حیدر کے پھاٹک میں مڑ گئیں۔

مبارز الدولہ حسام الملک حسام الدین حیدر غالب کے ختم نواب الہی بخش معروف

کے عزیز دوست تھے انکے بیٹے حسین مرزا سے مرزا نوشہ کا لڑکپن سے یار نہ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد حسام الدین حیدر کی وسعت و عریض جویلی کے اندر محیر اور دیندار پنجابی آن بے تھے۔ یہ چورہ فروش نسل ملتان کے کھتری تھے۔ صدیوں قبل ان کے تجارت پیشہ اجداد کو حضرت شمس الدین گردیزی نے کلمہ پڑھایا تھا۔ بساط خانے کے کاروبار کی غرض سے بعد شاہجہاں دہلی پہنچے۔ غدر ۷۵ء کے چار پانچ سال بعد انگریزوں نے انکے محلے سے انہیں بیدخل کر کے اس جگہ ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا۔ انہوں نے احاطہ کاٹے صاحب، پھانگ حبش خاں اور جویلی حسام الدین حیدر میں اپنے گھر بنائے۔

چوکیدار نے پھانگ کا دروازہ کھولا۔ جن بی بہت آہستہ آہستہ چلتی گئی گونچانہ میں کوہوں۔ ایک ڈیوڑھی کی کٹڑی کھڑکھڑانی کہ گئی کا کتا دوڑ پڑا۔ دہل کر اٹھے پاؤں لوہیں کچھ دور جا کر ایک تنگ و تاریک کوچے میں قدم رکھا۔ ایک شاندار دروازہ دکھلانی دیا۔ میٹرھی پر جا کر دستک دی۔ آواز لگائی۔ ”تبیج خاک پاک کی۔“

نجیب زادیوں کا ان دلوں سے یہ معمول۔ وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول۔ اور انکے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ ہے اصول۔ کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو بیجے مول۔۔۔ سودا کی دلی سے داغ کی دلی تک شہر آشوب مسلسل ہے۔ اور دنوازا بانو بیگم بھی لو اصلاً نجیب زادی ہی تھیں۔



پرلوں کا کھولہ

جمعرات کے روز فقیر بھانت بھانت کی صدائیں لگاتے۔ نوابن ڈیوڑھی میں جا کر کسی کو آٹے کی چٹکی دیتی، کسی کو پیسہ۔ ٹکے۔ پائی۔ چھدام۔ کوڑی۔ جو جسکا مقرر اور مقدر ہوتا۔ خالی کے مہینے میں ایک جمعرات کنڈی کھڑکی۔ نوابن نے باہر جھانکا۔ میلا برقعہ اوڑھے ایک بڑی بی در میں کھڑی تھیں۔ ایک ہاتھ میں اگر بنٹی کے بنڈل دوسرے میں چوڑن کی شیشیوں کا تھیلا۔ کلانی میں لسیوں کے رنگ برنگے ٹپھے۔ گویا سرتاپا ایک کوچہ گرد جتن ان سے پوچھے بغیر نوابن نے پلٹ کر آواز دی ”بیوی۔ جتن بی آتی ہیں مکے مدینے سے“

شیخ عبدالواسط کا چھوٹا پوتا صبح سے بخار میں پڑا بھن رہا تھا۔ بیمار داری میں مصروف دادی نے جواب دیا ”کہدے برکت ہے۔ پھر آئیں“

”اے ہے بھابی جتن ہیں۔ منع نہ کرو۔ گناہ ہوگا۔ اے نوابن۔ بلالے“ ننندنے باور چھانے میں سے پکارا۔

جتن گزر گاہ سے نکلتی صحن میں آئیں۔ سہ درے میں پہنچ کر لسیوں والا ہاتھ پھر سنگل کی طرح سامنے کر دیا۔ بولی کچھ نہیں۔ اب وہ بولتی بہت کم تھیں۔

”السلام علیکم۔ بیٹھے“ شیخ جی کی بہن نے تپاک سے کہا۔

”وعلیکم السلام“ پیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ دوپٹے سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

سرخ و سفید رنگت، کھڑے نقشے والی ان جیسی مصیبت زدہ قبول صورت عورتوں سے شہر ٹپ پڑا تھا۔ گو غدر کو چھپیس، سینتیس برس ہونے آئے۔

جن بی نے اپنی ایک سوانح حیات گھڑ رکھی تھی جو بوقت ضرورت پُرساں
حال کو سنا دیتی تھیں نہ بھی سناتیں تو لوگ سمجھ لیتے کہ ایسی ہی کوئی بتا رہی ہوگی۔
سارا ملک ہی اتنی بڑی ٹریڈی بن چکا تھا۔

’بوا کہاں سے آئیں۔‘ شیخ جی کی بیوی نے پوچھا۔ جتن بی نے قصہ شروع کیا۔
باپ کا قلعہ سے تعلق تھا۔ سنہ ستاون میں مارے گئے۔ شوہر کے ساتھ حج کو گئیں۔
ہاں وہ چل بے۔ نہ آل نہ اولاد۔ اللہ کی ذات کا سہارا۔ ایک کٹورہ پانی پلوا دو۔
حاجی کی خدمت ثواب۔ نوابن نے پانی کے کٹورے کے ساتھ ایک صحتک
میں تھوڑا سا سالن اور ڈلیا میں رکھ کر ایک روٹی ادب سے پیش کی۔ جتن بی نے
تکلف کیا۔ سالن ذرا سا چکھا۔ پانی پی کر نوابن کو دعائیں دی۔ بیویوں نے ایک
ایک تسبیح چُن کر آنکھوں سے لگائی۔ ہدیہ نذر کیا۔ انہیں نے بتایا سات بار حج کر چکی
ہیں شیخانی نے انکے ہاتھ جوڑے۔ ایک پُہنچا ادھ جلا دیکھ کر پُوچھا ”اُونی۔ اب
سے دُور یہ کیا ہوا تھا مغلانی بی؟“

”جدہ کے راستے میں آگ بوت پر کھانا پکانے کے لیے آنکھٹی دہکار ہی تھی۔
روٹی کی صدی پر چنگاری ایسی پڑی شعلے بھبھک اٹھے۔ جہاز کے فرنگی ڈاکٹر نے
علاج کیا۔ پروردگار کا کرم تھا ورنہ جل کر کوتلہ ہو گئی ہوتی۔“

جس اللہ کی بندی نے سات بار حج کیا ہو وہ ایسے سفید جھوٹ بولے۔ مگر
وہ عظیم و خیر میری ہر مجبوری سے واقف ہے۔ شاید معاف ہی کر دے۔ سامنے
نگاہ کی۔ دھوپ چھتوں پر سے اتر رہی تھی۔ با وضو تھیں۔ کٹورے کے بقیہ پانی سے
کھلی کی۔ فرش پر برقعہ بچھا کر عصر کے لیے کھڑی ہونے والی تھیں کہ شیخ جی کی
بہن لپک کر مصلے لے آئیں۔

جب یہ سلام پھیر چکیں شیخانی نے آواز دی ”اے جتن بی نوٹڈا صبح سے بخار
میں پھنک رہا ہے۔ بہتیری دوائیں پلائیں۔ ذرا کچھ پڑھ کر پھونک تو دیجیو۔“

یہ فوراً بند کرنی چھلکی جھکی لڑے کے سرہانے پہنچیں۔ دعائیں پونکیں۔ پانی دم کر کے پلایا۔ قرآن شریف کی ہوا دی۔ اسے لو۔ مغرب تک چھو کرے کا بخار کم ہو گیا۔ گھر بھر جینّ بی کا معتقد۔ امفوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے نسیجوں کو واپس بائیں ہاتھ کی کھونٹی پر لٹکایا۔ چلنے کے لیے اٹھیں۔ شیخانی نے پوچھا۔ ”کہاں رہو ہو۔۔۔“

”آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر“

”اسے تو یہیں رہ جاؤ نا۔ اپنا گھر سمجھو۔ لوٹدیلوں کو کلام مجید پڑھا دینا“

جینّ بی نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ذرا ہچکچا کر بولیں ”تو میں اپنی گڈری لے آؤں۔ چٹکی قبر سے۔۔۔“

”کل لے آنا تو اب رات کو کہاں جاتی پھوگی۔ اری نوابن چمکو۔ کھانا نکال“

برقعہ اتار پیکٹو لے پر۔ چھوٹی بہو نے پاندان آگے سرکایا۔ نوابن بٹاچہ لیکر آئی۔ اب امفوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ لگتا تھا کسی دن کی بھو کی تھیں۔ دکھیا۔

مغلانی بی۔

آٹھ برس عربستان یہاں بسر کر کے مغلانی بی عربی داں ہو چکی تھیں۔ فارسی اردو میں پہلے سے برق کشیدہ کاری سوزن کاری طباحتی میں طاق۔ خوش الحان نعت خواں۔ محلے میں جہاں مولود شریف ہو جینّ کے لیے نیوتہ موجود۔ مگر امفوں نے کہہ رکھا تھا اس گھر سے قدم نہ نکالیں گی سو بیویاں نعت خوانی سننے انکی سیخ جی کے ہاں آجائیں۔ محرموں میں دس دن مغلانی بی نے شہادت نامہ پڑھا۔ محلے والیاں چُپ چاپ بیٹھی سنا کرتیں۔ عشرے کی صبح نھن میں دیغ کا ڈر بڑی بہو نے کھچڑا گھونٹا۔ دیغ پر کلاوہ بندھا۔ کھچڑا اور دودھ کا شربت کورے دسترخوان پر چُنا گیا۔ مغلانی بی نے ”اماموں کی نیاز“ دی۔ نواب فاطمہ کو اپنے گھر کی اعزاداری یاد تھی۔ جو اس پھیکے بے رنگ محرم سے خاصی مختلف اور بہت شور شرابے کی ہوا کرتی تھی۔ شیخ عبدالباسط کے ہاں عشرے کے روز سب روزہ رکھتے۔ اس مرتبہ نواب فاطمہ

بول پڑی۔ ”ہماری اماں تو اسے فاقہ کہتی تھیں۔ چار بجا تو پڑا کریں تھے“ وہ اتنی غیر اہم ہستی تھی کہ گوٹے والوں کے ہاں کسی نے آج تک یہ بھی نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ وضو کرتے ہوئے پاؤں پہلے دھوتی ہے۔ اب جا کر اتنے برسوں بعد شیخ عبدالباسط کی بیوی کو پتہ چلا کہ نوابن رافضیوں کی اولاد ہے۔ چپ رہیں۔ وسیع المشرب ججن بی کے دغظوں سے مستفید ہو چکی تھیں۔ دل میں انھیں کے الفاظ دہرائے۔ بوا سب اللہ کے بندے اور ایک رسول پاک کی امت ہیں۔

محلے والیاں ججن بی کو مغلائی جی یا آتو جی بھی پکارتیں۔ چورن کے علاوہ دیگر شریف سے ترکی اور عرب دوا داروں کے چند نسخے لیتی آتی تھیں۔ مرحوم نیم حکیم میان کی صحبت میں نیم حکیمینی ہو چکی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی مستورات دم درود دوا علاج معاہجے کے لیے آنے لگیں۔

ڈیوڑھی کے مقابل والی صفحی میں ججن بی اپنا کھٹ کھلا رہے بیٹھی رہتیں۔ سرہانے طاق میں بڑی روٹ۔ دینی رسالے۔ تلے دانی۔ سرے دانی۔ دواؤں کی شیشیاں۔ کھولے کے نیچے پیٹی۔ درمیں نماز کی چوکی۔ دن بھر گھونگٹ کاڑھے اہل خانہ کے مسئلے مسایل بڑائی جھگڑے طے کیا کرتیں۔ عصر مغرب کے درمیان غوثیہ اور نوابن دوپٹیاں سر پہ سلیقے سے پیٹ جزدان سنبھالے حاضر ہوتیں۔ محلے کی چند پچیاں بغدادی قاعدے اور سپارے لیکر آجاتیں۔ عربی داں آتو جی تیسوں کلام ناظرہ کے بجائے سمجھا سمجھا کر پڑھاتیں۔ سچ ہے کوئی گریز کالج اس وقت موجود ہوتا تو ججن بی اس میں پروفیسر بن سکتی تھیں۔ اتنی قابل تھیں دکھیا۔

مکتب کے بعد مغرب عشاء کے درمیان محلے والیوں کی دوا دارو کرتیں اسی وقت نوابن کو کام کاج سے فرصت ملتی وہ غوثیہ اور ملائی جی کی نمھی شاگردوں کے ساتھ آنگن میں کھیل کودتیں وسیع ڈیوڑھی میں ایک شکستہ پالکی پڑھی ہوئی تھی۔ اور چند خالی کریٹ جن میں بساط خانے کا سامان بھی گلگتہ کی بندرگاہوں سے شیخ عبدالباسط اینڈ سنز کے ہاں آتا تھا۔ اسی نیم تاریک گزرگاہ میں پہنچ کر کھار ہانک

لگاتے۔ سواری اتروالو۔ نواب فاطمہ، غوثیہ اور مکتب کی بچیاں آنکھ چولی کھیلتے ہوئے اکثر اس ٹوٹی پھوٹی پینس یا کسی کریٹ یا مغلانی بی کی کسی ارادتمند کی خالی ڈولی میں جا چھتیں۔

تیرہ تیزی کی ایک شام بعد اذان مغرب آسمان کی گلرنگ دستوں سے سپید اور سستی کبوتر اپنی چھتریوں پر لوٹ رہے تھے، پتنگیں چھتوں پر واپس اتاری جا رہی تھیں، کہا چلا تے سواری اتروالو۔

حسب معمول نوابن نے دروازے کی اوٹ سے جواب دیا ”بیوی آجائے پردہ ہے“ ایک سفید شٹل کا کبرقعہ جھپاک سے اندر متوسط اندام نو وارد نے نقاب اٹھاتے بغیر سر گھما کر دو پیش کا جائزہ لیا۔ گھر کی بیویاں وضو نماز میں مشغول تھیں۔ مغلانی بی اپنی صحیحی میں نیت باندھنے والی تھیں کہ برقعہ پوش انکی طرف پسکی۔ قریب جا کر چپکے سے کچھ کہا۔ مغلانی بی نے ایک صندلی کی جانب اشارہ کیا۔

نوابن پان کی ڈھولی لیکر ادھر سے گزری تو وہ دیک سی گئی۔

حسن بی کے پاس اب رقم رقم کی مستورات آنے لگی تھیں۔ بہت سی سمجھتی تھیں کہ ملائی جی عامل بھی ہیں۔ نظربد، آسیب، مسان کا اتار کر دینگی۔ اس امید پر وہ بے چاریاں چپکے چپکے اپنے دکھڑے رویا کرتیں۔

یہ بیوی کھڑی ڈولی آئی تھیں۔ برقعے میں سے صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اٹھ کر ڈیوڑھی میں پہنیں۔ کہا راند راتے۔ غائب۔

تیرہ تیزی کی گئی گئی وہ اجنبی عورت مدار کے مہینے میں ایک شام پھر وارد ہوئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ لیکن مجال ہے جو چہرے سے نقاب اٹھاتی ہو۔ تیسری بار جب آئی جاڑوں کا زمانہ تھا۔ مغرب عشائے کے درمیان گھر والیاں شب دیگ کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ کھڑے پر اکڑوں بیٹھ کر دوچار بھگوانے

مانجنے کے بعد نوابن بھویوں کے سنگ آنکھ مچولی میں جٹ گئی۔ سارے لوگ بیاں آنکھی
کے کونوں کھدروں میں غائب ہو چکی تھیں۔ غوثیہ انکو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ نوابن
دوڑ کر سنسان ڈیوڑھی میں پہنچی۔ انھیں نقاب پوش بیوی کی ڈولی کا پردہ اٹھا کر اسکے
اندر سمٹ گئی۔

کہار باہر منتظر تھے۔ قدموں کی آہٹ اور کھٹولی کے چرچرانے سے سمجھے بیوی
آگئیں۔ بیوی کا حکم تھا جوں ہی سوار ہوں جھٹ اندر آجاؤ۔ انھوں نے فوراً اس حکم
کی تعمیل کی۔

ایک تالیے کے لیے نوابن کو گمان ہوا۔ دو لوٹکیوں نے کھیل کھیل میں ڈولی
اٹھالی ہے۔ ابھی دھم سے واپس رکھ دینگی۔ مگر اے لو۔ وہ تو باہر نکل گئی۔ کہار
ہوا کے گھمڑے پر سوار۔ نوابن کی سٹی گم۔

ڈولی گلی گٹو خانہ سے ہوتی بزر یا میں پہنچی۔ نوابن نے پردے میں سے جھانکا۔
گھگھکی بندھ گئی۔ کہار دن کو روکنا چاہا۔ لیکن آواز غائب۔ جب سے وہ مرزا سبط احمد
کے مکان سے نانگے پہ بیٹھ کر شیخ عبدالباسط کے ہاں آئی تھی پچھلے چھ سال میں اس
گھر سے بہت کم باہر نکلی تھی۔ چھوٹی تھی تو بیویاں سودا سلف منگوانے گلی کی
دوکان پر بھیج دیتی تھیں۔ اب چار برس سے وہ پردے میں بیٹھی تھی۔ ان سب
کے ساتھ ہر سال سلطان جی نی سترہویں میں البتہ ہو آتی تھی۔ اور ساون میں
مہرولی۔ جہاں قطب صاحب کی امرتوں میں ہنڈولے پر پینگیں بڑھاتی کن سڑی
غوثیہ کے ساتھ اپنی سڑیلی آوازیں ”جھولاکن نے ڈالوری امرباں“ الاپا کرتی۔
— بیویاں اس سے ”گڑا رہی ہنڈولا میرے بابل کے گھر“ اور ”نیلی سی گھوڑی

پاتلی“ بھی بار بار گواتیں۔

گلی قاسم جان کا کنڈر۔ کٹھہ عالم بیگ۔ کوچہ رحمن۔
بارہ درمی شیر افکن تک پہنچتے پہنچتے نوابن کو مزار کی پہچان نہ رہی۔ اتنی دور
وہ کبھی نہ آئی تھی۔ اب وہ محلہ چرخہ والاں سے گزر رہے تھے۔ کوچہ بی بی گوہر سمجھے

رہ گیا۔ گلی کا استھان کا موڑ آیا۔ اسکے بعد ایک چوڑی سڑک۔ گیس کے ہنڈوں سے روشناس، بازار درودیہ دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں۔ چند ایک میں سے چھن چھن کی آواز آرہی تھی۔ سنا تھا پچھل پائیاں چھن چھن کر کے چلتی ہیں۔ دہشت بڑھتی گئی۔ کہا ایک بڑے پھاٹک لے اندر پہنچ کر بولے ” اترے۔ بی صاحبہ۔“

دوبارہ آواز دی۔ نواب فاطمہ چُپ۔ کہا روں نے پردہ اٹھایا۔ اندر ایک نو عمر لڑکی۔ چاند سا چہرہ۔ پیٹی پیٹی آنکھیں۔ میلے کپڑے۔ بے اوسان۔

” اے چھیدو یہ کیا معاملہ ہے۔ بی صاحب کہاں رہ گئیں؟ کیوں رسی؟ بائی جی نہ آئیں؟ تو کون ہے؟“

نوابن چُپ۔

بنواری کہا نے آواز دی۔ ”شیراتی بھائی“

جما پنواری کے چوتھے پر سے ایک کر خندار اتر کر پھاٹک میں آیا۔ چھیدو لال انگوٹھے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ” اوپر جا کر خبر دو۔ بی صاحب یہاں سے تو بھلی چنگی گئی تھیں۔ کسی حکیمنی کے دھورے۔ وہاں سے اس لمٹیا کو بھیجا ہے۔ اسی منہ سے پھوٹ۔“

کر خندار پکا ہوا کوٹھے پر گیا۔ ابیلی گٹنی کو بلا لایا۔ ابیلی ذات کی ناتن۔ بلحاظ پیشہ دلالہ اور اب عرصے سے مہر و جان کی گرن فرائیڈے۔ چاؤڑسی میں مشہور تھا۔ کہ اسکا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ چھیدو نے قہقہہ دہرایا۔ نوابن پھس پھسرونے لگی۔

” ارے کو گو غضب ہو گیا۔ ارے سنو۔ کوئی سن جاؤ۔ چھیدو بنواری کیا کہتے ہیں؟ ابیلی سر پر دو ہنتر مار کر چلائی۔ ” ارے بیوی کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا“ گلی کے اوباش تماش بین پھاٹک میں جمع ہو گئے۔ پل کی پل میں چاؤڑسی بازار میں اڑ گئی بی مہر و دوالانے کسی شیدسی حکیمنی کے ہاں گئی تھیں۔ وہیں چل بسیں حکیمنی کے گھر سے سناؤنی آئی ہے۔

تین سازندے دھپ دھپ کرتے اوپر سے اترے۔ روتی بکھرتی نوابن کو

پکڑ کر چوبارے پر لے گئے۔ اس وقت اچانک نواب فاطمہ کو احساس ہوا کہ نہ برقعہ نہ ڈلائی وہ کھلے منہ بے پردہ، مردوں کے ہجوم میں گھری کھڑی ہے۔ اس انکشاف سے سر تاپا لہری اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

سازندے اسے لال کمرے میں لے گئے تھے۔ رونے کی آواز سن کر مہر و کی لڑکی شموغ خانے سے نکل آئی۔ ایسی نے نوابین کو آگے دھکیلا۔ ”اری منہ سے پھوٹ۔ بیوی کیسی ہیں؟ ارے بول کیا گونگے کا گڑ کھایا ہے کجنت“

نوابین کو دہشت نے آن دبوچا۔ کہ جب واپس گئی عبدالباسط گوٹے والے ڈھریا اڑا دینگے۔ ہڈیوں کا سُرمہ بن جائے گا۔ ایک بار انہوں نے ممدو کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ سارا محلہ انکے غصے سے کانپتا تھا۔

”اری بول پچھل پیری ڈوبی اجاڑ صورت تجھے ٹوکا لگاؤں“ شموغ نے ایک طمانچہ رسید کیا۔ ”منہ میں گھنگھنیاں بھرے کھڑی ہے۔ قطامہ۔ منحوس۔ بول۔ خدا نخواستہ کیا ہوا؟“

نوابین سات آٹھ سال کی عمر سے مصیبتیں سہتے سہتے اعصاب زدہ ہو چکی تھی۔ بات بے بات رو پڑتی تھی اب تو قیامت کا سامنا تھا۔ ہسٹریا کا سادورہ پڑ گیا جبری طرح کپکپانے لگی۔

شموغ نے ایک اور دھپ جرٹی۔

”نگوڑی کو شاید جاڑا بخار چڑھ رہا ہے۔ اے بی ذرا دم لینے دو کیوں مارو ہو۔“ شموغ کی نیکدل بھاوج نے پردے کے پیچھے سے جھانک کر کہا۔

دسمبر کا مہینہ۔ باہر پالا گر رہا تھا۔ معاً نوابین کو غش آگیا۔ دھڑام سے قالین پر گر پڑی۔ جیسے ممدو کو مارا تھا مجھے بھی ماریں گے۔ ممدو کے خیال نے لرزہ طاری کر دیا۔ اس پاگل گندے غلیظ چھو کرے سے جس کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے، جو خننا کر بولتا ہے، جو بکرے کی طرح بے عقل ہے۔ وہ ظالم لوگ وہ رحم لوگ اس سے میری شادی کرنے والے ہیں۔ اگلے مہینے ساری دنیا ستم گروں

سے پڑتی تھی۔ ساری دنیا زیدی لشکر تھی۔ سارے جہان میں اشتیاقا کابول بالا تھا۔ وہ تمام مناظر اس کے ذہن میں کوندے۔ مرزا سبط احمد جنھوں نے اسکی گڑیوں کی پٹاری میں چند پرانے کپڑے ٹھونس کے بطور بے دام کی کینز گولے والوں کے ہاں نہال دیا تھا۔ کیسا کیسا روٹی گڑ گڑا کر دعائیں مانگیں۔ پھلے چھ برس سے ان لوگوں کے ہاں کو لہو کے پیل کی طرح جتی ہوئی تھی۔ بغیر تخواہ۔ صرف دو اٹھنیاں بطور عیدی شیخ جی سال میں دو مرتبہ اُسے دیتے تھے۔ اب تک اسکے پاس پورے چھ روپے جمع ہو گئے ہوتے لیکن غوثیہ اس سے اُدھار مانگ کر کبھی لوٹاتی ہی نہیں تھی۔

گھر کے مرد زیادہ تر باہر والے مکان میں رہتے۔ کھانا بھی وہی رکھتے۔ سوتے بھی وہیں۔ کبھی کبھار ندر آجاتے۔ ابھی چند روز قبل کی بات تھی۔ بڑے شیخ جی جب زنان خانے میں آئے۔ بیوی سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ اس گفتگو سے نوابن نے پہلی بار اندازہ لگایا کہ مرزا سبط احمد اسکی اتنی بڑی جائیداد ہرپ کر کے جیلا بادکن جا ہے۔

لیکن اسکی طرف سے مقدمہ لڑنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ اسکے پاس اس جائیداد کی ملکیت کا کوئی ثبوت موجود تھا۔ شیخ عبدالبا سبط پر اُسے پھٹے میں پاؤں اڑانے کے قابل نہ تھے۔ تہجد گزار پر سبز گار آدمی تھے۔ پیشانی پر گٹا۔ جماعت سے وہ بچکانہ ادا کریں۔ اشراق و چاشت وہ پڑھیں۔ لیکن یتیم کے طرفدار بھی نہ تھے۔ درد مندی کے دو بول کہنے دلچودہ سالہ زندگی میں اسے بہت کم ملے تھے۔ دراصل ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی بھی نہیں ملا تھا۔ اور غوثیہ کی بے جس سونے سے لدی بھینس جیسی ماں نے اس کے لئے پھٹے پرانے بادلے کا سرخ دوپٹہ نکال رکھا تھا۔ خستہ گنگا جمی کرن پٹھے والا جسے اُٹھا کر وہ اُسے ممد و کی دلہن بنائیں گی۔

پٹروس کی مسجد کے کٹھ ملانے ایک بار جمعہ کے وعظ میں زوجہ کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ عورت ذات انسان نہیں۔ مرد سے کمتر درجے کی مخلوق ہے۔ ناقص العقل۔ اسوجہ سے اسکا دین بھی ناقص ہے۔ وعظ صحن میں صاف

سنائی دیتا تھا اور گوٹے والوں کی مستورات سر ڈھانپ کر بڑی عقیدت سے سنا کرتی تھیں ” اے ہم عورت ذات کیا جانیں “ ان سب کا تکیہ کلام تھا۔ نواہن بھی اب تک یقین کرتی رہی تھی کہ وہ انسان سے کم درجے کی مخلوق ہے۔ اس وقت قالین پر بیٹھے بیٹھے اچانک اس نے طے کیا۔ میں انسان ہوں۔ بھیڑ بکری گائے بھینس کی طرح کوئی شے نہیں ہوں۔

کروٹ بدل کر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے ہاتھوں پر غور سے نظر ڈالی اور فیصلہ کر لیا۔ میں انسان ہوں۔ حیوان نہیں ہوں۔ انسان۔ لڑکی اُسے لگا جیسے کسی نے اپنا نرم سا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ بسکیاں لیتے لیتے اسکی آنکھ لگ گئی۔ شمو کی خلاتر س بھاوج پردہ کروا کر لال کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے ریشمی لحاف اڑھایا آنکھیں منگوا کر قریب رکھی اور گرم دودھ لانے یا درچی خانے چلی گئی۔

برابر کے کمرے میں شمو کے بین جاری تھے۔ شور سے نواہن کی آنکھ کھل گئی۔ ”ہائے اماں جانی مجھ کس پر چھوڑ گیتے ہائے ابھی تمہارے مرنے کے دن تھے؟ اور کتنا منع کیا جب وہ دیوانی خالہ واپس آنے کو تیار نہیں نہ ملنا چاہے ہے تو تم کیوں اس کے پاس دوڑی دوڑی جاؤ ہو لو کا دو۔ ارے اسی غیبانی ملائی نے چورن میں ملا کر کچھ کھلا نہ دیا ہو۔ ہماری تو وہ دشمن ہو رہی ہے۔ ڈائین۔ خدانے تمہو بڑے پر جھلسا بنگا کر صورت بھی ڈائین کی کر دی ارے اسی ہپونے اماں کو۔“

”توبہ کرو بیٹیا۔ سگی بہن سگی بہن کی قاتل ہوگی؟“ ایک مردانی آواز۔

”استاد جی آپ کیا جانیں۔ آپ تو ہمارے یہاں ابھی آئے ہیں۔ یہ چالیس کے پیٹھے میں تھیں جب تائب ہوئیں۔ کیوں؟ چہرہ جھلس گیا تھا۔ مجبوری کا نام صبر۔ پھر اماں کے پیچھے پڑ گیتیں تم بھی توبہ کرو۔ میں پوچھتی ہوں کا ہے سے توبہ کرو؟ ہم ڈاکے ڈالتے ہیں؟ قتل کرتے ہیں؟ جراثیم پیشہ ہیں؟ ہم نے راگ ریت کو زندہ

رکھا ہے گا نانا ج ہمارے دم قدم سے قائم ہے۔ بڑے بڑے استادوں کا نام ہم روشن کرتے ہیں۔ اپنی مرضی سے آزادی سے رہتے ہیں۔ بھیڑ بکری گائے بھینس کی طرح جینا نہیں چاہتے۔ بے دام لونڈیوں کی طرح ساری عمر کھانا پکاؤ۔ بچے پالو میاں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ طلاق کی تلوار سر پر لٹکتی رہے۔ میاں سوتن لے آویں۔

ساس نندیں جوتیاں ماریں اُف نہ کرو۔ نا صاحب ہمیں گرسنتوں کی یوچڑ زندگی نہیں چاہیے۔ ذرا اسی گھر میں دیکھ لو چوق کے ادھر ہمارے بھائی صاحب نے نکاحی بیوی کی کیا گت بنا رکھی ہے۔ وال میں نمک زیادہ ہوا اور وہ چلائے ابھی ایک دو تین کڑوں گا۔ اور وہ سر جھکائے سنتی رہتی ہے غریب نا صاحب۔ ہم کاہے سے توبہ کریں۔ ایں؟ تو استاد جی یہ خالہ جانی ہماری دشمن ہو گئیں۔ ایک سپر فوڈ نے ایک کھترے نیم حکیم سے دو بولوں پڑھوا دئے۔ حج کر کے آئیں تو گللی گللی تسبیح چورن بچنے لگیں۔ اماں کو پتہ چلا کسی پنجابی سوداگر کے ہاں آتو جی بن گئی ہیں مطب کرتی ہیں۔ یہ محبت کی ماری علاج معالجے کے بہانے پتہ معلوم کر کے انکے ہاں پہنچیں۔ وہ اسی رکھائی سے ملیں اب انکو یہ ڈرائگ تھا کہ راز فاش نہ ہو جائے اگر سوداگروں کو معلوم ہوا کہ یہی وہ مشہور دلنواز دلی والی ہیں یا ہوا کرتی تھیں تو آفت آجائے گی۔

”مگر صاحب ہماری والدہ کہاں مانتی ہیں۔ آج پھر گئیں۔ جی ماندہ تھا۔ میں نے کہا ٹمٹم بیھج کر انگریز ڈاکٹر بلوا لو۔ بولیں نہیں آپا سے مل آؤں انکی مکہ شریف والی دوا سے اچھی ہو جاؤنگی۔“

چند لمحوں قبل مہر و گھر پہنچی تھی۔ لال کمرے میں داخل ہوئی۔ نور نظر کے بین کالوں میں پڑے بے اختیار ہنسنے لگی۔ شمو بھاگی بھاگی آئی ماں سے پٹ گئی۔ مہرونے لاڈ سے کہا: ”توبہ ہے نیچی۔ کیا کھرام پچا رکھا ہے۔ خواہی نخواہی مجھے واپس آنے میں ذرا دیر کیا لگی تم لوگ بولا گئے۔ اور یہ لحاف میں کون ڈھیر ہے؟ یہ سونے کی جگہ ہے؟ وہاں انکی چھو کرسی نوا بن چیت ہو گئی۔ انکے ہاں پٹسٹن پڑی ہے۔“

جوان جہان لڑکی بھاگ گئی۔“

ابیلیسی دودھ کا پیالہ لے کر آئی۔ نوابن کو سہارا دیکر اٹھایا۔ وہ متوحش لگا ہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مہروا سے دیکھ کر سٹ پٹائی۔ پیالہ اُسے تھماتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”اے نوابن چمکو۔ کرموں جلی تو یہاں کیسے پہنچ گئی۔“ میں نے ڈیوڑھی میں جا کر دیکھا ڈولی نہ کہار۔ جسمی ماتھا ٹھنکا تھا۔ ممدو دوسری ڈولی لایا۔ اندر نوابن نوابن کی پکار پڑی تھی۔ سودا گروں کے کھانے کا وقت۔ بی نوابن غایت۔ بتا تو وہی وہاں سے کیوں بھاگ آئی کیا تو وہاں بہت دکھی ہے۔ وہاں سے نکلنا چاہتی ہے؟“

نوابن کی ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ جو نہ ہاں تھا نہ نہیں۔ پھر بولی ”میاں تو آنکھ چھوٹی کھیلنے کھیلنے ڈولی میں چھپ گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ کہار اندر آئے۔ ڈولی لے بھاگے۔ سمجھے آپ ہیں“

”یا مظہر العجائب۔ چراغِ گل اور لونڈیا غائب! استاد جی نے کہا۔“

”میں نے استاد جی چھیدو اور بنواری سے کہہ رکھا تھا۔ جو ہی ڈولی میں بیٹھوں وہ اسے اٹھا کر چلتے ہیں۔ میری تو اس گھر جاتے روح فنا ہوتی ہے۔ کہیں بے چاری آپا بیگمماں کا راز نہ فاش ہو جاتے“

”اے تو گئی ہی کیوں تھیں۔ ٹمٹم بیہج کر بلوائیتیں“ شمنو نے ناک پر انگلی رکھی۔

”انہوں نے یہاں قدم رکھنے کی قسم جو کھا رکھی ہے۔“

اس اثنا میں نوابن کو گرم گرم دودھ پی کر آرام ملا۔ گرمی اور راحت اور سکون کے انوکھے احساس نے غلبہ کیا اور آنکھ لگ گئی۔

سردیوں کا موسم۔ دس بجے آدھی رات معلوم ہو رہی تھی۔ شہر کے دور رئیس رائے زدہ کیلاش نرائن ماتھرا اور خان بہادر برکت اللہ فوجی ٹھیکیدار تشریف لائے۔ صدر نشین ہوئے۔ ابیلیسی نے کنٹراور گلاس سامنے رکھے۔ اٹام اور اسکاچ پیش کی۔ جو کشمیری گیٹ کے پارسی کی دوکان سے اسی روز آئی تھی۔ مہر و فوراً

بنت بناؤ کر، انکے پاس آن بیٹھیں۔ دونوں وضعدار صاحبان مہر و سہ سے کلام غالب سننے آجایا کرتے تھے۔ انھیں خوش نہ آیا کہ ایک چھوکری وہیں فرش پر پڑی بے جنر سو رہی ہے۔ ”بی صاحبہ یہ کون علت ہے؟“ رائے زادہ صاحب نے پوچھا۔

”اے علت سی علت؟“ مہر و سہ نے افسانہ شب زمستان گوش گزار کرنے کے بعد مشورہ طلب کیا۔ ”یہ ناگہانی امر ہے۔ آدھی رات کو واپس بھیجتی ہوں سو داگر پچھے پوچھیں گے کنواری جوان پردہ نشین لڑکی کہاں گئی تھی۔ اتنی دیر کہاں رہی۔ کیا بتلائے گی۔ بتلائی ہے تو میری بڑی بہن سابق بیگماں جان حال حاجیہ ملانی صاحبہ کا پردہ فاش ہوتا ہے۔“

دونوں اصحاب حقہ کڑکڑانے میں مشغول رہے رائے زادہ صاحب کچھ دیر بعد بولے۔ ”بائی صاحب ہونی اپنی بنسی بجا چکی۔ ورنہ وہ تمہاری پالکی میں کاہے کو چھپتی۔“

”رائے صاحب وہ تو کہتی ہے ہمیشہ ہی آنکھ مچولی کیلئے۔“

”ہاں۔ مگر یہ تمہاری ڈولی تھی۔ پریوں کا کھٹولہ۔“

”ساری زندگی ناگہانی حادثات کا سلسلہ ہے؟“ تھر و پھر فلسفہ پر اتریں۔ ان پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت ہی نے انکو خراب کیا۔ پھر پوچھا۔ ”بتلائیے اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔“

رائے زدہ گورنمنٹ کالج لاہور اور خان بہادر علیگڈھ کے گریجویٹ تھے۔

برکت اللہ صاحب کو علم جفر سے بھی شغف تھا۔ کچھ سوچ کر بولے ”اس کا نام؟“

”یتہ نہیں۔ وہاں سب اُسے نوابن پکارتے ہیں۔“

”ہوں۔ تو ن بادی ہے۔ ہوائی اڑنے اڑانے والا۔“

”اسی یئے یہ اڑ کر یہاں آگئی؟“ مہر و سہ نے ہنس کر پوچھا۔ ”چھوڑیے میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔“

” نہ مانیے “ انہوں نے فوراً جیب سے نوٹ بک نکال کر حساب جوڑنا شروع کیا۔ ” صحیح نام معلوم ہونا ضروری ہے جب عقل کام نہیں کرتی تو موڈرن فلسفہ دھرارہ جاتا ہے۔ انسان پھر اپنے بزرگوں کے علوم میں پناہ لیتا ہے۔ طرفہ واردات ہے۔ مگر پورا نام معلوم ہونا چاہیے۔ فال نکال رہا ہوں۔

” مہر و لڑکی! کو بھول جفر میں لگ گئیں۔ اچھا ہمارا بتائیے کیا ہوگا؟ “
 ” یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔۔۔ “ جلدی جلدی حساب لگایا۔ بولے ” م آتشیں حرف ہے۔ آپ تو۔۔۔ “

” اے نوج۔ ڈور پار۔ چھائیں پھوئیں۔ آتشیں حرف ہو سیری دشمن کا۔ صا۔
 آپا کا ایسا بھیا نک واقعہ ہو چکا ہے۔ اب آتش و آتش کا نام نہ لیجئے۔ دال کیا آتشیں حرف تھا جو وہ جل گئیں۔۔۔؟ “

” دال خاکی ہے۔ خاک ر اور عاجزی پر دلالت کرتا ہے۔ تو دیکھئے سچ مچ

فقیری لے لی “

مہر کو پھر نوا بن یاد آئی۔ جو سامنے لحاف میں پٹی بے خبر سو رہی تھی۔
 ” صاحب مجھے تواب اس چھو کرمی کی فکر ہے “

” فکر کا ہے کی۔ اگر اس کا کوئی پُرساں حال نہیں اور صورت کی اچھی ہے اپنی
 ملکہ بنا لیجئے گا “ رائے زادہ کی تلاش نرائن نے جواب دیا۔ ” فقط تین سو نو چیاں
 چند بانی مہ لقا تے دکن کے گویا اسٹاف پر تھیں۔ آپ مہ لقا تے دلی ہیں اس
 لڑکی سے آغاز کیجئے! “

” توبہ ہے رائے صاحب۔ آپ مجھے کیا پیشہ ورنائیکہ سمجھتے ہیں؟ میں بھی ایک
 شریف زادی۔ دو وقتاً مہر و لڑکی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

دونوں صاحبان متعجب نظر آتے۔ رائے صاحب نے گھبرا کر کہا معاف
 کیجئے گا ہمیں معلوم نہ تھا۔ چند منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ مہر نے گلوریاں بنا کر
 پیش کیں۔ کچھ دیر سوچا کیں پھر بولیں۔۔۔ ” سنہ ستاؤں میں طغرل بیگ کی سر سے

جب نکلے، دنوآز اور مہرہ کو کون جانتا تھا۔ اتنے عرصے اس ستارے عیوب نے پردہ داری کی۔ آج اس وقت آپکے فقرے پر منہ سے نکل گیا۔ مگر اب کیا مصافحہ ہے پرانی باتیں ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ عرب سرائے۔ طفعل بیگ کی سرائے — ہم جیسی ہزاروں پر کیا کیا گزری۔ غدر کو لوگ بھول بھال گئے۔“ چند الفاظ میں اپنا قصہ سنایا۔

”ع جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا۔“ رائے زادہ نے ایک آہ سرد کھینچی۔ مہرہ سر جھکا کر پان بنانے لگیں۔

”بھائی برکت اللہ“ رائے زادہ کی لاش نرائن کچھ دیر کے سکوت کے بعد بولے۔
 ”مشنریوں نے کتنی شامت زدہ لڑکیوں کو بازار میں بیٹھنے سے بچایا۔ نصیب کی بات ہے کہ انھیں منورمی کشمیرن ملیں کسی بائبل ٹھونکتی میم کے ہاتھ نہ لگیں۔“
 ”اے نوج۔ احاطے کے عیسائی بنتے میرے دشمن“ مہرہ نے چمک کر کہا۔
 ”ہمارے ہاں قسمت کی ماری بچیوں کے غجور کون ہیں۔؟ میرے شکار۔ نایرکائیں۔ عبرت! مشنری اسپرٹ کا مالک نہ مولوی نہ پنڈت۔ نوآرے پر پادری سے مناظرے کرنے کو البتہ دونوں مستعد۔ معاف کرنا بھائی برکت اللہ۔ کھری بات کہتا ہوں“
 کم سخن خان بہادر سٹک گڑ گڑا کیے۔

آتشدان پہ رکھے جرم کلاک نے گیارہ بجاتے۔

”نادر چیز ہے“ رائے زادہ نے اظہار خیال کیا۔

”اماں منورمی کی والدہ کو لارڈ لیک کے کسی افسر نے دیا تھا“

”واہ“ رائے زادہ نے قہقہہ لگایا۔ ”جب سارا کشور ہند گنگھڑا اور تلوار کی

جھنکار سے گونج رہا تھا۔ ادھر اس کلاک نے گجر بچایا ادھر کرنیل صاحب النوری کشمیرن کے ڈیرے سے برآمد ہوئے کسی ہندوستانی بادشاہ کا تیا پانچہ کرنے نکل گئے۔“

”اماں منورمی بتلاتی تھیں۔ بیگم سمرو بھی ایک کشمیری رقاصہ تھیں۔ اور چھوٹی

بیگم بھی۔ نواب شمس الدین والی۔ اور چودھری فتح محمد عبدالغیر الدین حیدر

کے لکھنؤ کے انسانے سناتے تھے“

”اں صاحب۔ دلی اور لکھنؤ کی زنان کشامرہ! ہم تو افسوس آپکو انھیں کے زمرے میں شامل سمجھائیے“

مہرونے ایک مرمیں یونانی مجھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ تقدیر کی دیسی ہے نا۔ آپکو بتایا تھا اماں منوڑی کرنل ہیرٹ کے بی بی خانے میں بہت دنوں رہی تھیں۔ دلایت لوٹتے وقت وہ اس طرح کی بہت سی خوبصورت چیزیں انکو دے گیا تھا۔ کافی تو میرے شیطان بچوں نے توڑ ڈالیں۔ چاندی کی منی سی لکھشمی سیٹھ ترلوک چند کسی دیوالی پر شمو کے لیے لے آئے تھے۔ میں نے گھر میں نہیں رکھی کہ مت پرستی ہے۔ یہی پت پکھا وحی کو دیدی۔“ مہرونے اولڈ ٹام کی چسکی لگا کر کہا۔

”مورتی گھر میں رکھیے نہ رکھیے لکھشمی جی آپ پر یونہی مہربان ہیں“ رائے زادہ صاحب ہنس کر بولے۔ چند منٹ سکوت طاری رہا۔ پھر انھوں نے کہا۔

”محمد شاہی بزرگوں کو گزرے بھی سو سال ہونے آئے۔ بلکہ زیادہ۔ لیکن پونہ صدی قبل کا آصف جاہی حیدرآباد! اس کے عجائب و غرائب کا تذکرہ ہم والد مرحوم سے سُن چکے ہیں۔ ہمارے دادا جی مہاراجہ چند دلال کے درباری مراسلہ نویس ہو کر دکن چلے گئے تھے۔ چند بابائی اس زمانے میں ایک مجرے کا ایک ہزار لیتی تھیں۔“

رائے زادہ نے اولڈ ٹام کے گلاس پر نظر میں جمادیں۔ گویا مہ لقا شیشے میں اتر آئی ہوں۔ کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ملول آواز میں کہا۔

”دلی کی ان خواجہ زادیوں کو طوائف الملکو کی نے طوائف بنایا۔ آپکو غدرنے افسوس۔ ہماری سوسائٹی تے مہرو صاحب۔ شریف ایجوکیٹڈ لیڈیاں پیدا نہ کیں۔ البتہ تعلیم یافتہ ارباب نشاط۔۔۔ بہات۔۔۔!“

مہرونے اپنا بلوریں جام گنگا جمنی طشت میں رکھ کر طہورہ سنبھال لیا تھا۔ رکھ دیا۔ وہ رائے زدہ صاحب کی باتیں اس سیرج مہموت ہو کر سنا کرتی تھیں۔

”چند بابائی کی آفت زدہ ماں بہنوں کی دستگیری بھگتوں نے کی تھی۔ آپکی دھاڑیوں نے دونوں قومیں ردِ خلائق۔ آڑے وقت میں وہی لوگ کام آتے۔ نہ ملا نہ پنڈے“

خان بہادر صاحب کو مخاطب کیا جو مے نوشی سے اجتناب کرتے تھے۔ چپ چاپ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ”اسی ہماری دلی کے ایک صاحب تھے۔ خواجہ محمد حسین۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں۔ سینے کا بھائی برکت اللہ۔ آپکے سننے کی بات ہے سرکاری ملازم ہو کر گجرات چلے گئے۔ سورت کے محکمہ کسٹمز میں۔ وہاں کیاغبن۔ زبردست۔ فرار ہو گئے۔ بیوی بچوں کو بے سہارا چھوڑا۔ ان غریبوں نے بڑی مصیبتیں جھیلیں۔

در بدر۔ ماں اور چار پانچ بیٹیاں۔ مالوہ میں بھٹک رہی تھیں۔ چند بھگتے مل گئے۔ نہ۔ وہ لوگ ننھے بچوں کو نچاتے تماشہ کرواتے جگہ جگہ گھومتے تھے۔ انہوں نے اس کبے کو آسرا دیا۔ بچوں کو نواح گانا سکھایا۔ ناچتے گاتے برہان پور پہنچے۔

” وہاں آصف جاہ نظام الملک کیمپ کر رہے تھے۔ بھائی برکت اللہ۔ غور فرمائیے گا۔ ادھر ادھ میں ایک صوبیدار خود مختار ہو کر اپنی نئی عیش پرست سوسائٹی کی بنا ڈال رہا ہے۔ ادھر دکھن میں دوسرا صوبیدار۔ توہاں۔ مہر و صاحب۔ آپٹن رہی ہیں“

رائے زادہ نے دوسرا جام بھرا ”بھگیتوں نے ان لڑکیوں سے کہا فاقہ کشی اور خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات چاہتی ہو۔ اپنے نام بدل ڈالو اور کُود پڑو میدان عمل میں۔ چنانچہ خواجہ محمد حسین دہلوی کی بیٹیاں بائیاں بن گئیں۔

” مغربی ہند میں بانی تکریم کا لقب ہے۔ ہمارے ہاں اونچی ڈیر سے دارطوائفوں کی بڑی عزت تھی۔ جو کوچہ بی بی گوہر ہے۔ پھلی صدی کی بڑی باعزت ڈیر سے دارنی تھیں

” محمد شاہی دلی دکھن اور راجستھانی پاتروں سے پٹ گئی تھی لیکن وہ نر تکیاں برہان پور کیمپ سے آصف جاہی دربار میں پہنچیں ایک کی نور نظر چندا۔ —

شدو اندر آیا۔ حقے تازہ کرنے کے لیے لے کیا۔ مہر و ہمہ تن گوش رہیں

” — مہاراجہ چندو لال کے دربار میں کُرسی ملتی تھی۔ خود اپنا دربار لگاتی تھیں۔ آصف جاہ ثانی کے پیچھے پیچھے اپنے ہاتھی پر میدان جنگ میں جاتی تھیں۔

” ہندوستان کی بد قسمتی۔ مہر و جان۔ ٹیمپو صاحب جو ہے وہ انگریزوں سے بڑتا بھرتا پھر رہا ہے۔ اور ہمارے آصف جاہ اس کے خلاف انگریزوں

کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسے ایک جنگ میں شکست دے کر حیدرآباد لوٹتے ہیں۔ جشن مناتے ہیں چند! بانی کو ملے لقا کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔ جاگیر۔ نوبت۔ منصب۔ افسوس۔ پہلے دکھن نے چاند سلطانہ پیدا کی تھی افسوس کہ اب چند بانی — جوئی کی محو شاہی طوائف نور بانی سے زیادہ شان و شوکت رکھتی تھی۔

” لیکن صاحب وہ عورت تھی کیتائے روزگار۔ نیزہ باز۔ تیر انداز۔ شہسوار۔ علم دوست۔ رُو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ۔ کہنے لگی

ع دیکھو کچھ تو یار بجایس تمام رقص — محفل میں ناچتے تاجتے اپنا علمی دیوان اٹھا کر
کئی کپتان میلکم کے حوالے کیا۔ وہ ننھو انڈیا آفس لندن میں داخل دفتر۔ مرزا نوشہ کی پیشبرد
تھی۔ ع سر پہے مراجب کف آججئے تیغ۔ اور اپنے ہم عصر اودھ کے نواب آصف الدولہ
کی زمین میں سے ہلال مہ نو کو کم دیکھتے ہیں۔ میاں یہ جو ابرو کا خم — اور ہر غزل کے
مقطع میں مولانا علی کی منقبت — ہمارے دادا جی نے اپنی بیاض میں نقل کر رکھی تھیں۔
مگر بھائی برکت اللہ —

” اگر پردے کی بو بو ہوتی نہ اتنا لکھ پڑھ پاتی نہ اسکی قابلیت کو اتنا سراہا جاتا۔
آج بھی مہر و صاحب اردو میگزینوں میں آپ جیسی دلرباؤں ہی کی غزلیں چھپتی ہیں“
” رائے صاحب۔ اب اور زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ یہ سوسائٹی اور اس کے قوانین
میں نے نہیں بنائے۔ اور سن لیجئے خان بہادر صاحب چند بانی کتنی عالم فاضل تھیں۔
آپ صاحبان عورت کو ناقص العقل کہتے ہیں۔ ہائے ہائے۔ جس امت کی بی بی فاطمہ
شفاعت کی سفارش فرمائیں گی۔ اسکے طبقہ نسوان کی یہ درگت۔ “ مہر و نے آہ بھری
اور پاندان اپنی طرف کھینچا ” لفظ حرافہ اور علامہ بھی عورتوں کیلئے بطور دشنام
استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کا پڑھا لکھا ہونا اتنی معیوب بات ہے! “

برکت اللہ صاحب اب بھی چپ رہے۔ انکو مہر و جیسی ذہین عورتوں سے چڑھ
تھی۔ مگر اپنے گھر کی ان پڑھ ستورات میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر سہفتے یہیں آجاتے تھے اور
مہر و اور رائے زادہ کے مباحثے خاموشی سے سنا کرتے تھے۔

” مہر و صاحب۔ ضروری نہیں کہ چندا بائی جیسی عالم بننے کے لیے بالا خانہ کی عالم آرا بنا جائے۔“

” بمعانی کیلاش نرائن۔ یہ دستور تو بھارت و رش میں قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اب خان بہادر نے بات کی۔ پرانے زمانے کی ویشیاؤں کے لیے چونٹھ گنٹوں کا جاننا لازمی تھا یا نہیں؟“

” درست۔ لیکن میں آج کے اہل ہند کو یہی تو سمجھانا چاہتا ہوں۔ کلکتہ بمبئی مدراس میں آج ایک سے ایک لائق نیٹو لیڈیاں موجود ہیں بے پردہ اور تعلیم یافتہ ہونے کے لیے بے عزت ہونا ضروری نہیں ہم فخر یہ یہ کہتے ہیں کہ روساء اپنے لڑکوں کو آداب و تہذیب سیکھنے اعلیٰ درجے کے بالا خانوں پر بھیجتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیوں؟ کیوں نہیں ہماری مائیں بہنیں ایسی ایجوکیٹڈ کہ خود اپنے لڑکوں کی تربیت کر سکیں؟ انگلستان میں لارڈ لوگ اپنی اولاد کو تھیر میں ناچنے والیوں کے ہاں تربیت کے لیے بھیجتے ہیں؟ اس اتوار کو۔“ وہ مہر و سے مخاطب ہوئے۔

”طاؤن ہاں میں میرا لیکچر ہے۔ آئیے گا؟“

”بسرو چشم“

رائے زادہ اور مہر و جان کے چہرے گیس کی روشنی میں زرد نظر آ رہے تھے۔ ملول۔ پشیمان۔ متفکر۔

”واقعات پر ہمارا قابو نہیں رائے صاحب۔“ مہر و نے آہستہ سے کہا۔

”کبھی بھی نہیں تھا۔ لیکن انسان نے کوشش تو برابر کی۔ ڈارون کہتا ہے۔“

”کیلاش نرائن۔ تم تو بن گئے ہو ریفارمر۔“ برکت اللہ صاحب نے قطع کلام

کیا۔ ”تم اپنا کام کئے جاؤ۔ سوشل ریفارمر بی مہر و کا منصب نہیں۔ انھیں گانا

سنانے دو۔ سر سید احمد خان ہمارا برا بھلا خوب سمجھتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو خود

ایک زمانہ مدر علی گڑھ میں قائم کر دیتے۔ کچھ تو وجہ ہوگی جو وہ لڑکیوں کو اسکول

بھیجنے کے خلاف ہیں۔“

اچھا بھئی۔ یہ آپ لوگوں کا قومی معاملہ ہے ہم کچھ نہ کہیں گے۔ مگر اپنے آرمیکل لکھنے کے لیے پردہ سسٹم کے متعلق ہم نے بھی بہت اسٹڈی کیا ہے۔ کاسیٹہ قوم اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ ہم یہ تو بھی جانتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اس موجودہ رسم سے کوئی کنکشن نہیں۔ تاریخ کی ایک سے ایک مستند کتابیں ہم نے کھنگال ڈالیں۔ سید امیر علی کی کتاب ابھی لندن سے چھپ کر آئی ہے۔ جی۔۔۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔ سننے مہر و صاحب۔ ایک خلیفہ تھا۔ ولید۔ پرلے درجے کا عیاش۔ اس کے دور میں شہر بغداد ساری دنیا کی زنان بازار سے بھر گیا۔ تو شرفاء نے اپنی عورتوں کے لیے پردہ لازم کر دیا۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ آج بھی جو نیٹو پرنس حد سے زیادہ بد معاش لنگنگا ہوتا ہے اسکی دہشت میں اسکی رعایا اپنی بہو بیٹوں کو بالکل دم نچت رکھتی ہے۔

”اپہن پر آپ لوگوں نے سات سو برس حکومت کی۔ وہاں پردہ تھا؟ اجی بالکل نہیں تھا۔ وہاں کی محمدن بیبیاں کھلے منہ ہر چیز میں شامل ہوتی تھیں۔ باقی یورپین عورتوں کی طرح۔ اور اس وقت کے یورپ کی ساری عورتوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ جلسے جلوس۔ ناچ گانا۔ اسکول کالج“

”شریف زادیاں ناچتی گاتی تھیں؟“ مہر نے حیرت سے سوال کیا۔

”رقص و سرود کبیوں کے کھاتے میں ہیں ڈالا گیا ہے۔ مشرق میں جیہی تو فرنگی ہماری سوسائٹی کو تعجب سے دیکھتا ہے۔ ہمارے سوشل قانون اسکی سمجھ میں نہیں آتے مہر و صاحب ایک تازہ ولایت انگریز استاد نے گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھ سے پوچھا تھا۔ کیا تملوگ اپنی لیڈیز کو فطرتاً آوارہ اور بد معاش سمجھتے ہو جو انکو اتنا گھونٹ کر رکھتے ہو کہ باہر نکلیں اور بھاگیں۔ کسی نامحرم کی نظر ان پر پڑی اور وہ ہوئیں برباد“

”لا حول ولا قوۃ۔۔۔ برکت اللہ صاحب نے آرزو کی سے کہا۔

”جی ہاں۔ لا حول ولا قوۃ۔۔۔“

”سھائی کیلاش نرائین۔ پردہ عزت کی نشانی ہے ناموس کا ضامن“

” سبحان اللہ! تو یہ لاکھوں کروڑوں عزیز محمدن عورتیں بازاروں میں سودا سلف پتی پتی پھر رہی ہیں کر گھوں پر بیٹھی ہیں کھیتوں میں کام کر رہی ہیں انکی کوئی عزت نہیں؟ سب آوارہ ہیں؟ آپکے مولوی صاحبان انکے لیے فتوے کیوں نہیں صادر کرتے۔؟“

” ہاں۔ ہاں۔ کر دیں انھیں اسلام سے خارج کہ کھلے منہ پھرتی ہیں۔ قوم اجلاف قوم ارزال!“ مہرونے طنز کی۔ ”عزت محض نجیوں کی اجارہ داری ہے۔“

” مہرو جان! عزت بے عزتی سارے پیمانے گردش میں ہیں۔ پیہم گردش۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے رنگ محفل بدل گیا۔ کل تک فرنگی ہماری پوشاک پہنتا تھا۔ ہماری زبان بولتا تھا۔ آج ہماری تذلیل کرتا ہے۔“

چند منٹ کے سکوت کے بعد کیلاش نرائین نے اولڈ ٹام کی بوتل اٹھالی۔ اسے غور سے دیکھا۔ آہ بھری۔ ”ہائے۔ غالب خستہ۔! واقعی انکے بغیر کون سے کام بند ہیں! ہمارے تاؤ جی مرحوم کہا کرتے تھے۔ مرزا نوشہ کے بعد دیٹی میں رہے تو کیا رہے وہ بھی جیدر آباد جا بے۔“ رائے زادہ صاحب اب بہت افسردہ ہو چکے تھے۔

” سنا ہے چند بابائی مہ لقا لاکھوں روپیہ چھوڑ کر مرے!“ مہرونے کہا۔
” لاکھوں۔؟ پورا ایک کروڑ۔ لاکھوں تو زندگی میں خیرات کر گئی تھیں۔ مرے کے بعد مقبرے پر عرس ہونے لگا۔ آپ مہ لقا تے دہلی ہیں آپ بھی کچھ کار خیر فرمائیے۔“
” مثلاً۔؟“

” ایک زنانہ یتیم خانہ قائم کیجئے اس میں اس بڑکی کو داخل کیجئے جہاں وہ یتیم حاصل کرے۔ بجائے اسکے کہ کوٹھے پر تعلیم لے۔!“

مہرو اپنی کنجوسی کے لیے مشہور تھیں۔ رائے زادہ نے پھر کہا: ”کیوں صاحب؟“
” میرے کھولے ہوئے یتیم خانے کو لوگ قبحہ خانہ نہ کہیں گے؟“

گھوریاں بنائیں۔ چند منٹ کے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولیں۔

”رائے صاحب۔ ہم نے کم از کم اپنے باپ دادا کا نام رسوا نہ کیا۔ آپا بیگمیں اب چوڑن والی جین کھلاتی ہیں وہ ستار عیوب اب تک انکی پردہ داری کر رہا ہے۔ خیر آپا کا معاملہ تو اب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا والوں سے انھوں نے اپنا کیس واپس لے لیا۔ پراس معصوم بچی کے لیے قدرت کو کیا منظور ہے۔ پردہ داری یا پردہ دری؟“

سنہرے فرشتوں والے جرمن کلاک نے گرو گرو گرو شروع کی۔ گیس کی لائین مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ دونوں حضرات اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہرو انکو زینے تک پہنچانے گئیں۔ چند لمحوں بعد نیچے سڑک پر سے انکی بگھمیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ مہرو دروازے پر ہاتھ ٹیکے کھڑی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ مانوس آوازیں رات کی گہرائی میں ڈوب گئیں۔

جاگتے رہو۔ گشت کا چوکیدار چلا رہا تھا۔

فضل مولا اللہ والی اللہ مالک۔ بیچ خواجہ کی دیگ میں مولا مالک۔ اندھیرے میں کسی مجذوب نے نعرہ لگایا۔ لال کمرے میں واپس آکر مہرو نے سوچا نواب فاطمہ کے لیے کھانا نکلوائیں۔ مگر وہ اٹلسی لحاف میں لپٹی بے خبر سو رہی تھی۔

صبح نوبے کے قریب اپنے پیوند لگے برقعے میں ملفوف مغلائی بی بی بیٹھے گھسیٹی تسبیح ہزار دانہ جھلاتی زینے پر نمودار ہوئیں کوڑکی اوٹ سے پکارا۔ مہرو اد مہرو چھوٹی بہن اسی وقت سو کے اٹھی نہیں۔ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی صحن میں آئیں۔

مغلائی بی بی حلق پھاڑ کر چلائیں۔ ”کہاں ہے۔ ادھر تو میرے سامنے چھتسی۔“
 ”ہیں ہیں۔ آپا۔ ذرا آہستہ سارا بازار سن رہا ہے۔“
 ”تسقل۔ قظامہ۔ نواہن کو اغوا کر لاتی۔ دقاہ۔ اری کجھے ذرا خوف خدا نہیں۔“
 ”خدا سے تو تم ڈرو آپا۔ توبہ توبہ۔“

” اسی جرم ہی — سوداگروں کے ہاں پیسے پڑی ہے۔ بلا اس اچھا مال چھٹکا کو۔ اور یاد رکھ مہرو کی بچی۔ جرتی۔ اگر تو نے اس شتا کو چھپا دیا۔ کچھری چڑھو گی۔ برتنڈازوں سے نکلواؤں گی۔ یہ برٹش کاراج ہے سمجھی؟“

” آہ۔ دُند نہ مچاؤ۔“

” چُپ چنڈالنی۔ لو صاحب۔ یہ اندھیر دیکھو۔ ایک اجنبی جُروا دوا دارو کے بہانے میرے پاس آئے اور انکے گھر کے جوان جہان لوکرانی کو اٹھوا کے غارت غول۔ ہائے ہائے اب تو مجھ نگوڑی کا بھانڈا بھی کیسا پھوٹا۔ ہے ہے۔ کیا اندھی تقدیر لیکے پیدا ہوتی تھی۔ جاؤ پُوت دکھن۔۔۔ وہی کرم کے لچھن۔۔۔“

خالہ کی یہ پرانی رٹ اتنے برسوں بعد دوبارہ کان میں پڑی۔ شمو اور شدو بے اختیار نہیں پڑے۔ وہ چلا آیا کس۔۔۔ برسوں بعد آرام چین کی زندگی ان نیکدل بساٹیوں کے ہاں ملی تھی۔ مگر مجھ بندی کو تو اپنے لکھے پورے کرنے ہیں۔ نوابن۔ ادنوابن۔ ادھر تو آجھاڑو پیٹی — بڑا بیگنی — تجھ پر علیٰ کی سنوار۔۔۔“

نوابن کی آنکھ پرستان میں کھلی اڈوا اطلسی لحاف۔ نیچے فیروزی رنگ کا ریشمی تُرکی قالین۔ اسکے نیچے یہ موٹا گھٹا۔ خود کشمیری شال میں پارسل کی طرح لیٹی ادھر نفیس طشت میں دھری انگیٹی۔ اونچے دروازوں پر دلائی مشجر کے پردے ایک طباقے میں گلاب کی کیلوں کا ڈھیر۔ طاقوں میں گلاب پاش اور غود سوز۔ سبز تابدانوں سے چھتی آفتاب کی نارنجی شعاعیں ایک ننھی سی مرمرین دلائی موڑتی کو دمکار ہی تھیں۔ نواب فاطمہ مسحور ہو کر تقدیر کی دیہی کو دیکھتی رہی۔ دُھوپ کے چوڑے راستے میں رنگ برنگے چمکیلے ذرہ پراں تھے۔ نیلگوں کمرہ نیم غنودگی میں نوابن کو پریوں کا جل محل معلوم ہوا ہر چیز جس میں تیرتی سی پھر رہی تھی۔ عنابی محل کی جھالروالے آتھان پر ایک سنہرا منقش کلاک رکھا تھا۔ اس کی محراب پر بیٹھ دو ننھے ننھے سنہرے فرشتوں نے پربلا کر نفیریاں سنبھالیں۔ اس کرامت نے نوابن کو

بھوپکا کر دیا۔ نو کا گجر بجا۔ عین اسوقت ملائی جی کی کرازی آواز سنائی دی جو اسے گالیاں کوسنے دیکر باہر بلا رہی تھیں۔

وہ یہاں کیسے آن پہنچیں؟ جل محل کا طلسم مستتر ہو گیا۔ گھبرا کے کھڑی ہوئی۔ اپنے آپے پر نگاہ کی۔ یاد آیا۔ رات جب سردی سے لرز رہی تھی مہرو کی بہونے اسے اڑھادی تھی۔ ایسی ملائم نفیس گرم چادر۔ اسے جسم سے علیحدہ کرنے کو جی نہیں چاہا۔ اسوقت بھی بہت سردی تھی۔ شال اتار کر دوبارہ اچھی طرح اپنے گرد پیٹی۔ باہر آئی۔

مہرو کا چھیل چھبیلانوجوان لڑکا شد و برمی ٹنگی باندھے چھینٹ کی بندھی پر نقرئی تعویذ چھاتا، کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ نوابن کو دیکھ کر آنکھیں چمکائیں اور ماں سے بولا۔ ”اماں رات جب میں حقہ تازہ کرنے اندر گیا تھا راتے زادہ صاحب کسی مہلقا کا قصہ سن رہے تھے۔ تم نے بھی یہ حور لقا خوب پھانسی۔ جو“

مہلقا اور حور لقا کبوتریوں کی اقسام تھیں۔ بھائی کا فقرہ سن کر شمو نے ستائشی قہقہہ لگایا۔ وہ بھی ججن بی کا تماشہ دیکھنے اپنی خوابگاہ سے نکل آئی تھی۔ مہرو نے اپنی نالائق اولاد کو آتش بارنگاہوں سے گھورا۔ وہ صحن کی دھوپ میں مونڈھا ڈالے بیٹھی تھیں۔ نوابن سے بولیں۔ ”آپا کو کتھا سنا دے۔“

نوابن نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

ججن بی نے زینے کی لینڈنگ پر برقعہ بچھاتے بچھاتے رک کر اپنا ماتھا کوٹھا۔

”ہئے ہئے نواب فاطمہ۔ اُجرٹی۔ ازل کی بد نصیب۔ پیاروں پیٹی۔ چل واپس۔“

ہرچہ بادا باد۔ پر شیخ جی نہ تجھے نہ مجھ بد بخت کو اب اپنی دہلیز نہ لانگنے دینگے۔“

”جب تم بھی جانو ہو کہ تمہارا دہاں بُرا حشر ہوگا تو کیوں جارہی ہو اوکھلی میں

سردینے رک جاؤ یہیں دونوں۔ رہو آرام سے“ مہرو نے کہا۔

”اس لونڈیا کے لیے برقعہ منگا۔“ ججن بی نے ڈپٹ کر حکم دیا۔

بوقت ضرورت مہرو اپنی پردہ نشین بہو کا برقعہ استعمال کرتی تھیں۔

گھبراہٹ اور جلدی میں نوابین نے کاہی رنگ کی اس کار چوٹی شمال کے اوپر
برقعہ ڈال لیا۔ اور مغلانی بی کے ساتھ سیڑھیاں اتریں۔ پانکی حویلی حسام الدین حیدر
کی سمت روانہ ہوئی۔

شیخ عبدالباسط اور انکے بیٹے بھتیجے ابھی صدر بازار اپنی دوکان پر نہیں گئے تھے
مکان کے بیرونی چبوترے پر سر جھکاتے بیٹھے تھے۔ اہل محلہ جمع تھے۔ علی الصبح برادری
کے ایک پھیری والے کے ذریعے انکو سارا واقعہ معلوم ہو چکا تھا۔ خیر و مہرو کے ہاں
پیمک لیس پچک پینے جایا کرتا تھا۔ مہرو کو پردے میں بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ کل
شام اس گلی میں پہنچیں بے دھیانی میں پاؤں ڈولی کے غلاف سے باہر نکال لیے۔
خیر و تنبوی کی دوکان پر کھڑا تھا۔ خوردہ فروش تھا۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز نظر میں
رکھتا تھا۔ پانچ اندر بیٹھنے کے لیے ہاتھ برآمد ہوا تو ہیرے کی انگوٹھی کلائی میں جبرمن
سلور کی وہی چوڑیاں جو ایک روز قبل مہرو بانی نے اس سے خریدی تھیں سارے
دلی شہر میں یہ نئی وضع کی دلایتی چوڑیاں سب سے پہلے اس نے مہرو جان کے
ہاں بیچیں تھیں۔ انکی ہیرے کی انگوٹھی بھی پہچانتا تھا۔ انکے سازندوں نے اسے یہ
بھی بتا رکھا تھا کہ بڑی بہن دنو از حج کر آئیں اور اب شہر میں کسی جگہ ملانی گیری
کر رہی ہیں۔ دو اور دو چار۔ سارا معاملہ صاف۔

نوابین اور مغلانی بی جوں ہی واپس پہنچیں۔ شیخ عبدالباسط کا پہلوان نما بھتیجا
عبدالخالق آگے بڑھ کر لڑکی پر چھپٹا۔ ایک زور دار تھپڑ۔ قلعاقنی۔ رات کہاں گزاری
بول۔ مال زادی۔۔۔ دوسرا تھپڑ۔ نوابین مار سے بچنے کے لیے
جھک کر دہری ہو گئی۔ عبدالخالق نے اسکی شمال کھینچی جو برقعے سے نکل کر نیچے
گھسٹ رہی تھی۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں حرام کی کمانی۔ بول۔ کس تیرے یار نے
یہ دیا تحفہ۔ پچی زمانے بھر کی۔ حرام الدھر۔ بڑے آبا۔ اس شہدن کو

آپ نے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔“

” اجی مجھے تو یہ صدمہ ہے میری بچی غوثیہ برسوں اس بد ذات کی صحبت

میں رہی۔“

” بس بھائی جان۔ اب اس بات کو زبان پر نہ لائے۔ آپ بھی بغیر سوچے سمجھے“

اب عبدالباسط گرجے۔ ” بڑبی بی آپ نے سال بھر ہم کو بڑے دھوکے میں رکھا

بڑا جل دیا ہم لوگوں کو۔“

” نونو چوہے کھا کر۔“

” چور چوری سے جائے۔“

” علامہ۔“

” حرافہ۔“ حاضرین کے ریمارک۔

” اس بیجانی کا جواب نہیں گشتی۔ کیسے شکوہ تھکتی، واپس آن پہنچی۔ دلالہ سمیت“

” آپکی چھوٹی بہن مہر و جان آپ سے ملے آیا کی چاڈری سے نکل کر ہمارے

زنان خانے میں در آتی تھی۔ غضب خدا کا۔ اس نونڈیا کو درغلا کر اپنے کو ٹھٹھے پر

لے گئی اب آپ کیا چاہتی ہیں بائی جی“

” ہم دونوں کا سامان باہر منگوا دیں“ جن بی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

” ماشا اللہ۔ یہ بات آپ نے سمجھ لاری کی کری۔ جی ہاں۔ پس اب ہمیں بھینٹے۔

ابے اولمڈے۔۔۔ ممدو کے بچے۔۔۔ ابے منہ کیا تک رہا ہے۔ شکر کر بھونڈو بخش۔

کدی اس حرافہ نوابن سے تیرا نکاح ہو گیا ہوتا۔ عید کے چاند۔۔۔ نچ گیا بے“

شکر الحمد للہ کہ میں بھی کیا خوب بچی۔ قربان جاؤں صدقے جاؤں اس کلیسا ز

حقیقی کی قدرت کے۔۔۔ نواب فاطمہ نے گلی میں کھڑے کھڑے آسمان پر نظر

ڈالی اور سر جھکا لیا۔

رال کے ساتھ ممدو کے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کے بھی کچھ سہانے خواب تھے۔

جو وہ نوابن کے متعلق دیکھا کرتا تھا۔ سر نہ ہوڑاتے ناک سینکتا اندر گیا۔ شیخ عبدالباسط

کی بیوی نے ڈیوڑھی میں آکر حجنّ بی اور نوابن کا حقیرا تاشہ باہر پھینکنا شروع کیا۔ پوٹلیاں۔ بوچھے۔ بوسیدہ دریوں میں لپیٹ کر انکے بسترے لٹھکاتے گئے۔ پھر بتلے داناں باہر آن گئیں۔ سرے دانی۔ پندینا۔ نوابن کی سُرخ یٹاری۔

سرپوش پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ چبوترے پر کھٹ سے گرنے ہی اسمیں سے نکل کر نوابن کی گڑیاں، گنتی کے چند کپڑے، نقلی موتیوں کے ہار اور کانچ کی چوڑیاں گلی میں بکھر گئیں۔ وہ جھک کر انکو چننے لگی۔ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتی جاتی۔ ناک سنکتی۔ دوسرے ہاتھ سے بالوں کی لیٹس چہرے سے ہٹا کر گڑیاں اور کپڑے بٹورتی۔ برقعہ اوڑھے اوڑھے چیزیں سمیٹنا مشکل تھا۔ بنجیالی میں نقاب اٹھالی مجمع بڑے اشتیاق سے اسے گھورنے لگا۔

”اجازت ہو تو اندر جا کر اپنی کتابیں لے آؤں“ حجنّ بی نے گلی میں سے آواز دی۔

”وہیں کھڑی رہیے۔ بیسجدی جائیں گی۔“ اندر سے شیخ جی کی بہن کا جواب ملا۔ آنسوؤں نے لال کتاب اور دینی رسالوں کا بستہ احتیاط اور ادب کے ساتھ کواٹر کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر ممدو کو دیا۔ اس نے سوں سوں روتے سنکتے اسی تکریم سے لاکر کتابیں حجنّ کو پیش کیں۔

سب سے آخر میں نواب فاطمہ کا مٹنا سا میلہ برقعہ باہر آن گرا۔ اور ایک گڑیا۔



دیکھو کھیلین دھمال خواجہ معین الدینؒ

شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے مکان کا چرچر اتا صدر دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ جنّ بی اور نواب فاطمہ نے سارا سامان چنّ چنّ کر گلی کے کنارے رکھا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ لوگ قہقہے لگاتے فقرے کہتے اپنے اپنے کام پر روانہ ہوئے۔ جنّ بی پنجابی پھاٹک تک جا کر یکہ لائیں۔ بالکل خاموش تھیں نوابین متوقع رہی، دعائیں مانگ رہی تھی، کہ وہ ہنسو کے گھر واپس جائیں گی۔ وہ کیا پرستانی طلسمانی مقام تھا۔ لوگ کیا چین کی بنسی بجاتے تھے۔ مگر جنّ بی نے ایکے والے سے کہا۔ ”بیٹا۔ اسٹیشن چلیو۔“

جب وہ سولہ سالہ دنوازا بانو بیگم تھیں منوری کے رتھ پر بیٹھ کر شہر خرابی کے بعد دلی لوٹی تھیں۔ اس وقت شاہجہاں آباد مرحوم کی تجہیز و تدفین سو رہی تھی۔ ادھر نوابشاہرہا ادھر وہ ایک متحرک اور موہا بیل پینے میں جوان ہوئیں۔ گلڈمبر، پالکی، نالکی، بوچھے، تاجمان ٹٹم، کوچ، ہاتھی، برسوں ان کی سواری میں رہے۔ دھویں کی گاڑی کے خس پوش دوسرے درجوں اور والیان ریاست کی اسپیشل ٹرینوں میں طویل مسافیتیں انھوں نے طے کیں۔ پھر وہ تھرڈ کلاس میں بمبئی اور عرب حاجیوں سے بھری اگن بوٹ پر جدہ گئیں۔ عرب و عراق میں انھوں نے سارا بانوں کے نغمے سنتے اونٹوں کے کجاوے پر ہلتے ڈولتے لمبے لمبے سفر کئے۔ ارے دنوازا بانو بیگم عرف بیگم کاشمیرن عرف جنّ بی یا مغلانی بی سے زیادہ تجربہ کار سیاح کون ہوگا بھلا۔

جبون یا ترا انھوں نے بھانت بھانت کی غیر مرئی ٹرانسپورٹ پر بھی طے کی تھی۔ منوری کے رتھ کیل گویا ہم راج کے سیاہ بھینسے۔ جو چھن چھن کرتے تیز تیز دوڑتے انکو

اخلاقی ہلاکت کی طرف لے گئے۔ کبھی سرسوتی کے پوتر راج ہنس کہ منوری کے گھر پہ ہی انھوں نے شعر و ادب اور شناستریہ سنگیت اور رقص کی تعلیم حاصل کی۔ کبھی لکشمی کی سواری کا اٹو کہ عیاش امیر زادوں کو اٹو بنا کر اپنا اٹو سیدھا کیا۔

آخر میں تیز رفتار جہاز ایس۔ ایس ایگل گویا وشنو کا گر رٹو پاپ کے پاتال سے نکال کر دھرم کی سورگ پر لے گیا۔

مگر بے چاری نوابین۔ اسے پچپن میں ماں باپ کے ساتھ لکھنؤ اور آگرے جانا دھنلا سیاد تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ریلوے اسٹیشن اور ریل گاڑی آج پہلی بار دیکھی۔ جتن بی نے صدری کی جیب سے چند سکے نکال کر تھوڑا کلاس کے دو ٹکٹ خریدے۔ اب وہ حمیر شریف جا رہی ہیں۔

ٹرین شام کو چلتی تھی۔ دن بھر وہ زنانہ تھوڑا کلاس وٹینگ روم میں بیٹھی لینگ یا خواجہ — لینگ یا خواجہ کا ورد کرتی رہیں۔ بھوک لگی تو نوابین کو لیکر باہر نکلیں۔ خوئے والے سے خرید کر نان کباب کھائے۔ کلب میں پانی پیا۔ واپس آئیں۔

وٹینگ روم خالی پڑا تھا۔ پنجابی کرپین آیا بڑے سپر برانڈاز میں ادھر سے ادھر گذر جاتی — جتن بی نماز ظہر کے لئے اٹھی ہی تھیں کہ سر منڈی جوان ہندو بنگالی ددھواؤں کا ایک تافلہ اندر آیا۔ وہ بقیہ عمر کسی آشرم میں گزارنے کے لئے بنگال سے ہر دو ایچی جا رہی تھیں۔ ایک بے حسین کسن بیوہ پر جتن بی کی نگاہ پڑی۔ دل میں سوچیں شاید یہ ہر دووار میں زیادہ دیر نہ ٹکے۔ آشرم سے فرار ہو جاتے اور چند سال بعد ویشیا مشہور ہو۔ روم جنی سمجھی جائے۔ چلتے پھرتے کی اولاد — یا اگلے چالیس پچاس برس ہر دووار کے دھوا آشرم میں مقید رہ کر ایک روز گنگا کنارے پھونک دی جاتے۔

العظمتہ اللہ۔ تیمم کر کے فرش پر رقعہ پچھایا اور نیت باندھ لی۔ ایک مشنری گوری میم صاحب اندر آ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اردو ہندی کتابچے بیگ میں سے نکالنے لگی۔ نوابین نے موقعہ غنیمت جانا۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ سیدھی مہر کے گھر جائے گی۔

جالی کے کواڑ کھول پلٹیٹ فارم پر پہنچی۔ جہاں دوسری سبز بانات سے منڈھی ڈوبیاں
ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ کہا رستورات کو ٹرین کے زمانہ ڈبوں تک لے جانے کیلئے
مستعد بیٹھے تھے۔ مسافروں کی بھیر بڑھتی جا رہی تھی۔ گھبرا کر پھر ویٹنگ روم میں آگئی۔
انگریز مشنری اسے دیکھ کر ہمت افزا اور پرامید انداز میں مسکرائی۔ نواب فاطمہ نے
ہونٹ پچکالیے۔ بڑی پکی مسلمان تھی۔

جنّ بی سلام پھیر کر اٹھیں۔ برقعہ جھاڑا۔ اسے طویل کوچ پر پھیلا کر دروازہ ہوئیں۔ انھیں
موندیں۔ نوابن ہمت کر کے پھراٹھی۔ بڑی بی نے فوراً ہنکارا بھرا۔ ”کہاں چلیں —“
نوابن دروازے میں پہنچ چکی تھی۔ گھبرا کر بولی ”قدچے پر —“
”قدچہ باہر دھرا ہے؛ برآمدے میں؛ شستا۔ حرافتہ۔ ادھر آن کر بیٹھ ورنہ ٹانگیں توڑ
دوں گی —“
نواب فاطمہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکی تھی۔

سلطان الہند کے دربار کے عظیم الشان پھانگ پر نوبت اور نقارہ بج رہا تھا۔
سُن کر چی لڑتا تھا۔ تھر تھر کانپتی توبہ تالا کرتی آنسو بہاتی جنّ بی صحن میں داخل ہوئیں۔ روضے
پر حاضری دینے کے بعد ایک عمارت کے بآئدے میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ اس جگہ پہلے سے بہت سی
لاوارث عورتیں اور بھکاریاں اپنے اپنے اڈے جمائے بیٹھی تھیں۔

جنّ بی نے سامان قرینے سے رکھنا شروع کیا۔ دھک سی رہ گئیں۔ نسخوں کا
بنتہ اور دواؤں کی پیٹی گوٹے والوں کے ہاں دلی میں رہ گئی تھی۔ سوچا تھا یہاں درگاہ
شریفت میں اسی طرح چورن بیچ کر خرچ چلائیں گی۔ کھانا لنگر سے۔ اب وہ سچ مچ بھکاریوں
کی طرح دونوں وقت کا کھانا لنگر سے کھانے لگیں۔ جس روز آستانہ مبارک پر پہنچی ہیں
اس کے دوسرے دن ہی ہمیں کے کسی سیٹھ کی منت پوری ہوئی تھی۔ چھوٹی ڈبک کے

نیچے منوں لکڑیاں جلائی گئیں۔ نوابین ایک طرف کھڑی جیزت سے دیکھا کی۔ دوپوری آٹا دیگ میں ڈالا گیا۔ پھر پانی۔ ایک اور آدمی نے سیرٹھی چڑھ کر چار بوری شکر انڈیلی۔ پورے بتیس سیر گھی۔ چار بوری چاول۔ ڈھیروں نمک۔ بلدی۔ تھوہارے۔ ناریل۔ نماز عصر کے بعد سے دس بجے رات تک چکی۔ پھر اسے ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ فجر کے وقت دیگ لٹی۔ ایک آدمی اندر کودا۔ بالٹی بھر بھر دلیہ صحن کے پکے فرش پر پھینکا گیا۔ دوسرے خدام اسے غریبوں اور بھنگاریوں میں بانٹنے لگے۔

ہندوئی کا آستانہ زمانے بھر کے سنائے ہوئے انسانوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ جن بی یہاں اب یونانی ادویہ اور چوڑن کوٹنے سپینے کی مصروفیت سے آزاد تھیں۔ دن رات عبادت میں جٹ گئیں۔ یا تو آل بچوں کے وجد آفریں نغمے سنا کر تیں۔

پھاگن کی رت آئی۔ ایک روز ملک کے ایک نامی گرامی استاد حاضری دینے کے بعد سب دستور خواجہ کی بارگاہ میں اپنی موسیقی کا نذرانہ پیش کرنے میں مصروف تھے۔ جن بی چہرے پہ تقاب ڈال، رنگتی رنگتی صحن میں پہنچیں ایک طرف کو بیٹھ گئیں، استاد نے الاپنا شروع کیا۔ دیکھو دھمال کھیلیں خواجہ معین الدین۔

مدنوں بعد پکا کاٹا سونے کو ملا تھا بے اختیار خود بھی زیر لب سنگت کرنے لگیں۔ دیکھو دھمال کھیلیں خواجہ معین الدین۔ سلطان المشائخ۔ خواجہ فرید گنج شکر۔ ایسی رت آئی۔ ایسی رت۔

گانا ختم ہوا۔ جن بی کو خبر نہ پڑی اپنی دھن میں الاپے گئیں۔ اب وہ بہار کا ایک اد خیال گنگنا رہی تھیں۔ کھیلے دھمار۔ حجت بنام الدین کے سنگ کھیلے دھمار۔ نزدیک بیٹھے ایک سارنگی نے کان کھڑے کیے۔ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ کچھ سامعین نے انکی طرف دیکھا۔ ہڑبڑا کر اٹھیں اور تیزی سے اپنے برآمدے کی طرف بڑھ گئیں۔ لیکن اب ان کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ دیوار کے سہارے بیٹھی چپکے چپکے بے حد نیچے سڑوں میں اپنی موسیقی کا نذرانہ خواجہ کو پیش کرنی سہیں۔ سلطان الہند کے دربار

میں حاضر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے درباری گویے حاجی سبحان کا دھر پد جوگت میں گنگنائیں۔ پرتھمان اللہ۔ جن رچو نور پاک۔ نبی جی پر رکھ ایمان۔ اے سبحان۔ کبھی ادھی رات کو بیٹے درباری میں "پیاپا پوانمول" چھیڑ دیتیں۔ کہت کبیر۔ آندھیو ہے۔ پیاپا پوانمول۔ گھونگٹ کے پٹ کھول۔

خواجہ کی جو کن کو اپنے انمول پیامل گئے تھے۔ نواب فاطمہ کے گھونگٹ کے پٹ دوسرے انداز سے کھلے۔

دن بھر منہ پر نقاب ڈالے ڈالے اسکادم بولا گیا۔ گوٹے والوں کے گھروم بھسکی مہلت نہ ملتی تھی یہاں مستقل بیکاری اور فرصت نے طرح طرح کے منصوبے بنانے پر آمادہ کیا۔ چند روز بعد نقاب الٹ کر وسیع احاطے کے چکر لگانے لگی۔

جن جن خیرات نہیں لیتی تھیں۔ پیٹ بھرنے کیلئے لنگر کافی تھا۔ کپڑے چکٹ ہو گئے۔

نواب نے کہا۔ "آٹو جی۔ تیل صابن خریدنے کے لئے کچھ پیسہ کوڑی چاہیے۔" جو نقدی پاس تھی وہ دہائی سے یہاں تک آنے میں خرچ ہو چکی تھی۔ جواب دیا۔

"خالی پانی میں پھینچ لا۔"

"خالی پانی سے میل نکل جائے گا؟"

"اچھا۔ میں کچھ بند و بست کرتی ہوں۔ چل نماز پڑھو۔ اذان ہو رہی ہے۔"

جن جن پی میراں جی کے چاند تیر وار دہوئی تھیں۔ خواجہ جی کا مہینہ آیا عرس کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ نظام دکن اور دوسرے نوابوں مہاراجوں کی طرف سے بیش قیمت چڑھاوے چڑھنے والے تھے۔ پیرزادے استقامات میں مصروف۔ بھکاریوں کی ابھی سے چاندی۔

میراثنوں اور ڈومینوں کی ٹولیاں سنگی جالی کے پیچھے شہزادی جہاں آرا بیگم کی

عبادت کا وہ میں بیٹھ کر گائیں ، ریلا بنا آیا — اے میرا واجہ بنا آیا — حیدر کا پوت آیا — زسرا کر گایا آیا — جن بی ان پر وہ نشینوں کے پاس جا بیٹھتیں اور خوب لہک لہک گائیں — ”تصویر مصطفیٰ کی — تصویر مرتضیٰ کی — مرا واجہ بنا آیا —“ انھیں بیل بھی ملنے لگی ، اللہ نے تیل صابن کا انتظام کر دیا ۔

درگاہ شریف سے کچھ فاصلے پر بازار حسن تھا ۔ جمعرات کے روز کسبیاں حاضر می دیتیں ۔ نواب فاطمہ ان کے زرق برق کپڑوں اور گہنوں کو رشک سے دیکھا کرتی ۔ اپنے میلے لباس ، الجھے بال اور ننگے پیروں پر نظر ڈال کر شرم سے کٹ کٹ جاتی ۔ لوگ اسے بھی منگنتی سمجھنے لگے تھے ۔ ایک سیاہ فام بھٹاکٹا نوجوان بھکاری رنگ برنگے منکوں کی مالائیں لوہے کے کڑے اور پیروں کا تاج پہنے پھانگ کے قریب ایک کونے میں بیٹھا اپنی لال لال آنکھوں سے نوابین کو گھورا کرتا ۔ وہ بہت مالدار تھا ۔ اور بچلہ ۔ ایسے گداگر والدین جنکی نوعمر بن بیابھی لڑکیاں چکٹ برقعے اوڑھے یا کھلے منہ ، کٹورے سامنے رکھے انکے پہلو میں بیٹھی رہتی تھیں ، اکثر سوچتے : کاؤباشاہ نجانی نے کس قسمت والی کے لئے ”رقعہ“ بھیجے گا ۔ لوصحاب وہ بھینکر چرسی تو جا کر ایک روز جن بی کی پریر و بھانجی کا رشتہ مانگ آیا ۔

جن بی چھو کر می کی طرف سے از حد فکر مند تھیں ۔ وہ نوابن کو امرتسر سے آنے والی کنجریوں کی ایک ٹوٹی کے پیچھے پیچھے چلتے دیکھ چکی تھیں ۔ انکو یہ بھی یاد تھا کہ نواب فاطمہ دلی ریلوے اسٹیشن کے زنانہ ویٹنگ روم سے فرار ہونے کے لیے پرتول چکی تھی ۔ انھوں نے بھینکے بھینکے کاؤباشاہ کا پیغام فوراً منظور کر لیا ۔

اس روز جب نوابین لنگر سے کھانا لے کر اپنے ٹھکانے پر پہنچی جن بی نے کہا : سستا ! وہ سوداگر چچے تجھے ٹھیک پہچانے تھے ۔ تو ہے ہی ہوائی دیدہ ۔ ساری درگاہ میں کد کڑے

۱۹۲

لگائی پھر رہی تھی۔ اب بزرگیاں تک پہنچنے لگی۔

”آ توجی میں تو۔“

”ٹھہر تو سہی خیمہ پارہ۔ اسی جمعے کو دو بول پڑھوائی ہوں۔“

”کس سے۔“

”اسی کا لو بادشاہ سے اور کس سے۔ کیا مرگی کا شہزادہ تجھے بیاہنے آئے گا“

”اللہ کرے ملانی تم پر بھلی گرے۔ ڈھائی گھڑی کی آئے۔ ڈھڈو۔ تم کھڑے سے

گر پڑو اور پٹ سے دم نکل جائے۔ عباس علمدار کا علم تم پہ لٹے۔ سپو۔“ نوابن نے

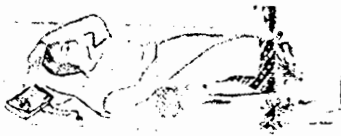
پوری جان سے لرزتے ہوئے دانت پیس کر جواب دیا۔

جن بی ساید شہنشاہ گئی تھیں۔ انھوں نے نوابن کی بد تمیزی کا مطلق نوٹس نہ لیا۔

کھانا کھا، کٹی کمر، دیوار سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ نیم کے تنکے سے خلال کرنے لگیں۔ سامنے کے

چھتتا نیم کی بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہو اور آمد سے میں آرہی تھی۔ چند منٹ بعد ٹانگیں پا کر

فرش پر بیٹیں اور سنانے لگیں۔



اڑھائی دن کا جھونپڑا

نوابن نے آنسو بونچھے۔ کچھ دیر سوچا کی پہلا کام تو یہ کہ ماہن تیل خریدوں۔ کپڑے دھوؤں۔ ایسی ٹھننی بنی رہی تو کا تو باٹا جیسے بھک منگے ہی رقعے بچھیں گے۔ جن بی کو بیل کے چوپیسے ملتے تھے وہ اس کی شادی کے لئے جوڑ رہی تھیں۔

کانی آلود گھڑے سے پانی نکال کر کٹورہ دھویا۔ میلا برقعہ اوڑھ کٹورہ ہاتھ میں لے بڑے پھانک پر جا بیٹھی۔ آج وہ پہلی بار بھیک مانگنے جا رہی تھی۔

طرح طرح کی صدائیں لگا کر مانگنے کے فن لطیف سے ناواقف تھی۔ چپکی بیٹھی رہی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ کٹورے میں فقط ایک ٹکڑا جو کسی مارواڑی نے گرایا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے نقاب الٹ دی۔ آدھ گھنٹے کے اندر کٹورے میں کوڑی چھرام پائی اور ٹکوں کا انبار لگ گیا۔ اتنے میں بازار کی ایک عشوہ طراز مغنیہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ جلو میں اس کے سپردانی اور نوجیاں۔ نوابن نے گلگھیا کر پیالہ اس کے سامنے بڑھایا۔

”خواجہ کے نام پر ایک ڈبل۔“

راحت بانی اجیر وانی نے ٹھٹھک کر اس پر نظر ڈالی۔ ایک نوجیزمہ حبیب۔ اور ہاتھ میں کاسہ گدائی۔ اس نے درد مندی سے پوچھا —

”اری کیا تیرے ماں باپ بھی یہیں ہیں؟“

”مر گئے۔“

”یہیں کے بھکاری تھے؟“

گلرخ بانو بیگم عرف نواب فاطمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ مرحوم مرزا دلدار علی برلاس

دلی کے مشہور عطر فروش اشکبار آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو انکی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔

سر دم دکھم دکھم — مہا تما بدھ نے انکشاف کیا تھا۔ گریہ زندگی کی بنیادی حقیقت ہے سیراب کشتہ نشد —؟ نہ۔ کس آلبش نداد —؟ ہنسی، مسرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ چؤل شُد۔؟ شہید شد۔ بکجا —؟ دشت ماریہ۔

ساری دنیا دشت ماریہ تھی۔ ساری زندگی زندانِ شام میں، جناب سیکینہ کی ایک خفیہ کنیز — ان کی جوتیوں کی خاک — کیا ہمیشہ اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتی رہوں گی؟

”تو تو یہاں اکیلی رہتی ہے؟“

راحت بانی کی آواز نے اسے چونکایا۔

”نہیں۔ ایک ہوتیوں۔ دفاقہ۔ حجن بی۔ ان کے ساتھ۔“

”ہمارے ہاں چلے گی؟ نوکری کرے گی؟ اوپر کا کام۔“

بڑی بی نہیں جانے دیں گی۔

تجھ سے بھیک منگوائی میں؟

”نہ۔ مگر اپنے پاس سے ملنے نہیں دیتیں۔“

”شادی بیاہ طے کر دیا ہے؟“

نوابن نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کس سے؟“

”ایک بھکاری ہے۔ کالو بادشاہ —“ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

”اللہ غنی۔ تجھ جیسی حور لقا کا نکاح اس مکروہ منگتے سے — کیا وہ حجن بی پلگا گئی ہیں؟“

”جی ہاں۔ کچھ بٹرن سی ہو گئی ہیں۔ ابھی۔ ابھی۔ حال میں۔ پہلے ایسی نہیں تھیں جب سے

انہیں دلی کے گونے والوں کے گھر سے نکالا گیا ہے ان کا کلیجہ الٹ گیا —“

”جل۔ ادھر آکر بات کر۔“ راحت بانی نے دھیرے سے کہا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ طائیفے کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

مصنوعی طور پر گھلگھیا کر خیرات مانگتی جاتی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔

اس رات نوابن درگاہ شریف سے بھاگ گئی۔ اپنی سُرُخ پٹاری ساتھ لیتی گئی۔ راحت بانی نے اپنا پتہ بتلادیا تھا۔ اماوس کی اس رات جب درگاہ شریف کے پیڑسرسرار ہے تھے اور سارے میں سوتا پڑا تھا کسی ریاست سے آئی ہوئی کوئی مظلوم بیگم صاحبہ جن کو نواب نے طلاق دیدی تھی، اس کمرے میں جہاں شہزادی جہاں آرابیگم عبادت کرتی تھی، جانماز پر بیٹھی نغمیں پڑھ رہی تھیں۔ نوابن دے پاؤں قریب سے گذری۔ جی چاہا سنگی جالی کے نزدیک جا کر دیکھے کیسی لگتی ہیں۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ پھانک پڑی۔ سارے بھگے اپنے اپنے ٹھکانوں پر مخواب تھے۔

بازار میں اُتری۔ دورویہ دکانیں بند۔ تنور سنان۔ ایک موٹی نکلٹی نے اپنی نارنجی آنکھوں سے اسے گھورا۔ اسے تین سال قبل کی وہ رات یاد آئی جب غوثیہ نے اسے بتلایا تھا کہ مدد سے اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ گوٹے والوں کے گھر کے کنوین میں کود پڑے گی۔

غور سے دیکھتی، ڈرتی، ہمتی، پٹاری سر پر اٹھائے سمکھن لال حلوانی کی دوکان پر پہنچی جس کے اوپر راحت بانی کا چو بارہ تھا۔ پہلو کے تاریک زینے میں داخل ہوئی اندھیرے میں زور کی ٹھوک لگی۔ انگوٹھے میں چوٹ آئی۔ برقعہ اتار کر پٹاری میں ٹھونسنا۔ بمشکل سیر پھریاں چڑھی۔ راحت کے کمرے پر پہنچ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ پہلے تھوڑا دوانے سے پی۔ اب چرسی مسٹنڈے کاٹوسے۔

”قدرت کے کرشمے نرا لے ہیں۔“ راحت بانی نے اس سے کہا۔

جنّ بی نے صبح اٹھ کر دیکھا۔ نوابن مع پٹاری غائب۔ دو سال قبل وہ لونڈا سلطان جی میں ابن بطوطہ کی سرائے سے ان کا اندوختہ لے کر فوج چکر بیوا تھا۔

نماز فجر کے بعد احاطے میں تلاش کر دیا۔ کاتوباٹشانے اپنے چیلے چانٹے چاروں طرف دوڑائے۔ عرس شریف کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں ایک نقاب پوش لڑکی کو ڈھونڈنا کارے دارد۔ جن بی خود اس کی تلاش میں نکلیں۔ ان کی آنکھوں میں تیزی سے پانی اتر رہا تھا۔ لائٹنی کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر چلتی پھرا کر اپنی شطرنجی پر بیٹھ گئیں۔ حریف انکومات دے کر فرار ہو چکا تھا۔ دیوار کے کنارے بچے اور چند برتن اسی طرح قرینے سے چنے ہوئے تھے۔ نوابن کی لال پٹاری کی جگہ خالی تھی۔

اب وہ پھر اکیل رہ گئیں تمہیں۔ تسبیح کمال کر اللہ اللہ کرنے لگیں۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔

راحت بائی نے نوابن کو چند روز اپنے ہاں چھپائے رکھا۔ ریشمیں جوڑے سلوائے۔ نئے کپڑے اس نے برسوں سے نہ پہنے تھے۔ پرانا گودڑ پھجے سے نیچے پھینکنے کے بعد نواب فاطمہ نے اپنی گڑیاں پٹاری کی تہہ میں احتیاط سے رکھیں۔ ان کے اوپر نئے ملبوسات۔ جسے کے دن سائٹن کا نیا کور جوڑا پہنا۔ راحت نے لٹھ بند ملازم ساتھ کیا۔ ایک پردہ دار شکر میں سوار کر کے اپنی خالہ زاد بہن گجرا کے ہاں جے پور روانہ کر دیا۔

شکر مدار دروازے کی طرف سے نکلی۔ پھراڑھائی دن کا جھونپڑا نظر آیا جو ایک بادشاہ نے نبویا تھا۔ پل پل پھن پھن دنیا کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور اللہ بڑا بے نیاز ہے۔

حب عادت شدید استہزاسے ہونٹ لٹکائے، اشرف الملوقات سے حد درجہ بیزار نظر آنے والا کلیت پسند راتی اونٹ ایک حیران پریشان مہبوت اور تنہا لڑکی کو گاڑی میں بٹھالے ایک انجانی منزل کی طرف لیے جا رہا تھا۔



www.urduchannel.in





مس نواب بانی آف جے پور

نشاہ استاد مبارک علی خاں۔ تان رس خاں۔ حدو خاں۔ بہرام خاں۔ کلن خاں
 سی پڑے فنکار کا نام لیجئے وہ سر آندر آجہ ہائے ہندوستان ہزبائی نس جہا راجہ جے پور
 کے گنی جن خانے کو رونق بخش رہا تھا۔ نامی کتھک اور گوئیے چاند پول بازار میں گجر بانی کی
 چھو کریوں کو بتاتے تھے۔ پانچ چھ برس کے اندر اندر پری رُو اور خوش آواز نواب بانی کے
 لئے دور دور سے کچھڑی آنے لگی اس کے علاوہ نو چند می کامیلہ، بکیر شریف۔ بسنت کامیلہ
 ریاست کپور تھلہ۔ بینظیر کامیلہ، دار سرور راپور۔ نواب بانی آج یہاں کل وہاں دیکھتے
 دیکھتے بیسویں صدی آگئی۔ ۱۹۰۲ء میں پرنس ایڈورڈ طویل انتظار کے بعد سر پر آرائے
 سلطنت ہوئے۔ انڈین ایمپائر میں دھوم کے جشن منائے گئے۔ ایک میوزک کانفرنس
 لاہور میں منعقد ہوئی۔ نواب بانی مدعو کی گئیں۔ لاہور میں ان کا جی بہت لگا۔ اتنا بارونق
 فیشن ایل شہر۔ شاندار طرؤں نو کیلی مونچھوں والے کٹیدہ قامت دریا دل روسا۔ اور
 جاگیر دار۔ زندہ دل عوام محفلوں میں اور داتا کے دربار میں نواب بانی شاہی محلے والیوں
 سے ملیں۔ وہ لوگ زیادہ تر بیگم کہلاتی تھیں۔ ارشاد بیگم۔ سردار بیگم۔ ممتاز بیگم۔
 لاہور میں نواب بانی بھی نواب بیگم کہلانے لگیں۔ اسی نام سے مشہور ہوئیں۔

شاہ ایڈورڈ کی تاج پوشی شہنشاہت ہوئی۔ جے پور لوٹیں ایک عقل کے اندھے کا ٹھٹھا واڑی
 ریس گانا سننے تشریف لائے۔ یہ نوعمر دربار صاحب باپ کے مرتے ہی گل پھڑے
 اڑانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ انکی سوگد باشی با ایک جے پوری سردار کی اکلونی بی بی ٹھٹھیں
 رام گنج بازار میں ایک وسیع ویلی باپ نے انکو دہیز میں دی تھی۔ وہ مقفل رہتی تھی۔

دربار صاحب جے پورا کراسی میں ٹھہرے۔ نواب بیگم پر ایسے عاشق ہوئے کہ جوہلی انکے نام لکھ دی۔ کاٹھیاواڑ واپس گئے۔ اس کے بعد پیرس۔ وہاں پہنچتے ہی بذریعہ موٹر کار جہان فانی سے کوچ فرمایا۔

نواب بیگم نے جوہلی میں ٹھاٹھ باٹ سے رہنا شروع کیا۔ گانے میں راجستھانی مانڈانکی خصوصیت تھی۔ فونو گراف ریکارڈوں کے خاکی پیکٹ پر جو فونو گراف ان کا چھپتا تھا اس میں بڑی بائگی نظر آتیں۔ ناک میں لونگ۔ گلے میں ٹھٹھہ۔ ساری پر بروج کی جگہ تنغے۔ جوان کو میوزک کانفرنسوں میں ملے تھے۔ نواب بیگم جے پورا والی۔

کئی بار ارادہ کیا مہر کو خط لکھیں۔ وقت نہ ملا۔ جنّ بی کو خط لکھنے یا جا کر ان سے ملنے کی سمیت نہ پاتی تھیں۔

کئی سال بعد اپنے طاہیفے کے ساتھ چادر چڑھانے امیر شریف گئیں۔ اس برآمدے کے پاس سے گزر رہا جہاں برسوں قبل وہ اور جنّ بی اپنا اپنا زادراہ اٹھاتے دئی سے آن کر اترتی تھیں۔ اسی درمیں جنّ بی کی شطرنج کی جگہ ایک شکستہ سوزنی بھی دکھلائی دی۔ اس پر موجود ایک نابینا بھکارن زائرین کو لگانا اور رے تکان دعائیں دے رہی تھی۔

”یہاں کوئی جنّ بی بیٹھا کرتی تھیں؟“ نواب بیگم نے ٹھٹھک کر دریافت کیا۔

”ہاں بانی صاحب۔“ ایک ابا بیچ فقیر نے برآمدے کے دوسرے کونے سے جواب دیا

”اندھی ہو گئی تھیں ان کی بھانجی تھی کہ کون تھی وہ بھاگ گئی۔ اس کے بعد سے وہ ہاؤلی سی بھی ہو گئیں تھیں۔ موتیا بند نے غریب کی آنکھیں پٹ کر دیں۔ پچھلے سال ہی مرے۔ بڑی تکلیف میں تھیں۔ ہر طرح سے معذور۔ اللہ نے مشکل آسان کی۔ اسے بانی صاحب۔

غریب نواز کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔ اللہ تمہیں اور دے گا۔ بہت دے گا۔“

نواب بیگم چند منٹ گم سم کھڑی رہیں۔ پہلے جنّ بی کے انجام پر آنسو بہائے پھر بھکاری کی دعا پر غور کیا۔ اللہ تمہیں اور دے گا۔ ایک بار انھوں نے راحت بانی سے

پوچھا تھا کہ اولیاء کے مزاروں پر گانے والیوں کا ہجوم ان بزرگان دین کی بے ادبی نہیں ہے؟
 جواباً راحت بانی نے ایک حکایت سنائی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ایک
 کلال نے درخواست کی اس کے کاروبار میں برکت کی دعا فرمادیں۔ حضرت محبوبؒ الہی نے
 ایک پرچی اس کو لکھ دی جسے وہ تعویذ جان کر لے گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دلی کا متمول ترین کلال
 بن گیا۔ حضرت محبوبؒ الہی نے اس پرچی پر محض اتنا لکھا تھا۔ خدایا تیرے کچھ بندے شراب
 تو پیئے ہی رہیں گے۔ تو وہ اسی کلال کی دکان سے کیوں نہ پیئیں؟
 یہ حکایت سن کر نواب بیگم کو اپنی نئی طرز زندگی کے متعلق کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا۔

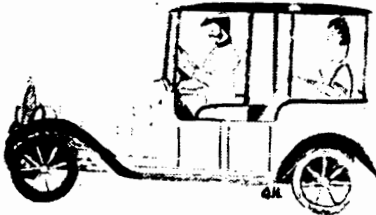
لیکن جن بی لائٹھی ٹیکتی پھر آکھڑی ہوئیں۔ مرحومہ کہا کرتی تھیں۔
 ”زندگی میں بہت بھانک وقت آئے۔ سزائے فطرت بیگ کی شبِ محشر کے آگے
 سب ہیچ۔ وہ قتل کی رات تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں کی شہادت کی رات سارے رشتے
 ناتوں کا انقطاع۔ ایک پورے عہد کی ہلاکت۔ کہتے ہیں سمند گاتے گاتے جل کر راکھ ہونے
 کے بعد اسی راکھ سے پھر زندہ ہوتا ہے۔ سارا ہندوستان اپنے بلبے اور راکھ میں دب کر
 اس میں سے دوبارہ نمودار ہوا تھا مگر بدلا ہوا۔ اس کی موسیقی کے سُر مختلف ہو چکے تھے کیا کپک
 — انسان بدل گئے تھے“ جن بی بڑی عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ تعلیم یافتہ بیوی تھیں۔

ایک بار بتلایا۔ نواب بیگم سیڑھی پر رومال پچھا کر بیٹھ گئیں اور سوچا کس ایک بار
 بتلایا انھوں نے کہ جب میں خود سمند کی طرح گاتے گاتے جل جانے کے بعد دوبارہ جی
 اٹھی تو بے کی اور ایک بڑی رقم سید احمد خان کو ان کے مدرسے کے لئے بھجوا دی۔ بہت سی
 گانے والیوں نے چنہ بھیجا تھا۔ ہم سب رذیل، شریف عزیز امیر اپنی قوم کی شکست اور
 ہندوستان کی تباہی سے دل گرفتہ تھے۔ بہت سے لوگ خصوصاً کٹھ ملا سید کے مخالف بھی
 تھے مگر ہم ان کے خیر خواہ تھے۔ پھر ہم نے سنا کہ سید نے ہمارے چند سے سے کالج کے لورڈنگ
 ہاؤس کے بیت الخلاء بنوا دیے! بلا سے۔ اے بی ہمارا روپیہ قوم کے کسی کام تو آیا۔ یہ کہہ کر

جن بی خوب سنہی تھیں۔ ایک مرتبہ پولیس — کہتے ہیں جنات دو طرح کے خلق ہوتے ہیں نیک جن آگ سے۔ بد دھویں سے۔ تو پھنوس ہندوستان میں جو آگ لگی تھی اسکے دھویں سے بھانت بھانت کے کیشف جن پیدا ہوئے۔ نفاق اور تعصب اور نفرتوں کے جن۔ وہ ہر طرف منڈلاتے پھیر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کہا۔ ”ہمیشہ یاد رکھیو۔ جو گنہگاروں کو جہنم کا داروغہ مطہح تھو ہڑ کی بھجیا لپکا لپکا کر کھلایا کرے گا۔ آپ زقوم پینے کو ملے گا۔“ کبھی بیٹھے بیٹھے بڑبڑائیں ”ایک عزیز الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے اس کے کفن دفن کے لئے کچھ رقم درکار ہے۔“ وہ تو جن بی کی سنی ان سنی کر کے فرار کی ترکیبیں سوچا کرتیں۔

”بانی صاحب اللہ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔ اللہ تم کو اور دے گا۔ بہت دے گا۔“

اپنا بیچ فقیر ٹاکیا۔ نامینا بھکارن فونو گراف کے ریکارڈ کے مانند اپنی دعائیں دہرا رہی تھی۔ نواب سیکم سیڑھی سے اٹھیں۔ پھانک کی طرف روانہ ہوتیں۔ گداگروں کا ہجوم ان کے تعاقب میں لپکا۔ نواب سیکم کے استاد جی سب کو ریزنگاری بانٹتے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ درگاہ شریف کا زینہ اتر کر باہر آئیں جہاں وردی پوش شو فر اور ڈیملر موٹر کاران کی منتظر تھی۔



پورٹریٹ آف اے ناچ گزل

یہ ڈیملر موٹر کار نواب بگیم کے لئے ٹھاکر مہیشور سنگھ جی صاحب خاص طور پر ولایت سے لے کر آئے تھے۔ اس کچھواہا شیناوت سردار کی جاگیر بہت چھوٹی اور دل بہت بڑا تھا۔ اپنے مہاراجہ کی طرف سے، جس کے وہ باجگذار تھے، چنور، پالکی، تعظیم اور لوازمہ کا استحقاق رکھتے تھے۔ اجداد مغلیہ منصب دار رہ چکے تھے۔ اپنی اونچی شان نبھانے کے لیے محدود آمدنی کے باوجود شاہ خرچ — باذوق تھے اور دھرماتما۔ ایک دور افتادہ بادیے کے وسط میں سرخ پہاڑی پر ان کے ٹھکانے میں سال کے بارہ مہینے پوجا پاٹ تیج تہوار راگ رنگ کا سلسلہ جاری رہتا۔ پہاڑی کی ڈھال پر ستیلا دیوی کی قدیم چھتیاں استادہ تھیں۔ چیت کرشن اشمی کے روز ستیلا دیوی تخت ڈال پر پورے لوازمے کے ساتھ نکالی جاتیں۔ دیوی کے علاوہ ٹھاکر صاحب مہاراجگان جے پور کے مانند ام جین کے بھگت تھے۔ دسویں محرم کو ان کا جگمگانا تعزیه گشت پر نکلتا۔ تین ٹھکرانیاں وینو تھیں۔ ہاشورا تری کے علاوہ جنم اشمی دھوم سے منائی جاتی۔ ٹھاکر صاحب میوا سکول امیر کے تعلیم یافتہ اور انگریز ٹرنڈ آدمی تھے مصوری کی پرکھ درتے میں پائی تھی۔ مورث اعلیٰ تھیو ریکری کے تصویر خانے کے محافظ دستے کے افسر رہے تھے۔

راجپوتانہ کے بیشتر ٹھاکروں کے ”ٹھکانوں“ میں ان کے خاندانی ورثے کی مینا توری تصاویر کے ایسے بتے اب تک موجود تھے جن کی خبر بیوک جیسے فرنگی پارکھوں کو اب تک نہ پڑی تھی۔ ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کے خاندانی بتے میں عہد اکبر و جہانگیر کی متعدد تصاویر محفوظ تھیں۔ جن کو ٹھاکر صاحب اپنا اہم ترین اثاثہ سمجھتے تھے۔ بہت کم

خوش نصیب ایسے تھے جن کے سامنے وہ بےستہ کھولا جاتا۔

ٹھاکر صاحب کا دوسرا اگر انقدر آناٹہ وہ نامور گائیک اور بین کار تھے جو ٹھکانے کے چھوٹے سے دربار سے منسلک تھے نواب بیگم جیسی حسین اور نامی مطربہ بھی ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کی تنخواہ دار ملازم تھیں۔ علاقے کی ایک نیلگوں جھیل کے کنارے استادہ سترہویں صدی کی ایک بارہ درمی مرمت کروا کر نواب بیگم کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ عظیم المرتبت متعل شہزادے شہزادیاں مع لاؤشکر شکار کھیلنے آگرے سے اس طرف آتے تو اس بارہ درمی میں ٹھاکر صاحب کے پُرکھوں کے مہمان ہوتے۔ نواب بانی مستقل طور پر جیسور میں رہتی تھیں۔ سال میں چند بار تہواروں اور نجی تقاریب کے مواقع پر گانے کے لیے مدعو کی جاتیں اور اس بارہ درمی میں قیام کرتیں۔ ٹھاکر صاحب کا ٹھکانہ ریاست جے پور سے دور ایک اور جواڑے میں واقع تھا۔ ڈیملر بنز اسی مسافت کے لیے خریدی گئی تھی۔ ورنہ جے پور شہر کے اندر نواب بیگم اپنی میلارڈ فٹن استعمال کرنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

کاٹھیاواڑ کے احمق اور آنجنہانی دربار صاحب کی عنایت کردہ حویلی جتنی عالی شان تھی نواب بیگم اسی ٹیم ٹام سے اس میں فروکش تھیں۔ لائف اسٹائل ارباب نشاط والا نہ تھا۔ نہ نائیکہ نہ میٹر شکار۔ ٹھاکر صاحب کا ”کھلے جُڑے“ کی ملازم تھیں کہ دوسرے روسا رکھی محفلوں میں گاسکتی تھیں لیکن فن زرگری سے ناواقف تھیں اور کچھ لُٹ گویا اپنے مرتبی ٹھاکر مہیشور سنگھ کی ناؤ پر سوار۔ ان کی بھی آمدنی کم اور اخراجات وافر۔ درجن بھر ملازمین۔ شو فر۔ خاناساں۔ اس کا میٹ جو مشالچی (یعنی مشعلچی) کہلاتا تھا۔ خدمت گار۔ آیا۔ چھوکر ابوائے“ مہری۔ کوچبان۔ سائیس۔ مالی۔ دھوبی۔ جمعدار۔ ان کے علاوہ استاد جی۔ سارنگیے۔ طباطبائی۔ سارا اسٹاف دو منزلہ شاگرد پیشے میں رہتا تھا۔

کابل اتنی کہل کے پانی نہ پتیں۔ پاؤں آگے بڑھائیں۔ مہری پیک کر گرگابیاں پہناتی۔ آیا بالوں میں برش کرتی۔ سارے طور طریقے رانیوں نواب زادیوں والے اپنا رکھے تھے۔ ایک بار اپنی ہمزاد اور وفادار گوانی آیا فلو مینا ڈی کو سٹا سے کہا تھا۔ فلو میں نے سات آٹھ برس کی عمر سے اتنی شدید مشقت کی ہے کہ غریبوں اور کسانوں کے بچوں نے بھی ایسی کٹھن زندگی نہ گذاری ہوگی۔ اب میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔

نواب بیگم غیر بھی تھیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر معلوم کروائیں۔ کسی نادار ماں باپ کی لڑکی کا بیاہ ہونے والا ہے۔ سرخ بادے کے بھاری سالہ ٹکے دوپٹے بنوار رکھے تھے۔ جو وہ نقدی کے ساتھ شادی سے ایک روز قبل لڑکی کے باپ کو بھجوا دیا کرتی تھیں۔

دلی دربار کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اخبارات اس کی خبروں سے پڑتھے۔ ٹھا کر صاحب بھی مع نواب بیگم دلی جانے والے تھے۔

اسی زمانے میں انڈین پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کا کرنل چارلس ڈالٹن راجپوتانہ کا دورہ کرنا ٹھا کر مہیشور سنگھ جی کے ٹھکانے پر پہنچا وہ دلی دربار کے اخراجات کیلئے والیان ریاست سے بھاری رقمیں وصول کرنے کی غرض سے وارد ہوا تھا۔ سارے راجا نواب اپنی اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے خزانے لٹائے دے رہے تھے۔ لیکن بذریعہ موٹر کار دشوار گزار ریگستانی علاقہ طے کر کے ٹھا کر صاحب کی گڑھی تک پہنچنے میں کرنل کا مدعا کچھ اور تھا۔

چارلس ڈالٹن منگل راجپوت مصوری کا پارکھ تھا۔ وہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری اور اوکسفرڈ اور کیمرج کے کتب خانوں میں اس موضوع کا وسیع مطالعہ کر چکا تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن کے انڈین سیکشن کی مجلس مشاورت کا رکن تھا۔ ہندوستان میں جب اسے اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی والیان ریاست کے موروثی ذخیرے ملاحظہ کرنے ان کے ہاں پہنچ جانا۔ وہ نادر تصاویر اس کی تذکر کرتے رہتے

کرنل ان فنی نوادر کو فوراً وطن عزیز کے عجائب خانوں کے لیے روانہ کر دیتا۔ اور ان کے متعلق آرٹ کے برطانوی رسالوں میں مضامین لکھتا۔

برسات کی وجہ سے صحرا اچانک سرسبز ہو چکا تھا۔ نواب بیگم جنم اشٹی کے جشن "راس لیلہ" میں گانے کے لیے جے پور سے آئی ہوئی تھیں اور بارہ دری میں مقیم تھیں۔ رہس دھاریوں کی ایک نامی ٹولی لکھنؤ سے بلوائی گئی تھی۔ گڑھی میں۔ پید چہل پہل تھی۔ جو دھپور سے کرنل ڈالٹن کا تار پہنچ چکا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے نواب بیگم کا خدشہ نگار اور انگریزی "خانہ ماں بھی جے پور سے بلوایا تھا۔

مہیشور سنگھ جی بہت چھوٹے جاگیر دار تھے اور یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ٹھاکر صاحب ان نول گڑھ، ڈوگی، سیوار، دیوکہ وغیرہ کی طرح انہیں بھی دلی دربار میں شرکت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ مگر کیا پتہ۔ کرنل خوش ہو جائے اور گورنر جنرل کے ایجنٹ برائے راجپوتانا سر ایلیٹ کالون سے ان کی سفارش کر دے۔ وہ جلوس میں شامل نہ ہو سکیں تو کسی کارڈن پارٹی میں شاہ جارج اور ملکہ میری سے ہاتھ ملانے ہی کا شرف حاصل ہو جائے۔ کرنل ڈالٹن کو خوش کرنے کا ایک طریقہ مہیشور سنگھ جی کو معلوم تھا۔

نواب بیگم - ؟

جی نہیں۔ نادر منلیہ نصابیر۔

ٹھاکر صاحب نے اپنا اہم ترین بستہ تجوری سے نکالا۔ اس میں وہ مینا تو محفوظ تھے جو فتح پور سیکری میں ان کے جد امجد کو اکبر اعظم نے بہ نفس نفیس عنایت کیے تھے۔ نصابیر اپنے دیوان خانے کی وسطی مرمرین میز پر پھیل کر انہوں نے کرنل کے انتظار میں گھڑیال کی سوئیوں پر نگاہ جمادی۔

کرنل ڈالٹن تیسرے پہر کے قریب پہنچا۔ وہ ٹھاکر صاحب سے ایک مزید بیکانیر میں ملا تھا۔ باہتی کا حافظ رکھتا تھا۔ کسی نے سرسری طور پر اس سے مہیشور سنگھ جی کی کہل

تصاویر کا تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ آج وہ گڑھی پر وارد ہو رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے چند ناقہ سوار قبضے کے بوسیدہ پھانک پر تعینات کر دیے تھے۔ کرنل نے بے پرواہی سے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں واپس لوٹایا اور ڈرائیور کو جھیل کی سمت مڑنے کا حکم دیا۔
دراصل کرنل ڈالٹن کو سنگ سرخ کی وہ بارہ درمی دور سے نظر آگئی تھی۔ دوڑین لگا کر دیکھا تو نعل راجپوت طرز تعمیر کا نہایت دل کش نمونہ ثابت ہوئی۔ اپنے ساتھ بیٹھے نوجوان بلجین فوٹو گرافر آندرے رینال سے کہا۔

“LET’S HAVE A DEKKO.”

یہ فقرہ اپریل انگریزوں کی اپنی ریختہ یعنی انگلش اردو کچھڑی کی اصطلاحات اور جملوں میں شامل تھا۔ لیکن آندرے رینال بلجیم سے آیا تھا اور چند رنگر میں رہتا تھا اور HOBSON-JOBSON کا علم نہ رکھتا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے کرنل کو دیکھا۔

چارلس ڈالٹن دور میں میں منہک ہو چکا تھا۔

یہ نوجوان بلجین فوٹو گرافر بھی دلی دربار کے سلسلے میں اپنا گھوڑا دوڑانے میں مشغول تھا۔ اسے برسوں سے ہندوستان آئے ڈھائی تین سال ہوئے تھے۔ وہ کلکتہ کا ایک فیشن ایبل پورٹریٹ فوٹو گرافر بننا چاہتا تھا۔ مگر گھوڑ دوڑ اور جوئے کی لت کی وجہ سے اپنا کاروبار بھنپا پایا تھا اور چند رنگر کے ایک فرانسیسی فوٹو گرافر کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ اب وہ شملہ پہنچا تھا اور کرنل ڈالٹن سے درخواست کی تھی کہ دلی دربار کے سرکاری فوٹو گرافروں کے زمرے میں اس کا نام بھی درج کر لیا جائے۔

شملہ کلب کی بار پر ایک شام کرنل ڈالٹن نے دفعتاً اس سے کہا: نوجوان آدمی، میں پرسوں راجپوتانہ جا رہا ہوں وہ ملک فوٹو گرافروں کے لیے جنت ہے۔ اگر تم چاہو تو میرے ہمراہ وہاں چلو۔ علاوہ ازیں میں چاہوں گا کہ چند نعل راجپوت تصاویر کے فوٹو بھی تم سے بنوا لوں :-

موسیو رینال نے کرنل ڈالٹن سے تعلقات بڑھانے کے اس سہرے موقع کو مضبوطی

سے پکڑا۔ چنانچہ وہ اس دشوار گزار سفر میں برطانوی افسر کے ہمراہ کاب یا ہم موٹر تھا۔

ڈراہور نے فوراً بارہ دری سے کچھ فاصلے پر روکی۔ چپڑاسی نے اتر کر پھلا اور اوزہ کھولا۔ پہلے کرنل چارلس ڈالٹن اور اس کے بی۔ موسیو آندرے رینال سفید سولاہیٹ اور ڈی گاڑی سے برآمد ہوئے۔ دوسری موٹر کار اسباب اور فوٹو گرافی کے لوازمات سے لدی دھول اڑاتی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

بونی وارنٹلوار قبض اور آب رواں کے دوپٹے میں ملبوس نواب بانی ہال بھڑائے بادلوں کے نیچے شہ نشین میں کھڑی تھیں اور بے فکری سے ایک لمہار کار ریاض کر رہی تھیں۔ کرنل نے دور بین لگائی اور ٹھٹھک گیا۔ ”بانی جو د — !“ اس نے دوہرین آندرے رینال کو تھامی۔ آندرے نے شہ نشین کا نظارہ کیا اور دھبی سی سیٹی بجائی۔ ”کیا تم کو ایسا نہیں لگتا نوجوان آدمی کہ ایک مغل راجپوت تصویر کا اوچھیل منظر ہائے سامنے موجود ہے؟ بارہ دری — آسمان پر کالی گھٹا۔ اور سفید پرندے۔ شہ نشین میں نغمہ سرا حسینہ۔“

کرنل کی بات آندرے کے پلے نہ پڑی۔

”راگ مالا تصاویر میں“ کرنل نہایت جوش سے بولتا رہا ”اس منظر کا عنوان لمہار ہو سکتا تھا۔“

آندرے نے پھر سر ہلایا۔ ہم اہل یورپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ انگریز قوم ایک سخی قوم ہے۔ وہ جو کہادت ہے۔ ”باڈلے کئے اور انگریز لوگ دھوپ میں گھوما کرتے ہیں!“ سولاہیٹ اوڑھے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں اپنے ملک برطانیہ کی عظمت کی خاطر سرگرداں اور انڈین آرٹ کا محقق کرنل ڈالٹن کیا ایک مثالی سخی انگریز بڑھتھا نہیں تھا؟ آندرے نے مسکرا کر دریافت کیا ”سر۔ یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟“ ٹھا کر مئی رانی؟“

” غالباً کوئی ناچ گرل یہ کرنل نے جانکاری سے جواب دیا، ٹھاکر صاحب کی رانیاں بے پردہ نہیں کھڑی ہوں گی۔ یا ہم کو دیکھتے ہی فوراً اندر چلی جاتیں۔ آؤ گڑھی چلتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی اجازت سے شام کو آکر اس بارہ درمی کے طرزِ تعمیر کا مطالعہ کریں گے۔“

پڑھا کرنل تیز تیز قدم رکھتا موٹر کار کی سمت چلا گیا۔ آندرے نے ٹھٹھک کر نواب بیگم پر نظر ڈالی اور مسکرایا۔ ناچ گرل! — اولاً — لا — لا —

نواب بیگم اس منظر سے مخلوظ ہوئی — دو فرنگی نفر ہونٹوں کی طرح منہ کھولے اسے تک رہے تھے۔ پڑھا تو یقیناً وہی کرنل تھا بانکا فرنگی شاید اس کا اسسٹنٹ۔ آندرے نے یورپین انازا میں کندھے اچکائے اور نواب بیگم کو ویک کیا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔ شو فرنے ہارن بجایا۔ آندرے ورتا ہوا کار میں جا بیٹھا۔

کرنل اور فوٹو گرافر نے تین روز گڑھی میں قیام کیا۔ ٹھاکر مہینتور سنگھ جی نے چار نادر منغل تصاویر پر کرنل کو بندہ کیسے کرنل نے ٹھاکر کو دئی دربار کے لیے مدعو کیا۔ اور آندرے کو حکم دیا کہ ناچ گرل نواب بانی کا پورٹریٹ بنا کر ٹھاکر صاحب کو کلکتے سے بھیجے۔ آندرے نے یہ کمیشن خوشی منظور کیا۔

فوٹو سیشن بارہ درمی میں منتقل ہوا۔ سولہ نگہا کیے ٹھاکر کے عنایت کردہ قیام علیہ زیورات سے سبھی نواب بیگم کوچ پڑھی۔ آندرے نے کیمرا اسٹینڈ پر جما کر نہایت انہماک سے اس کی تصویریں کھینچیں۔ ان میں سے BEST پوزیشن کر کے ہم تم کو بھیجے گا۔ کلکتہ میں رہ کر اسے ٹوٹی چھوٹی گورا شاہی اردو آگئی تھی۔ نواب بانی جو انگریزی کی شہدہ فی الحال آسٹی HOBSON-JOBSON کافی تھی۔

(۱۳)

روشن چوکی

”حضرت اکبر نے۔“ بوڑھے رائے زادہ کیلاش نرائن ماتھریان کی پیکہ نبھالنے کے لیے منہ چھت گیری کی طرف کر کے بولے ” ۱۹۰۳ کے وئی دربار میں صاحب ڈوک کناٹ کو دیکھا تو آنسو بہائے۔ ۱۹۱۱ کا وئی دربار کہیں زیادہ عبرتناک ہے۔ کیوں بی مہرو وہ گلوپیاں بنانے میں مصروف تھیں۔ رائے صاحب ہتھے رہے۔“ ملکہ میری لندن سے چلنے لگیں تو بیگم مرشد آباد نے زنانہ بند کی جانب سے ان کو ایک عدد ایڈریس پیش کیا۔ والدہ سراج الدولہ کی روح کیسی اس روز تڑپی ہوگی؟“

”رائے صاحب کس کس کی روح کس کس بات پڑنے لگی۔“ مہرو نے جواب دیا۔ نواب بیگم ڈلی کاٹ رہی تھیں۔ وہ سب مہرو کے لال کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تھے۔ چاندنی کے فرش اور مسندوں کے علاوہ ایک کونے میں ڈرائینگ روم بنا یا جا چکا تھا۔ وسطی میز پر تازہ اردو اخبارات اور دربار کے متعلقہ باتوں کے مضمیموں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نواب بیگم اور مہیشور سنگھ جی لال قلعے کی گاڑن پارٹی سے سیدھے یہاں وارد ہوئے تھے۔ شہر نفریوں اور ولایتی بینڈ باجے کی دُھنوں سے گونج رہا تھا۔ آتش بازی چھٹ رہی تھی۔ روشن چوکیاں چاؤڑی سے گذرتی چاندنی چوک جا رہی تھیں۔ رائے صاحب اُٹھ کر چھتے پر گئے۔ چند منٹ بعد واپس آکر بولے۔ ”ہر روشن چوکی پر سازندوں کے بھیس میں ایک ایک آدمی سی۔ آئی۔ ڈی کا ضرور موجود ہوگا۔“ بنگالیوں کے ڈر سے

ہر بزم طرب میں غم کا سی۔ آئی۔ ڈی تو بھیس بدل کر چھپا رہتا ہے۔ مہرو نے :
انہاز میں سوچا۔ اللہ کے کرم سے پڑھے لکھوں کی صحبت اب تک بیتر تھی۔ بے چار

خان بہادر برکت اللہ پچھلے سال اللہ کے گھر گئے۔ اب رائے زادہ کی تلاش مانٹر کا دم ایسا ویسا غنیمت تھا؟ بڑھاپے میں ذرا غنیمتے ہو گئے تھے۔ اور ملک اور گوکھلے کے جھگت بن چکے تھے۔ اب وہ برا فریختہ آواز میں فرما رہے تھے ”ہمارے راجہ نوابوں نے جھجک جھجک کر اپنی تلواریں اس سالے جارج پنجم کے قدموں میں رکھیں۔ ہمیں تو فقط ایک آدمی پسند آیا۔ کوئی عدنان کا یہ چارہ سلطان لایج۔ یہ سب منخرے نواب راجہ مرغ زریں بنے میروں زیور لادے بادشاہ اور ملک کے قدموں میں لوٹے جا رہے تھے یہ عرب نفر۔ سلطان لایج۔ اس کا ملک بمبئی پرنسپلٹی میں شامل کر لیا گیا ہے مگر صاحب وہ عرب میں نہیں آتا۔ جناب عالی۔ تمہ بند باندھے سادا چونغہ پہنے سمرانٹھائے کیا نام کر سیدھا چلتا ہوا آیا بادشاہ سلامت کو السلام علیکم کہنے کے مارا میرے بشیر نے اور فوراً واپس۔ یہ بے خود داری۔ نہ کہ سب سسرے آداب تسلیمات کو نشانات بجالاتے ادھ موئے ہوئے جا رہے ہیں“

مہرونے ابرو کے اشارے سے رائے زادہ کو روکنا چاہا اور ٹھاٹھا صاحب کا پورا تعارف کرایا۔ رائے صاحب۔ آپ ٹھاٹھا مہیشور سنگھ جی ہیں۔ دربار میں شرکت کے لیے راجپوتانہ سے تشریف لائے ہیں۔“

”ارماں معاف کرنا ٹھاٹھا صاحب۔“ رائے زادہ نے بے تکلفی سے ارشاد کیا۔ ہم صاف بات کہنے کے عادی ہیں۔“

ٹھاٹھا صاحب خاموش رہے۔ مہرونے نواب بیگم کی طرف اشارہ کیا۔ رائے صاحب آپ ان کو پہچانتے ہیں؟“

”ان کو کون نہیں پہچانتا۔“

”وہ سترہ اٹھارہ سال قبل، کرات، یاد ہے؟۔ یہی دسمبر جنوری کا زمانہ تھا یہ میری ڈولی پر بیٹھ کر غلطی سے یہاں پہنچ گئی تھیں۔“

”نوب یاد ہے اسی رومی قالین پر نجات اوڑھے پڑی سو رہی تھیں۔ ہونی شنی۔“

”تو بس، مہیشور سنگھ جی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔“ یہ بھی ایک شنی امر

تھا کہ راجپوت سردار فرنگی سمرٹ کے قدموں میں اپنی تلواریں رکھیں۔ مغلوں کے قدور
میں بھی تو رکھی تھیں۔“

”کیوں رائے صاحب ہوئے لاجواب؟“ نواب بیگم نے تکلفی سے بولیں۔

”آپ تو کنگز و پرنسز فرما ہوں گے۔“ رائے صاحب نے پوچھا۔
”راجگان راجپوتانہ کے کیمپ میں۔“

”جی نہیں کئیر می گیٹ۔ ہوٹل میں آج اس طرف آتے ہوئے ایک مہاجن
مکان پر بادشاہ سلامت کی وہ تصویر دیکھی جو برقی قلموں سے بنائی گئی ہے۔“ ٹھاکر۔
اس انداز سے جواب دیا گویا تم دلی والے بھی ہم راجپوتوں سے کم ٹوڑی نہیں۔

”ڈیڑھ سو نواب راجے۔ سائٹ سو جاگیر دار۔ جلوس تھا کہ شیطان کی آنت۔ میں تو
کھڑے کھڑے تھک گئی۔“ مہر کی نواسی، شتم کی لڑکی چھتو نے اٹھلا کر کہا۔ وہ اسی وقت
کرے میں آئی تھی۔

”تم نے کہاں سے دیکھا؟“ نواب بیگم نے دریافت کیا۔

”ٹاؤن ہال کی چھت پر سے۔“ چھتو نے جواب دیا اور بام پہ جا کر روشن چوکو
کا نظارہ کرنے لگی۔

”آپ نے ان کو دربار لائٹ ریلوے کی سیر کرائی؟“ رائے زادہ نے ٹھاکرے
دریافت کیا۔

”صاحب ہم کو آج کل قطعی فرصت نہیں۔ انہیں ان کی مہر و خال کے سپرد کر دیا
جو چاہیں دکھلا لائیں۔ ہم تو آپ کی دلی میں پر ویسی ہیں۔“

”اس ریلوے کی تیاری کے لئے مہاراجہ جے پور نے بھی تو کئیر رقم دی ہے۔“

”رائے صاحب، مہیشور سنگھ جی نے منانت سے کہا: ”اسمیں تعجب کی کیا بات
باجنڈاروں کا یہی کام ہے۔ امپریل مغلوں کے درباروں اور تقریبوں کے لیے بھی

ہمارے پڑھے اس طرح حاضر ہوتے تھے۔ رہے آپ لوگ تو ہم نے سنا ہے آپکے بزرگ نو دہائی کے آخری تلاش بادشاہوں کو قرضہ دیا کرتے تھے۔“

” وہ ہم نہیں۔ دلی کا ایک اور گھرانہ ہے۔ بنیوں کا۔ ہمارے بزرگ توفیقے میں محض مٹی منصدی تھے۔ بی نوابن۔ کل دربار لائٹ ریلوے پر سارے جشن کی سیر کر آؤ۔ نیس ہزاری سے ہر پانچ منٹ پر چھوٹی ہے۔ رستے میں اٹھارہ اسٹیشن بنائے گئے ہیں ایک سے ایک خوب صورت۔ انھوں نے ایک اخبار اٹھایا۔ اس کی سرخیاں اور خبریں پڑھ کر سنانی شروع کیں۔“

” کشور ہند کے نامور علمائے دین، اور ماہانہ پندتوں نے کل حضور ملک معظم کی خدمت میں بربان عربی و سنسکرت قصائد پیش کیے۔“

” مشاعرہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر اقبال نے پندت جرمون دنا تریہ کینی کا قصیدہ بہاریہ بہترین قرار دیا۔“

”۔ بنگال کے شاعر اعظم رامندر ناتھ ٹیگور نے اس مبارک موقعے کے لیے ایک نثر بربان بنگالی رقم کیا۔ ترانے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: جن گن من ادھنائیک جے ہے بھارت بھاگیہ ودھانا۔ ناظرین۔ مادر ہند کی خوش نصیبی سے آج ہم۔“

راتے صاحب نے اخبار رکھ کر نواب بیگم کو مخاطب کیا۔ ”کیوں صاحب۔ ع۔ جناجی کے گھاٹ کو دیکھا؟“

” جی ہاں۔ تو ہیں اور رسالے دیکھے۔ بینڈ بجانے والے دیکھے۔ کل بادشاہی میلے میں گئے۔ زیریں قلعہ وہاں سب سے اونچے لاٹ کوکل دیکھا۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ آج۔“

چھٹونے بالکنی سے واپس آکر بڑی اداسے بات کی۔ ”ناہم تو مینڈھوں کی اور ہاتھیوں کی لڑائی دیکھیں گے۔ سرکس۔ تھیٹر۔ انگریزی بائیسکوپ۔ کلکتہ کی میموں کا زندہ ناچ۔“

” میس نہیں یوریشین چھوکر یاں،“ ٹھاکر ہیشور سنگھ نے حقارت سے کہا۔

” سنا ہے جو کچھ آج کل ہو رہا ہے۔ اس کا بھی بائیسکوپ بن گیا ہے وہ دکھلایا جاوے گا۔ کوئی یورپین فوٹو گرافر آیا ہوا ہے کلکتہ سے۔ رینال صاحب کر کے وہ بھی ایسا کیمرہ لایا ہے جو چلتی پھرتی تصویریں کھینچ لیتا ہے۔“ مہرولی۔ اور چھتو کو ابرو سے اشارہ کیا کہ فرینے سے ایک طرف کو بیٹھے۔

” یہ رینال صاحب۔“ ٹھاکر مہیشور سنگھ نے فخریہ کہا۔ ”میرے ہاں آچکا ہے بگڑھی پہ نواب بانی کا فوٹو بھی اسنے کھینچا۔“

” او ہو۔ ماشا اللہ۔“ راتے صاحب بولے۔ پھر ایک بانصویر اخبار اٹھایا۔ ”ہیں تو صاحب بیگم بھوپال سب سے شاندار لگیں۔ نیلے برقعے پہ بیرون کا تاج پہنے۔ ہمارے خان بہادر صاحب مرحوم آج زندہ ہوتے جہانی برکت اللہ۔ تو خوش ہوتے کہ بیگم صاحبہ نے اپنا پردہ ترک نہ کیا۔ سلطان لایج کی طرح وہ بھی کسی کے رعب میں نہیں آئیں صاحب۔ او ہو یہ خبر سنیے۔ مہارانی صاحبہ پٹیلالہ نے زنانہ بند کمری جانب سے حضور مکہ معظمہ کو زیورات پیش کئے برس ہم سے وال بیٹھے کڑھا کرتے ہیں۔ بوڑھے ہو گئے ورنہ ایک آدوہیم ہم بھی جا کر چھینک آئے۔“ اجار چھینک کر وہ اپنی جریب فرش پر کھٹکھٹانے لگے۔

ٹھاکر صاحب نے چہرہ اونچا کر کے بالکنی پر نگاہیں جمادیں یہ کاسیتھ بڈھایا باخبطی ہے یا خود سی۔ آئی۔ ڈمی کا آدمی۔ اب یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ توقف کے بعد ماتھر صاحب بولے۔ ”جان تشاران دولت برطانیہ کے اس تہن میں بس شاید بی مہرو بی ہماری ہم خیال و مہربان ہیں۔ ویرینہ غم خوار۔ جب ہم اس چہل پہل میں منحل شہزادوں شہزادیوں کو بھیک مانگتے دیکھتے ہیں دل خون ہوتا ہے۔ آج آئے تو دیکھا بی مہرو بی اخبارات سامنے پھیلانے بیٹھی رو رہی ہیں۔ ہم نے پوچھا خیریت؟ بولیں راتے صاحب۔“ غدر میں لڑنے والے خاکبوسوں کی فوج کے تیس چالیس گورے اور کالی پلٹن کے آٹھ ایسی ابھی قیامت کے بورے سینے کو زندہ ہیں۔ کل صبح ان کا جلوس نکلا تھا۔ ان بوڑھے پوسہ پنشنیے فوجیوں کو بادشاہ کے حضور میں تمنغہ پہنائے گئے۔ یہ تصویریں دیکھیں تو دل پہ

ایک گھونٹہ سا لگا۔ کیا پتہ جن ظالموں نے سرائے طغرل بیگ میں، میرے کنبے کو ٹھہرانا ہی میں سے رہے ہوں۔“

”سرائے طغرل بیگ - ؟“ ٹھاکر صاحب نے پوچھا۔

”اجی چھوڑیے۔ پرانی خبر ہے۔ آج کی نیوز— سنیے۔“

مانٹر صاحب نے طنزیہ انداز سے پھر ایک اخبار اٹھایا۔

”مسٹر الما لطیفی آئی۔ سی۔ ایس۔ انچارج انڈین پریس کمیٹی کو مسٹر محمد علی جوہر اڈوکیٹر کامریڈ نے وزنا کیولر اخبار نویسوں کی طرف سے ایک تقری فی سیڈ پیش کیا۔“ ٹھاکر صاحب ہمارا ایک بھتیجا بھی انگلینڈ سے آئی۔ سی۔ ایس بن کر آیا ہے۔ وہ بھی بیگالیوں کو منشد اور باغی گردانتا ہے۔“

آتشدان پر رکھے منوڑی کے قدیم جرمن کلاک نے گھر در گھر رر شروع کی۔

”کبھی کے دن بڑے کبھی کمی راتیں، بہرہ نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔“

”نوابن۔ تم توفیق کی کارڈن پارٹی میں ہو آئیں۔ مبارک ہو۔“

”ٹھاکر صاحب نے مجھے جو نیر رانی ظاہر کر کے دعوتی کارڈ حاصل کیا، کرنل ڈالٹن

جو آیا تھا گڑھی پر۔ اس کے ذریعے، نواب بیگم نے آہستہ سے کہا۔

”ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔ وہ وقت یاد ہے۔ جب اسی دلی شہر میں نوابن چھو کرمی

کو ذلیل کر کے گوٹے والوں نے اپنے گھر سے نکالا تھا۔“

”ہاں بہرہ و خال، مگر کچینی بن کے یہ عزت ملی تو کیا ملی؟“ نواب بیگم نے نیچی آواز میں

جواب دیا۔ اور سیاہ شہاب کاروسی اور کوٹ کوچ پر سے اٹھایا۔ جرمن کلاک کے

مکتبکل فرشتوں نے دس کا گجر بجانے کے لیے اپنی نفریاں سنبھالیں۔

(۱۵)

میراجیم امول تھا

دلی دربار کی گھسان میں آندرے سے ملاقات ناممکن تھی۔ قلعے کی گارڈن پارٹی میں سارے فرنگی فوٹو گرافر ایک سی شکلوں کے دکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شاید آندرے تھا کہ دیوان خاص کی ایک بُرجی میں بندر کی طرح بیٹھا تصویریں کھینچنے میں مصروف تھا۔ نواب بانی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں اور وہ نیچے کود کر مچ میں غائب ہو گیا۔

جے پور واپس پہنچیں۔ چند ہفتے بعد چندرنگر سے ایک پارسل آیا۔ فلو مینا نے بڑے اشتیاق سے کھولا اور چلائی۔ ”میم صاحب تمہارا فوٹو۔“

نواب سگیم دالان سے اٹھ کر بھاگی بھاگی صحن میں آئیں۔ ”اوہو میم صاحب۔ فلو مینا نے باجھیں کھلا کر کہا۔“ یہ صاحب تمہارے LOVE میں پڑ گیا ہے۔ LOOK, LOOK کیا بوٹی فل پینٹ کیا ہے تمہارے کو۔“

”دیکھیں۔ دیکھیں۔“ نواب سگیم نے پورٹریٹ سنبھال کر ہاتھ میں اٹھایا۔ ”تم کو ایک دم ملکہ نور جہاں کے موافک بنا دیا۔ باپ رے۔“ اس نے دفعتی بیٹی اور پیچھے لکھا فوٹو گرافر کا نام پڑھا۔

JACQUES CORBIN

CHANDRANAGORE

”آندرے صاحب بولا تھا وہ اسی فرنج صاحب کے اسٹوڈیو میں نوکر ہے۔ فلو مینا نے کہا۔“ اس کا ایک دم بڑھیا فریم بنانا مانگتا۔ بالکل جیسے سپلیں میں مہارانی لوگ کے فوٹو

”افریم ہم دیکھتا تھا۔ ہم برور سپلیں کے اندر جا کر تانا تھا جب ہمارا POOR —“

”فلو مینا۔“ نواب بانی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”دیکھو شاید ٹھاکر صاحب تشریف لائے ہیں۔“

فلومینا باہر لپکی۔ نواب بانی نے تصویر دیوان خانے کے منٹیل پیس پر سجائی۔ دیکھ دیکھ کر مسرور ہو آئیں۔ آندرے نے کہا تھا کہ وہ اس تصویر کو لندن اور پیرس کے رسالوں میں چھپوانے کے لئے بھیجے گا۔ بعنوان ”پورٹریٹ اٹ اے ناچ گرل“۔
فلومینا نے کھڑکی میں بھانکا ایم صاحبہ گڑھی سے انوپ سنگھ آئے تھے۔ بولے۔ ٹھا کر صاحب کل آئے گا۔ بولے تمہارے کو گھر تاج پہ رہنا مانگتا۔ بولے۔

تو زہور کا وقت۔ چڑیلوں کی چپکار سے چین گونج رہا تھا۔ والان میں نماز پڑھ کر نواب بیگم نے چائے پی۔ انڈوری استاد جی اور سازندے آندر آئے۔ درمی پر اپنی جگہ سنبھالی۔ طنزورے کے سٹراٹے گئے۔ مطیع میں کھا: اپکنا شروع ہوا۔ مالی ہزارہ لیے سامنے سے گذرا۔ شاگرد پیشے میں خدمت کار کی بیوی زور سے ہنسی۔ گلانی فراک پہنے سیاہ فام فلومینا ڈمی کو سٹا صحن میں استری کے کویلے دہکار ہی تھی۔

طنزورہ سنبھالتے ہوئے نواب بیگم نے اپنے اس وسیع کارخانے پر نظر ڈالی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ برسوں انھوں نے دوسروں کے دسترفوان کی جھوٹن سے پیٹ بھرا۔ اب ساہا سال سے پالن ہارنے ان کو اس لائق کر رکھا تھا کہ اس کے چند بندوں کی رزق کا وسیلہ بنیں۔

دستور کے مطابق حمد و نعت سے ریاض شروع ہوا۔ طلبگی نے جتھتال بجائی۔ نواب بیگم نے بھیرو کا خیال چھیڑا۔ تو اب یاد کر لے بندے۔ اپنے اللہ کو۔ جو کچھ بھلا ہووے تیرا ٹھا کر ہمیشہ رو سنگھ جی پھانگ میں نمودار ہوئے۔

نواب بیگم کافی رہیں۔ لا الہ اللہ محمد الرسول اللہ۔ کلمہ نبی جی کا پڑھ لے۔
تو اب یاد کر لے۔

ٹھا کر صاحب آہستہ آہستہ چلتے والان میں پہنچے۔ سر جھکا کر کھڑے سنا کیے۔ تو اب یاد کر لے بندے اپنے اللہ کو۔

خیال ختم ہوا۔ نواب بیگم اور سازندوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ ٹھا کر تخت کے نزدیک آرام کرسی پر بیٹھے۔ دوسری منزل کے کمرے ان کے قیام کے لیے مخصوص تھے۔ چڑھواں داڑھیوں والے ملازم اپنے آقا کا دلائمی ٹرنک، بسترنید اور پوچا کے سامان کی پیٹی اٹھائے زینے کی سمت چلے گئے۔ رسوئیا اپنی ٹوکریاں سنبھالے ایک رسوئی گھر کی طرف بڑھا۔ جو ٹھا کر صاحب کے لئے مقفل رہتا تھا۔

مہیشو سنگھ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ سوموار کی صبح۔ دو روز دیک کے شوالوں سے گھنٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے زیر ب شیوجی کی پانسانیں مشغول ہو گئے۔

کرالم مہاکال۔ کالم کرپالم۔

ایک بار انھوں نے نواب بیگم کو بھجایا تھا۔ بھیانک ڈر درشتی شو مہاکال سنسا کر ختم

کردیتا ہے۔

چاپ ختم کر کے آنکھیں کھولیں۔ پریشان سے نظر آرہے تھے۔ استاد جی نے اب نواب بیگم سے گانے کے لئے کہا۔ ٹھا کر صاحب کبیر کے دلدادہ تھے۔ نواب بیگم نے ایک آدھ کبیر بانی گنگنا کر ایک چھڑی۔ رات گنوائی سوئے کے۔ دن گنوا یا کھائے۔ ہیرا جنم امول تھا کوڑی بدلے جائے ہیرا جنم۔ ہیرا جنم امول تھا۔

ٹھا کر صاحب جھومایے۔ بھجن ختم ہوا تو چونکے گھڑی دیکھی۔ نواب بیگم نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ وہ فرشی سلام کر کے رخصت ہوئے۔ ٹھا کر صاحب نے کہا: ”ہم اشنان کر کے ابھی آتے ہیں نواب بانی تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے:“ استاد جی ڈیوڑھی تک پہنچ چکے تھے۔ انھیں پکارا وہ الٹے پاؤں لوٹے۔ فرمایا۔ ”خاں صاحب۔ چند راوتی کے بیاہ میں آپ کو ہمارے دربار کا نام روشن کرنا ہے۔ بانی جی کی ایسی تیاری کروائیے۔“

”حکم“ استاد جی نے دست بستہ عرض کی۔

”ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشد!“ طبلے پر تھاپ دیکر نواب بیگم خوشدلی سے گنگنائیں لیکن ٹھا کر صاحب بہت متفکر نظر آتے تھے۔ کرسی پر سے اٹھے۔ ہم اشنان کراؤں۔ انھوں نے دہرایا اور آہستہ آہستہ چلتے زینے کی طرف مڑ گئے۔

استاد جی نے سوالیہ نظروں سے نواب بیگم کو دیکھا اور پھر واپس گئے۔ نواب بیگم اپنی خوابگاہ میں آ کر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئیں۔ فلو مینا استری شدہ ساریاں الماری میں رکھ رہی تھی پلٹ کر مالکن کو مخاطب کیا۔

”میم صاحب! کانوں تک باچھیں پھیل گئیں سیاہ چہرے میں سفید دانت جھلملائے۔ بڑی بڑی آنکھیں چھت کی طرف گھما کر۔“ بھنوری بانی کا ویڈنگ میں ٹھا کر صاحب میرے کوسچا گولڈ کا گھڑیاں دے گا نا؟ انوپ سنگھ بولنا گیا رہ توپ کا سیلوٹ والا اسٹیٹ کا پرنس ہے۔ یاب رے گیا رہ توپ۔ اپنا ٹھا کر صاحب کے واسطے تو ایک پٹاخہ بھی نہیں ٹھہتا۔“

”چب فلو مینا۔“

”ایسا بڑا مہاراجہ کا پھوکرا اپنا بھنوری بانی سے سادی بنائے گا ڈیم لگی کرل۔ بٹ ویسری بیوٹی فُل گرل میم صاحب۔ ہم تو اس کو گرہمی کے اندر جا کر دیکھا ہے۔“

”جھی تو سات پردوں میں سے اس کی خبر باہر پہنچ گئی۔ نواب بیگم نے کہا۔“

”بیوٹی فُل تو تم ہی ہے میم صاحب پن لکی نہیں ہے۔“ فلو مینا نے زبان دانتوں تلے داب کر بات بدلی۔ ”پرنس کو اس کا فوٹو دکھلایا ہوگا۔“

نواب بیگم کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے تھے۔ فلو مینا ایک محافظ فرشتہ تھی لیکن اسکے قدم مضبوطی سے دھرتی پر چبے ہوئے تھے۔ جب نواب بیگم اوجھی اڑانیں بھرنے لگتیں۔ وہ کوئی بات ایسی کہہ کر فوراً ان کو حقیقت کی سطح پر واپس اتار لیتی تھی۔ نواب بیگم نے معطر رومال سے آنکھیں خشک کر جواب دیا۔ ”ہاں۔ دلی لنگز نوے کیمپ پر راجہ لوگوں نے بات طے کروائی۔ مجھے تو ٹھا کر صاحب نے ابھی بتایا پلے روز جب آئے تھے۔“

”ہم جانتا ہے۔ ٹراؤنکور بولو۔ مانی سور بولو۔ اینڈ۔ کوہا پور۔ جام نگر بولو۔“

بڑودہ بولو۔ اتنا بڑا بڑا پرنس لوگ کے لیے یووراج کا بات آیا۔ پن اپنا چندرا ووتی جی۔

گریب آدمی کا بیٹی۔ اس کے بھاگ۔ انوپ سنگھ لوے پرنس اینڈ پرنس یورپ

راجستھان کے ٹھا کر جاگیر داروں کا بڑا بڑا کتوری ہنھلا بھنوری چھوٹا ستوری کہلاتا ہے۔ اسی طرح بڑی بھلی اور چھوٹی بیٹیاں کتوری بانی بھنوری بانی اور ستوری بانی۔ اہل بیٹی کی زبان میں گھڑی۔

میں ہنی مون منائے گا۔ ہزبائی نس کا ایک بنگلہ انگلینڈ میں بھی ہے — باپ رے —
 نواب بانی بے دھیانی سے عطر کی شیشیاں سنگھار میز کی سطح پر ادھر ادھر سرسکایا کیں
 کپڑے تہہ کرتے ہوئے فلو مینا نے بات جاری رکھی — ”پن اپنا — پوسٹ بھائی وہ نوا
 کا ٹھیا داڑھی ڈرائیو ہے نا میم صاحب وہ میرے کو بولا ابھی انگلینڈ ونگلینڈ تو سمجھے — پہلے
 بیاہ تو ہو جانے دو — اور بھی کیا کیا بول رہا تھا —“

”بڑا نمک حرام ہے۔ اپنے آقا کے خلاف بکتا ہے“ نواب سگیم نے غصے سے کہا۔

”باہر کا آدمی ہے بانی۔ نوا آدمی ہے۔ بولا اس نے ٹھا کر صاحب سے پگھار مانگی۔ چار مہینا
 سے اس کو پگھار نہیں ملی۔ ٹھا کر صاحب بولے ابھی نہیں پھر دے گا۔ پوسٹ بھائی تاؤ کھا گیا۔
 بوتا ہے ایسا خانی پبلی شان کائے کو مارتا۔ کرنل صاحب آیا اس کے لئے اُدھار مل گیا تب
 اُدھار گڑھی کا اکھا چیز گرومی رکھ چکا ہے۔ جانے کب سے ایسا چل رہا ہے میم صاحب۔ اپن
 لوگ کو ابی ما لوم ہوا۔ اُدھار جب کنوری بانی کا سادی بنا یا تھا۔ وہ تو گو الیر کا ایک معمولی سردار
 تھا۔ ابی بھنوری بانی کا سادی تو اتنے بڑے راجکار سے ہوتا۔ اس کے لئے ہمارا اولڈ مین
 کیا کریگا — ہ کتنا سوڈ بھر بلا ہے اس نے اب تک —“

نواب سگیم خاموش بیٹھی سنتی رہیں۔

”میم صاحب جھوٹا شان کائے کو مارنے کا —“

امیروں کے معاملات یہ دو ٹکے کی کرستان آیا کیا سمجھے۔ نواب سگیم نے خفیف سی
 حقارت کے ساتھ سوچا۔ فلو مینا نے کمرے کے دروازے بند کیے اور سنگھار میز کے قریب
 آکر سرگوشی میں بولی ”ایک بات بولوں — ہ ٹھا کر صاحب بڑا UNLUCKY ہے۔

— تین تین ٹھکرانیاں تینوں سے پھو کر ایک نہیں۔ پانچ پانچ پھو کر ی۔“

”تو پھر —؟“

”بات سنو۔ ابھی پانچ پھو کر میم سے ایک کی سادی بنا یا دوسری کے لیے —“

”پچھلے مہرم میں میں نے کہا جناب عباس سے بھنوری بانی کے لیے منت مان لیجئے۔“

امام حسین سے تو وہ مان ہی چکے تھے۔ میں نے کہا جناب عباس کی طبیعت میں عجلت پسندی

بہت تھی وہ جلدی کام کر دیتے ہیں۔ تو دیکھو سال کے اندر اندر اتنا بڑھا رشتہ۔“
 ”میں صاحب ہمارا بات سنو۔“ فلومینا بیچی آواز میں مضر رہی۔ ”ٹھکرانی لوگ تم سے بہت
 خنس کھاتا۔“

”عجب کی کون سی بات ہے؟“ نواب بیگم نے اکتا کر پوچھا۔
 ”سنو۔ ٹھکرانی لوگ بولتا مغل ٹائیم کا اتنا داگینہ ٹھا کرنے وہ کھینچی کو دیدیا۔ ابھی چار
 چھو کر می کا شادی بنانا ہے۔“
 ”ارے فلومینا۔“ نواب بیگم نے بے پرواہی سے کہا۔ ”ٹھا کر کے یاس بہت داگینہ ہے

سیروں۔“

”ہاں پسن اس کو چار چھو کر می کا میرج بنانا ہے۔ — THEN — ہائی۔ تم بھی ذرا
 اپنا کھانے پینے میں ہوشیاری رکھو۔ کوئی چیز ٹھا کر کا سروٹ لوگ تم کو کھانے کو دے کہ گڑھی
 سے آیا ہے۔ بالکل نہیں کھانے کا۔ تمہارے کو بول دیا ہے۔ ٹھکرانی لوگ تمہارا دشمن ہو رہا
 ہے۔“

”فلومینا —“ باہر سے رسوئیے نے پکارا۔

پیرا تجم امول تھا۔ امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ کوڑی بدلے جائے۔
 کھرج میں گنگنا نے ہمیشہور سنگھ زینہ ترے بیشتر شینو شاکت ٹھا کروں کی طرح گوشت خور
 تھے۔ دالان میں پہنچ کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ رسوئیے نے میز سامنے رکھ کے کچڑی کا
 گوشت اور سانگری کا ساگ پیش کیا۔

”نواب بانی —“ انھوں نے آواز دی۔

نواب بیگم کمرے سے برآمد ہوئیں۔ فلومینا کی گفتگو کو سنا کر پیشینگی کی گپ سمجھ کر نظر انداز کر
 چکی تھیں۔ زیورات کے سلسلے میں ٹھکرانیوں کے ”خنس“ والی بات البتہ کھٹک رہی تھی۔
 تخت پر گاؤتیکے سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ بھٹوری بانی کی ماں اس رسوئیے کے ذریعے تو زہریلا
 اچار مجھے بھجوائے گی نہیں۔ فلومینا کی نصیحت پر ہنسی آئی۔

کا پھل ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے اگلے جنم میں تم ایک شریف گھرسنار کی مالکن بیابنا ستوتی
کا جیون بتاؤ گی۔“

نواب بیگم کے دل پر بڑی کرمی چوٹ لگی۔ پٹ پٹ آنسو بہانے لگیں
”افسوس تمہارا دل دکھایا۔“ انہوں نے گہرا کر کہا۔

نواب بیگم نے آنسو پونچھے۔ سوچنے لگیں کس طرح اس نیک طہنیت تنگ حال آدمی کی
مدد کریں جس نے اپنے بھلے دونوں میں انہیں مالا مال کر دیا تھا۔ راجپوت دی ہوئی مجینہ
دائیں نہیں لینا۔ ٹھا کر کے عطا کردہ مغلیہ زیورات کسی بہانے انہیں لوٹانے کی ہمت نہ تھی
”نواب بانی“ ٹھا کر صاحب بولے ”اپنی فضول خرچی کی وجہ سے تم بھی مقروض رہتی ہو
یہ تمہارا سا ہو کا رجو ہے۔ چھوٹی پوٹڑی والا گردھاری لال رنجھوڑ مل۔ اس کے سود کی
شرح بھلا کتنی ہے؟ ہمیں سر دست تنگ کے لئے محض پچاس ہزار نقد کی کمی پڑ رہی ہے
باقی ساری تیاری مکمل ہے۔ اس سے سود کی شرح کم کروادو۔“

”حکم۔ ابھی بلاتی ہوں۔ موٹو مل کو۔“ دروازے میں جا کر فلو مینا کو پکارا۔

”ڈرائیور کو بولو سیٹھ گردھاری لال کو لے کر آئے۔ فوراً سے پیشتر۔“

”یس مہم صاحب۔“ فلو مینا ڈیوڑھی کی سمت بھاگی۔

”کھلے کھلے پانی۔ پچاس ہزار روپے کی کیا حقیقت ہے۔ گردھاری لال بھی بھلا
آدمی ہے۔“ نواب بیگم نے شیر لونگ کی طرف دایں آتے ہوئے کہا۔

”بھولی بانی! سود فور بھلا آدمی۔؟ اسی لئے تمہارے مذہب میں سود حرام ہے۔“

تھا کرنے کشمیری کر دھت کے کٹن سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سفید بڑی
بڑی لوکیلی مونچھوں والے وجیہہ اور شاندار سورج سنسی راجپوت۔ نواب بیگم نے۔
راہو اور تخیل کو آزاد کیا۔ انکے پرکھ اکبر اور جہانگیر کے دربار میں اسی طرح بیٹھتے ہوں گے
خیر۔ وہاں صوفہ تو ہو گا نہیں۔ بھر پے رہتے ہوں گے۔ دست بستہ۔ دیوان خاص میں۔

بے چارہ لڑکی کا باپ - لڑکیوں کا باپ ہونا سچ مچ بڑی بد قسمتی ہے — اگر یہ ہم
مغلوں کا زمانہ ہوتا۔ اتنی فکر ان دکھیا کو کا ہے کہ ہوتی جہیز شاہی دربار سے عطا ہو جاتا — یا
ایک پالکی انکی گڑھی میں شہنشاہ کے محل جانے کے لئے علیحدہ رکھی ہوتی۔ چند راوی اس میں
بٹھال کر آگے بھیج دی جاتی۔ مغل شہزادوں کی ماں بنتی —

اگر وہ یاد کیا تو نہ ہمال کا خیال آیا آنسو پھرا منڈے۔ اسپ تخیل گلی شاہ تارا، دلی،
کی جانب موڑا۔ اگر آبا زندہ ہوتے۔ مرزا دلدار علی برلاس۔ اور میری شادی ہونے والی ہوتی
کسی نواب زادے سے اعلیٰ مرتبت سمدھی سے بکتر — جہیز کی فراموشی کی خاطر
اسی طرح پریشان ہوتے میرے آبا — میری شادی — آبا میرے بیاہ کے انتظامات
میں مصروف میرے آبا میرے بیاہ کے انتظامات — ٹپ ٹپ آنسو —

پردہ نشین بھنوری بانی گڑھی میں مایوں بیٹھی ہے چوٹی کے دایانہ راست —
پارات میں آرہے ہیں اور فرض کر دکھا کر پچاس ہزار مہمانہ کر پایا۔ شادی میں لگی دیر۔ اور
یو دراج کو لے اڑی بڑا دن کو رکھی راجکاری — تو چند راوی کیا گڑھی کی خندق میں کوڈ
جائے گی — نہیں نہیں — میں ایسا نہیں ہونے دوں گی —
آنسو بھل بھل رواں تھے جب ڈبیلر کا ہارن پھانگ پر بجا۔

ٹھا کر صاحب نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ صدر دروازے سے چھوٹی چوڑا والے
سیدھے گردھاری لال رنچھوڑ مل کھڑا یا اپنے بستے سمیت فٹ بال کی طرح لڑھکتے صحن میں
داخل ہوئے۔ نواب سیکم کو یاد آیا یہ ڈبیلر بھی ٹھا کر مہیشور سنگھ ہی نے عنایت کی تھی۔

دوسری شام فلو مینا نے نواب سیکم کے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا: ہمیں صبا
یہ نرم نے بہت EGOISH بات کیا۔ اپنا بلڈنگ کا کارٹھی پر ٹھا کر کو پسیہ نہیں دلوانا مانگتا۔
— ٹھا کر نہیں مانتا تھا۔ اپنا اکھا مغل سینٹنگ گا رٹھی میں دینے کو تیار تھا۔ تم ہی نے خدا کیا
باہر سے ہم سب سن رہا تھا:

”فلو مینا۔ ٹھا کر صاحب جلد از جلد اصل مع سُو د ادا کر دیں گے۔ خالی ٹولی گارنٹی میں میرا کیا بگڑا؟“

”میم صاحب۔ اگر وہ رقم اولڈ مین ٹائیم پر نہیں دیا تو سیٹھ اکھا ملڈنگ کر کی کر والے گا۔“

”اکھا نہیں۔ ہاٹ۔ آدھی جوہلی تو پھر بھی میرے پاس باقی رہے گی۔“ نواب بیگم نے بے فکر سی سے قہقہہ لگایا۔

”لائبریری کے سامنے لکھا پڑھی ہوا۔ میم صاحب تم اس بات کو جوک سمجھتا؟“

”ارے فلو مینا کی بچی کیا رات کے وقت بدشگونی کر رہی ہے۔ کالی موٹی بھینس۔“

چڑھیل بھاگ — بھاگ جا یہاں سے، نواب بیگم نے جھلا کر سسزہ پڑایا۔ اور آئینے میں عکس جمال ملاحظہ کرنے لگیں۔ خدا نہ خواستہ — شیطان کے کان بہرے — تھو تھو — اگر کچھ گڑبڑ ہوئی اس رہن نامے کے سلسلے میں — گردھاری لال میری آواز اور رنگ روپ تو قرتی نہیں کر سکتا۔ اتنا ہی پھر سیداکر لونگی۔ اللہ اور دے گا — ایسے آرٹے وقت میں ٹھا کر کی مدد نہ کرتی؟

بلیبل کی آواز پر چونک کر دریچے میں گئیں: ”اے لورات کی راگنی ابھی سے الاپ رہی ہو؟“

پڑوسیوں کی بلیبل اطمینان سے گائے گئی۔

نواب بیگم نے منہسکر پکارا۔ ”اے بی۔ تم عنذیب ہزار داستان تو نہیں —؟“



پری تھیم

چند راوتی جی کی شادی میں نواب بیگم نے پوری تیاری سے گایا اور ٹھا کر مہیشورنگھ کے دربار کا نام روشن کیا۔ باپ کا دیوالہ نکال کر بھنوری بانی اپنے پرنس کے ساتھ سہنی مون کیلئے یورپ سدھاری۔ نواب بیگم جے پورا واپس آ کر اپنے معمولات میں مصروف ہوئیں۔ صبح کو رماض دوپہر کو قیلولہ۔ شام کو ڈیمیلر موٹر کار یا میلارڈ فٹن پر ہوا خوری۔ بیاہ کے جلسے کے بعد ٹھا کر کی بارہ درمی کو روتے دھوتے خیر باد کہہ آئی تھیں۔ مجرے آمدنی کا واحد ذریعہ رہ گئے مہاراجہ کو الیار کے برادر خورو بھیا گنیت راو نے رامپور سے ہارمونیم کو فروغ دیا تھا گھر گھر عطاءوں کی محفلیں سجنے لگی تھیں۔ کبسی کے مقابلے میں عطاءئی میدان میں آرہے تھے۔ مجرے کے بجائے فونوگراف۔ مہیشورنگھ جی کی ملازمت کے خاتمے نے حالات بدل دیے۔ نواب بیگم نے خدمت گار مہری، مشعلی اور ڈرائیور کو ایک ایک ماہ کا نوٹس دیا۔ استاد جی سے کہا ڈیمیلر کو اوپر اخراجات میں تخفیف کی دوسری سبلیں سوچنے لگیں۔

چند راوتی کے بیاہ کو تین چار ماہ گز گئے نواب بیگم کے لئے کہیں سے سانی نہیں آئی۔ ایک روز دن چڑھے والاں میں چپ چاپ بیٹھی پان بنا رہی تھیں کہ ٹھا کر صاحب وارد ہوئے۔ ”آج جے پور میں بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ چند منٹ کے لئے تمہاری خیریت معلوم کرنے آگئے آرام کرسی پر بیٹھے۔ چند لمحوں بعد بلولے۔ ”نواب بانی۔ تم نے ہمارے لئے بہت کیا۔ تم بہت بھلی عورت ہو۔“

برآمدے کے نیچے کیاری میں تیز سُرُخ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ بلبل گلاب کی ٹہنی پر آن بیٹھی۔ ٹھا کرنے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اڑی نہیں۔ اسی طرح بیٹھی چبکتی رہی۔ ”تو خالص ایران بلبل معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کیسے آگئی؟ انھوں نے حیرت سے پوچھا۔“

”پرندے اڑ کر کہاں سے کہاں چلے جاتے ہیں۔ حضور۔ نواب بیگم نے جواب دیا ”یہ بلبل ہے؟ میں سمجھی کوئیل ہوگی۔ مجھے اڑتے پرندوں کو پہچان نہیں۔“

دفعاً ٹھا کر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ گیارہ بجے ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ تھا۔ انہیں زحمت کر کے پٹر مردہ سی تخت پر لیٹ رہیں۔ ایک بجے خاصہ تناول کیا۔ اپنے کمرے میں جا بیٹھیں۔ بے مصرف بے کار زندگی۔ شام کو پانچ بجے برآمدے میں آکر چائے پی رہیں تھیں کہ وہ بلبل پھر شاخ گل پر آن بیٹھی اور یکسانیت سے گانا شروع کر دیا۔

پڑوس میں فیروزے کے ایرانی تاجر آن کر بسے تھے۔ اسے پنجرے میں بند کر کے اپنے ہمراہ اصفہان سے لائے تھے۔ اس کے تھوڑے سے پر کاٹ دئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ نیچا نیچا اڑتی بھدکتی نواب بانی کے صحن چمن میں آجاتی تھی۔

”ہلوسٹرٹائیٹ انگیل۔“ فلومینا نے چار دانی لاتے ہوئے اسے آواز دی ”ہم جم۔ یہ ہمارا بہن ہے۔ اپنا سینٹ فرانسس اف آسٹری سب چڑیا لوگ کو اپنا بہن بھائی بولتا تھا، اکھا جانور لوگ کو اپنا ساگا والا بولتا تھا“

”ایسا۔۔۔؟“ نواب بانی نے بے دھیانی سے کہا اور سوچیں گجر بانی کے ہاں ہو آئیں۔ گجر بانی عرصے سے مفلوج پڑی تھیں انکی بیٹیاں نواب بانی کی شہرت اور کامیابی سے بے طرح جلتی تھیں اور فلومینا کی اطلاع کے مطابق انکے خلاف جادو ٹونے کرواتی رہتی تھیں۔ نواب بانی بڑی نمک حلال اور احسان ماننے والی خاتون تھیں۔ جو انکے ساتھ بدی کرتا اسے پانی پی پی کر کوستیں ”لعنت“، تکلیہ کلام۔ جو نیکی کرنا اس کی ہمیشہ ممنون احسان رہتی تھیں۔ گجر بانی کے ہاں کی تعلیم و تربیت نے انکی زندگی بنائی تھی۔ لڑکیوں کی پرغاش کے باوجود وہ پھینے میں ایک آدھ بار انکے ہاں مزاج پرسی کے لیے ہوا آتی تھیں۔ دوسری محسنہ راحت بانی جب تک زندہ رہیں ان سے ملنے اکثر اٹھیر جایا کیں۔

چائے ختم کر کے اٹھنے ہی والی تھیں کہ بلبل کی آواز نے پھر متوجہ کیا۔ وہ بڑی مستقل مزاجی سے گائے جا رہی تھی۔

”کو ابولے تو سمجھ میں بھی آئے کہ بھی کونی ہمان آنے والا ہے۔ یہ نگوڑی بلبل کیوں

چلائے جا رہی ہے۔ انہوں نے فلومینا سے کہا۔ ”اچھا ڈرائیور کو بلو غائب نہ ہو جائے۔ چاند پول بازار جانا ہے۔“ معاہدہ آیا۔ ڈرائیور تو اب غائب ہونے والا ہے۔ یہ گاڑی گھوڑا موٹر سب بہار چند روزہ ہے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ گرگابی میں پاؤں ڈال کر ڈریسنگ روم روم کی سمت جا رہی تھیں کہ فلومینا بھاگی بھاگی آئی۔ ”بانی۔ اوبانی۔ باہر وہ صاحب آیا ہے۔ وہی فوٹو والا رینال صاحب۔ ہر بانی نس کی موٹر کار پر آیا ہے۔ تم بولا تھا گوڈ ایک ڈور بند کرتا ہے تو ستر ڈور کھولتا ہے۔ ادھر ٹھا کر گیا ادھر وہ آیا۔“

”ایسا۔؟“ نواب سلیم مسکرائیں۔ دل ڈوب سا گیا۔ وہ خوش مزاج خوش شکل سیکرٹا سنا جوان پھر آمو جو ہوا تھا۔ ستر اسی برس پہلے کا زمانہ ہوتا اصرغری اور متوری کشمیرن وال اور یہ پوربین ایک معمولی فوٹو گرافر کے بجائے ہوتا ایک دولت مند تاجر فوجی ایڈونچر۔ پلانٹ یا کسی ہندوستانی فرمانروا کی فوج کا جنرل۔ اور وہ خود ایک ڈیرے دارنی۔ تو وہ بخوشی اسکی کمپاؤنڈ میں بنے ”بنی خانے“ میں اپنی عمر گزار دیتیں۔ مگر یہ ۱۸۱۲ء کے بجائے ۱۹۱۲ء تھا۔ وقت بدل چکا تھا۔

”گول کمرے میں بٹھلاؤ میں ابھی آتی ہوں۔ فوراً ڈریسنگ روم میں گئیں۔ گجر بانی کی بیٹیوں کو جلانے کے لئے نیا بنا رسی جوڑا پہننے والی تھیں۔ جو چند راونی کے سیاہ میں ملا تھا اب رینال صاحب کی خاطر انہوں نے ”ایڈوٹیٹ انگریزی فیشن“ مناسب جانا۔ بھاری بھار دار بلاؤز۔ لگے توندے کی ہیل ٹکی سُرخ و سیاہ جار جٹ کی ساری پاری وضع سے باندھی۔ جوڑا کھول کر بال شانوں پہ بکھرائے۔ بنگالوں کی طرح۔ سینٹ کی شیشی نکالنے کے لیے سنگھار میز کی ایک دراز کھولی تو اس کے کونے میں پڑے ہیرے کے پری ہم جیک ٹھے۔ نکال کر وہ بھی پہن لیے۔ نیا رہو کر باہر آئیں۔ دالان سے گزرتے ہوئے ہاتھ بڑھا پئے کباری میں کھلا ایک سُرخ گلاب توڑا۔ اسے کان کے پیچھے اڑس، اونچی ایڑھی کے نوکیلے لائٹی بوتوں پر کھٹ کھٹ کرنی گول کمرے میں پہنچیں۔

آندر سے جوزف رینال صوفے پر بٹکا جڑ پٹی رہا تھا۔ فوراً تخیلاً کھڑا ہو گیا۔ پچھلی با

یہ نیٹو ناچ گرل ایک نعل پیرس لگی تھی۔ آج اسپنیش چمپی ڈانس سرگرم کر کے مصافحہ کیا۔ اور نواب بیگم کے فروکش ہونے کے بعد خود بیٹھا۔

ہم نیٹو رئیسوں کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ درباروں میں کھڑے ہو کر گاتے ہیں۔ حضور سرکار کہہ کر ان کو مخاطب کرتے ہیں۔ آج تک کوئی نیٹو جنملین نواب بیگم کیلئے کرسی چھوڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ نہایت ممنونیت کے ساتھ بولیں: "سلام آندرے صاحب جے پور کیسے آنا ہوا؟"

"ہنر بانی نس کے فوٹو گران —" آندرے نے گویا نرت کر کے بنایا۔ ٹھس خردماغ انگریزوں کے برخلاف یہ یورپین لوگ کتنے چو پچال اور بے تکلف ہیں۔ اور اچھے خاصے کھٹک۔ کیا بھاؤ بتاتے ہیں۔

"مبارک ہو۔"

"مخ سی۔"

"ہم نے آپ کو دلی میں دیکھا تھا۔ ریڈ فورٹ کی گارڈن پارٹی میں — آپ ایک بروجی پر چڑھا ہوا تھا —" نواب بیگم ہنسیں۔

"اوہ —" آندرے بھی ہنسا — مہمان اور میزبان چند منٹ تک ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اردو میں گفتگو کرتے رہے۔ فلو مینا چائے کا بندوبست کرتی ہوئی آئی تو اسے مزید ترجمانی کے لئے روک لیا۔ فلو مینا ڈمی کو سٹاکی گوانی بمبیا انگریزی گوئیگر انگلش تو نہ تھی البتہ بقدر ضرورت کافی۔

خدمت گارنفرنی ٹی ٹیٹ میں بڑھیا دارجلنگ ٹی لے کر داخل ہوا۔

آندرے محویت اور دلچسپی کے ساتھ اپنی میزبان کو رتی ڈازاں کی طرز معاشرت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ حسین خاتون ماہر فن بھی تھی۔ دولت مند اور باذوق بھی۔ آندرے رینال اپنی پورٹریٹ فوٹو گرافی کی بزنس کلکتے میں اب تک نہ جھاپایا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ نواب بیگم جیسی خود مختار متمول اور جذباتی عورت سے اس کی دوستی کا آمد ثابت ہوگی۔ پچھلی مرتبہ ٹھاکر مہینو سنگھ کے ہاں فوٹو سیشن کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ نواب بیگم اُس سے

دوبارہ ملاقات ناپسند نہ کرے گی۔ اتنے دنوں بعد آج پھر یہ مطربہ — مسرور و مضطرب نظر آئی اس کے ننھے منے گھنگر وڈل دانے ہیرے کے کڑے پھن پھن کرتے تو بہت اچھا لگتا۔
 آندرے ریاست کے مہمان خانے میں مقیم تھا۔ رائل فیملی کے پورٹریٹ بنانے کا کمیشن ختم ہوتے ہی نواب بیگم کی دعوت پر انکے ہاں منتقل ہو گیا۔

نواب بیگم کے نیم ڈینی نیم برطانوی کولونیل طرز رہائش نے برسوں کے سٹی بورڈ اور آندرے ریٹال کو بہت متاثر کیا۔ صبح بیڈی۔ نو بجے چھوٹا حاضری۔ (نواب بیگم اکثر سوچتی تھیں کہ جب عباس کی حاضری فرنگیوں کا بریکفا سٹ کس طرح بن گئی، کئی کورس کالج۔ شام کو ہائی ٹی۔
 (HIGH TEA)۔ رات کو بڑھیا ڈنر۔ نواب بیگم اتنی عالی دماغ تھیں کہ ایک بوہرے ملک التجار کریم علی جاپان والا کے ذریعے اپنے ڈنر سیٹ پر انگوڑے کے حلقے میں ”نواب بیگم اف جے پور“ کا طغریٰ تک چھپوا منگوایا تھا۔

ایک روز فٹن بھیج کر نواب بیگم نے سبٹھ گردھاری لال رنچھوڑ مل کنوڑیا اور انکے پارٹنر پر شوٹم داس جھا ویرمی کو پھر بلوایا۔ جھا ویرمی کے ہاتھ وہ ہیرے کے پری چیم فروخت کرنا چاہتی تھیں تاکہ آندرے کلکتے جاتے ہی فوٹو گرافی کی بزنس جاسکے۔ ٹھا کر مہیشور سنگھ کی تباہی کے متعلق جے پور میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ جھا ویرمی صورت حال فوراً بھانپ گیا۔ بانی جی کی ملازمت ختم ہو گئی۔ عمر ڈھل رہی ہے۔ خود اس صاحب پر عاشق ہو گئی ہیں۔ آمدنی بہت کم ہے۔ اپنے گھنے بیچ بیچ کر اس چالو گورے کو کھلا رہی ہیں۔ جھا ویرمی کاشن اسکینج کی طرح اس بازار کا اتار چڑھاؤ پہچانتا تھا۔ نواب بانی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس نے پری چیم کے دام بہت کم لگائے پیچھے کھڑی فلو مینا نے آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ نواب بیگم نے جگمگائی جوڑی اپنے پرس میں رکھ لی۔

جھا ویرمی کو معلوم تھا کہ فوٹو گرافر ریٹال یہیں مقیم ہے۔ وہ اپنے ساتھ چند کیمیا لایا تھا۔ بولا صاحب لوگ کو مغل راجپوت نوادر کی بہت تلاش رہتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ آندرے نے وہ پسند نہیں کئے۔ بے حد ہنگے تھے۔

تب جھادگیری نے آتشدان پر رکھے رنگین پورٹریٹ کی طرف اشارہ کیا: "بانی جی آپ اس فوٹو کا کیسویں نہیں بنوائیں؟ ہمارا آرٹسٹ اس کو سوہو ہوا تھی دانت پر بنا دے گا۔ واہی قیمت پر، پھر اس نے آندرے کو مخاطب کیا: "صاحب — بانی جی کو تم وہ برتھ ڈے پریزنٹ دینا مانگتا — کیا؟"

نواب بیگم مسکرائیں۔ اب تک وہ خود ہی صاحب کو پریزنٹ پر پریزنٹ دیے جا رہی تھیں۔ انہوں نے خود ایک فرنیچر فرنیچر کے علاوہ انکو کچھ نہ دیا تھا۔ مگر یہ معاملہ لین دین کا نہیں عشق کا تھا۔

ہفتہ بھر میں پرشوتم داس جھادگیری کی مینا کاری ورکشاپ میں ملازم مغل نژاد مصور مرزا فاروق احمد جے پوری نے اپنے موروثی فن کا نمونہ بنا کر پیش کر دیا۔ ہاتھی دانت پر بنے نواب بیگم کے مینا تورا کو آندرے نے اپنے کارپٹ بیگ میں رکھا۔ نواب بیگم نے چپکے سے الماس کے پری جیم اس کے سوٹ کیس میں ڈال دیئے۔

چلتے وقت وہ کہتا گیا اپنا اسٹوڈیو سیٹ اپ کر لوں پھر تم بھی چند رنگر آجانا۔

چند رنگر سے بہت دن بعد ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس کا خط آیا۔ نواب بیگم نے فوراً فلو مینا سے جواب لکھوایا۔ وہ ایک مصروف لائبریری سائنس دان تھا اور مہینوں بعد اس کا مختصر پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ نواب بانی اب بے حد فکرمند تھیں۔ مگر چلتے وقت اس نے جو جملہ کہا تھا میں اپنا اسٹوڈیو سیٹ اپ کر لوں پھر تم بھی شاندار ناگور آجانا۔ یہ ایک نہایت امید افزا جملہ تھا — بھلا کوئی کیوں کسی کو اپنے ہاں بلاتا ہے۔ کیوں فلو مینا —؟

"بروٹر۔ بٹ جب تم رینال میم صاحب بن جائے گا میرے کو بھی بلجیم لے جانا ایچ مانگتا نہیں تو بابا کی دیکھ بھال کون کرے گا —؟"

نواب بیگم کو چچی کا نام عندلیب بانو بیگم رکھنا ایچ بڑا کیونکر بڑوس بلبل متواتر ان کے

باغیچے میں آیا کی اور مسلسل گاتی رہی۔ بلبل تھی یا شامایا کلمدم۔ نواب بیگم کو اڑتے پرندوں کی پہچان نہ تھی۔ مگر شہرہتی آنکھوں اور بھورے بالوں والی بچی بہر حال عند تیب تھی شہر کے ایک پارسی فولو ڈاکٹر افر سے بچی کی تصویر کھینچو کر آندے کو بھیجی۔

خلاف معمول بو اپسی ڈاک جواب آیا۔ فلو مینا نے ترجمہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں تم کو اب کلکتہ آجانا چاہیے مگر جب تک میں شیل نہ ہو جاؤں۔ ایسا ممکن نہیں۔ میں اب تک اپنا اسٹوڈیو نہیں کھول سکا۔ کلکتہ مہنگا شہر ہے دوکان کے لئے بہت سرمایہ درکار ہے۔ البتہ چند رنگ میں ایک بوڑھا فرانسیسی جس کے اسٹوڈیو میں ملازم ہوں اپنا اسٹاک، اسٹوڈیو گڈول ہر چیز فروخت کر کے فرانس واپس جانا چاہتا ہے۔ اس سارے اثاثے کی قیمت آنے محض چالیس ہزار لگائی ہے جو واجب بلکہ سستی ہے۔ لیکن اتنی بڑی رقم میرے بس کی بات نہیں تم جس عیش و آرام کی عادی ہو اور ننھی نائیٹ اینگیل جن آسانٹوں کی منتھی ہے وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں اپنے کاروبار کو دو مالک ہوں۔ کیونکہ میں ہرگز نہ چاہوں گا کہ تمہاری دولت اور آمدنی پر تکیہ کروں۔ کوئی ایشیا ملک یا یورپین غیرت مند مرد ایسی صورت حال قبول نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں میرے ماں باپ جو ملک بلجیم کے شہر برسلس میں رہتے ہیں قدامت پسند رومن کیتھولک ہیں وہ یہ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ میں نے ہندوستان آکر ایک کٹھن محمدان ڈانسنگ گرل سے شادی کر لی بہار سے چند نوجوانوں نے بلجیم کو نگو میں افریقی لڑکیوں سے بیاہ کئے ہیں مگر وہ ہماری اپنی کولونی ہے۔ اور وہ لڑکیاں عیسائی۔ تم بھی پسند نہ کرو گی کہ اپنا مذہب تبدیل کرو۔ لہذا ان حالات میں بہتر یہی ہو گا کہ ہم کوئی فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ گو میں یقیناً یہ چاہوں گا کہ میری لڑکی ماڈر کلیسا کے پستے سے محروم نہ رہے اور ایک کورتی زالا کے ہاں پرورش نہ پائے۔

آخری جیلے پہ نواب بیگم تلملا کر رہ گئیں۔ سوچتے سوچتے حیران ہو گئیں۔ بڑی کبٹن بنی تھی۔ اگر وہ شادی کے لئے تیار ہو بھی گیا تو مرنی مر جاؤں گی نہ خود کمرشان بنوں نہ لڑکی کو بننے دوں۔ مٹا ایک ترکیب سمجھائی دی۔

پیسہ — پیسہ — ہر مصیبت کا حل پیسہ۔ چالیس ہزار۔ آندیسے رینال کو چالیس ہزار چاہیے۔ بہرے کے پری چیم اس کے حوالے کیے۔ چلو۔ بلا سے۔ اس چھو کرمی کا باپ ہے۔ شادی کر لے۔ چھو کرمی کی زندگی سنور جائے گی۔ صاحب کی بیٹی کہلائے گی۔ چالیس ہزار وہ اسٹوڈیو خریدے۔ احسان مند ہو کر کلکتہ بلا لے۔ سنا ہے اب عدالت میں جا کر بیاہ کرنے لگے ہیں تم اپنے مذہب پر قائم ہم اپنے۔ کیلجٹ بڑا سکون محسوس ہو اموٹانے راہ سمجھا دی۔ عندلیب کی فکر میں مزید بچت شروع کی۔ ڈیمیلر اور فنٹ گھوڑا بکوا کر پچھلے قرضے سود ادا کئے۔ سوائے باورچی اور فلو مینا کے سارے ملازمین علیحدہ کیے۔ گردھاری لال کو بلوانے کے لئے نہ ڈیمیلر باقی تھی نہ فنٹ۔ تانگے پر آئے اور کر ایہ نواب بانی سے دلویا۔ گلابی رنگ کی جوہلی مردانہ اور زنانہ حصوں میں اس طرح منقسم تھی کہ دونوں کو ایک سنگی جالی دار راہداری نے ایک دوسرے سے ملتی کر رکھا تھا۔ بیرونی حصہ دو سال قبل مہیشو سنگھ کو دینے کے لیے مسبلخ پچاس ہزار روپیہ میں رہن رکھ چکی تھیں۔ اس کا سود در سود ٹھا کر صاحب ادا کر رہے تھے۔ شرائط کے مطابق دو سال بعد اصل رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں مہاجن اس حصے کی قرضی کردانے کا مختار تھا۔

تانگے پر سے وہ وکیل صاحب بھی اترے جنہوں نے کاٹھیا واڑی بیوقوف دربار صاحب کی موجودگی میں انکے حکم سے اسی دیوان خانے کی اسی دینیشن کوچ پر بیٹھ کر اس جوہلی کو نواب بانی کے نام منتقل کیا تھا۔ دو سال قبل انہوں نے جوہلی کے نصف حصہ کا رہن نامہ تیار کیا تھا۔ آج زنان خانہ، شاگرد پیشیہ اصطل اور نشتر خانہ رہن رکھ کر مسبلخ چالیس ہزار روپیہ گردھاری لال سے نواب بیگم کو دلویا۔ اب سود در سود کی رقم لڑزہ خیر تھی مگر نواب بانی کا دل کہہ رہا تھا کہ آندر سے کا کارو بار جلد چمک جائے گا۔ اس نے بتلایا تھا کہ بوٹھا فرانسسی ژاک کو رہیں کلکتہ۔ چند رنگر کا نامی فوٹو گرافر ہے۔ شملہ دہلی لاہور رنگ بلایا جاتا ہے وائسرائے کمانڈر انچیف گورنر بنگال، انکی لیڈیاں اور والیان ریاست سبھی اس سے اپنے پورٹریٹ بنواتے ہیں ایک دوکان خریدنے کے بعد یہ رقم ادا کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ چند روز بعد چالیس ہزار کا بینک ڈرافٹ آندر سے کورا نہ کیا۔ اصل خیر سے تو چند رنگر پہنچنے کی

منت مانی۔ ساتھ ہی عندلیب کے عقیقہ کی تقریب منعقد کی۔ چاند پول بازار کی سہیلیوں نے گلگٹے تلے عرصے بعد راگ رنگ کی محفل جمی۔ رت جگہ منایا گیا۔ صبح منہ اندھیرے گھی کے چالیس چراغ تھالی میں رکھ کر نواب بیگم بھولیوں کے ساتھ کافی بجانی مسجد کا طاق بھرنے گئیں۔ گردھاری لال اور وکیل صاحب کو بلا کر انہوں نے بقیہ جو بلی اتوار کے روز رہن رکھی تھی جب فلو مینا کئی گھنٹے کے لئے چرچ جاتی تھی۔ انکو ڈرتھا کہ ٹوڑی پھر کوئی بدشگونی نہ کرے مثلاً یہ کہ بانی تمہارا منک پھر بلا ہے۔ تمہارا بھی خلاص — اکھا بلدنگ گروی۔

اتوار کے روز گردھاری لال قانونی کاغذات پر دستخط کروا کے اپنے گھر گیا۔ چند گھنٹے کے اندر اندر مہیضہ سے فضا کی۔ بڑھا نسبتاً شریف آدمی تھا۔ گوبے انتہا پیٹو۔ سنگا کہ چوکے ہی میں اس کا دم نکلا۔ لڑکا خور دسال تھا۔ چھوٹا بھائی بیسکانیر سے آکر گدی پر بیٹھا۔ وہ معاملے کا سخت مشہور تھا۔ اب تو اللہ ہی خیر کرے۔ نواب بیگم کے دل کو سیکھے لگ گئے۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمروں کمروں گھومتیں اور سامان آرائش کو چھوچھو کر دیکھتیں۔ جیسے بہت جلد اس سے بھی ہاتھ دھونے والی ہوں۔ دربار صاحب انجہانی سبھی سجائی جو بلی بخش گئے تھے۔ عنابی نعل کے سنہری ڈوریوں والے پردے۔ بڑھیا قالین اور دریاں۔ دیشین طرز کا فرنیچر۔ عندلیب گھنگر و لگے رنگین گجراتی پنگوڑے میں بڑی غاؤں غاؤں کیا کرتی۔ نواب بانی سے زیادہ فلو مینا اس پر جان چھڑکتی تھی گھر میں اب دو ملازم رہ گئے تھے۔ باہر خاناماں جی اندر فلو مینا۔ دیکھتے دیکھتے نواب بانی کی ”ریاست“ پر زوال آ گیا تھا۔

چند روز سے بنک ڈرافٹ کی رسید آچکی تھی۔ شکرے کا خط ندارد۔ ایک روز ٹھا کر مہیشور سنگھ کا گھنگر و بجا تا سانڈنی سوار آخری تنکالے کروا دہوا جس نے اوٹنی کی کمر توڑی — ٹھا کر صاحب کا گڑھی میں دیہانت ہو گیا۔ چند راوتی کی شادی کے بعد ڈیڑھ سال کے اندر تیسرا ہارٹ اٹیک۔ بال بال تو ان کا قرضے میں بندھ چکا تھا۔

سورگباشی آخری بار جب آئے تھے کہہ رہے تھے کہ اس شور اتزمی پر پائرا کے واسطے مالوہ جانے والے ہیں وہاں ایک گھنے بن کے بچوں بیچ بھیروجی کا مندر تھا۔ وہ شیوہی اور درگا بھوانی کے پرستار تھے۔ دکھیا کہا کرتے تھے۔ شوہما کال ہے۔ تمہارے بیغمبر صاحب کی بھی ایک حدیث ہے کہ خدا صاحب زمانہ ہے۔ اس لئے زمانے کو بُرا نہ کہو۔ ٹھاکر صاحب جیسے شائستہ گیان دھیان والے اور وضعدار آدمی اب کہاں — انکی موت کی خبر سے نواب بیگم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی غش آگیا۔ سانڈنی سوار بیغمبر نے اسے صدمے پر محمول کیا۔ فلو مینا نے دال بائی اور باجری کی کھینچ سے اس کی توضع کی۔ دوڑی دوڑی واپس آئی۔ مالکن پر لونڈر چھڑکا۔ پانی پلایا۔ جب حواس ذرا بجا ہوئے تو کہنے لگی ”میم صاحب ہم تم کو پہلے ہی بولا تھا۔ اولدین دو سال کے اندر ڈبہ گول کیا تو تم کیا کرے گا۔ ارے اب ہم لوگ رستے پہ کھڑا ہوگا۔ وہ نواسیٹھ بڑا ظلمی مشہور ہے۔ ہم لوگ کو نکال باہر کرے گا۔ بنگ ڈرافٹ فلو مینا ہی نے رجسٹری کیا تھا — محض اینڈی بابا کی خاطر — مگر اس چار سو بیس موالی نے ڈکار تک نہ لی۔ باٹلی کا وقت تھا بھولے میں پڑی عندلیب زور سے روئی۔ فلو مینا دودھ گرم کرنے باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

نواب بیگم ہڑ ہڑا کر مسند سے اٹھیں۔ وضو کیا۔ نفل پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔ سجدے میں گر کر زار و قطار روئیں۔ اب انکی لاج خدا کے ہاتھ میں تھی۔

فلو مینا نے سچی کو دودھ پلایا بنا سنوار کر پریبولیٹر میں بٹھالا۔ باہر خانسا ماں جی کو دے آئی۔ خود بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی۔ سیاہ جالی کا اسکارف سر پر ڈالا۔ سینٹے فرانسس ات اسی کی مورتی کے سامنے شمع روشن کی۔ کوکئی میں جلدی جلدی بُدبائی ہوئی ناز ہم سب مورکھ جانور ایک دوسرے کا سگدا لایا ہے۔ ہوئی فادر ہمارے لئے دُعا کرنا لگتا۔ چھوٹا اینڈی بابا کے لئے دُعا کرو۔ اس کی بے وقوف ماں کے لئے دُعا کرو۔ ہوئی فادر — آدھی رات کو نواب بیگم سچن میں گئیں۔ گھپ اندھیرے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر بال بھرائے۔ فریادی ماتم کیا — اسے کل کے مددگار مدد کے لئے آؤ۔ فریاد کو پہنچو۔

استاد جی اور سارنگی نواز ماموں بھانجے تھپٹی لے کر اپنے وطن اندور گئے ہوئے تھے۔ انہی طباطبائی کو پہلے برطرف کر چکی تھیں کہ ہر وقت بینک میں رہنے لگا تھا۔ شاگرد پیشے میں اب محض خانہ سالماں جی تھے۔ جوہلی کی بجلی منزل میں دو خوش فزودہ عورتیں۔ بالائی منزل کے کمرے بند پڑے تھے۔ دوپہر کے سناٹے میں اور رات کے وقت لق ووق عمارت بھائیوں بھائیوں کرتی۔

کنڈھی کھڑکی اور نواب بیگم دلیس کہ قرق امین آگیا۔ کبھی سوچتیں شہر میں ڈونڈھی پٹے گی۔ نواب بانی کی جوہلی کا نیلام۔ دیواروں پر اشتہار لگیں گے۔ اخباروں میں سُرخیاں۔ ایک کسی کی ناعاقبت اندیشی کا عبرتناک نتیجہ۔ افسانے بھپیں گے۔ ایک طوائف کا حسرتناک انجام۔ اور کیا جگ ہنسائی ہوگی۔ اللہ اللہ۔ وہ خدمت گار۔ شو فر۔ ذاتی کریٹ کے برتن۔ ڈیمسٹر فٹن۔ سارا کر و فرغایب۔

عندلیب سبز قدم ہے۔ توبہ توبہ۔ عندلیب کا ہے کونخوس ہونے لگی گجر بانی کی بد ذات لڑکیاں! مجھے سہنت نظری کی نظر لگ گئی۔ دشمنوں نے گلو اپسر کے ذریعے مجھ پر عمل کروادیا۔ قلو مینا یہاں سے بھاگ چلو۔

کہاں۔

کلمتہ اور کہاں۔

اخباروں میں سُرخیاں۔ نواب بیگم کی پراسرار گمشدگی۔ سیٹھ گردھاری لال کنوڑیا کو دھوکہ دے کر فرار۔

ایک رات خواب میں کیا دیکھتی ہیں۔ دروازے پر نیلام کا اشتہار لگ گیا ہے۔ ڈنکا بج رہا ہے۔ لوگ جمع ہیں۔ وہ خود لال پٹاری سر پہ اٹھائے سڑک کے کنارے کھڑی ہیں۔ برفہ اوڑھے تیسچ ہزار دانہ بھلائی جن بی ساتھ موجود ہیں۔ صبح چارجے کا خواب تھا۔ ہیبت زدہ ہو کر اٹھیں۔ قلو مینا کو جگایا جو عندلیب کے پالنے کے قریب غالیچے پر سو رہی تھی۔ اسے خواب سنایا اس نے فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ دن بھر بریشان رہیں۔ دوسری رات پھر خواب میں دیکھا کہ شکستہ برفہ اوڑھے تیسچیں بیچ رہی ہیں۔ اندھی جن بی لاٹھی ٹیکتی ساتھ ساتھ رینگ رہی ہیں

تیسری رات خواب میں اجیرہ کی درگاہ شریف نظر آئی۔ پیکھا وچ پر دھما۔ کوئی استاد الاپ رہے تھے۔ جن کا چہرہ انڈے کی طرح صاف سپاٹ تھا۔ نہ آنکھ نہ ناک نہ منہ۔ اور اس انڈے میں سے آواز نکل رہی تھی۔ دیکھو کھیلےں دھمال خواجہ معین الدین؟ — دیکھو کھیلےں دھمال خواجہ معین الدین؟ — اب ایسی رُت آئی — ایسی رُت آئی۔ دہشت سے دل دھڑکنے لگا آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر پانی پیا۔

اب روز صبح بیڈنی پیش کرتے ہوئے فلو مینا پریشانی سے پوچھتی — ”میم صاحب آج کوئی سپنا گرا۔؟“

دو سال کی مدت چند روز بعد پوری ہونے والی تھی۔ نواب بیگم نے نیک سرشت خانساںماں جی کو محرم راز بنایا۔ انھوں نے کہا آپ کیوں اتنی پریشان ہیں۔ خدا کا دیا اتنا گھنا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ خدا نخواستہ سیٹھ اگر کچھ چیں پٹاخ کرے تین چار چیز الگ کر کے۔ ”اور چھو کر می کے لئے کیا باقی بچے گا۔ زیور بھی الگ کر دوں۔ واہ خانساںماں جی بڑی اچھی صلاح دی آپ نے —“ نواب بیگم اب بے انتہا چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ بات بے بات عندلیب کو مسارنی پیٹتی رہتیں۔ وہ ڈیڑھ سال کی جان بہم کر فلو مینا کے گھیر دار فراک کے پیچھے پھپ جاتی۔

ایک روز صبح آندڑے کو تار بھجوا یا۔ اور سینگ میں جُٹ گئیں۔ کچھ سامان چپکے سے خانساںماں جی کے ذریعے فروخت کر دیا۔ صند و چیمہ زیورات آہنی ٹرنک میں مقفل کر کے اس پر نادِ علی کا جھار کیا۔ خانساںماں جی نے لوگوں سے کہا بانی جی بمبئی جا رہی ہیں اکثر اس طرح دو زردیک جایا کرتیں تھیں اور بہت ساز و سامان کے ساتھ جاتی تھیں کسی کو شک نہ ہوا۔ کرائے کی دو بند گاڑیاں منگوائیں ایک میں خانساںماں جی مع اسباب دوسری میں نواب بیگم۔ فلو مینا۔ عندلیب۔ مقابل کی سیٹ پر عندلیب کا فولڈنگ پریمبولیٹ اور نواب بیگم کی لال پٹاری۔

آٹھ سال کے سن میں مرموم ماں باپ کے گھر سے نکل کر سبط احمد کے ہاں گئی تھیں

توانکی گڑبائیوں اور کپڑوں سے بھری یہ سُرخ پٹاری ساتھ تھی۔ وہاں سے یہ شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے گھر آئی۔ پھر اجیر شریف۔ درگاہ سے راحت بانی کے چوبارے۔ اجیر سے گجر بانی کے ہاں جے پور۔ بالآخر انکی ذاتی توہیلی میں منتقل ہوئی۔ پچھلے دس سال سے وہ بحفاظت انکے ڈرائیگ روم کی الماری کے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ اب ایک اور جادہ پیمانی پر نکلی۔ قدیم عبرانیوں نے آرکٹ—صندوق سکینہ—کی طرح—

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ خریدے۔ پولس کے سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا سمجھیں سمن نے کرائیکی تلاش میں آئے ہیں۔

وہ آگے نکل گئے۔ مگر یہ ہڑ بڑا کرفوراً ایک زنانہ انٹر کلاس میں گھس گئیں۔ ٹیلیوں کی مدد سے خانسا ماں نے مشکل اسباب چڑھایا۔ وہ بے چارے پلیٹ فارم پر کھڑے آنسو بہایا کیے ٹرین چل دی۔

دلی پر گاڑی بدلی۔ جنگ چھڑ چکی تھی۔ ساری ریلیں فوجیوں سے لدی ہوئی گز رہی تھیں اس بھڑ بھڑ کے میں فلومینا اور شیر خوا زچی اور بے تحاشا سامان کے ساتھ کلکتے والی ٹرین میں زنانہ ڈبہ ڈھونڈتی پھرتی۔ جب ایک مرغیوں کے ٹاپے جیسے کپڑے میں جگہ ملی اللہ کا شکر ادا کیا۔

دُھواں اُگلتی چھک چھک کرتی ٹرین روانہ ہوئی۔ اب تک آرام آسائش سے سفر کرنے کی عادی تھیں۔ بمشکل ایک کونے میں کھڑکی کے قریب ٹھنس کر بیٹھیں۔ شور مچاتی مارواڑوں کا دھاڑا شاید کبھی میلے جا رہا تھا۔ عندلیب کو گود میں سنبھالے فلومینا حفاظت کے خیال سے صندوق زبورات والے ٹرنک پر چڑھ بیٹھی۔ اور کوئی میں AVE MARIA کا ورد شروع کیا۔ آدھی رات گزر گئی تب جا کر نواب بیگم کے حواس ٹھکانے ہوئے۔ ایک الاپ گنگنا ناچا ہا۔ اتنے دنوں سے گانے بجانے کا ہوش کہاں تھا۔ اب ایک بار پھر دھک سے رہ گئیں۔ آواز غائب۔ چونکلی وہ بے سُرمی۔ اب تک انھوں نے فلومینا کے اس نظریے پر یقین کرنا نہ چاہا تھا کہ گجر بانی کی سیٹیوں نے پان میں سیندور کھلا دیا ہے یا جادو کر دیا ہے۔ نزلہ کھانسی کی وجہ سے

گلا پڑھی جاتا ہے۔ بہت کھانسیں کھنکھاریں مگر جو آواز نکلی وہ بھدی اور کخت۔
اب انہوں نے انتہائی لاچارگی کے ساتھ چپکے چپکے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔
پھر سوچا کلکتے میں ایک سے ایک قابل ڈاکٹر موجود ہے۔ آندرے علاج کروادے گا۔
روتے روتے آنکھ لگ گئی۔

گاڑی ہوڑہ اسٹیشن پہنچی۔ آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ بے شمار وادی پوش
گورے فوجی۔ آندرے ندارد۔

علی علیٰ کرتی پلیٹ فارم پر اتریں تین گھنٹے تک ٹرنک پر بیٹھ کر انتظار کیا۔ فلو میسن
عند لیب کو بہلانے میں جٹی رہی۔ آخر تھک ہار کر اٹھیں باہر جا کر گھوڑا گاڑی کی۔ کوچیان
سے کہا ”چندرنگر چلو۔“

وہ ہنس پڑا ”بہت دور ہے سگیم صاحب کل لاری سے چلی جائے گا۔ ہوٹل چلی چلیے“
کلکتے سے ناواقف تھیں۔ ایک دفعہ ہفتہ بھر کے لیے آئی تھیں۔ اور یہاں صرف
گوہر جان کو جانتی تھیں۔ ان سے بھی ایک دو بار ہی ملاقات ہوتی تھی۔

لیکن اب وہ مادام رینال کی حیثیت سے شریفانہ زندگی کا آغاز کرنے جا رہی
تھیں گوہر جان کے ہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہونا تھا۔ گاڑی بان نے برقعہ پوش
کے قیمتی اسباب ولایتی فراک میں ملبوس گوری چٹی پٹی اور کریمین آیا پر نظر ڈال کر دریافت
کیا ”کہاں۔ گرینڈ ہوٹل؟“ گرینڈ کے متعلق سن چکی تھیں بہت ہنسکا ولایتی ہوٹل ہے کسی
یسی ہوٹل پر لے چلو“ فرض کیجئے تین چار دن تک آندرے کا پتہ نہ چلا۔ ممکن ہے وہ
کلکتے سے باہر ہو۔ اتنے عرصے میں گرینڈ ورینڈ میں تو کھال اُدھڑ جائے گی۔

کوچیان نے انکو لوٹیر حیت پور روڈ کے ایک معمولی ہوٹل پر جانا را۔
دوسرے روز علی الصبح پتے پوچھتی پوچھتی ٹرام کے ذریعے پھر ہوڑہ پہنچیں۔ وہاں چندنگر
کے لئے ”موٹریس“ پکڑی۔

شہر کے بازار میں داخل ہوتے ہی ”زاک کو رہیں۔ فوٹو گرافر“ کا اسٹوڈیو۔ اندر گئیں۔

بوڑھا فرانسیسی میز کے پیچھے بیٹھا چند سیفتے پرانا ایک فرنیچ روزنامہ پڑھنے میں محو تھا۔
 آہٹ پر سر اٹھایا۔ فوراً تعظیماً کھڑا ہوا۔ نواب بیگم نے سوال کیا — ”آندر سے صاحب ہ کدھر
 ہے؟ آئی ایم وائیٹ۔“

”وائٹ —؟“ موسیو کو رہیں نے تعجب سے دہرایا۔

”آئی ایم انڈیا — وائیٹ — انڈیا — انڈین وائیٹ —“

”پلیز —؟“

”نو۔ نو۔ انڈین وائیٹ۔ مسٹر آندر سے۔“

”او۔ مادر دیو۔“ فرانسیسی نے سر تھام لیا۔ ”کم ہیر سیت داؤن مائی دیر —“

وہ ایک اسٹول پر ٹیک گئیں۔ پرس میں سے نکال کر پاسنگ شو جلا یا۔ بوڑھا تار گیا۔

یہ وہی ناچ گرل تھی جسکا آندر سے نے وہ شاندار پورٹریٹ بنایا تھا۔ بد معاش اس بے چاری

کو کیسا جھل دیا۔ افسوس۔ بنگالی اسٹنٹ کو آواز دی ”کھے۔“

”وی۔ موسیو، بنگالی نوجوان ڈاکر روم سے نمودار ہوا — چند منٹ بعد سیاہ فرانسیسی

کانی بنا کر لایا۔ موسیو کو رہیں اٹھا۔ ایک الماری سے برانڈی آؤٹ پنولین نکالی۔ فرنیچ دستور

کے مطابق سیاہ کانی میں تھوڑی سی کوئی ایک ملائی۔ پیالی نو وارد عورت کو پیش کی۔

نواب بیگم کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ لرزاں ہاتھوں سے پیالی اٹھائی۔ ایک گھونٹ بھرا۔

جھجھکتے ہوئے چند الفاظ میں سارا واقعہ بتایا۔ بنگالی اسٹنٹ فرنیچ میں موسیو کو بتانا گیا۔

بڈھے نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”وہ لڑکا — وہ شریر بد معاش لڑکا — یہاں سے

جا چکا ہے شیر سی۔ تم کو معلوم ہے یورپ میں لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اعلان جنگ ہوتے ہی وہ بلجیم

روانہ ہو گیا۔ وہ فوجی فوٹو گرافر کی حیثیت سے محاذ پر جانا چاہتا تھا۔ اس وقت فرانس کی کسی

خندق میں بیٹھا ہو گا۔ یا شاید اننگ مارا جا چکا ہو — مادر دیو — ”بڈھے نے صلیب کا

نشان بنایا۔ بنگالی اسٹنٹ نے ترجمانی کی۔

”میں نے — میں نے اسے چالیس ہزار کا بنک ڈرافٹ —“ نواب بیگم کی آواز ڈوب گئی۔ آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگے۔

”مون دیو —“ بڈھا انگنت بدنداں رہ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک زبردست رقم کلکتہ ریس کورس پر جیتی ہے — ژاک پوت — یونو — ژاک پوت —“

”جیک پوٹ —“ بنگالی نوجوان نے نواب بیگم کو سمجھایا۔
موسیو کو ریس کہتا رہا۔ وہ ریس کا عادی تھا۔ اسی مارے ہمیشہ پریشان حال رہتا تھا۔ وہ بڑا چالاک لڑکا تھا۔ تمہارے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کے لئے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پھر وہ رقم بھی ریس میں ہار گیا۔ یکشت۔ کیونکہ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے وہ ساری پونجی ”ڈائمنڈ کونین“ پر گنوا دی ہے۔ ڈائمنڈ پر خیال آتا ہے۔ اسے ایک جوڑی ڈائمنڈ BANGLES بھی شاید تم ہی نے دیے ہوں گے۔ انہیں بھی کھاپی کر برابر کیا — خدا سے معاف کرے میری بچی۔ اس نے ہمیں بہت بڑی دعا دی۔“

آٹھ سالہ نواب فاطمہ کو اس کے ولی مرزا سبط احمد بھیانک دھوکہ دے چکے تھے۔ مگر اب پچیس سال کی عمر میں اس نے خود فریب کھایا محض ایک محفوظ باعزت مستقبل کی موہوم امید پر۔ دوسرا سگریٹ — اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کے لئے زور زور سے کش لیسے ژاک کو ریس کے سفید سر کے عین اوپر ایک طاق میں گنوا ری مریم استادہ تھیں۔ تاج بنے۔ ہاتھ جوڑے۔ سر جھکاتے انسر دگی سے مینظر دیکھ رہی تھیں۔ دیواروں پر بھانت بھانت کی تصاویر دبیراں تھیں فرنیچ کو لونیل انسر نارنگی کے شکوے سنہالے سفید باریک ویل اور ٹھے انیس دہنیں کلکتے کے ہٹلوں میں کیبرے ناچنے والی ”ہاف کاسٹ“ یوریشین قاصبتیں۔ فرسٹ کمیونین کے لئے ”دولہا“ اور ”دلہن“ بنے ننھے فرانسسی پچے اور ”ہمارا لارڈ جن کے دلوں میں اترنے والا تھا۔

نواب بیگم نے ایش ٹرے میں سگریٹ بٹھایا تب انکی نظر ہاتھی دانت کے اس کیپر پڑ گئی ایک الماری میں مہارانی کوچ بہار اور ایک اینگلو برمن جینہ کی تصاویر کے درمیان
”نمایاں طور پر سجا ہوا تھا۔“

”کلمت اسے بھی چھوڑ گیا۔ لعنت۔“ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

بوڑھے زاہد نے ندامت سے سر جھکا لیا گویا آندھے کے کینے پن کا خود سے دار تھا
”بعض نوجوان بہت ہی نامعقول ثابت ہوتے ہیں۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا۔“

نواب فاطمہ پیدائشی پلک ممتنی تھیں اور محکمہ قضا و قدر نے افراط گریہ کیلئے انوار
اقسام کے مواقع انھیں ہمیشہ فراہم کیے۔ اب پرس میں سے ننھی عندلیب کی تصویر نکال
ہوئے آنسوؤں کی بھڑی۔ ”میری بچی اور آیا کلکتے کے ایک سٹریٹ سے ہوٹل میں
ایکلی پڑی ہیں۔ میرا سارا قیمتی اثاثہ بھی وہیں رکھا ہے۔ خدا کے بھروسے پر۔“

”اب تم کیا کرو گی؟ تم تو جیسا تم نے بنایا ہے پور میں اپنی کشتیاں جلا آئیں
”اب میں وہی کروں گی۔“ نواب بانی نے قبوہ ختم کر کے اٹھے ہوئے کلمت بڑ
منصوب آواز میں جواب دیا۔ ”جو بے پور میں کرنی تھی۔ اور عندلیب کے بڑے ہونے
انتظار کروں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میرا ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔
تمہارے ساتھ ہو۔“

بوڑھے فرانسس نے نواب بیگم کو دوکان کے برآمدے تک پہنچایا۔ اچانک اسے
یا د آیا۔ دوڑا ہوا اندر گیا۔ وہ کمیولا کر نواب بیگم کو پیش کیا۔ ”یہ تمہاری چیز ہے۔ لے جاؤ۔“



www.urduchannel.in



ماہ و سال عند لیب

عند لیب باؤنگیم بنت موسیو آندے جوزف رینال۔ باشندہ شہر برسلز صحیح پتہ نامعلوم۔ غالباً معرفت فریچ فورن بلمین۔ الجیریا۔ شمالی افریقہ

”بیٹا منصور۔ اگر تم کسی سے یہ سوال کرو اس کے والد کہاں ہیں اور وہ جواب دے سکتو! تو تم یقیناً سمجھو گے کہ وہ شخص مذاق کر رہا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں یہی جواب دیتی تھی۔ ساری برٹش ایمپائر میں لندن کے بعد سب سے زیادہ شاندار اور بارونٹی کرسمس سین کلکتہ کا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فلومینا اور ماما کے ساتھ پارک اسٹریٹ میں بڑے دن کی چہل پہل دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک دوکان کے سامنے موسیو تراک کو رخ میں مل گئے۔ ماما کو پہچان کر ہیٹ اتاری سلام کیا۔ ماما اس پہلے روز کے بعد نہ پھر کبھی ان سے ملی تھیں نہ فون کیا تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ موسیو نے پوچھا آندے کی کچھ خبر معلوم ہے؟ ماما نے نفی میں سر ہلایا۔ کہنے لگے۔ دس سال بعد اس نے پہلی بار کرسمس کارڈ بھیجا ہے۔ شاید فریچ فورن بلمین جو آئن کر لی ہے۔ کارڈ پر الجیریا کے ٹکٹ اور ٹمبکتو کی مہر پڑی تھی۔ مجھ سے پوچھا۔ جانتی ہو۔ ٹمبکتو کہاں ہے؟“

”اس وقت کوئی کیا رسال کی رہی ہوں گی۔ لوریو کا نوٹس میں اپنی کلاس کی ذہین ترین طالب علم بھی جاتی تھی۔ فوراً بتایا۔ مسکرا کر بولے۔ بس۔ میں۔ صبح کے وسط میں، پھر وائٹ ویز سے گڑیا اور چوکلیٹ خرید کر دی۔ اور اپنے راستے چلے گئے۔ ماما نے پولس کے چند سپاہیوں کو آنے دیکھ کر فوراً چہرے پر نقاب ڈال لی۔“

اسل ہم لوگ کلکتہ میں عجیب بے تکی اندوہناک زندگی گزار رہے تھے۔ مباحس روز سے کلکتہ پہنچی تھیں ان کو مستقل یہ دھڑکا تھا کہ ان کے نام وارنٹ گرفتاری آتا ہوگا۔ نوے ہزار اصل مح سودور سودکی دہشت نے ان کا خون خشک کر رکھا تھا۔ بال قبل از وقت سفید ہو چے۔ رنگ روپ کھلا گیا۔ آواز تو پہلے ہی غائب ہو چکی تھی پھر بھی ان جیسی نامی گرانی مطربہ کا کلکتہ میں گننام اور روپوش رہنا ناممکن تھا۔ چند نگر سے جب لوٹ کر آئیں اس کے دوسرے روز یہ المناک تافلہ گوہر جان کے گھر پہنچا۔

”آنٹ گوہر ایک لیجنڈری سٹی تھیں بکوڑ پتی اور بارسوخ۔ انھوں نے مہا کے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے۔ زیور بنک میں رکھوایا۔ اب سوال یہ تھا کہ مہا رہیں کہاں اور روزی روٹی کا وسیلہ کیا ہو۔ اعلیٰ درجے کی طوائفیں بہو بازار میں رہتی تھیں معمولی سونا کاچی، سیندوریہ پٹی اور ناخدا مسجد کے علاقے میں اور جانے کہاں کہاں۔ آنٹ گوہر نے مہا کو بتایا کہ یہ مسجد جہازیوں نے پہلے کبھی یہاں بنوائی تھی۔ ان کی وجہ سے اس علاقے میں طوائفیں بھی آباد ہو گئی تھیں۔ مہا جو ایک زانی کی طرح اپنی حویلی میں رہ چکی تھیں۔ ریڈ لائیٹ ایریا کے تصور سے لرزیں۔ نہ وہ کبھی اس طرح بازار میں بٹھی تھیں۔ لیکن پہلے کی طرح محض بطور کلاسیکل سنگر گنڈر بسر اب ناممکن تھی۔ آواز اگر باقی بھی ہوتی تو گانا بجانا شروع کرنے میں افشائے راز کا خطرہ تھا۔ خیر اب تو بانس ہی نہ رہا جو بانسری بچے انھوں نے روتے ہوئے آنٹ گوہر سے کہا۔ یہ سب باتیں جب میں بڑی ہونی تو فلو مینا مجھے بتایا کرتی تھی۔

”آنٹ گوہر نے ایک بڑھیا باعزت علاقے میں ریپن اسٹریٹ پر ایک یہودی تاجر کے مکان کی دوسری منزل ان کو کرائے پر دلوا دی۔ وہ اپنے عالی مرتبت ہندوستانی مرہیوں سے مہا کا تعارف کروا سکتی تھیں مگر اس صورت میں بھی بھید کھل جاتا۔ آنٹ گوہر کے پرستاروں میں دولت مند یورپین، ایرانی، ارمینی

ہودی بھی سناں ہے۔ ان میں سے چند ایک سے ملاقات کرادی بوقت ضرورت
 ڈرھے مریضوں کی نرس کمپنن بننے کے لیے تھوڑی سی نرسنگ اور انجکشن
 فانا بھی سیکھا۔ نہایت جزوری سے گذر بسر کرنے لگیں۔ جب کبھی بگھی کی جھللیاں
 لرا کے رات کے وقت کہیں جاتیں تو فلومینا مجھ سے کہتی۔ اینڈی بابا۔ تمہارا ماما
 اکلر کے پاس گیا ہے۔

”بختیبت ایک کالی میم فلومینا کو اس بات پر سجدناز تھا کہ میں نصف پونین
 فی۔ اس نے شروع سے میرا نام آندرے اور عند کیب کے وزن پر ولایتی نمسا
 AND رکھ لیا تھا۔

”وہ بتلاتی تھی کہ ماما جے پور میں بے انتہا فضول خرچ تھیں مگر میں نے جب
 سے ہوش نبھالا ان کو پائی پائی کا حساب جوڑتے دیکھا۔ دراصل روپے پیسے کے
 حالے میں بچپن سے لے کر اب تک تا بڑ توڑ اتنی زبردست چوٹیں کھانے کے بعد
 ن کو دولت کا نہو کا ہو گیا تھا۔ اب ان کا واحد مقصد حیات یہ تھا کہ مجھے ایک
 ہرقن رقاصہ بنا کر ان تمام نقصانات کی تلافی کریں جو اب تک ان کو سہنے پڑے۔

”ساڑھے چار سال کی عمر سے مجھے کتھک سکھایا گیا۔ فلومینا کے ساتھ رکشا پڑھی
 لرا ایک بنارسی گروچی کے گھر جاتی۔ اس وقت شہر کی سڑکوں پر سے گذرنا بہت
 چھا لگتا۔ رکشا والا گھنٹی بجاتا تیز تیز دوڑتا۔ برابر سے ٹن ٹن کرتی ٹرا میں گذرتیں اور
 وچی چھتوں والی موٹریں۔ رنگارنگ ٹریفک۔ بڈل کلاس بنگالی عورتیں سڑکوں پر
 .. کم نظر آتیں اس وقت بنگالی ہندو عورتیں بھی بہت کم باہر نکلتی تھیں
 ورنشین لڑکیاں البتہ بہت دکھلائی دیتیں۔ کلکتہ ہندوستان کی یوریشین کمیونٹی
 گویا ہیڈ کوارٹر تھا۔ گوہر جان بھی میری طرح یوریشین تھیں۔

”پانچ سال کی عمر میں آئنٹ گوہر کے اصرار پر ممانے یہودی مالک مکان کے ذریعے مجھے لورٹو کا ٹونٹ میں داخل کروایا۔ داخلے کے رجسٹر میں میرا نام اینڈی رینال اور باپ کا ”آندرے جوزف رینال حال مقیم برسلز“ لکھوایا گیا کوئی مشکوک بات نہ تھی بہت سے اینگلو انڈین بچے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے لورٹو ہاؤس بہت بھایا۔ ناچ سیکھنے میں دل نہ لگتا۔

”اب میں کتھک سکھلانے والے مہاراج کے ہاں بلبل تھی (عندلیب گروجی کو مشکل لگتا تھا) اسکول میں اینڈی۔ ذرا بڑی ہوئی تو یہ دو غلاین کھلنے لگا۔

”یہ شاید ۱۹۲۳ یا ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے۔ بچے پورے نہ کوئی سمن آیا نہ وارنٹ۔ عجیب بات تھی۔ ممانے اسے معزے پر محمول کیا تھا اب ان کی دہشت کچھ کم ہو گئی تھی۔ یکطرفہ کارروائی کے بعد مرلی دھر کنوڑیا کی اس حویلی پر قابض ہو چکا ہو گا۔ یہ سوچ کر انھوں نے صبر کر لیا تھا کہ کم از کم جگ ہنسائی سے بچیں۔ اب وہ بے پردہ باہر نکلنے لگی تھیں۔

”اپنے ایک میمن مرتی کے ساتھ بمبئی گئیں۔ میں بھی ساتھ تھی۔ فلوینا بھی ایک روز بم چو پائی سے گذر رہے تھے وکٹوریہ گاڑی میں۔ سمندر کے کنارے بڑا مجمع نظر آیا۔ گاڑی والے نے کہا: ”بی اماں جنت کو سدھاریں۔ تعزیتی جلسہ ہے۔“

”بی اماں کا انتقال ہو گیا؟ ممانے دہرایا اور فوراً آنسو بہانے لگیں۔ اپنی نئی کنبوسی کے باوجود وہ خلافت فٹ میں بھی چندہ دے چکی تھیں۔ وکٹوریہ رکوائی میں اوپر کوچ بکس پر جا بیٹھی۔ سب صاف نظر آ رہا تھا۔ کوچوان نے بتایا۔ ایسٹج پر وہ گاندھی جی بیٹھے ہیں۔ انھوں نے بی اماں کے جنازے کو کندھا بھی دیا تھا۔ بے پر نے۔ وہ سی۔ آر۔ واس ہیں۔ ادھر موتی محل نہرو ہیں۔ سر جینی نائیڈو تقریر کر رہی ہیں میں نے ان سب پر حقارت کمی نظر ڈالی۔ یہ سب لوگ، میں نے کوچوان سے کہا،

ہمارے دشمن ہیں۔ اسکول میں ہندوستانی لیڈروں کے متعلق انگریز اور ایٹنگلو اینڈین لڑکیاں یہی کہتی تھیں کہ جو ان نے چونک کر میرے سہرے بالوں کو ٹوٹس کیا اور خاموش ہو گیا۔

”اس کے دو تین برس بعد کا ایک قصہ سناؤں۔“
”اچھا اب باقی پھر۔“

”ایک ڈچ یہودی تاجر کو ماما کے ایک شناسا کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ کام چلاؤ نرسنگ سے بھی واقف ہیں۔ وہ بوڑھا آدمی سا تھا ایسٹ ایشیا کے دورے پر نکل رہا تھا اور دل کا مریض تھا۔ اس نے ماما سے معلوم کروایا۔ بطور نرس کمپنیاں ساتھ جانے کے لئے فوراً تیار ہو گئیں۔ چنانچہ ہم لوگ سیاحت پر نکلے۔ ماما فلومینا۔ میں اور وہ ڈچ مین۔“
”پہلے پھر اس گئے۔ وہاں سے کولمبو۔ رنگون۔ سنگاپور۔ اس دورے میں میں نے برٹش ایمپائر کے رومانس کا نظارہ کیا۔ لائڈز آف لندن اور طامس گگ کے دفتر۔ بی۔ اینڈ۔ او۔ کے جہاز۔ کولونیل کلب۔ بنگلے۔ پلانٹرز کی گارڈن پارٹیاں۔ ”یور وینٹرز اوئی“ کلبوں میں ماما اور فلومینا نہیں جاسکتی تھیں۔ میں بیشیت یوریشین مزے سے اس ڈچ مین کے ساتھ چلی جاتی۔ اور وہاں بیٹھ کر ٹوب آس کریم کھاتی۔ میں چاہتی تھی لوگ مجھے ایک نیٹو ناچ گرل کمی اولاد کے بجائے یورپین لڑکی سمجھیں۔ ماما اور میری ذہنی دنیاؤں میں کتنا فرق تھا اس کا اندازہ مجھے رنگون جاکر ہوا۔“

اچانک عندلیب بانو الا اپنے لگیں۔ ”میرے پیا گئے رنگون۔ وہاں سے کیا بے ٹیلی فون۔“ منصور نے ایک بار پھر اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ لیکن پھلے تین روز سے انہوں نے نواب بانی کی داستان مختصراً اس کو سنانا شروع کی تھی اور اب منبر بیگ اور ان کے غیر متوقع پرفلمی گیت اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آتے

لگے تھے۔ ماضی جادو کی طرح سر چڑھ کر لوٹا ہے۔

عندلیب بانو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ہنس پڑیں ”یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میرا اسکاٹش بوائے فرینڈ ۱۹۴۲ میں برما فرنٹ پر گیا رنگون سے اس کا ٹیلی فون کھی نہ آیا۔ خیر۔ تو میں کہاں تک پہنچی تھی؟“
”۱۹۴۶۔ آپ رنگون گئیں۔“
”ہاں۔ کولمبو سے رنگون۔“

”مما کہنے لگیں۔ میں جہاں پناہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گی۔ میں نے پوچھا کون جہاں پناہ؟ زور سے چلائیں؛ حضرت بہادر شاہ اور کون۔“

”ایک روز اس متولی سے چوہلی دو منزلہ مکان کئی زیارت کے لیے پہنچیں جہاں بادشاہ کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ بولیں ہائے ہائے دکھیا کو دس روپے روز خرچے کے لیے دیتے تھے حرام زادے۔ لعنت۔ میں سمجھ گئی انگریزوں کو گالیاں دے رہی ہیں۔ مجھے بہت برا لگا۔ میں نے منہ پھلایا۔ میں اسکول میں ہسٹری پڑھ رہی تھی اور
'SEPOY MUTINY'، بلیک ہول وغیرہ سب اذہر تھا۔

”مگر ماما کی ہسٹری دوسری تھی۔ وہ ان کے دل پر ان کے خون دل سے لکھی گئی تھی۔ اس وقت میں نہ ماما کو سمجھ سکی نہ ان کے آنسوؤں کی قیمت پہچان پائی۔ رونا تو ان کی عادت ہی تھی۔ اور لعنت تیکہ کلام۔“

”پھر ہم بادشاہ کے مزار پر گئے۔ وہاں ان کے پڑ پوتے شہزادہ سکندر نجات نہایت حسرتہ حال، مجاور بنے بیٹھے تھے۔ ایک آدمی نذر نیاز کی روٹیاں لایا۔ وہ نوش کرنے میں مشغول ہو گئے۔ ماما نے بچشم پر نرم ان کو صاحبِ عالم کہہ کر مخاطب کیا اور نذر پیش کی۔ مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔“

”تب ماما نے پلٹ کر ایک زوردار تھپڑ مجھے رسید کیا۔ میں بھونچکی رہ گئی۔ ماما

دو کوب تو ہمیشہ کرتی رہتی تھیں مگر اتنی طاقت اور جوش سے کبھی نہ مارتھا۔
 ”میں جھنکا کر ٹہلتی ہوئی جا کے ایک جنگلے سے ٹپک گئی۔ فلومینا منہ اٹھائے سیر کا
 درخت ملاحظہ کر رہی تھی۔ جو سبکی کے مزار کے سرہانے کھڑا تھا۔
 ”یہ جینت کا درخت ہے۔ مزار پر اگر تیاں سلگاتے ہوئے ایک برنی مسلمان
 نے فلومینا کو مخاطب کیا۔

”ایسا؟ اس نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ بڑی انگریز پرست عورت تھی مگر
 اس وقت وہ بھی متاثر نظر آرہی تھی۔

”ممانے مزار کے تعویذ پر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں لٹکا کر فاتحہ اور دعائیں پڑھیں۔
 فلومینا نے بھو، اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ممانے سیر کے چند پتے قبر پر سے
 چن کر تیر کا اپنے پرس میں رکھ لیے۔ اپنے بوریہ نشین ”صاحبِ عالم“ کے سامنے کوڑش
 بجلا کر رخصت ہوئیں۔ واپسی میں راستے بھر ظفر کی المناک غزلیں اپنی بے سُر می آواز
 میں گنگنایا کیں۔ وہ میری ولادت کے کچھ عرصے بعد ہی جے پور میں اپنی آواز کھو چکی تھیں۔
 شاید راحت بائی کی لڑکیوں نے پان میں سیندور کھلادیا تھا۔ یا کیا۔ کلکتہ پہنچ کر ایک
 روز شدید ڈپریشن کے عالم میں اپنے تونو گراف ریکارڈ چکنا چور کر دیے تھے۔ دوکانوں
 پر شاید ان کے ریکارڈ ملتے تھے لیکن فلومینا کو حکم دے رکھا تھا۔ خبردار جو میرا کوئی تو خرید
 کر اس گھر میں لائی۔ لہذا مجھے ان کی سابقہ شان و شوکت کے افسانوں کی طرح یہ بھی
 یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایک ماہر فن گائیکہ رہ چکی تھیں۔ دراصل ممانے کسی گریڈ
 کا سا کردار تھیں مگر مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا۔

”چنانچہ سرمہ درگلو نواب بیگم ظفر کے اشعار گنگناتی رہیں اور میں ان کے غیر متوقع
 تھپڑ کے غم و غصے سے تلملایا کی۔

”میرے اور ممانے کے درمیان زیر دست ٹیشن کا آغاز چند روز قبل کلکتہ ہی میں ہو چکا تھا۔
 میں چودھویں سال میں پڑ رہی تھی۔ اور ممانے کی وجہ سے کچی پنچوٹ ہو چکی تھی۔

” میں ایگززم کی فطری بناوت کے علاوہ یہ عقل بھی آگئی تھی کہ مجھے کس قسم کی ٹیننگ دے رہی ہیں۔ اس زمانے میں شریف زادیاں ناچ نہیں سکتی تھیں یہ محض ارباب نشاط اور کلکتہ میں بوریشین طوائفوں کا فن سمجھا جاتا تھا۔ آئٹ گورنر کے منع کرنے کے باوجود ممانے مجھے ایک خاموش فلم کے گروپ ڈانس میں بھرتی کروا دیا کیونکہ اس کے پیسے اچھے مل رہے تھے یہ اطلاع کہ ایک ویسی فلم میں ناچ رہی رہی ہوں کانٹونٹ کمی مدرسپیری کول گئی انھوں نے ممانے سے جواب طلب کیا۔ ممانے فوراً اسکول سے میرا نام کٹوا دیا۔ میں اپنے جوئیہ کیمبرج کے امتحان کی تیاری میں بے طرح مشغول تھی۔ ایک روز حسب معمول یونیفارم پہن، بستہ سنبھال اسکول جانے کے لیے زینے سے نیچے اتری رکشا والا نثارو۔ اس وقت ممانے دروازہ پر آئیں اور آواز دی بس بیوی آج سے تمہارا اسکول القسط۔ اب اپنی اوقات پر آؤ۔

” میرا خون خشک ہو گیا۔ ان کا منہ تلکنے لگی۔ سرد آواز میں بولیں۔ اپنے توڑے پختہ کرو اٹا اللہ پہلے حجرے کی سانی آگئی ہے۔

” میرے اوپر بجلی سی گری۔ والدہ کو دکھتی کی دکھتی رہ گئی۔ وہ کشادہ چوٹی زینے کی بیٹنگ پر دونوں ہاتھ رکھے مجھے گھور رہی تھیں ان کے پیچھے لینڈنگ پریسودی لینڈ لارڈ کا گرینڈ فادر کلاک کالے بھوت کی طرح دانت نکوسے کھڑا تھا۔ دروازے میں فلومینا کا پریشان چہرہ نظر آیا۔ نیچے جو دروازہ تھا وہ لوریٹو کی سمت جانے والے راستے پر کھنڈ ہوا تھا۔ اوپر نواب بانی نائیکہ مسلط تھی۔ اس کے عقب میں میری بہن روگر بے بس فلومینا۔ میں زینے کے وسط میں دو دنیاؤں کے درمیان معلق۔ بیتہ پھینک کر سیرھی پر بیٹھ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ممانے دھم دھم کرتی اتریں بانہہ کپڑا کھینچا۔ چل اوپر سیرھی طرح حرامزادی ورنہ ساری بس صاحبی نکال دوں گی۔ ایک تھپڑ۔ میں وہیں چل گئی۔ فلومینا۔ فلومینا۔ میں نے حج حج کر ماں می گرفت سے آزاد ہونا چاہا۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئیں کمرے میں مقفل کر دیا۔ فلومینا کی خوشامد پر رات گئے

نالہ لھولا۔ اس سے جد ہی ممانے سنگاپور وغیرہ کے دورے پر نکلنا طے کیا تاکہ میرا جی بہل جائے۔ ماما کے بجائے محبت کی پتی فلومینا کو زیادہ چاہتی تھی اب اپنی ماں سے باقاعدہ نفرت سی کرنے لگی۔

”میرے اور ماما کے درمیان یہ سرد جنگ ایک رات عروج پر پہنچ گئی۔ سنگاپور میں۔“

”جہاں آپ نے پینوں کے سرخ دروازوں والے گھر دیکھے تھے؟“

”ہاں۔ اے بیٹا تمہیں کیسے معلوم؟“

”اس شام آپ کھڑکی میں سے عینبر کو بتلا رہی تھیں جب میں اپنے آلات لینے واپس آ رہا تھا۔“

”راہٹ۔ تو سنگاپور میں مشہور انگریزی ہوٹل ریفلز میں ٹھہرے جس میں سمرسٹ نام نے اپنے ناول لکھے تھے۔ وہ ہوٹل انٹرنیشنل طوائفوں کا ڈاکا بھی تھا۔ مشرق و مغرب کی حسین ترین چھوکریاں وہاں منڈلاتی نظر آتی تھیں۔“

”اُسی دور کے شگھائی اور ہانگ کانگ کی طرح۔“

”ہاں۔ سنو تو۔ رات کو ماما ڈائینگ ہال سے لوٹیں۔ اب تک وہ کام چلاؤ انگریزی بولنے لگی تھیں۔ میرے اور فلومینا کے کمرے میں توبہ تلا کرتی داخل ہوئیں۔ توبہ توبہ بخت۔“

THIS HOTEL FULL OF LOOSE WOMAN

I DON'T LIKE LOOSE WOMAN

”میں نے پلٹ کر تلخی سے سوال کیا۔“

AND WHO DO YOU THINK YOU ARE ?

”ماما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نجائے کیوں مجھے مارنے پٹینے کے بجائے چُپ رہیں فلومینا نے ان کا کوٹ اٹھا کر وارڈروب میں ٹانگا۔ پلٹ کر ایک لمحے کے لیے ساکت رہی پھر پٹی کی طرح دبے پاؤں چلتی میرے قریب آئی اور میرے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید

کیا۔ میری قوت گویائی سلب ہوگئی۔ فلورینا نے مجھے بے انتہا لڑپیار سے یالا تھا۔ اور
پر جان چھڑکتی تھی۔

”اب اس نے کمرے میں گشت کرتے ہوئے آتش بار آواز میں کہنا شروع کیا۔
”کک بیہر۔ مس سپیریہ۔ تم اپنی ایجیل مدر کو کیا بولا؟ پھر سے بولو۔ تم اپنی ماما سے ماچھی
مانگو۔ سوری بولو۔ سوری بولو۔ تمہارا مدر تمہارے واسطے کیا کیا مصیبت اٹھایا۔ کیسا
ٹریبل دیکھا۔ تم اس کو LOOSE WOMAN بولتا؟ تم کو مالوم تم کو BEST اسکول میں
سیھیجے واسطے تم کو LUXURY میں رکھنے واسطے وہ جبرستی ایسا لائف LEAD کرتا۔

”میری پیدائش سے پہلے کون سی لائف لیڈ کر رہی تھیں؟ میں نے پھر کسوال کیا۔
”شرٹ اپ یونانی گرل۔ وہ جو کچھ کیا مجبوری کیا۔ ہم تم کو کتنے بار ان کا اسٹوری
بتایا۔ اینڈ یہ تمہاری FATE میں لکھیلا تھا کہ تم ان کے ہاں جنم لو۔ ہم بے عقل
جانور لوگ ہے۔ ہمارے کو مالوم اچ نہیں ہمارا HEAVENLY FATHER ہمارے
کیسا سوچتا۔ کیا کرتا۔ اچانک وہ آنسو بہانے لگی۔ بڑا بڑا بات نہیں کرنا مانگتا میرا بچہ۔
جب ہم بینڈرہ بویمے کے ORPHANGE سے شادی بنا کر اپنا فریڈو کے سنگ
جے پور گیا تھا الفریڈو ہمارا جہ کا ہیڈنگ تھا۔ ہم بھی بڑی شان مازتا تھا۔ اپنے کو پورچکیز
میم صاحب بولتا تھا۔ اپنے کو پورچکیز میم صاحب بولتا تھا۔ ہمارا گریٹ گریڈ فادر بھی
پورچکیز وائیٹ مین تھا۔ BUT? THEN? میرا الفریڈو جوان مر گیا۔ میرا دونوں بے بی مر گیا
میرے کو آیا گیری کرنا پڑا۔ پھر؟ THEN -?
”بڑا بول کبھی نہیں بولنا مانگتا۔ اینڈ می بابا۔ گوڈ کو بھی سوری بولو۔ ماما کو بھی
سوری بولو۔

”مجھے آج تک فلورینا ڈی کوٹسا کی یہ تقریر لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ مگر میں گوڈ سے
بغاوت شروع کر چکی تھی چاروں طرف اتنی بے انصافیاں اور مظالم دیکھنے کے بعد ایک

شفیق و کریم، منصف، عادل، جبیر و بصیر، قادر مطلق کا وجود سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج تک نہیں آیا۔

”بیسک صاحب۔ کھانا لگ گیا۔“ بہادر نے دروازے میں جھانک کر آواز دی۔
 ”اؤ۔“ عندلیب بانو کی شرتہتی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے تھے۔
 ”عجبہ کا انتظار تھوڑا اور کر لیں۔“

”اس نے فون کیا تھا شام تک آئے گی۔ سیریرین کیس ہے۔ چلو تم کو یہ قہقہہ سنا کر آج ختم کروں۔ اس وقت فلو مینا یاد آگئی۔ اپنی رفیقہ انقلاب ماں کے رُخِ عمل کے طور پر خاصی غیر جذباتی خاتون ہوں مگر اس وقت جی بھر آیا“

پنج کے دوران عندلیب بانو نے کہانی جاری رکھی: رنگون میں مزارِ ظفر پر جانے کا قصہ سنایا تھا نا؟ اس طرح کا ایک دردناک واقعہ کلکتہ میں پیش آیا۔
 ”ہم لوگوں کو — لویہ گوشتی کی مچھلی نوش کرو۔ بڑی خوش نصیبی کی علامت ہے۔“
 ”اسی کا تو شاہانِ اودھ نے اپنا ظفر بنایا تھا۔ آپ بھی تو لیجئے۔“
 ”تاکہ خوش نصیب ہو جاؤں۔؟ بابا بابا۔ ہاں تو ہم لوگوں کو سنکا پور وغیرہ سے لٹے چند روز ہوئے تھے کہ دلی سے مہر و خالہ مع شمو خالہ اور نواسی چھتو آ پہنچیں۔“
 ”ٹھیکہ چاہئے۔ میں ذرا ورک آؤٹ کر لوں۔ مہر و خالہ اس روز آپ نے بتایا تھا۔
 دلتوا عرف حجن بنی کی بہن۔ مگر شمو یا د نہیں رہیں اور چھتو۔“
 ”ان کی لڑکی اور نواسی اور بیٹا شدو۔“

”آپ نے یہ داستان مجھے بالکل شارٹ سینڈ میں سنائی ہے۔“
 ”اے تو بیٹا کیا میں بوتان خیال گوش گزار کر رہی ہوں اور قبنا مجھے نما اور فلو مینا نے بتایا وہی دہرا رہی ہوں۔ تفصیلات مجھے بھی نہیں معلوم۔ اپنی تو تم کو ہر قطر سنا رہی ہوں — ہاں تو یہ دلی والیاں آئی تھیں۔ عالی جاہ نواب بہادر مرشد آباد

کے ہاں ایک جلسے میں گانے۔ گانا تو محض چھینو کو تھا۔ ماں نانی اور ماموں ہمراہ آئے تھے۔ ماہر و خالہ اور شمو خالہ کو کبھی کبھار خط لکھتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ کلکتہ پہنچتے ہی دوسرے روز ملنے آئیں۔ مہر و خالہ ان بان والی تورہ بیٹی بیوی تھیں۔ بتاتی تھیں غدر کے وقت چھ برس کی بچی تھیں۔ اب پچھتر سال کی رہی ہوں گی مگر مضبوط کاٹھی کی کھری منغل زادی۔ کڑی کمان کے تیر جیسی چال۔ عمر سے دس سال کم لگتیں۔ اودی منغل کا تنگ پانجامہ۔ فلائین کی قمیص۔ کشمیری شال۔ ناک میں ہیرے کی بڑی سی لونگ۔ ممالی طرح بارعب شخصیت۔ شمو جانے کس چٹانات کی اولاد تھی۔ اس میں عایمان پن تھا چھو جان تیز طرار۔ بڑی شکل۔ دیکھو تیسری پڑھی تک پہنچ کر وہ —

مرا عثمان بیگ غائب ہو گئے۔

”عالی جاہ کے جلسے کے بعد ایک روز آئیں مہر و خالہ تو کہنے لگیں۔ جلسے میں حضرت جان عالم کے ایک پوتے سے معلوم ہوا کہ حضرت بہادر شاہ کے ایک بیٹے ڈیپیر ٹریوٹے شہزادہ بیدار تخت برما سے آگئے ہیں۔ دکھیا کوزنگون میں آٹھ روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ اپنے نانا کے ساتھ ٹیٹا برج کے ایک بوسیدہ کمرے میں مقیم ہیں۔ وہ حضرت جان عالم کے پوتے بتلا رہے تھے کہ صاحب عالم کے والدین کی جوانمردی کے بعد گورنمنٹ نے ان کا مکان ضبط کر لیا۔ ایک ڈبہ تھا اس میں بڑی بڑی کنبیاں تھیں۔ منغل دینیوں کی —

کنبیاں حضرت بہادر شاہ ساتھ لے گئے تھے۔ دینے یہیں رہ گئے۔ برما کے انگریز حکام نے وہ کنبیاں بھی چھین لیں۔ حضرت بادشاہ سلامت کا کلام، کتابیں ہر چیز برباد کی۔ دس ماہ کے نواسے کو لے کر ان کے نانا یہاں آگئے تھے۔ کلکتے میں گورنمنٹ نے ان کی پنشن سولہ روپے مہینہ مقرر کی۔ سبے غضب۔ مہر و خالہ نے کہا۔ ارے چنگیز کی اولاد کہلاتے ہم تھے۔ چنگیز ہلا کو کی ذریت تو یہ ہیں حرام الدہر فرنگی —

”مما بولیں۔ جناب عباس کا علم ٹوٹے۔ ان پیارے بیٹوں پر۔ اے مہر و خالہ

میں توجیب بھی لاٹ صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گذرتی ہوں یہی دعا مانگتی ہوں۔
” میں ان دونوں کے اس مکالمے پر زیر لب مسکرائی۔“

”خیر تو دوسرے روز ہم لوگ دو گاڑیوں پر لہ کر شیابرج پہنچے۔ مہر و خالہ حبیبی خیس
خاتون خورد سال شہزادہ بیدار بخت کو چند اشرفیاں نذر کرنے لے گئی تھیں میں اور چھتو،
مما، شمو خالہ اور مہر و خالہ کے مقابلہ کی سیٹ پر بیٹھے۔ کوچ کبس پر مہر و خالہ کا مہر بیٹیا
شدت و خالہ جو اب چاؤڑی کا چودہری تھا۔ دھاڑیوں کا سردار چودہری فتنے کا جانشین۔

چنانچہ بیدخل مغلوں کا یہ قافلہ اپنے بیدخل بادشاہ کی بیدخل اولاد کی خدمت
میں حاضری دینے جا رہا تھا۔ مہر و خالہ غدر کے قصبے ساقی رہیں۔ سرائے طغرل بیگ
میں ان کے خاندان کا قتل۔ جننا کی ریتی اور کوتوالی کے چبوترے پر ہزاروں لٹانوں کو
پھانسی یا گولیوں کی باڑھ یا توپ کے منہ سے باندھ کر اڑایا جاتا۔ بادشاہ ملکہ اور شہزادہ
جواں بخت کی رنگون جلا وطنی۔

” پھر مہر و خالہ بولیں۔ عالی جاہ کے ہاں کل وہ اودھ کے شہزادے بتلا رہے تھے
کہ جب حضرت سلطان عالم نے موتیوں سے بھرا ہوا اتھال نذر کرنا چاہا۔ ان بد معاش
انگریزوں نے وہ بھی قبول نہ کرنے دیا۔

” یہ دکھیا پچھ شہزادہ بیدار بخت شہزادہ جواں بخت کا پوتا ہے۔ ہائے کس مصیبت
میں پڑا ہے بے چارہ۔ لعنت۔ لعنت۔ ممانے دہرایا۔

” میں ان دونوں کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ یہ لوگ سب مغل ایمپائر کے مجاور تھے،
ادھر شیابرج والے کنگڈم ان اودھ کے روتے اور مرثیہ خواں۔ ٹالی گنج میں ٹیپو سلطان
کی اولاد سلطنت خداداد میسور کی نوحہ گر۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر مرشد آباد والے
اپنی عظمت رفتہ پر آہیں بھر رہے تھے۔ اس گھوڑا گاڑی میں ممد اور مہر و خالہ آبدیدہ شمو
خالہ مغموم۔ لیکن چھنوتویا مئی ۱۹۲۶ء بے پردہ۔“

”ہم لوگ شہزادے کے نانا ایک مفلس لکھنوی و شیعہ دار پیارے مرزا کے جہاں قیام پر پہنچے۔ شمو خالہ کے بڑے بھائی شندو خان کوچ بکس سے اتر کر دوازے پر ایک اور بوڑھا باہر نکلا۔ انھوں نے اس سے کچھ کہا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ لامٹہ ٹیکتے واپس آئے۔ گاڑی کی کھڑکی کے نزدیک پہنچ کر شمو سے سرگوشی کی۔ کوچبان کو مدد سے کوچ بکس پر چڑھے۔

”گاڑی واپس مڑی۔ سب خاموش۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں سے کیوں لوٹ آئے۔ یا نانا نواسے نے ملنے سے انکار کر دیا یا مکان پر موجود نہ تھے۔

”گھر پہنچ کر چھٹو نے مجھ سے کہا۔ ”اجی وہ بادشاہ زادے مونڈھے والیوں کی نندا قبول کرتے؟ بہت جوش و خروش سے گئی تھیں۔ اللہ قسم نانی سے فدر کے مرثیے سنتے سنتے کان پک گئے۔ بادشاہ سلامت کا ایک اور سگا پڑ پوتا۔ سلطان جی میں خواجہ حسن نظامی کے ہاں نوکر ہے۔ مرزا سہراب شاہ۔ خواجہ صاحب کا ذاتی ملازم ہے۔ میر نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ستر ہوں شریف کے زمانے میں اور بادشاہ کے نواسے جو ہیں۔ قمر سلطان اور نصیر الملک وہ شہر میں گداگری کرتے ہیں۔ باقاعدہ بھکاری ہیں بڑی نانی دنلواز قلعے کے ایک عرض بیگی ہی کی بیٹی تھیں۔ اور انھوں نے بھیک نہیہ مانگی۔ چورن بیچی۔ اور وہ بھی اپنی مرضی سے۔

”اب مہر و خالہ دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھر کر مہاسے کہہ رہی تھیں۔ نوابن! میں جب بھی لالہ جوہلی کے سامنے سے گزرتی ہوں ہمیشہ وہ شعر یا داتا پڑے۔ ”بوم نوبت می زند۔۔۔۔۔۔ ممانے پوچھا۔

”ہاں اور وہ کیا ہے۔ دیکھا میں قصر فریدوں کے در اور پراک شخص حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں۔

”ہے کیوں نہیں۔ میں جل کر اس گفتگو میں کود پڑی۔ پوری برٹش چھاؤنی۔

ہوتی ہے اس میں۔ اور یہ تو بتائیے مہر و خالہ میں ہسٹری پڑھی ہے۔ لورٹینو باؤس میں۔ اس نام سے میرے دل پر چھڑی سی چل گئی مگر مضبوطی سے بولے گئی۔ دلی کو تو دراصل نادر شاہ اور احمد شاہ نے تاراج کیا تھا۔

”۱۸۰۳ء میں۔۔۔ میں کہتی رہی۔ جب لارڈ ٹیک نے قبضہ کیا اسکے بعد سے تو دلی پھر سے بسی۔ اور اس نے ترقی کی۔ ماما خود بتاتی ہیں کہ انکے دادا پر دادا شاہی خوشبو ساز تھے۔ انکی عطر کی دوکان چاندنی چوک میں تھی۔ اور وہ ولایتی پرفیوم منگوانے لگے تھے۔ دوکان پر انگریزی میں بورڈ لگا دیا تھا اپنے نام کا۔ غدر سے پچیس تین سال پہلے۔۔۔ ہمارا پشتینی کارخانہ بھی تو گرد سی میں برباد ہوا۔ ممانے ٹھنڈی سانس بھری۔

آباد کیا دوبارہ اپنی ساکھ تھوڑی سی جما پائے تھے کہ خود چل بسے۔۔۔
”ان کبخت مرزا سبط احمد کا کچھ پتہ نہ چلا جنھوں نے تمہاری جائیداد ہڑپ کی تھی؟ مہر و خالہ نے دریافت کیا۔

”مرزا سبط احمد سے گفتگو ماما کی بے پوری تویلی کے رہن وغیرہ کے قصے کی طرف منتقل ہو گئی۔ میں نے اب شد و مانوں کو مخاطب کیا۔ جو دسترخوان کے کونے پر بیٹھے تندی سے کھانے میں مصروف تھے۔ ان کی اماں مہر و مانٹی تھیں یہ کمزور اور بہرے بھی ہو گئے تھے۔ مگر میں اپنی بات کسی کو سنانا چاہتی تھی۔ کوئی میری بات سننے کو تیار نہ تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔۔۔ شد و ماموں۔

”انھوں نے کان کے پیچھے ہاتھ رکھا۔

”سینے۔ سلاطین زادے جو تھے۔۔۔“

”سلاطین زادے۔۔۔؟ ہاں ہاں۔۔۔ کہو شاہ عالم کی اولاد تھے۔ شاہی

خاندان کے سب لوگ سلاطین کہلائیں تھے۔ کیا ہوا۔؟ غدر سے پہلے ہی افغانوں اور مرہٹوں نے پلٹھن نکال دیا تھا۔ اور روھیلے تھے یا قہر الہی اللہ بخشے ماموں جی بتایا کرتے تھے۔ کپسنی کی سرکار کو دلی ٹھیکے پر دیدی گئی تھی کہ اسکا انتظام

کرو۔ حضرت بادشاہ سلامت کو خود اپنی اور ان دو ہزار سلاطین کی کفالت کے لیے بارہ لاکھ سالانہ ملتا تھا۔ قلعے کے بھاری خرچے۔ سلاطینوں کی عادتیں بگڑی ہوئی — زیادہ تر تو بٹیا بہت تنگ دست تھے۔ قلعے سے باہر رہنے لگے تھے۔

” مرزا بھورے تو بڑی شان سے قلعے میں رہتے تھے۔ ہمارے ہاں کا حضرت ان کے مرض بیگی تھے۔ مہرونے جے پور والی بات ادھوری چھوڑ کر اپنے بیٹے شندو کو مخاطب کیا۔

” آپ لوگ یہ شاہی خاندان شاہی خاندان لال قلعہ لال قلعہ کب تک رٹے جائیں گی؟ میں نے بھنا کر جواب دیا۔ محض اس لیے کہ ایک ناکارہ آدمی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس سے اتنی ہمدردی۔ جن کڑوروں غریبوں کے کنبے صدیوں سے مفلس چلے آ رہے ہیں ان پر ترس نہیں آتا؟ محض کسی شاہی گھرانے سے رشتہ داری سُرخاب کا پر لگا دیتی ہے آدمی میں؟

” وہی سُرخاب کا پر لگا دیتی ہے صاحبزادی جو تم سمجھتی ہو تمہاری ہیٹ میں لگا ہے کیونکہ تم ایک یورپین کی اولاد ہو۔ ایک گورے ٹھگ کی۔ چلتے پھرتے کی اولاد۔ رم جی کتیا۔

” میں لا جواب شرم سے پانی پانی۔ مہرودلی کی شایستہ طوائف تھیں۔ مہاراجہ اس یہ ہودہ گوئی سے جزبہ ہوئیں۔ میری سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو غصے سے پھر کر پھر اپنی بات دہرائی۔ آپ کی چہیتی دلی کو ایرانیوں نے اجاڑا تھا۔ افغانوں اور رویلوں نے غارت کیا تھا۔ وہ لوگ کیا کافر مشرک فرنگی تھے؟ آپ ہی لوگوں کے ہم مذہب تھے۔

” ہم لوگوں کے ہم مذہب؟ مہرود خالہ نے ناک پہ انگلی رکھ کر دہرایا۔ اوتیرا کو۔

سامذہب ہے چھو کری؟

” میرا؟ میرا کوئی مذہب نہیں۔

”سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
”اور نہ میں آپ لوگوں کا پیشہ اختیار کرونگی۔“

”فرنگی خون کا اثر۔ شمو خالہ نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فیصلہ صادر کیا۔
”اے ہے تو فرنگی خون تو نگوڑی گوہر ہیں بھی ہے دیکھو کیسے پیالہ پی کر ڈیرے دار
بنی۔ چلی جاتی دلالت۔ یا رہتی میموں کی طرح۔ نہیں صاحب۔ لکھنؤ کی ڈیرہ داروں
نے اے اپنا ہم پلہ نہ سمجھا تو بے چاری نے نوا پچوا کی خوشامد کی۔
”ننا آپ بھی تو پیدائشی ڈیرے دار نہیں تھیں۔ آپ نے بھی پیالہ پیا تھا۔؟
چھٹونے دلچسپی سے پوچھا۔“

”نہیں میرے چاند۔ مہر و خالہ نے نواسی کو جواب دیا۔ اماں منوری نے آپا
بیگماں مرحومہ کو اور مجھے اپنی بیٹیاں بنا کر پالا تھا۔ ہمیں خود بخود وہ حیثیت مل گئی۔
”اب میں نے نوٹس کیا کہ مہر و خالہ کی آواز میں خفیف سے غرور کی جھلک آگئی
تھی۔ اب تک اپنے کھرے شریف مغلیہ حسب نسب کو رو رہی تھیں۔ انسان بھی کیا
چوں چوں کا مرتبہ ہے۔“

”پیالہ پی کر ڈیرے دار کیسے بنتے ہیں۔؟ چھٹونے اٹھلا کر پوچھا۔
”مہر و خالہ نے بتلایا گوہر نے نوا پچوا کے ہاں برادری کی دعوت کی۔
”ضیافت کے بعد پیالہ بھر شربت پہلے نوا پچوا کی بھانجیوں نے پھر ان دونوں بھانجیوں
بہنوں نے۔ پھر ساری طوائفوں نے باری باری چکھا۔
”آخر میں اسے گوہر نے نوش کیا اور گویا آنریری ڈیرے دار بن گئیں۔ ڈیرے دار
کے لیے بیٹا شرط تھی کہ سات پشتوں تک اسمیں حلالی کوئی نہ ہو۔“
”یہ بڑے فخر کی بات تھی۔؟“ منصور نے پوچھا۔

”ہر سوسائٹی کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ جب مہر و خالہ نے یہ قصہ سنا یا میرا بھی

یہی ری ایکشن ہوا۔ میں نے طیش میں آکر کہا۔ شرم نہ آئی آنت گوہر کو۔
 ”پیشہ ور عورتوں کا جھوٹا شربت ایسے پی گئیں کہ سات پشت کی حرامی کہلائیں۔
 غصے کے مارے میرا برا حال۔ میں تو انکو بہت معقول پڑھی لکھی خاتون سمجھتی تھی بیسے
 اندر بہت دنوں سے جو لاداسا اہل رہا تھا اب وہ سطح پر اچکا تھا۔ میں نے دسترخوان پر سے
 اٹھتے ہوئے اعلان کیا آپ سب کان کھول کر سن لیجئے۔ نہ میں آپکا دین قبول کرتی ہوں
 نہ آپکا خدا۔ نہ آپکا پیشہ۔“

”میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ چکر اکر گر پڑی۔ ممانے مجھے زور کر تپھڑ لگایا تھا۔ پھر
 لاتوں گھونسوں کی بارش۔ فلو، مہر واد رش تو خالہ ماکو نہ روکتیں تو شاید اس روز کی مار
 سے جانبر نہ ہو پاتی“

”جو بنگالی ہندو“ غذیب بانو نے دوسری شام داستان آگے بڑھائی ”پچھلی دو
 صدیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کی حیثیت سے بے تحاشا دولت کما چکے تھے۔
 انہوں نے زمینداریاں خریدی تھی۔ انکے خاندان کلکتہ کے مرچنٹ پرنس کہلاتے تھے۔
 انہوں نے مرحوم دُبار مرشد آباد کی تہذیب اور طور طریقے اختیار کر رکھے تھے۔
 ”ایک مرچنٹ پرنس نے میرے پہلے جلے کا خرچ اٹھانے کی پیش کش کی۔ ممانے
 انتظامات میں بے طرح مصروف ہو گئیں۔ وہ مجھے بازار کا ایک مولوی صاحب سے
 اردو فارسی بھی پڑھوا رہی تھیں۔“

”برآمدے میں درزی بیٹھ چکا تھا۔ زرق برق پوشاکیں تیار کی جا رہی تھیں۔“

”رقص کے مردانہ اور زنانہ اصل لباس جو اس وقت تک رائج تھے آج کے کتھک
 ڈریس سے مختلف تھے۔ رقا ص بر کا پا جامہ پہنتے تھے۔ مشروع کا۔ گونا بنت لگا۔ انگرکھا

آربانے کا۔ بوٹی دار۔ بالوں میں پیچ کی مانگ۔ پیٹے۔ دو پیٹے کا کرؤس۔ لڑکیوں کی پشتوں کے نیچے بڑکا پا جامہ۔ اتنا نیچا کہ اڑھائی سیر گھنکرہ کی جوڑی نظر نہ آوے۔ آڑا پا جامہ راتج نہ تھا۔ گھنکرہ موری کے اوپر نہیں باندھے جاتے تھے۔ پنڈلیاں ہولہان ہوجاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا جب تک گھنکرہ گوشت نہ کھالیں مہارت حاصل نہیں ہوگی۔“

”افوہ۔“ منصور نے کہا۔

”اس سارے بکھیڑے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ طلبہ بجا۔ لہرا شروع ہوا۔ جسم سادھا۔ بھنوس چلیں۔“ اچانک عنذیب بانو پھر گنگنا نے لگیں: ”کہاں جاگے ساری رات نیناں کسمبری رنگ ہو گئے۔ ایک تو تلنگوا۔ تلنگوا کا پہرہ۔ دو بے ٹھاڑے جمعدار۔“

”میں مقصوری سیکھانا چاہتی تھی۔ کہاں ٹرزا اور کانٹیل کہاں دو بے ٹھاڑے جمعدار۔ گت نکلے اڈھا۔ تال کہروا۔“

”لیکن مسز بیگ یہ تو بہت عظیم آرٹ ہے۔“

”ہوگا۔ ایک روز جلسے کے لیے گھر پر پریکٹس کر رہی تھی ماما کی ایک سہیلی بولیں

نام بلبل ہی رہے گا؟ ممانے کہا۔ اور کیا۔

”وہ بولیں اگر یہ باؤ کے بلبل خانے سے اڑ گئی تو بلبل نہ بیٹھ جائے گا؟“

”اے توج خدا نہ کرے جو میری لڑکی نکلے۔ ممانے چمک کر جواب دیا۔“

”شرفار میں اگر لڑکی ماں باپ کے گھر سے نکل کر آوارہ ہو جائے اسے بھاگ جانا کہتے

ہیں۔ طوائفوں کے ہاں الثا حساب تھا۔ لڑکی نکاح کر لے یا کسی کے گھر بیٹھ جائے تو نہایت

تاسف سے کہا جاتا تھا فلاں کی لڑکی بھاگ گئی۔“

”امی ذرا مختصر کیجئے۔ ابھی ہم لوگوں کو کلنک بھی جانا ہے۔“ عنبرین نے الجھ کر

یاد دلایا۔

”مجھے بڑھا پے کا ANECDOTAGE ہو گیا ہے۔ بھلا میں کہاں تک پہنچی تھی؟“

”نرت سے آپکی روح فنا۔“

”ناقدین فنِ روسا کے سامنے ناچنے کے خیال سے لرزہ چڑھ رہا تھا۔ اس دور کے چند اہم اہل بھی کتھک کے ماہر تھے۔ رامپور کے نواب رضا علی خاں کتھک کے استاد تھے۔“

”واجد علی شاہ کی روایت!“

”ہاں۔ اور مجرے کا جو ایٹی کیٹ محمد شاہ رنگیلے کے دور سے چلا آ رہا تھا اور مجھے مجھے سکھلا رہی تھیں۔ وہ یاد نہیں رہتا تھا۔ یہ ہندوستانی فلموں میں جو SO-CALLED مجرے کے VULGAR سین تم دیکھتے ہو آج سے پچاس سال قبل تک مجرے قطنی مختلف اور انتہائی شائستگی کی محفل ہوتی تھی۔ گائینوالیاں اپنے معزز سامعین اور بڑے والیان ریاست کے سامنے پان نہیں کھا سکتی تھیں۔ چہرہ ایک طرف کر کے بیٹھہ منہ میں رکھتی تھیں۔ پانی بھی اجازت حاصل کر کے پیتی تھیں۔ نہایت شرعی قسم کا لباس پہننا پڑتا تھا۔ پوری طرح پردے دار۔ نہایت رکھ رکھاؤ اور تہذیب کا پیر تکلف ماحول ہوتا تھا۔ اور کیسے کیسے اہل کمال اس زمانے میں موجود تھے۔ لکھنؤ کی نوابوچا کا لکابن رادین کی شاگرد۔ بے پناہ کبر و ناچتی تھیں۔ کون ایسے کی نار جھما جھم پانی بھرے۔“

”شہنشاہ مہاراج کس نے چلمن سے مارا نجا را مجھے، شیر طریقے سے بتاتے تھے۔“

”ایسے ماحول میں تو میرا DEBUT ہونے والا تھا۔ وہشت کے مارے راتوں کی نیندیں حرام۔ کبھی سوچی جو فلو میٹ کہتی ہے میری قسمت ہی میں لکھا تھا اور نہ نواب بانی کے ہاں کیوں جنم لیتی۔ لیکن مجھے یہ قسمت والی بات لغو معلوم ہوتی تھی۔ ان دنوں کلکتہ میں سوویٹ یونین اور سوشلسٹ انقلاب کا بہت چرچا تھا۔ ٹیگور شاید روس ہو آئے تھے یا جانے والے تھے۔ یاد نہیں۔ بولشویزم کا تذکرہ اخباروں میں

چھپتا رہتا تھا وہ زیادہ پلے نہ پڑتا۔ مگر اتنا سمجھ میں آگیا تھا کہ انسان ایک ان دیکھی مفروضہ اور خیالی آسمانی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنی جدوجہد سے حالات بدل سکتا ہے اور EXPLOIT کیے جانے سے بچ سکتا ہے۔

”لیکن میں اتنی کمسن تھی۔ کیا کر سکتی تھی۔ جلسے سے دور و زقبل رات کو سونے کیلئے لیٹی تو اچانک ایک راہ فرار سوچ گئی۔ بہت ہی DESPERATE ترکیب تھی مگر اس نا تجربہ کار اور کچی عمر میں وہی ایک راستہ دکھلائی دیا۔“

”صاحب پرسوں میں کہاں تک پہنچی تھی؟“

”آپ کو ایک راہ فرار۔“

”ہاں تو میں گجروم اٹھ بیٹھی۔ ماما اور فلو مینا دونوں اپنے اپنے کمروں میں غافل سو رہی تھیں۔ میں نے روشنی جلائے بغیر فراک پہنا ہیڈ لگائی۔ پرس اٹھایا۔ دبے پاؤں زینہ اتر کر رین اسٹریٹ میں آئی۔ کچھ دور تک دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ ایک رکشا ملا۔ سیڑھی اوڑھ لکھاٹ۔“

”چند رنگر پچیس^{۲۵} میل دور تھا۔ موٹر لاپنچ ایک جیٹی پر پہنچی۔ سامنے فرانسیسی پرچم لہرا رہا تھا، کانوٹ کار راستہ پوچھ کر سیڈل روانہ ہوئی۔ ایک مہربان فرانسیسی نے اپنی موٹر کار روک کر لفٹ دی۔ سینٹ جوزف اف کلونی کی درسگاہ پر جاتا رہا۔“

”اندگئی۔ یہاں ہر طرف فرنچ بولی جا رہی تھی۔ اپنے ان دیکھے باپ کی کلچر کی ایک جھلک نے مضطرب کیا۔ ایک نو عمر نرن اپنے دائرے کے مطابق سیاہ بادے کے ڈھیلے آستینوں میں ہاتھ چھپائے سر جھکائے دیوار کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ مجسم عجز وانکسار آگے بڑھ کر اس سے بات کی۔ وہ انگریزی سے ناواقف تھی۔ تو ریڈیوس پڑھی ہوئی ابتدائی فرنچ کے ذریعے سمجھایا۔“

چند رنگر کے ایک باشندے موسیو آندر سے رینال کی لڑکی ہوں۔ وہ فرنچ فورن لیمن میں شامل ہو گئے

تھے۔ عرصے سے لاپتہ ہیں۔ میری بیٹیاں مجھے ڈانٹ کر بنا ناچا ہتی ہے۔ کل شام وہ مجھے باضابطہ اپنے پیشے میں شامل کرے گی۔ خدا کے واسطے مجھے آج ابھی ابھی اس خانقاہ میں داخل کر کے فوراً نئے بنا لیجئے۔

”نوجوان راہبہ نے اپنی پرندوں جیسی روشن آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے تعجب سے دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ نئی تکی فرانس سے آئی ہے اور پُر اسرار شرق کے معاملات سے ناواقف ہے۔ ایک نیوڈاننگ گرل کی بلونڈ لڑکی۔! مومن دیو۔!!

”میری دردناک التجا کو سر جھکا کر بڑے دھیان سے سنا۔ اور خاموشی کے ساتھ مجھے ایک سرخ عمارت کی طرف لے چلی۔

”راستے میں ایک گروڈیوٹر۔ بلند و بالا مر میں مریم کے عقب میں نتھاسا بھرا کر رہا تھا۔ مذہب سے برگشتہ پہلی تھی مگر اس لمحے بگڑا کر دعا مانگی۔ سہلی میری ناچ کر نہیں۔

”میں نے ٹوریو میں دیکھا تھا۔ ہماری راہبہ استانیاں کسی پرسکون مصائب سے آزاد زندگیاں گذارتی تھیں۔ اس وقت میں سچا کیفیت دیکھی اور ہر قیمت پر ممالک کے جنگل سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ نن مجھے پرنسپل کے دفتر میں لے گئی۔ مدر سپریماری جوزف نے متعدد ہاتھ دیکھے۔ پھر بجلی گرائی۔ تم ابھی قانوناً بنا لیج نہیں ہو۔ تمہاری والدہ تمہاری سرپرست ہیں۔ اور وہ برٹش سبکٹ ہیں۔ ابھی تم گھر جاؤ۔ بڑی ہو جاؤ تو ہمارے پاس ضرور آنا۔ ہم ابھی سے تمہارے لیے دعا کرتے رہیں گے۔

”انہوں نے انگریزی، فرانسیسی اور بنگالی میں چھ چند دینی کتابچے اور مشہور مسیحی راہبہ کی زندگیوں کے متعلق ایک باتھریکتاب مجھے تھما دی۔ ان فریج راہبات نے فرانس اور برطانیہ کی افریقی اور ایشیائی نوآبادیات میں اسکول اور ہسپتال قائم کئے تھے۔ وغیرہ۔ ایک فادر نے بڑا سا چوکلیٹ کا ڈبہ مرحمت کیا۔ جب وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر نہایت شفقت سے مجھے دروازے کی طرف لے چلا میں دھاروں روئی۔ باہر کئی فادروں اور نونوں نے مجھے گھیر لیا۔ اور دلاسہ دینے لگے۔ صبح کچھ کھائے پیے بغیر گھر سے بھاگ آئی تھی اور کھوکھوک

اور صدمے سے بڑھال تھی۔ ایک فادر نے اسکول کے ڈہیننگ ہال میں لے جا کر لہج کھلایا۔ پھر موٹر میں بٹھال کر کلکتے روانہ ہوا۔ میں راستے بھر خاموش رہی۔ ان لوگوں کی غدار کی پریچ و تاب کھار ہی تھی۔ وہ ایک مظلوم گوری لڑکی کو اس نیٹوانڈین غلاط میں واپس پھینکنے جا رہے تھے۔

”اسٹریٹ پر پہنچ کر فادر نے میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ رپن اسٹریٹ کے موٹر پر اتارا۔ میں نے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ دینی رسالے اور راہب بات کی سوانح حیات کوڑے کے ڈھول میں پھینک دی۔ چوکلیٹ کا ڈبہ نہیں پھینکا۔“

”اب تم تو بن گئے ہو CAPTIVE AUDIENCE آج ایک اور تصویر بھی دیکھ لو۔“ وہ منصور کو اپنے اسٹوڈیو میں لے گئیں۔ دیوار کے سہارے کھڑے چند کنیسوس سرکاتے۔ ایک بڑا فولڈو گراف نمودار ہوا۔ پشتوا میں ملبوس ایک پری بیکر کتھک کی ”آمد“ کا پوز بنائے، بڑے شوخ تبسم کے ساتھ کیمبرے کو دیکھ رہی تھی۔

”پورٹریٹ اف اے ناچ گرل II“

”یا — ڈیمینز فورن لیجین کی ایک رکن۔“ وہ اسٹول پر ٹک کئیں۔

”ایک روز ہم لوگ فرینچ فورن لیجین کے متعلق ایک خاموش فلم دیکھ کر آ رہے تھے۔ یوجین سپرٹن کے ساتھ۔ تو اس نے کہا تھا دنیا بھر کی مصیبت زدہ عورتیں ایک قسم کی ڈیمینز فورن لیجین میں بھرتی ہو جاتی ہیں۔ اپنے نام بدل لیتی ہیں۔ انکی شخصیتیں ماحول تبدیل کر دیتا ہے۔“

”مما جاپانی جا رہی کی نیلی ساری پہنے بند جو توں پر کھٹر کھٹر کرتی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہم چورنگھی سے گذر رہے تھے۔ میں اپنی ماں سے متنفر تھی۔ اس وقت ترس اگیا۔ یوجین ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے سوچا۔ معصوم شریف زادی نواب فاطمہ کیسی رہی ہوگی۔ کیا سے کیا بن گئیں۔ پھر

بھی کتنی بہادر کیسی امید پرست۔ سمجھ میں آنے نہ آتے۔ فریچ فورن لیجین کے منعلق ایک فلم نہیں چھوڑتیں۔ محض اس موسم، اہمقا نہ توقع پر کہ شاید کسی سین میں موسیو آندرے رینال دکھلائی دے جائیں۔

”یوچین نے بتلایا تھا ان فلموں کی شمالی افریقہ میں لوکیشن شوٹنگ ہوتی ہے۔“
 ”یوں بھی اس کو لو نیل دور میں فریچ فورن لیجین ایک بڑی روٹینک چیز سمجھی جاتی تھی۔ دراصل، ہما، فلومینا اور میں — تین مضطرب دکھی رومان پرست رُو حیں تھیں۔ نگلش اور اردو بائیسکوپ دیکھنا ہمارا محبوب مشغلہ۔ یوچین — عرف اندرا دیوی بھی ہمیں فری پاس بھجواتی رہتی تھی وہی رُو سی لڑکی جسکا نوٹو گراف ڈرائنگ روم میں رکھا ہے۔ آنت گوہر کے ہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“

”وہ عجیب زمانے تھے۔ بہر منیر چودھرائین لکھنؤ کے نام سے ایک انگریزی ناول کا شریج شائع ہوا تھا۔ یہودی شراڈ گوہر جان کی مجالس محرم کے حصے چاندی کی طشتریوں سمیت تقسیم کیے جاتے تھے۔ اور گوہر ہی نے مجھے ’ولایتی ناچ‘ سکھوایا — جو اس زمانے میں کلکتہ اسٹیج ریہیت مقبول تھا“



ولایتی چکر

”چلبے والی ملکہ۔“

”ایک اور پری چیم سے نکلی۔ پٹاری سے!“

”بہترین بھاؤ بتاتی تھی۔ اس کی سوتیلی بہن جَدَن۔“

”سوتیلی۔؟ میرا مطلب ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس سوسائٹی میں سب ایک

دوسرے کے نصف بہن بھائی۔ مطلب ماں ایک اور۔ یعنی کہ۔“

”ملکہ اور جَدَن ایک سپردانی بلبلہ نواز کی بیٹیاں تھیں۔ گوہرنے جَدَن کو گروم کیا۔“

”سپردانی سر مختصر نوٹ۔“

”تم کو ایک موڈرن باشعور انسان سمجھا تھا۔ نکلے تم بھی شیخ عبدالباسط گوٹے والے۔“

”استغفر اللہ آپ تو خفا ہو گئیں۔ اچھا ملکہ اور جَدَن۔“

”ایک سپردانی کی لڑکیاں تھیں۔“

”وہی تو پوچھ رہا تھا۔ سپردانی کیا۔“

”پاتروں کے ایک گاؤں چلبلا، ضلع الہ آباد کے ایک سپردا۔“

”وہی تو پوچھ۔“

”تم ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے ہاں ذات بندیاں کیں۔ بے مثال فنکاروں کو

’میراثی‘، پکار کر حقیر سمجھا۔“

”میسڈیول یورپ میں بھی تماشا گروں کو ٹاٹ باہر سمجھا جاتا تھا۔ اب ہم اعلیٰ

سرکاری اعزازات۔“

” اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تم اس کی شادی ایک ماہر فن گوئیے سے کر دیتے؟“
 ” پچاس ساٹھ سال میں تو پورا نہ تعصبات اور روئیے مٹ نہیں سکتے اچھا سپردا۔“
 ” اس ذات بند سماج میں خود ان کے ہاں زبردست کاسٹ سسٹم موجود تھا۔“
 ” بس تو آپ خود ہی سوچیے۔“

” بلنڈ پایہ گویوں اور منت کڑوں کا طبقہ علیحدہ تھا۔ طنورہ بند میراثی برتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی عورتیں سخت پردے میں۔“
 ” مسز بیگ۔ لٹڈ۔ سپردا۔“

” گلے دایوں کے سازندے۔ اکثر ان کی لڑکیاں بھی پروفیشن میں شامل۔“
 ” آئی۔ سی۔ واقعی یہ بھی ایک علم دریا ہے۔ اب جڈن بانی اور جلیبی ملکہ بتائیے۔“
 ” جلیبی والی۔ جب بیگ جان کے باپ جگدو خاں کچن۔“
 ” کچن سمجھاتی چلیے۔“

” تمہارا رویہ تمسخر کا ہے۔ کیونکہ تم زندگی کے بازار سے ناواقف ہو۔ ہٹاؤ۔“
 ” پلیز۔ گوہر جان تو رہی جاتی ہیں۔“

” بیوقوفی کی باتیں جو کیے جا رہے ہو۔ گوہر کی ماں دوسری ملکہ جان تھیں۔ بنا رسی۔
 دراصل ارمنی۔ بنا رسی میں کسی انگریز کے ہاں آیا گیری کرتی تھیں۔ وہ شخص گوہر کا باپ
 بنا تو ماں بیٹی کو بے سہارا چھوڑ کر غائب۔ ملکہ بے چاری ایک ارمنی نائیکہ کے ہتھے چڑھ گئیں
 ناچ گانا سیکھا۔ اور اکیڈمی تک اردو فارسی جو اعلیٰ کورٹی زن کے لیے لازمی تھی۔ شعر کہنے
 لگیں۔ استاد نہایت پر کل رہے ہونگے۔ حکیم ہو صاحب ہلال بنا رسی۔ کاشی میں رہیں
 پھر کلکتے آگئیں۔ وہاں یوریشین، یہودی، ارمنی اونچی طوائفوں کی کثرت تھی لیکن ملکہ جان
 کی دھوم مچ گئی۔ اصلاً ارمنی یہودی تھیں۔ یوروپین لباس پہنتیں۔ میم صاحب کہلاتی
 تھیں۔ سید ذہین اور ٹیلنڈ سیلف میڈ کریو دمن۔ مسکراؤ مت۔“ مسز بیگ ذرا جوش
 سے اٹھ کر اندر گئیں ایک خستہ کتاب پڑھتی واپس آئیں۔ ”کلکتے میں ٹیپو سلطان کے
 پڑ پڑتے پرنس ابراہیم شاہ رسا انکے ایک سرپرست تھے۔“

”طاؤس و رباب آخر!“ منہور نے آہ بھری۔
 ”نہیں۔ موسیقی رزم و بزم کا جزو تھی۔ ٹیپو کی فوج کے مارچنگ سونگ کوئی ہنڈول
 میں باندھا گیا تھا کوئی جنگلہ۔ پھرو۔ سارنگ۔ گوری کلیان۔ پرنس ابراہیم شاہ ہی نے
 انٹ گوہر کو بتلایا تھا۔ ایک فوجی ترانہ تھا۔ ملک ہندوستان کا دس میں وہی سلطان
 ہے۔ غرق جس کی آبِ نجر میں فرنگستان ہے!“
 ”واہ۔!“

”اور غزلیں آہستہ قدم۔ جلد قدم۔ طلوع صبح۔ وقت شام۔ وقت طنبور دوم کوچ
 اور جانے کیا کیا۔ لیکن تم نے پھر میری بات کاٹی۔ خیر تو ۱۸۸۶ء میں یہ مخزن آفتِ ملکہ
 چھپا۔ اکثر شعر نہایت ادق سے لکھا حسابِ خلق کا جو کلک مرگ سے۔ تھاحرف کُن سے
 رابطہ روز شمار کا۔ اور۔ خیر یہ تو آسان ہے۔ عجب حکمت سے خاک لامکاں بنیاد
 میں ڈالی۔ بنایا جب خدا کے قصد نے ایواں رسالت کا۔ یہ لو۔ خمیر گرد کُن تھا موجود زقار
 کا جوہر۔ اور سنو۔ چشمِ قناں نقشہ عین الیقین ہے صاد کا۔ کسی مدارج نے لکھا
 ہے۔ دیکھو ہے زیب محفل مشکل خیالِ ملکہ! اب شہزادہ ابراہیم شاہ کی تقریظ ملاحظہ ہو:
 — جہانگیر نہیں مگر افسانہ ہے مجوں نہیں مگر دیرانہ ہے۔ جالینوس نہیں مگر سرزمینِ طوس
 ہے۔ ناسخ نہیں مگر دیوان ہے۔ میر تقی میر نہیں مگر ذکر ہے۔ نور جہاں نہیں۔ زیب النساء
 نہیں۔ یہ کارخانہ الہی ہے یہاں جو ہے سوئے عدم راہی ہے۔ مولفہ گو ایک عورت ہے مگر
 رفعت مضامین فصاحت و بلاغت اور سنو آگے۔ صاحب دیوان تو ماشا اللہ اور
 معاذ اللہ۔ انکی ادائیں انکی وفائیں۔“

”یہ ٹیپو سلطان کے پڑپوتے بھی سبحان اللہ۔“

”داغ کے مشہور شاگردوں نے تاریخیں نکالیں۔ ان گنت۔ آج بندے

سے کئی حسن پرستوں نے کہا۔ ملکہ کشور بیداد کا چہرہ کہے۔ عارض انور جانان کے لیے
 ہے زیبا۔ معنی آیت والشمس کا جلو اچھے۔ فکر سے زندہ کیے مردہ خیالات بہت۔ ذہنِ ملکہ
 کو بھی اعجازِ میسما کہتے۔ جسکے چھپنے کا خدائی میں چما ہے اک شور۔ مہم صاحب کا وہ دیوان اُلوکھا کہتے۔

”مہاراج یو دراج بیر برٹھا کر ہر کشن سنگھ والی ریاست کشن کوٹ :- بدین نوید
کہ دیوان ملکہ شد مطبوع - مہاراجہ پدماند سنگھ بہادر افسر والی ریاست نیلی دکھڑ پور
ضلع بھاکپور :- سُننے جب کچھ مضامین ذہن بولا طبیعت علم غایب پر ہے حاضر صفات
اوج معنی کیا بیاں ہوں۔ زبان بلبل سدرہ ہے قاصر۔

”ایک شاگرد آغ :- نقطہ کو اختر فلک کہیے۔ سطر کو خط کہتاں کہیے۔ میں نے
استاد سے اجازت لی۔ حکم ناقد ہوا کہ ہاں، کہیے اسکی تاریخ ہے قیامت کی۔ سخن فتنہ جہان
”بے حساب ارباب نشاط کی تاریخیں۔ بی بیجو صاحبہ پری، طوائف یہودن -
بی بی منجھو صاحبہ۔ مشتری طوائف لکھنوی۔ خورشید جان دہلوی صاحب دیوان -
بی بی شیریں جان شیریں طوائف لکھنوی۔“

”یعنی طوائف نام کے آگے اس طرح لکھا جاتا تھا جیسے ڈینیٹ یا وکیل!“

”مکھن جان صاحبہ متوطن کیا۔ پردہ غیب میں پنہاں تھا جو سال ہجری۔ کان میں
انگنی ناگاہ۔ فغان ملکہ۔ یہ جلد آنت گوہر نے ماکو دی تھی وہ اسکا ایک شعر اکثر درمیت
سے اسدرجہ خوشخرام چلا کاروان عمر۔ میدان حشر طے ہوں تنو ایک راہ میں۔ دیوان ملکہ
کا دوسرا واحد نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے،

”کلکتہ ہندوستانی میوزک کا گڑھ بن چکا تھا۔ لکھنؤ اور بنارس کارنگ غالب
ملکہ بنارسی نے ہولیاں ٹھہریاں دادرے ایسے بنائے آج تلک گائے جاتے ہیں۔
دستور کے مطابق استھانی پوربی یا اودھی میں انترہ فارسی۔ ناپن کرت بات گریات
جات بیابا کہ ملکہ بیقرارم۔ وغیرہ اور بھری گلگرمی موری ڈھرکانی شام۔

”ملکہ بنارسی مشہور شاعرہ تھیں۔ نامی گائیکہ اور کمپوزر۔

”مگر طوائفوں کے سماج میں بھی کاسٹ موجود تھی۔ چنانچہ گوہر جان جب کالکا
بند دین سے کتھک کی تعلیم لینے لکھنؤ گئیں کیونکہ بے چاری محض فرسٹ جزیشن غیر
حلالی تھیں۔ لہذا انھوں نے پیالہ پی کر۔“

”جی ہاں۔ آپ بتا چکی ہیں۔ مجھے یہ واقعہ بہت اندوہناک معلوم ہوا۔ ایک ذہن طابع

پڑھی لکھی لڑکی اپنی قابلیت اور فنکاری کی بدولت کوئی بہتر مقام حاصل نہیں کر سکتی تھی؟“
 ” آج سے اسی نوے برس پہلے؟ ہرگز نہیں۔ اور جڈن کی لڑکی نے آج کل کے
 زمانے میں جو مرتبہ سوسائٹی میں حاصل کیا وہ ایک منفرد واقعہ ہے۔“
 ” بالکل منفرد بھی نہیں ہے۔“

” بہر حال۔ آنٹ گومہر اپنی اس زندگی سے بیدار تھیں اور اس سے لطف اندوز
 ہوتی تھیں۔ آڈتازہ ہو امیں چلیں۔“

وہ باہر آکر لان پر پڑھی سفید کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ عجزیں باورچی خانے کی سمت سے
 آتی دکھلائی دی۔ گویا بن دیوی کی طرح درختوں کے جھٹٹ سے نمودار ہوئی۔ منصور
 نے سوچا۔ بن دیوی جس کی جھلک جھٹٹ پٹے وقت دکھلائی دے جاتی ہے۔ بن دیوی
 جسے انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔

” مغرب میں “عذیب بانو نے سلسلہ کلام جاری رکھا” اس وقت مادام میلبا وغیرہ
 افسانوی ہستیاں شو بزنس میں تھیں گومہر ان کی ٹکڑ کی تھیں LARGER-THAN-LIFE
 ” کم اوڈن امی۔ آغا حشر انڈین شیکسپیر۔ گومہر جان انڈین مادام میلبا!“
 عجزیں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

” کیپ کو ایٹ۔ تم کیا جانو تم نے آنٹ گومہر کو دیکھا ہی کہاں۔“

” ماسٹہ ۱۹ میں پہلی بار ان سے ملیں یہی میں۔ آنٹ گومہر نے ٹاؤن ہال کے کرسی
 چرٹی ٹشو میں گایا تھا۔ سر فریڈر شاہ مہتہ نے ایسٹج پراکرا ان کی بجد تعریف کی۔ جو ابا انہوں
 نے بڑھیا انگریزی میں یورپین میوزک پرایک تقریر کر ڈالی۔ وہ عربی داں بھی تھیں۔ کیونکہ
 کلکتہ میں بغدادی یہودی تاجروں کی کثرت تھی اور وہ لوگ ہندوستانی موسیقی کے بہت
 دلدادہ تھے۔ اچھا جب ایک ایرلنی ان کا GIGOLO تھا فر فر فارسی اڑتیں۔ وہ بنگالی
 فرنج انگریزی گانے خوب گاتی تھیں۔ شاندار اور مدیحہ امالوی PRIMA DONNA
 معلوم ہوتی تھیں۔ گھنٹکریاے جو کلیٹ براڈن بالوں کی امی چوٹی۔ چوڑی دارپا بجامہ

— جب وہ گاتی تھیں والیان ریاست ان کے اوپر سے جواہرات بچھا اور کرتے —

انکی تو آیا تک ہمیشہ بنا رسی ساڑیاں بانڈھتی تھی۔ سونے کا خا صدان لیے انکے پیچھے چلتی۔ انکے پٹی میرے کی انکو ٹھیاں پہنتے تھے۔ بچپن میں میں اکثر انکے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں بیٹھی رہتی جب وہ روساڑ کو گانا سنا تی تھیں۔ سامعین بڑے بڑے چیک کاٹ کر ان کو دیتے۔ جب وہ باہر جاتی تھیں مسلح باڈی گارڈ ساتھ ہوتے۔ “

” ہوں ہوں“ منصور نے امریکن اسٹائل ہنکارا بھرا۔

” دھرم تلے میں انکی کوٹھی کے پھاٹک پر دو سنگی شیر بنے ہوئے تھے۔ خود بھی شیرنی سی لگتی تھیں۔ ونگ۔ شاندار۔

” حامد علی خاں نواب راجپور ان کے بڑے قدر دان تھے وہ محل کے اندر بھی بلاتی جا تی

تھیں بیگمات ان کی دلچسپ گفتگو بڑے شوق سے سنتی۔

” ہربائی نس فاروقی بیگم صاحبہ پٹھان تھیں۔ گوہر کی دلیری بہت سراہنیں۔ شاید پرنس اف ویلز یا ڈیوک اف کنٹا یا انہیں بہر حال وہ لنگڑے شہزادے کہلاتے تھے۔ راجپور آئے۔ ایوننگ گاؤن اور میرے جڑے موزے پہن کر گوہر نے انکے ساتھ بال روم رقص کیا۔ اسی محل میں جواب رضا لائبریری ہے۔

” نواب حامد علی خاں نے انگلش پرنس کے لیے ایک پلے اسٹیج کروایا۔ گوہر میرین ہربائی نس کہا کرتے تھے کیا کروں گوہر تم موٹی بہت ہو ورنہ تم پر عاشق ہو جاتا۔ ایک با، نواب صاحب نے گوہر ڈے منایا۔ سو ستور پیسے ٹکٹ۔ ستر ہزار روپیہ لیکر کلکتہ لوٹیں۔ “ انکا ایک فیورٹ داورا جسے وہ نرت سے گاتی تھیں۔ ساڈوں۔ ہتر تھی نگاہوں کی بر چھی۔ جگر پہ ماری۔ لگی ایسی کاری، ار سے ہم نے ملانی جو نظر آنکھوں سے۔ “

حسین بخش کافی لار ہے تھے۔ چونک کر خاموش ہو گئیں۔

” اس روز۔ “ عنبریں نے ٹپکے سے منصور کو مخاطب کیا۔ ” رینڈیٹنسی میں ہم لوگ ہندو کے تضادات کی بات کر رہے تھے۔ امی بھی مجھے اضا دہیں۔ گوہر جان اف کیل کٹا کو آئیٹلا

کرتی ہیں اور سو ویٹ خلا باز لڑکیوں کو بھی۔ “

انہوں نے سن لیا۔ معاً جی جی اینگلو انڈین لہجے میں ڈانٹا "پاپ ڈاؤن" چینی چمپاکے پتوں سے پھسل کر بارش کی چند بوندیں ان کے سفید بالوں پر گر گئیں۔
 "مس صاحب میں آٹھ گواہوں کو اس لیے ایڈمائر کرتی تھی کہ وہ انڈینڈنٹ اور سیما صفت تھیں اور یہ ان کے دلایتی خون کا اثر تھا۔"

"خالص ہندوستانی عورتیں انڈینڈنٹ نہیں ہوتیں؟" غبر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
 "آپ کو تو اپنے دلایتی خون کا COMPLEX ہے۔ شکر ہے کم از کم میں نہیں ہوں کسی قسم کی

“ MIXED BREED

"ہاں ہاں۔ سید زادی۔ تمہیں کوئی کو میلیکس بھلا کا ہے گوہر نے لگا۔" عندلیب بانو نے چمک کر جواب دیا۔
 وہ تینوں دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے۔

"کلکتے کے عوام بھی انکی بیخونی کی وجہ سے انکی بہت عزت کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ سے اعلانیہ نافرمانی کا طرح طرح سے اظہار کرتیں۔ چوراسے پر تہی سرخ ہوئی یہ اپنی موٹر کار میں زن سے نکل گئیں۔ انگریز پولس کمشنر انکی اس قسم کی حرکتوں سے عاجز آگیا تھا۔ آٹے دن جرمانے ہوا کرتے۔ گورنرنگال کے فیسی ڈپس بال میں خود بھی بھیس بدل کر پہنچ گئیں۔ چند وایان ریاست نے اعتراض کیا۔ گوہر نے انھیں اپنی محفلوں میں آنے کی مناجا کر دی۔"

"سننے کی بڑی نمائش میں اللہ آباد گئیں۔ اکبر نے کہا ہے خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا۔ چنانچہ ایک ایرانی سے نکاح کر لیا۔ اکبر نے فوراً ارشاد کیا ہے مرد خلیج فارس۔ کیسویں جس کے کالے۔ گوہر نے آب اپنی کر دی جسے حوالے۔ اس واقعے کو شاعر سانچے میں کیسے ڈھالے۔ سعدی کا ہاں یہ مصرع لجنوں میں لاکے گالے۔ ہرگز حسد نہ بردم بامنصبے دمالے۔ الا

برآں کہ وارد باد لبرے۔ ارے وہ آغا صاحب ابھنی ابھی میرے تصور میں آگئے۔
عباس نام تھا نہایت شکیل۔ ہر وقت مالا پھیرا کرتے۔ ایسا لگا جیسے اپنی تسبیح عقیق :
اس پردے کے پچھے سے نکل آئینگے۔ انہوں نے گوہر کو بہت دکھ دیے۔
”ان سے علیحدگی کے بعد بہت سے جگ لو آئے اور گئے۔“

”جگ لوز سے متعلق ولایتی نادلوں ہی میں پڑھا تھا۔ امریکہ میں ایک انڈین پرنس
ملے۔ وہ خود ایک۔ مگر وہ گوہر کے زمانے کے تو نہ رہے ہونگے۔“
”ان بے چاری کو تو مرے بھی آدھی صدی گذر گئی۔“

”وہ اتنے قدیم نہیں تھے مگر اولڈ ولڈ کرٹسی اور چارم کے پتلے۔ سنا ہے
حال ہی میں انکو مافیا والوں نے چلتا کیا۔ یعنی یہ پروفیشن اور مافیا! ڈیڈلی کوئی میٹر
اچھا اور بتلائیے۔“

”اب ایک سینار جگ لوز پر بھی ہوگا؟“ عنبر نے کوفت سے پوچھا۔

”تم چپ رہو جی۔ آپ فرمائیے۔“

”علیکڈھ میں انکا بجر تھا۔“

”ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں؟ گڈ ہیونرز۔“

”ڈونٹ بی ڈانٹ۔ ضلع کے ایک رئیس کے ہاں۔ بہت زیادہ شوخی سے نرنہ
کر رہی تھیں۔ آگرے کی نامی گرامی گائیکہ زہرہ بانی بھی موجود تھیں۔ بڑی رکھ رکھا
والی۔ قتالہ عالم کے عشوے انہیں خوش نہ آئے۔ تنبیہ نہ کرتیں مگر جلسے کے بعد ۳۱
آفت جاں نے بانی صاحبہ کی سادگی اور سنجیدگی پر فقرہ کہا۔ انہوں نے کہا۔ بیو
محض موسیقی میرا ذریعہ معاش ہے۔“

”حساس اور خود دار بھی بہت تھیں۔ اس روز سے حسن فروشی ترک کی۔ باغیہ
مزاج کی وجہ سے خرید و فروخت کا قانون البتہ اُلٹ دیا۔“

”اسی زمانے میں وہ وائسرائے والا مشہور واقعہ ہوا۔ آٹھ گوہر اپنی چوکرٹی پروڈیا
چکر میں ہوا کھار ہی تھیں برابر ان کا نیا جگ لوز براجمان تھا۔ چو بدار پیہ۔“

ہڑا تھا۔ کرسس سیزن تھا۔ واٹسراے شاید لارڈ ریڈنگ کی چوکرڈی سامنے سے آرہی تھی۔ قریب آئی تو گوہر جان نے نیم قد ہو کر لاٹ صاحب کو دس کیا۔ جو با لاٹ صاحب نے بھی زپ اتار کر سلام کا جواب دیا۔ گاڑی ذرا آگے نکلی تو ایک اے۔ ڈی۔ سی نے کہا۔ یو ایکس نی پ نے یہ کیا غضب کیا۔ وہ عورت تو اس شہر کی مشہور طوائف ہے۔

” واٹسراے بہت بھنایا۔ دوسرے روز غیر معمولی سرکاری گزٹ کی رو سے ممانعت کر ہی گئی جب تک واٹسراے یا گوئر پبلک میں خود کسی ہندوستانی کو مخاطب نہ کرے کوئی نیٹو مو WISH نہیں کر سکتا۔ اس بات پر اخباروں میں ایک سیاسی مباحثہ شروع ہوا۔ ایک انگریزی اخبار نے لکھا کہ کلکتہ کی طوائفیں عرصے سے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ ۱۸۴۵ء میں کلکتہ کے اخباروں میں انگریز ماسلہ نگار شاکی رہتے تھے کہ اسٹریٹ پر نیٹو ناچ گرنز گھیموں پر ہوا فوری کے لیے نکلتی ہیں ان کی ممانعت کی جاتے۔ اور آج تک وہی حال ہے۔ وغیرہ وغیرہ ” پھر بھی اس عہد کے طائفے گوہر نے بہت عزت حاصل کی تھی۔ دالیان ریاست کے درباروں میں انکو کرسی ملتی تھی۔ بڑی AWARE بیوی تھیں۔ ان کے ڈرائنگ روم ب طرح طرح کے اخبار رکھے رہتے تھے۔ کلکتہ کے سرداؤد سیٹوں کا عبرانی اخبار جو عربی رسم الخط میں کلکتہ کے بعد دی یہودیوں کے لیے چھپتا تھا وہ بھی پڑھتی تھیں۔ کلکتہ کا فارسی اخبار جل آلتین۔ شہر کے ارمنی اور انگریزی اخبار سب میں نے انھیں پڑھتے دیکھا۔ ان کے جہاں سے میں انگریزی فلمی رسالے مانگ لایا کرتی تھی۔ نیویارک کا ٹوڈیز ویلی۔ لندن کا ایسکوپ اور پکچر شو اور ڈرامہ۔ انکا آخری جگ لو۔“

”یہ ایک افسانے کا عنوان ہو سکتا ہے۔ آخری جگ لو۔“

”چنی لال۔ سوداگر بچہ۔ دیوالیہ ہوا تو زیور ساٹھ ہزار میں گروی رکھ کر اسکی مدد کی۔ ہانگی ساری دولت اور جائیداد ہٹ کر گیا۔ یعنی ایک اور کلاسیک پٹرن۔ نواب بانی چال باز کے جہاں سے میں آکر تباہ و برباد کلکتہ پہنچیں اسوقت گوہر جان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ چند سال بعد انکا وہی حشر ہوا۔ مطلب یہ کہ بکو تب بھی گھٹا۔ خرید و تب بھی۔“

”کامل مساوات کی دعویٰ دانتی عورت کا روم میٹ جب غایب ہوتا ہے عموماً

خانہ داری کے بل وہی چکاتی ہے۔ اولاد بھی اسی کے ذمے۔ ملکہ ارمی کو انگریز نے دھوکا دیا۔ انکی بیٹی گوہر کو ہندوستانی اور نواب بانی کو بلجین نے۔ ان تینوں میں اور باعزت، جدید ترین مغربی عورت کی سچویشن میں مجھے تو کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اخلاقیات کے محض پیمانے بدل گئے ہیں۔“

”اسی مولویانہ منطق کی وجہ سے یہاں عورتیں جائیز آزادی حاصل نہیں کھاتیں،“
”جائیز و ناجائیز بھی اضافی اصطلاحات ہیں“

”جب حکومت نے چوگرٹی پر سواری کی ممانعت کی گوہر نے کلکتہ ہی چھوڑ دیا۔“
”اس زمانے کا کلکتہ نہایت FASCINATING رہا ہوگا۔“

”ایسا دلچسپا۔“ عندلیب بانو نے ایک آہ بھری۔ ”شہر سے باہر امرار کے گارڈن ہاؤس۔ ویلز کی کے علاقے میں ان کے عالی شان مکانات۔ پارک اسٹریٹ پر نواب بہادر مرشد آباد کا محل۔ ٹالی گنج میں ٹیپو سلطان کی اولاد۔ بمبؤ و لاہور میں نواب مظفر جنگ کی۔“
”اُمی سوشلسٹ ہیں“ عنبر نے پھر چپکے سے منصور کے کان میں کہا۔

”شام کے وقت لوگ باگ اپنی اپنی بگھیٹوں اور موٹر کاروں میں ولایتی چکر کے چکر لگاتے۔ باغ کے وسط میں انگریزی مینڈ بجا کرتا۔ کلکتہ بڑا انٹرنیشنل قسم کا شہر تھا۔ چائینا ٹاؤن کے چینی۔ تھیٹر اسٹریٹ کے یہودی۔ کولوٹو اور ارمی ٹولہ کے ارمی۔ فری اسکول اسٹریٹ کے اینگلو انڈین۔ ان کی حسین لڑکیاں۔ یہ کچھ قانون قدرت ہے۔ کہ مخلوط النسل اولاد عموماً زیادہ حسین ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہی یوریشین لڑکیاں ان دنوں خاموش فلموں کی ہیروئن ہوا کرتی تھیں۔

”وہ رڈولف ویلینڈ کا دور تھا۔ ایک ہینڈ سَم پنجابی نوجوان ولایتی فلموں میں کام کر کے مشرق کارڈولف جیمینو کہلانے لگا تھا۔ شیخ افتخار الرسول۔“

”اے لیجئے۔ آپ نے پٹاری میں سے ایک اور گڈا نکالا!“

”یہ حضرت قانون پڑھنے ملتان سے لندن گئے تھے۔ بیسٹربنے کے بعد انگلش فلموں

بن کام کرنے لگے۔ گارڈن اف اللہ شیمڈواف دی حرم شہزادہ سرینٹ اف دی نائل۔ میں نے یہ سب فلمیں یوجینی کے ساتھ جا کر دیکھیں۔ وہ رقاص بھی تھے۔ اودے شنکر سے برسوں پہلے انھوں نے بوڈاپسٹ وی آنا وغیرہ میں ہندوستانی رقص پیش کئے۔ لیکن ٹوبزنس کی شہرت چند روزہ ہوتی ہے۔ آج کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔

” شاید ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ شیخ صاحب انگلستان میں ایک انڈین ٹاکی بنا رہے تھے۔ لالہ رخ۔ اس کے لیے یوجین نے مجھ سے کہا۔“

” ارے پھر آپ کیوں نہ گئیں ؟“

” ماما کی حراست! سترہ سالہ اور نابالغ! ایک دفعہ چند رنگر بھاگتے کا نتیجہ دیکھ چکی تھی۔ پھر بھی راتوں کو جاگ جاگ کر بہت منصوبے بناتے۔ بندرگاہ پہنچ کر جہاز پر چڑھ جاؤں۔ پھر طرح طرح کی خوفناک ممکنات کا خیال آتا۔ بردہ فروشوں کے ہاتھ پڑ گئی تو وہ ٹرل ایسٹ میں اتار لیں گے یا شنگھائی پہنچا دیں گے۔ اگلے سال رینی اسمتھ عرف بیتا دیو کی ایک فلم ایکٹرس تھی وہ انگلستان گئی۔ مس بلبلی اسی طرح تھیٹر میں سہیلیوں کے ناچ اور سوٹو ناچاکیں۔ یہی ذریعہ آمدنی تھا۔ دوسری اینگلو انڈین رقاصوں کی طرح۔ مس بنسن، مس ڈورین عرف مس منجری وغیرہ۔ میرا نام بھی اشتہاروں میں چھپتا؛ مس اینڈی ریٹال عرف مس بلبلی۔ جی چاہتا تھا کٹر کی سے کوڈر خود کشی کر لوں۔“

” ذہنی فرار کا واحد راستہ بائیسکوپ تھا۔ اور وہ اداکار خالص بردمانس۔ گریٹا گار بو۔ پولائیٹکسی۔ نور مائلیج۔ کلا رابو۔ للین گیش۔“

” اگر آپ ٹوڈی ایکٹرس بن جاتیں تو آپ کی زندگی کچھ مختلف ہوتی ؟“

” پتہ نہیں۔ مگر میں ہر قیمت پر ماما کے چنگل سے آزاد ہو کر یوریشین ڈانسرز کے اس سرکٹ سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ انہیں دنوں غالباً ۱۹۲۸ء میں ایک اردو سالے میں اشتہار دیکھا۔

اے۔ آر۔ کاردار کی طرف سے۔ انہوں نے ایک ٹاکی فلم کمپنی لاہور میں قائم کی تھی۔ ” اس اشتہار کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں۔“

’تجربہ کار حسین اور چالاک ایکٹرسوں کی ضرورت
 نا تجربہ کار لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ ایک سو سے پانچ سو ماہوار تک،
 ’میں نے فوراً درخواست بھیجی والدہ نے وہ خط پکڑ لیا اور مجھے خوب مارا۔
 ’انہیں دنوں ۱۹۲۰-۲۱ میں سر ڈیجینی نائیڈ و عطیہ فیضی کملا دیوی چٹوپادھیہ
 وغیرہ اخبارات میں بیان دے رہی تھیں کہ شریف لڑکیوں کو فلموں میں کام کرنا چاہیے
 میں تو شریف بھی نہ تھی مگر ماں کو یقین تھا ایک بار لاہور یا بمبئی گئی اور ان کی گرفت سے نکلی۔
 ’سلسلہ میں لاہور میں ایک فلم بن رہی تھی۔ اس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی
 فلم کا نام افغان شہزادہ اناؤنس ہوا تھا۔ خواجہ حسن نظامی اس کے ڈائریکٹر تھے!
 کلکتے میں THE FATAL NIGHT بن رہی تھی مکالمہ نویس مولانا ابوالکلام آزاد!‘
 ’نوکلنگ۔‘

’اور وہ خاموش فلم۔ ڈارک اینجل۔ اسے تھیٹف ان پیرا ڈائیز۔ ڈیزرٹ برائیڈ۔
 سیرینیڈ۔ ڈون جواں۔ بولتی فلموں میں ایسا کرسٹی۔ برودو سے میلڈمی الومات دی سراؤ تھیز۔
 ریورٹا۔ ہندوستانی خاموش فلمیں۔ اندرا دیوی کی عمرنی دلیر۔ سلو خیا کی انارکلی۔‘
 دفعتاً وہ سنس پٹریں۔ گلو ریاسوان سن۔ ویلما سکی۔ شیخ افتخار الرسول۔ !!

”WHERE ARE THE SNOWS OF YESTERYEAR?”

حُسنِ بخش نے دروازے میں سے جھانکا۔
 ’گلے تین چار روز میں میں تم کو باقی داستان بھی سُنا دوں گی،‘ کرسی پر سے اٹھتے
 ہوئے بولیں ’میں نے تم سے کہا تھا۔ مہربات صحیح، بلا کم و کاست ہونی چاہیے۔‘

لیکن ڈاکٹر منصور کا شعری کے ذہن میں ایک بات کھٹک رہی تھی۔
 غنبر ڈاکٹر دہس، بیگ کہلاتی ہے تو عندلیب بانو نے کچھ دیر قبل اسے اتنے طنز
 سے ’سید زادی،‘ کہہ کر یوں مخاطب کیا۔

(۱۹)

پھول والی گلی

” آج میں حین بخش کو ساتھ لے کر چوک گئی تھی عنبر کے BIG BOX کے لئے چکن کی ساریاں وغیرہ خریدنے کے لئے۔“

” بیگ بوکس۔؟“

” HOPE CHEST“

” —————؟“

” نہیں جانتے؟ مغرب میں لڑکیاں اپنے ٹروسوں کے لیے جو چیزیں خرید خرید کر ایک صندوق میں جمع کرتی جاتی ہیں وہ ہوپ چیسٹ کہلاتا ہے۔ میں برسوں سے عنبر کے لئے۔“

” اوہ۔“

” دکھلاؤں۔؟“

دوسرے اتوار کو منصور ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسنر بیگ کی باقیماندہ رام کہانی سننے کے لئے سہمہ تن گوش تھا۔ اب وہ یہ کہانی سننا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کر رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئیں اور پلاسٹک کے بیگ لاکر دیوان پر پھیلا دیئے چکن کی ایک بیش قیمت ساری نکالی ”دیکھو سلی گار دیں جو بڑے میاں ملے تھے ان جیسے خستہ حال و شیقہ داروں اور دیوالیہ نوابوں کی بیویاں اور بیٹیاں یہ لاجواب چکن کاڑھتی ہیں۔ انتہائی معمولی اجرت پر۔۔۔ دولت مند کاروباری سارا منافع خود وصول کرتے ہیں۔“

” ایک ایرکنڈیشنڈ دوکان کی کھڑکی میں ایک سجد بوڑھا لاغر سوزن کار آٹھ کے بالکل قریب لے جا کر چکن کاڑھنے میں منہمک تھا۔ میں نے سفید براق گدی لیے پر ہر اہمان سیدھے سے پوچھا آپ ان بزرگ کے لئے عینک کیوں نہیں بنوا دیتے۔ اس نے سینگرمی

سے تہقہمہ لگا کر جواب دیا۔ سگیم صاحب۔ یہ پرانے چاؤل ہیں۔ سینک بجیر ہی کام چلا لیتے ہیں۔
مجھے اتنا غصہ آیا کچھ خریدے بنا اٹھ کر باہر آگئی۔
”جانڈی بازار میں آگے بڑھی۔ پھول والی گلی تک پہنچی۔ معاوہ پچپن برس قبل کا
زمانہ آنکھوں میں پھر گیا۔ صاف ستھری گلیاں۔ دوکاندار، خریدار معطر۔ ہر دوکان سے خوشبو
کی بیٹیں آتی تھیں۔

”حسین بخش بھوتوں کے رکھوالے، گریک کوئس کی طرح ساتھ ساتھ چل رہے تھے حضور وہ
اس سامنے والے کوٹھے پر بیٹن رہتی تھیں۔ مجرم میں انکا اپنا تعزیر نہ نکلتا تھا۔ بال کھولے
ننگے پاؤں نوحہ پڑھتی ہوتی جاتی تھیں۔ ادھر جلی خورشید۔ وہی جو کنگوے بازی کی اسناد
تھیں۔ مہ لقا اور زہرہ اس طرف رہتی تھیں۔ اور اللہ رکھی۔

”ادھر خواجہ عزیز لکھنوی کی محلہ ہے۔ ابا عزیز منزل میں بانو بیٹا کے دادا کے
ہاں کھانا لکاتے تھے۔ چیلے آپ کو بانو بیٹا سے ملو انہیں؛ اللہ رکھی نے ذکر کیا تھا کہ وہ
اس محلہ کی شادیوں میں گا چکی تھیں۔ خاقانی ہند کی زندگی میں یہ خیابان شیراز سمجھی جاتی تھی
لیکن میں تجاہل عارفانہ سے یہ سب سنا کی۔ اگر میں بے چارے حسین بخش کو بتلاتی تھی کہ پچپن
برس قبل میں خود اس پھول والی گلی میں ان گانے والیوں کی مہمان کی حیثیت سے آچکی
ہوں یقیناً بے چارے کا SHOCK کے مارے دم نکل جاتا۔“

”آپ رین اسٹریٹ کلکتہ سے یہاں۔“ منصور نے تعجب سے پوچھا۔
”ایسا ہوا کہ آئنٹ گوہر نیوا لفریڈ کی چیف ایکڑس تھیں۔ انھوں نے مجھے کورس گریڈ
میں بھرتی کر دیا تھا۔ کمپنی تماشا دکھانے لکھنؤ آئی۔ مجھے بھی آنا پڑا۔ مہا ساتھ نہیں آئی تھیں
مگر انکے بجائے گوٹھر جان مجھ پر کڑی نگرانی رکھتی تھیں۔ کہیں بھاگ نہ جاؤں۔“
”اگر وہ اتنی باشعور خاتون تھیں وہ بھی کیوں چاہتی تھیں کہ آپ اس زندگی کو ترک
نہ کریں؟“

”انکا کہنا تھا کہ اس ہندوستانی سوسائٹی میں مجھے عزت نہ ملے گی۔ بعد کے تجربے
سے ثابت ہوا کہ انکا قول غلط نہ تھا۔“

”مسز بیگ محض ہندوستانی سوسائٹی ہی کیوں۔ ہر قدامت پرست سماج کے رویے یکساں رہے ہیں۔ کنگ ایڈورڈ کو تو محض ایک مطلقہ کی وجہ سے تخت چھوڑنا پڑا تھا۔ آج بھی کوئین ایلزبتھ کیا کسی ایکڑس کو بہو بنا لیں گی؟“

”تم میں نے محسوس کیا ہے ESTABLISHMENT کے طرفدار ہو۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔ لیکن وہی عادت ہے۔ معاملات کو انکے صحیح تناظر میں۔۔۔“

”خیر۔ چوک کا قصہ سنو۔ آج میں نے دیکھا کہ چوک کی رونق کا وہی سماں تھا۔ صرافوں کے ہاں چاندی کے نتھے منے علم اور نیچے اسی طرح بک رہے تھے۔ گل فروش بھی موجود تھے۔ اندر ریحیدار لگیاں اسی طرح آباد تھیں۔ فرق محض یہ تھا کہ بالاخانوں سے طوائفیں غائب ہو چکی تھیں انکی جگہ عام عزت دار شہری بسے ہوئے تھے۔ نیچے بازار میں بے پردہ ہندو مسلمان خواتین کے غول۔ جو خریداری کرتی پھر رہی تھیں۔ اس وقت اس علاقے کے شرفاء کی بیگمات پردے سے منڈھی پالکیوں میں نکلا کرتی تھیں۔“

”حسین کی مسجد کے نزدیک اصغر علی محمد علی کی جنابڈنگ نظر آئی۔ حسین بخش فوراً بولے۔ حضور اس جگہ پر نہو! پتو آکا بڑا عالیشان مکان تھا۔ جو انھوں نے کسی نواب سے خریدا تھا۔ حضور وہ آپ کے کلکتے میں ایک گورہر جان ہو کر تھیں۔ آغا میر کی ڈیوڑھی پر جن نواب صاحب کے ہاں ہمارے چچا ملازم تھے وہ بھی انکے بڑے قدر دان تھے۔ انکا ایک نام لیوا اب بھی زندہ ہے۔ قریب ہی ایک گلی میں رہتا ہے بُری حالت میں۔“

”میں چونک پڑی۔ اور حسین بخش کی قابل ہو گئی۔ واقعی شہر خیر و تھے۔“

”پھر بولے چلیے آپ کو مرزا محمد عسکری کے مکان پر لے چلیں جہاں میر انشاہ آن کر ٹھہرے تھے۔ مرزا محمد عسکری کی پہلی بہو ایک یورپین لیڈی تھیں۔ وہ وارثی فقیر بن گئیں۔ مرزا صاحب مرحوم کے ایک پوتے یہاں بنک کے بڑے افسر ہیں۔“

”چلیے آپ کو انکی والدہ اور بیگم سے ملو ادیس۔ انکے ہاں ہمارے چھوٹے چچا کھانا پکاتے تھے۔ بادشاہ پسند وال انکی مشہور تھی۔“

”میں نے کہا حسین بخش میں ان تمام پرانے گھرانوں سے ملتی پھری جہاں آپ کے

بزرگوں نے فن طباطبائی کے جوہر دکھلائے تو یہیں سویرا ہو جائے گا۔ میں گوہر جان کے ایڈیٹور سے ملنا چاہتی تھی۔ کہا چلیے ان بڑے میاں سے مل آئیں۔

”میری اس فرمائش پر انکو تعجب ہوا۔ کہاں جائیے گا اندر گلی کوچوں میں — میں نے فوراً بات بنائی کہ مجھے کلکتے کے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں کوئی کلکتے والا نہیں ملتا۔ بادل ناخواستہ ہمراہ چلے۔ پھول والی گلی سے نکل کر کوچہ میرا نہیں میں مُڑ گئے۔ کچھ دور جا کر ایک ڈیوڑھی پڑھنے والے۔ اندر گئے پھر مجھے بلایا۔

”ڈیوڑھی میں ایک مفلوج و معتدور بوڑھا کھاٹ پر پڑا تھا چیتھروں میں پلٹا۔ حسین بخش نے چلا کر اس سے کہا یہ کلکتے کی بیگم صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔

”کلکتے — میں نے بھی چلا کر کہا — جہاں گوہر جان رہتی تھیں۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا بولا۔ گوہر جان کیسی ہیں؟ خیریت سے ہیں؟

”میرا دل دکھا۔ اس بے چارے کا خیال تھا وہ اب تک زندہ ہیں۔ میں نے جواب دیا ہاں خیریت سے ہیں آپ کو سلام کہلوا یا ہے۔

”وعلیکم السلام۔ اس نے طمانیت سے جواب دیا۔ بڑی نیک دل بیوی ہیں۔ ہم جیسے غریبوں کو یاد رکھتی ہیں۔

”میں نے کہا آپ کلکتے میں کب تک تھے؟ کہنے لگا بیگم صاحبہ میں گارڈن ریج میں مستری تھا۔ گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ گوہر جان کے نامک دیکھا کرتا تھا۔ میری کیا حیثیت تھی کہ انکے گھر پہ جا کر گانا سنتا۔ بس ایک دفعہ ہمت کر کے پہنچ گیا تھا۔ انکے پیر سے نے گول کمرے میں بٹھایا۔ لیونیڈ کا گلاس لا کر دیا۔ بولا آج شام کو محفل ہے۔ تم بھی باہر بیٹھ کر سن لینا۔ اس طرح بس ایک مرتبہ انکا گانا سنا۔

”اب آپ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کہنے لگا۔ کیا کروں بیٹی کوئی ہے نہیں جو خیال رکھتی۔ بیٹا ہو ساتھ نہیں رکھتے۔ ان پجواروں نے اپنی ڈیوڑھی میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ دس روپیے انکو دے کر بیڑھیاں اتر آئی۔ میرا نہیں کے مکان کے سامنے گزری تو خیال آیا واہ

— دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت تو انہیں نے پہچانی تھی —
 ”یہ آج صبح کا ذکر ہے۔ جب میں نے اس جہان رفتنی و گذشتنی میں آخری سانسیں
 لیتے، گوہر جان کے شاید آخری مداح کو دیکھا۔ لیکن میں بات کر رہی تھی اس زمانے
 کی جب میں یہاں نیو الفریڈ کے ساتھ آئی تھی —
 ”رفاہ عام کلب کے سامنے میڈنر کھیٹر کا منڈوہ بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر مٹی کا
 اونچا پلیٹ فارم چوٹی والوں کا درجہ کہلاتا تھا۔ شاید خوبصورت بلا دکھلایا گیا تھا۔ گوہر جان
 برسوں پہلے بندادین سے ناچ سیکھنے لکھنؤ آچکی تھیں۔ اسی مرتبہ جب پیالہ پی کر
 ڈیسرے داڑھی تھیں۔ اس بار انہوں نے ایک کوٹھی کرائے پر لے رکھی تھی۔ شام کو ہوا تو
 کے لئے ٹمٹم پر نکلتیں۔ بھیر جی روڈ تھا ڈالال کے پل پر بندادین کا مکان تھا۔ جب
 فٹن سامنے سے گذرتی وہ اترتی اپنے گرو کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک کر آگے جاتیں۔ بندادین
 کے والد درگا پر شاد واجد علی شاہ کے استاد تھے۔ جب جان عالم میٹا برج گئے ہیں اس وقت
 بندادین شاید بارہ سال کے رہے ہوں گے۔ بچو ابھی انہیں کی شاگرد تھیں۔“
 وہ گلگانے لگیں ”کون ایسے کی نار۔ جھما بھم پانی بھرے —“

کچھ دیر بعد پھر بات شروع کی ”ایک روز آئنٹ گوہر کے ساتھ ہوا توڑی کیلئے
 چھاؤنی کی طرف گئی۔ راستے میں یورپیوں کا نوٹ کا بورڈ نظر آیا۔ اسی کے سٹر اسکول ٹورٹو
 ہاؤس کلکتہ میں میں نے پڑھا تھا۔ حلق میں کوئی چیز سی آن اگلی۔ میں اپنی بدقسمتی پر متحیر
 فٹن میں جیب چاپ بیٹھی رہی۔ ایک دن گوہر جان سیر کے لئے نکلیں تو لانا ٹینر گریز
 اسکول راستے میں پڑا۔ نیلے یونی فارم پہنے سفید قام اور اکا دکا سائلی لڑکیاں بیفکری
 سے ہنرے پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے آنسو ضبط کر کے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
 سکندر باغ کا چکر لگا کر گاڑی چوک روانہ ہو گئی۔

”اس روز چاندی بازار اور پھول والی گلی میں معمول سے زیادہ چہل پہل نظر آئی۔
 اور خوبصورت چوپہلوں کے ریل پیل۔ وہ نوجندی جمہرات کا دن تھا۔ ہم لوگ الٹا دکھی کے

ہاں پہنچے۔ وہاں بھی بسنت کے میلے میں جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔
 ”تب مجھے ایک بڑی خوفناک بات معلوم ہوئی، چوک کی نوچیوں کی ساری تعلیم و
 تربیت آج کے دن کے لئے کی جاتی تھی۔ یعنی ہر سال جو لڑکیاں گویا گریجویٹیشن کر چکی ہوتیں
 انکو بسنت کے میلے میں گویا انکے کانکیشن کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ عہد سعادت علیخان
 سے یہ رسم چلی آ رہی تھی شیعہ طوائفیں چوٹیوں پر درگاہ حضرت عباس کے میلے میں جاتیں۔
 سنی درگاہ شاہ مینا صاحب کے میلے۔“

”روسائے کرام چاندی بازار میں اپنے اپنے رستوگیوں کی دوکانوں پر آن کر بیٹھ جاتے
 ”مہرے چو پہلے اٹھائے سامنے سے گذرتے۔ نوچیاں بڑی اداسے انکو آداب تسلیم
 عرض کرتی نکل جاتیں۔ انکی نائیک کڈوں کے میٹر شکار پہلے سے ان دکانوں میں موجود رہتے۔
 جو لڑکی جس رئیس کو بھا جاتی وہ اپنا مصاحب خاص میلے کی طرف دوڑا دیتا اس موقعے
 پر یہ لوگ اپنی جو بلیاں جائیدادیں رستوگیوں کے ہاں رہن رکھ دیتے تھے۔
 ”ہندو امیر زادے بھی چو پہلوں کی اس پریڈ کے ملاحظے کے لئے موجود رہتے۔“

لیکن وہ ان اہل سلام کے سامنے ہٹ نہیں پاتے تھے۔ اتنے احمق نہ تھے۔
 ”جب میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ میں نے بھی یہ نظارے دیکھے ہیں۔“

مسنر بیگ صوفے سے اٹھیں۔

”گوہر جان کیا ہوئیں؟“ منصور نے انکے ساتھ ڈائمننگ روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔
 ”بڑا حشر۔ وہ بے چاری ایک NYMPHO خاتون تھیں۔ آخری جگ لوچی لال
 نے چونا لگا دیا۔ خوب ٹوٹا کنگال ہو گئیں۔ شاید مہاراجہ بڑودہ نے ترس کھا کر اپنے ہاں
 بلوایا۔ چارپانچ سو ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ سنا ہے بھارت بھی زائل ہو گئی تھی۔ جب مرے تو
 گنہام تھیں اور تنہا۔ انکی والدہ ملکہ جان بنارسی کا ایک شعر ہے۔
 ”وہ گور غریباں پہ آئے تو بولے یہ جنگل ہمارے بسائے ہوئے ہیں۔“

(۲۰)

نیک پروین

”بعض سترہ سال کلکتہ کے ایک بڑے کاروباری، امباپرشاد کی ملازمت میں مجھے
 اپن اسٹریٹ سے ٹالی گنج منتقل ہونا پڑا۔ تنخواہ۔ ہزار روپے ماہوار۔ موٹر۔ بنگلہ۔
 ”عالمی کسادبازاری کا زمانہ۔ امریکن کروڑپتیوں کی خودکشی کی خبریں چھپ رہی تھیں اس
 وقت۔ ہزار روپے ماہانہ بہت بڑی رقم تھی۔ ممانہاں اور میرا غم و غصے سے بُرا حال۔
 ”لیکن امباپرشاد ایک معقول انسان ثابت ہوئے۔ جس طرح کے قصے مہاراجستھان والے
 ٹھاکرہ مشور سنگھ کی نیکی کے سناتی تھیں۔ امباپرشاد بھی اسی قسم کے وضعدار اور شریف آدمی
 تھے۔ ان پڑھ میوٹی نیم پردے میں رہتی تھیں۔ نہایت مذہبی اور چھوٹے خاتون۔ امباپرشاد
 گوشت خور تھے۔ ان کے برتن بھانڈے بھی الگ کر دیے تھے۔ وہ اپنے گھر میں مہانوں کی
 طرح بسر کرتے لڑکے لڑکیاں جوان ہو چکے تھے۔ سیٹھ جی جوڑٹ کے کاروباری تھے۔ لکھنؤ
 کے کاسیٹھانکے داداجان عالم کے متوسلین میں شامل تھے۔ بادشاہ کے ہمراہ کلکتہ آئے تھے۔
 امباپرشاد بھی پرانی لکھنؤی روایت کے بید مہذب اور نفیس الطبع شاعر آدمی تھے۔ احقر
 تخلص کرتے تھے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ماہر فن مغینہ یار قاصد ان سے وابستہ رہتی تھی۔ اب
 ہفتے میں ایک دو بار وہ اپنے ٹالی گنج والے بنگلے پر آ جایا کرتے۔ پرانے لکھنؤی ٹاپ
 آدمی۔ مگر مہر رہتے تھے کہ جب ان کے ساتھ باہر جاؤں ہمیشہ انگریزی لباس پہنوں۔ تاکہ
 وہ ایک بلونڈ چھوٹے کمری کے ساتھ دلایتی چکر اور ریس کورس پر نظر آئیں۔

”جس سال ٹالی گنج پہنچی۔ انہیں رائے بہادر کا خطاب مل گیا مجھے بھاگوان
 سمجھنے لگے اب وہ ٹرف کلب میں میرا تعارف باقاعدہ جو نیر رائی کی حیثیت سے کرداتے

” مجھ پر ایک ادب دھن سوار ہوئی۔ کسی طرح کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کر لوں پھر ایف۔ اے۔ بی اے۔ ماما اور امبا پر شاد کی غلامی سے آزاد ہو کر اسکول پڑھاؤں۔ یہ خیال کبھی نہ آیا کہ بلبل دی ڈانس کو اسکول کی ملازمت کہاں ملے گی؟

” تعلیم سے میرا شدید شغف دیکھ کر امبا پر شاد نے اخباروں میں ٹیوٹر کی ضرورت مشہور کی۔ کئی نوجوان آئے۔ رائے بہادر نے انہیں ریجنٹ کر دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ سید زادہ قابل اعتبار معلوم ہوا۔ چالیس روپے ماہوار پر دو گھنٹہ روزانہ انٹرنس کے امتحان کی تیاری کروانے کے لیے مقرر کیا۔

” سید شکور حسین سنجیدہ۔ خوش قیافہ۔ مہذب۔ یعنی ایسا نوجوان جسے کوئی بھی مڈل کلاس شریف زادی برضا و رغبت بھینٹت یا خوند قبول کر سکتی تھی۔ مگر میں نہ مڈل کلاس شریف زادی۔ نہ وہ میرا خواستگار۔ بات بنے تو کیسے۔

” بیٹے منصور۔ میرے منصوبوں میں بڑی درائی تھی۔ چند رنگر جا کر نن بن جاؤں۔ منصور بہ فیمل۔ انگلستان جا کر لالہ رخ فلم میں ایکٹنگ کروں منصور بہ فیمل۔ لاہور جا کر لے۔ آر۔ کاردار کی فلم کمپنی جو ان کروں۔ منصور بہ فیمل۔

” اب تازہ ترین نہایت رومنٹک اور آئیڈیلٹک پلان یہ تھا کہ سید شکور حسین نے شادی کر کے پتی دوتا ہاؤس والیف بنوں وہ تلاش روزگار کے لیے کلکتہ آیا ہوا تھا والد مشرقی۔ یوپی کے کسی ضلع میں نائب تحصیل دار تھے۔ میں نے فوراً ایک مسلم مڈل کلاس گھرانے کا تصور کیا جس کا ایک اصول پرست نوجوان بطور قومی خدمت ستم رسیدہ نواب فاطمہ عرف نواب بیگم کی شامت زدہ لڑکی عندلیب بانو عرف بلبل دی ڈانس کو معاشرے میں واپس لانے گا۔ وغیرہ۔

” پچھلی مرتبہ فرار کے موقع پر درجن میری سے امداد طلب کی تھی۔

” یہ مسلم سماج کا معاملہ تھا۔ سوچا ماما کے بزرگان دین کو ٹرائی کروں۔ چنانچہ یا علی یا علی کا در شروع کیا۔

” لیکن نہ درجن میری پر اعتقاد تھا نہ ماما کے مذہب پر۔

” اب پڑھنے میں جی نہ لگتا۔ صبح سے شام تک سوچا کرتی ماسٹر صاحب سے کس طرح کہوں۔ جو ہوم ورک وہ دیں وہ نہ کروں۔ ایک روز انھوں نے مجھے بلا کر کہا رانی صاحب۔ رائے بہادر صاحب نے فرمایا تھا آپکو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ غالباً انکی خوش فہمی تھی۔ لیکن آپ نے دل لگا کر نہ پڑھا تو انکو کیا جواب دوں گا وہ سمجھیں گے پڑھانے کے بجائے بیٹھا آپ سے باتیں کرتا ہوں۔ مجھے برطرف کر دیں گے۔ یہی چالیس روپے میری کلہم آمدنی ہے۔

” ایک روز خوش خوش آئے۔ بولے۔ مجھے رائٹرز بلڈنگ میں کلرکی مل گئی ہے۔ ستر روپے ماہوار۔ ڈپارٹمنٹل امتحان کے ذریعے ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ میں رائے بہادر صاحب سے عرض کروں گا۔ صبح کے بجائے شام کے وقت آجایا کروں۔

” میں نے فوراً ایک اور پلان بنایا۔ ہاں اب وہ بولشویزم وغیرہ دماغ میں بھر چکی تھی۔ انٹرنس پاس کر کے میں بھی ملازمت کروں گی۔ شادی کے بعد دونوں کامریڈ مل کر ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں حصہ لیں گے۔ جنگ آزادی میں شامل ہونگے۔

” بولشویزم کی وجہ سے پرانے PRO-BRITISH خیالات اور اپنے نصف یورپین خون پر ناز کرنے کا رویہ بھی زائل ہو رہا تھا۔ میری اس نئی کاپیلٹ کا ذمہ دار ایک انقلابی بنگالی آرٹسٹ پروڈیپ مکرجی تھا۔ رائے بہادر صاحب نے میرا مصوری کا شوق دیکھ کر چند ماہ سے اسے بھی لگا لیا تھا۔ تیسرے پہر کو وہ آکر پینٹنگ سکھاتا۔“

” چندرنگر کا نوٹ جانے کا خیال آپکو کبھی نہ آیا؟ بالغ ہونے کے بعد“

” نہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔ میں رائے بہادر کے فلیٹ سے بھاگ کر آیا انکو بتا کر کسی روز بھی چندرنگر جاسکتی تھی۔ اگر میں ان سے کہتی کہ میں اس قسم کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تو وہ اتنے شریف تھے حلافاً مرضی ہرگز نہ روکتے۔ یوریشین طبقے کو بہت سی ملاقات حاصل تھیں۔ میں اینگلو انڈین ایسوسی ایشن کو بھی CONTACT کر سکتی تھی۔ آسان ترین بات یہ تھی کہ برٹش انڈیا سے بھاگ کر چندرنگر پہنچ جاتی۔

کانونٹ والے ماما کے چنگل سے بچانے کے لیے بلجمر روانہ کر دیتے میرا آبائی وطن؛
 ”آپ کا آبائی وطن دراصل مغلوں کی دلی تھی۔“ منصور نے کہا۔ ”موسیورینال
 آپ کے لیے محض ایک نام تھے ایک تصویر جو آپ کی سنگھار منظر پر رکھی رہتی تھی۔
 اپنی والدہ — نواب فاطمہ سے جدا کر دی جاتیں۔ موسیورینال آپ کو اپنے ہمراہ بلجمر لے جاتے
 جہاں برسلز میں آپ کی پرورش آپ کی بلجیمن دادی اور پھوپھیوں نے کی ہوتی تو آپ ایک
 رومن کیتھولک بلجیمن لڑکی ہوتیں۔ جس کے لیے ہندوستان اور اردو زبان اور کتھک ناچ
 بے معنی تھے۔“

”درست“ عندلیب بانو نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور میں
 فرانس یا بلجیم کے کسی چرچ میں جا کر عبادت کرتی اور پٹی بورڈ ہاؤس وائف ہوتی۔
 ”لیکن بھیا اگر حالات بدستور ناسازگار رہتے تو مجھے وہاں بھی برسلز یا پیرس یا لندن یا
 برلن میں اسٹریٹ واکر ہی بنا پڑتا۔
 ”زندگی کی گاڑی اندھا دھند پٹریاں بدلتی ہے۔ کوئی اس کا انجن ڈرائیور نہیں ہے۔
 سب معاملہ اندھا دھند ہے۔“

”شکور حسین صاحب اب شام کے پانچ سے سات تک پڑھانے لگے۔ تیسرے پہر کوچہ
 سے پانچ پر دیپ مگر جی کے ٹیوشن کا وقت تھا۔ مگر اس ایک گھنٹے میں وہ واٹر کلر پینٹنگ کم
 سکھاٹا۔ بھاشن زیادہ دیتا۔ وہ کہتا۔ تم CAPITALIST سوسائٹی کا VICTIM ہے۔
 تم کو ایک پونجی تپتی EXPLOIT کر رہا ہے۔ تمکو اپنی شکتی کے بل پر سماج کو بدلنا ہوگا۔“

”میں نے اس کو اپنا ہمارا بنا لیا۔ شکور صاحب!

”TYPICAL بنگالی رومان پرست نوجوان — آنکھوں میں چمک آگئی۔ بولا بلبل —
 ڈرتا کیوں ہے؟ ہمت کر کے آج ہی اس کو بول دو۔ کل ہم تم سے پوچھے گا تم اسکو کیا بولا۔
 ”دوسری شام جب ماسٹر صاحب وارد ہوئے تو اس سے پہلے کہ میں پر دیپ کی رٹائی

” تھا۔ بے حد معقول۔ مگر وہ 1920's کا تربیت یافتہ کیوسلٹ تھا۔ اس زمانہ کے روس کی گلاس آف واسٹریوری کا مداح۔ لیکن میں خواہ شکور حسین ہی سہی سیکور

چاہتی تھی اور زندگی گزارنے کا SOCIAL SANCTION

” احترام اور سماجی اجازت کی شدید آرزو اس لیے تھی کہ آنکھ ایک بے عزت ماحول میں کھولی تھی۔ یہ احساس اب تک ہے۔

” قصہ کوتاہ۔ ماسٹر صاحب کی متوقع شادی کی اطلاع سے میں برق زدہ سی رہ گئی والدہ کی طرح پلک منتنی نہیں تھی لیکن اس وقت دوبارہ روپڑی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے التجا کی ماسٹر صاحب۔ مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔ میں آپکے لیے بڑا اچھا کھانا پکایا کروا گی۔ بالکل آپ کی نوکرانی بن کر رہوں گی۔ بالکل نوکرانی۔ مجھ سے شادی کر لیجئے۔ اب ماسٹر صاحب ہونفوں کی طرح میرا منہ تلکنے لگے۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ کیا کہہ رہی ہوں لیکن میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔ بس مجھے یہاں سے نکال لے جائیے۔ بے شامہ بائیسکوپ دیکھے تھے اور نیوا آفریڈ کٹانکوں کی رہرہیں ان کا اثر تھا کیا کہ مجھ جیسی میم جنہ اور یہ دہائیات اور تفسیر ٹیکل پوز اور ڈائلاگ۔

” اس زمانے میں ایک گرافون ریکارڈ نہایت مقبول تھا۔ بلبل ناشاد نے کچھ اس طرح فریاد کی۔ تو ماسٹر صاحب تو گم صم بیٹھے رہ گئے۔ نہ وہ مجھ پر عاشق تھے نہ اس قسم کی میلو ڈیسٹک عزمداشت کے متوقع۔ اور امپائر شاد جیسے مقدر آدمی کی منظور نظر کو بھگا لے جاؤ ہنس کھیل نہ تھا۔ عاشق ہوتے تو دوسری بات تھی۔ سر پہ کفن باندھ کر اڑا لے جاتے۔ سوچتے ہوں گے بڑے پھنسے۔

” سرمایہ دار سماج کی بے انصافی اور مظالم کے متعلق جو نکتے پردیپ نے ذہن نشین کرائے تھے سب بھول گئی۔ ماسٹر صاحب کے سامنے نہایت نجل، قابل جرم افسوس ناک حالت میں بیٹھی اٹنوبہا یا کی۔ اس وقت خیال آیا۔ پردیپ کو روک لیا ہوتا وہی میری طرف سے بات کر لیتا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ چلو بھئی اب باقی کل ۷ غنڈیسی بانو نے گھڑی دیکھی ” ذرا ماتا بدل کی دوکان پر ہو آؤں۔ امین آباد۔“

” کلا میکس پر پرنچ کر پرانے داستان کو بھی یہی تکنیک استعمال کرتے تھے۔“ منصور نے الجھ کر کہا۔ عنبریں اپنا بیگ اٹھائے کر بے میں آئی۔ عنذیب بانو دوسرے دروازے سے باہر گئیں۔ عنبریں نے کہا: باقی میں سنا دوں گی۔ مخقر کر کے۔ ورنہ امی تو یہ الف لیلہ جانے کب تک جاری رکھیں گی۔ نہ معلوم کیوں تمکو یہ سیر قیصر سنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنے یا نانی اماں کے بارے میں آج تک کسی کو ایک لفظ نہیں بتایا۔ نہ اسکی ضرورت ہے۔ یہاں وہ زیادہ تر لوگوں سے بات ہی نہیں کرتیں چہ جائیکہ انہیں آتم کتھا سنائیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ ستری بہتری برہی ہیں۔“

عنذیب بانو شاپنگ بیگ سنبھالے باہر جانے کے لیے کمرے سے گزریں۔ تلخی سے بولیں۔ میں یہ کتھا ڈاکٹر منصور کو اس لیے سنارہی ہوں کہ یہ صاحبزادے تم میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کو تمہارے متعلق پوری جانکاری ہونی چاہیے۔“

” امی جان۔۔۔“ عنبریں نے نرمی سے کہا۔ ”سید شکور حسین کو آپ کے متعلق پوری جانکاری تھی۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟ کوئی فرق پڑا۔۔۔؟“

عنذیب بانو کار میں بیٹھیں اور پھٹاٹک سے باہر نکل گئیں۔

منصور نے سگریٹ جلایا۔ دریچے کے سامنے چڑیاں چھپا رہی تھیں۔ باغ میں سے رام سروپ اور مگلیا کی تکرار کی آواز آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد عنبریں نے کہا: ”کوفت ہو رہی ہے اب آگے کے واقعات کیسے سناؤں۔“

”سننا کر ختم کرو۔“

”اچھا اُس نے ایک گہری سانس لیکر کہا شروع کیا: ”قصہ مخقر۔ سید شکور حسین کو ترس آگیا۔ فلو مینا کہا کرتی تھی اینڈ اسی بابا اس وقت ہیرے کا پورا سیٹ پہنے ہوئے تھیں۔ اس سیٹ نے ماسٹر صاحب کو آمادہ کیا۔ میرا خیال ہے یہ فلو کی زیادتی تھی، بہر حال چند روز بعد موقع محل دیکھ کر ماسٹر صاحب نے خود امبا پر شاد سے بات کی۔ ان جیسی درجنوں ناچ گریز بلکہ

تو فیصدی فرنگی خون والیاں آپ کو مل جائیں گی۔ مس بلبلی اس طرز زندگی کو ترک کرنا چاہتی ہیں۔ آپکے بلبلی خانے سے رہائی کی آرزو مند ہیں۔

” ابا پر شاد نے پوچھا۔ میرے ہاں آنے سے قبل انہوں نے اس طرز زندگی کو کیوں نہ ترک کیا؟ سید صاحب نے کہا۔ اس وقت ان کو موقع نہ ملا تھا۔ کم عمر تھیں اور ماں سے ڈرتی تھیں۔ ” سید شکور حسین اس وقت کچھ خدمت اسلام بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ یعنی ایک مسلمان لڑکی کو ہندو کی ملازمت سے علیحدہ کر کے اس سے نکاح کرنے میں ثواب دارین مفسر تھا لیکن بعد میں وہ چڑیل فلو مینا ہمیشہ وہی بات رٹے جاتی تھی۔

” خیر تو ابا پر شاد خلاف امید راضی ہو گئے۔ نیک سرشت آدمی تھے۔ بولے۔ ٹھیک ہے۔

لے جاؤ۔ ان سے کہا اگر تمہارا یہ گھر ہستی کا تجربہ کامیاب ثابت نہ ہو تو واپس آجانا۔ یہ بنگلہ تمہارے لیے مقفل رہے گا۔ انہوں نے جواب دیا۔ اب میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔

” اچھا نواب بیگم کو ہوا نہیں لگنے دی۔ بے چارے ابا پر شاد بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ ان ہی کی موٹر میں عندلیب بانو بیگم سید شکور حسین کے ساتھ ناخدا مسجد پہنچیں۔ برائے عقد۔ جانے سے قبل وہ سارا زیور جو ابا پر شاد نے انکو دیا تھا واپس کرنا چاہا۔ انہوں نے کہا گدھے پن کی باتیں مت کرو۔ ہم دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔ بالکل یہی بات ٹھہا کر مہیشور سنگھ نواب بیگم سے کہتے اگر وہ ان کے زیور واپس کرنا چاہتیں، ” اگلے وقتوں کے لوگ! ”

” ہاں مگر سید شکور حسین نے بھی عندلیب بانو سے کہا وہ ان کا ایک پیسہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ ان کے گھر پہنچتے ہی انہوں نے وہ بیہرے کا سیٹ اتار دیا۔ معمولی سوتی ساری پہن کر آغا حشر کی نیک پروین بن گئیں۔ ان کا باقی زیور بنک میں محفوظ تھا۔ ” اب کو تو لوہ کے اس تنگ و تاریک مکان میں محصور ہو کر چوہا جھونکنے میں مصروف ہوئیں۔ شروع کے چند روز یہ نئی گھریلو زندگی بہت روٹینٹ لگی مگر کھانا کبھی پکا یا نہیں تھا۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہاتھ برباد ہو گئے۔ کبھی سالن جل جاتا کبھی چپاتیاں۔ خاوند ناک بھوں چڑھانے لگے۔ خود بہت جلد عاجز آ گئیں۔

” نواب بیگم کو جب معلوم ہوا کہ ان کی لڑکی بھاگ گئی۔ انہوں نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ عاق کروں گی۔ ساری دولت یتیم خانے کو دے جاؤں گی۔ فلوپتاہرا تو ار کو کولو ٹو لو آنا کرتی تھی۔ وہ سب قصے سناتی۔“

” پر دیکھ ملکہ جی سے کبھی ملاقات ہوئی؟“

” تو بہ کرو سخت پردہ۔“

” شکور حسین کا برتاؤ کیسا تھا؟“

” بہت خراب۔ شروع شروع میں ٹھیک رہے۔ پھر اٹھے بیٹھے طعنے بازاری عورت میرے گلے پڑ گئی۔ عذاب جان ہو گئی۔ وغیرہ۔ بیوی خاموش۔ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکی تھیں۔ ٹھیک چھ مہینے بعد شکور صاحب اسی لڑکی کو جس سے ان کی نسبت طے ہوئی تھی۔ وطن جا کر بیاہ لائے۔ امی بتاتی ہیں وہ کپڑے دھو کر صحن کی الگنی پر پھیل رہی تھیں۔ شوہر یہ کہہ گئے تھے کہ والدین سے ملنے جا رہے ہیں۔ باہر گھوڑا گاڑی آ کر رکی۔ یہ خوش ہوئیں کہ آ گئے۔ وہ حضرت ایک برقعہ پوش کو لیکر اترے۔ اندر آ کر کہا لو بھئی یہ تمہاری بہن ہیں۔ ہماری نئی بی بی۔ دونوں بل جل کر رہو۔ اگر ایک نے بھی چیس پٹاخ کی تو دونوں کو کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا۔“

” اللہ اکبر۔ یہ تو پرانے اصلاحی ناولوں والا نقشہ معلوم ہو رہا ہے! یہ کب کی بات ہے؟“

” ۱۹۳۳! لیکن منصور بہت سے سماجی رویے اب تک کہاں بدلے ہیں؟“

” ابھی آپ کا نزول اجلال نہیں ہوا۔“

” بتاتی ہوں۔ یوپی سے آئی ہوئی سوتن نے حسب توقع امی کا ناک میں دم کر دیا۔ لڑائی جھگڑے۔ شوہر سے شکایتیں۔ امی صبح کو سو کر اٹھتیں تو انکے تکیے کے نیچے سے تعویذ اور پڑیاں نکلتیں۔ ایک دن پلنگ سرکایا تو ایک پاتے کے تلے سے ایک پتلا برآمد ہوا جس میں سوتیاں چھبی ہوئی تھیں۔ امی اس الا بلا کو کوڑے کے ٹین میں پھینکتی رہیں ”سوت۔ محلے کی ایک بڑھیا کے ذریعے ٹونے ٹونکے کر وارہی تھی۔ اب امی کو یہ

فکر ہو گئی وہ لڑکی اسی جہالت میں کچھ عرصے بعد کوئی زہر دہر کھلا کر انکے متوقع بچے کا کام نہ تمام کر دے۔

”فلومینا ہر سہفتے پابندی کے ساتھ امی سے ملنے آیا کرتی تھی۔ متوقع ولادت کی اطلاع نواب بیگم کو دے چکی تھی۔ سید صاحب نے بیوی کو زنا نہ ڈفرن ہسپتال کے جنرل میسنری وارڈ میں داخل کر دیا۔ وہیں میں پیدا ہوئی۔ فلومینا غریب موجود تھی۔ اس نے فوراً اسٹریبلڈنگ جا کر ابا کو اطلاع دی پھر اکرامی کو بتلایا کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بولے۔ لاجول ولاقوۃ۔ لڑکا ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ کچھ عیب چھپ جاتا کپنچی کی جنی سے کون شادی کرے گا۔

”مجھے دیکھنے بھی نہیں آتے۔ نواب بیگم بھی نہیں آئیں۔ فلومینا نے امی سے کہا۔ اینڈری بابا ہم ماتھ جوڑتا ہے۔ ضد چھوڑو بانی کے گھر چلی چلو۔ اسپتال سے سیدھی رپن اسٹریٹ چلو آج ہی۔ امی نے کہا۔ نہیں میں نے جان بوجھ کر گھر گھر ستن کی زندگی اختیار کی تھی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ ایک عام ہندوستانی عورت کی گھریلو زندگی BED OF ROSES نہیں۔ بس کم و بیش کافرق ہوتا ہے۔ اور اگر شوہر کی آمدنی کم ہو اور وہ بد مزاج بھی ہو اور بیوی کو وہ سماجی HANDICAP حاصل ہو جو میرا ہے اور شوہر سوت بھی لاجچکا ہو۔ تو سبحان اللہ۔ آلام و مصائب کا نسخہ مکمل ہے MY CUP BRIMMETH OVER

”بہتر حالات کی توقع ہی نہیں کرنی چاہیے۔
» دراصل امی بعد خود دار تھیں۔ اور اپنے کیے کو نباہ رہی تھیں۔

» چند روز بعد وہ گھوڑا کٹاری میں سوار ہو کر ڈفرن ہسپتال سے خود ہی گھر آگئیں۔ شوہر ایک بار بھی ہسپتال نہیں گئے۔ اب وہ مجھے بھی پالیتیں اور کھانا بھی پکاتیں۔ ستون دن بھر پلنگ پر چڑھی گریوٹون سنا کرتی۔ یا ان پر حکم چلاتی۔ طرح طرح سے ذلیل کرتی۔ اگلی شاید ازیت پسند ہو گئی تھیں۔ ساری تکلیفیں چپ چاپ برداشت کرتی رہیں۔
» انکو صرف ایک ہی شوق تھا۔ سینما۔ ایک اسکول ٹیچر پڑوسن مسز گھوش سے

دوستی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ شوہر کی اجازت سے کبھی کبھار پکچر دیکھ آتیں۔ مینٹی شو تاکہ وقت پر لوٹ کر کھانا تیار کر سکیں۔

” میری ولادت کے بعد سے نہیں جا پائی تھیں میں شاید چھ سات مہینے کی ہو چکی تھی۔ جب ایک روز فلومینا نے آتے کیساتھ ہی چپکے سے کہا۔ اینڈی بابا۔ گل حمید کا نیا پکچر آیا ہے۔ باغی سیاہی۔ اس میں اپنا اینیٹ میم صاحب بھی ہے۔ آ زور سی کر کے۔ ہم ایمر بابا کو سنبھال لے گا۔ تم گھوش میم صاحب کے ساتھ پکچر دیکھ آؤ۔ تمہارے کو تمہوڑا BREAK مانگتا —

”بانی دی وے — میرا نام عنبریں رائے بہادر امبا پرشاد ہی نے رکھا تھا۔ فلومینا نے انکو ہسپتال سے ٹیلی فون کر دیا تھا۔ انہوں نے فوراً یہ نام تجویز کیا۔ بڑے بڑے بٹری آدمی تھے۔ بے چارے فلومینا نے اس کو AMBER کر دیا تھا۔

” شکور صاحب نے اس نام پر کوئی رائے نہیں دی؟ “ منصور نے پوچھا۔

” وہ قطعی بے نیاز تھے — خیر تو اب بے چاری امی نے کہا۔ میں ماسٹر صاحب سے پوچھے بغیر کیسے جاسکتی ہوں۔ وہ اب تک انکو ماسٹر صاحب کہتی تھیں۔ فلومینا غصے سے بولی۔ اینڈی بابا۔ اب تمہوڑا ہمت سے کام لو۔ تم بھی تمہوڑا باغی سپاہی بن جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہارا دم گھونٹ کر مار ڈالے گا۔

” امی بھی اب تک اس قدر عاجز آچکی تھیں کہ شوہر کی بغیر اجازت سینما جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ سوت اس وقت محلے کی جادو ٹونے والی بڑھیا سے کھسے پڑیں مشغول تھی۔ فلومینا بھاگی بھاگی پڑوسن مسز گھوش کے ہاں گئی۔

” انہوں نے کہا۔ ہم باغی سیاہی دو ٹائم دیکھ آیا ہے۔ بے بی کو ہم رکھ لے گا تم اپنی میم صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔

” ابا اس وقت آفس سے نہیں لوٹے تھے۔

” رات کے ساڑھے نو بجے امی اور فلومینا سینا ہاں سے نکلیں۔ امی نے نقاب بھی الٹ رکھی تھی۔ اتفاق سے بھیڑ میں امبا پر شاد کا ڈرائیور نظر آ گیا۔ وہ انکی کار لیکر کہیں جا رہا تھا۔ روک کر امی سے کہا چلیے آپکو گھر تھپوڑ آؤں۔

” چنانچہ امی اور فلومینا امبا پر شاد کی کرسیوں میں سوار ہو کر گھر پہنچیں۔ امی نے ڈرائیور سے کہا کار گلی سے باہر ہی روک لے۔

” عین اس وقت آبا آگئے۔

” شاید کھانا کھا کر سگریٹ خریدنے نکلے تھے۔ پنواڑی کی دوکان کی طرف سے آرہے تھے انہوں نے امی اور فلومینا کو گھر سے دُور امبا پر شاد کی کار سے اترتے دیکھا۔

” اب گلی میں آگے آگے امی اور فلومینا، دم بخود۔ پیچھے پیچھے آبا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی قیامت برپا کر دی۔ گالیاں۔ تھپڑ۔ گھونسنے۔ لات۔ اس خشنی فلومینا اس دلائلہ کے ساتھ امبا پر شاد کے ہاں جانے کا سلسلہ کب سے جاری ہے۔؟ پھر ایک تھپڑ۔

میں تمہیں اسی وقت طلاق دیتا ہوں۔ جہنم رسید ہو۔ پھر ایک گھونسنہ۔ فلومینا نے امی کو بچایا اور کس کر ایک جھانپڑ موصوف کے رخسار پر رسید کیا۔ وہ چکر آگئے۔ فلومینا اب کو کئی اور پر تلگالی میں گالیاں دیتی ماسٹر صاحب پر پل پڑی۔ نہایت مضبوط، لیم شمیم دیونی سسی عورت۔ آبا دھان پان۔ پلنگ پر گر کر بازوؤں سے چہرہ بچایا۔ دوسری بیوی نے چیخ پکار مچائی۔ اینڈی بابا اپنا سامان باندھو۔ فلومینا نے امی کو حکم دیا اور ان کی سوتن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک دھپ اسے لگائی۔ گالیاں انگ بیلڈی ڈومن۔ ہمارا بچپسہ لوگ کو جان سے مارنے کے لیے جادو کی پڑیا منگاتا تھا۔ ہم پولیس میں رپٹ لکھا دے گا ماٹوم۔ امی نے ہاتھ جوڑے کہ اب بس کرے اور باہر جا کر گاڑی لاتے۔

” آبا فلومینا کے زرد کوب سے حواس باختہ بیٹھے تھے۔ امی نے اب ان کی پرواہ نہیں کی۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پولیس کے نام پر انکی دوسری بیوی

جواب ابھی واحد میوی تھی، سہم کر دوسرے کمرے میں جا گئی۔
 ”امی کو کھٹ سے طلاق مل چکی تھی لہذا انہوں نے اپنی چوٹوں کی پرواہ ہی نہیں
 کی جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں۔ سید صاحب چُپ بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔
 ”امی بتلاتی ہیں کہ جب ابا طلاق طلاق دھاڑے فلو مینا خوشی کے آنسو بہانے
 لگی۔ امی بھی کھل اٹھیں۔ مگر فوراً ہی ابا نے امی کی ٹھکانی شروع کر دی۔

”بہر حال اب تو امی چھٹکارا پا چکی تھیں۔“
 ”محض یہ ایک موقع تھا جب حنفی اسٹائل طلاق نہایت کارآمد اور بر محل ثابت ہوئی۔“
 منصور نے بے اختیار ہنستے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”ہاں اور وہ خوش خوش سپیننگ میں مصروف تھیں۔ اس دوران میں مسز گھوش
 پیسج پکار سنکر محسن کی دیوار پر سے جھانک رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر امی کو اچانک میں یاد آئی
 بھاگی بھاگی فوراً پڑوسن کے گھر پہنچیں۔ جاتے جاتے اپنا برقعہ گلی میں پھینکتی گئیں۔ مسز گھوش
 کے گھر سے میری ٹوکری اٹھائی۔ فلو مینا گاڑی پر آئی نظر آئی۔ امی کہہ رہی تھیں بالکل کو تین
 وکٹوریہ کی طرح بڑے فاتحانہ انداز سے کوچ میں بیٹھی تھی۔

”چند ماہ قبل شکور صاحب نے اپنی دوسری بیوی کے چند معمولی سے زیور اور امی کا
 بچہ قیمتی ہیروں کا سیٹ صندوقچے میں رکھ کے اپنی ذاتی الماری میں مقفل کر دیا تھا
 جب یہ لوگ گاڑی میں سوار ہو کر کو لو لو کہ سے نکلیں رین اسٹریٹ کے راستے میں فلو مینا کو
 اچانک وہ سیرے یاد آتے۔

”امی نے کہا لعنت بیچھو۔ DAMN HER — DAMN THEM

”فلو مینا نے دہرایا۔ DAMN HER بٹ یہ ڈاؤن اس جادو گر نی

کی قیمت کا تھا۔ — BLOODY BITCH

”امی نے جواب دیا۔ GOD BLESS THE BITCH

”بٹ اینڈی بابا اس جادو ٹونا پکا تھا۔ تم کو گھر سے نکال دیا۔

”امی خوب نہیں۔ بویں فلو مینا۔ DONT TALK NONSENSE

”وہ بولی اوہ نو اینڈ سی بابا۔ جے پور میں گجر بانی کا چھو کرمی لوگ بانی کے خلاف کام کروایا دیکھو بانی پر کتنی مصیبت پڑی گھر سے بے گھر ہوا۔ حویلی ہاتھ سے گئی۔ منہ چھپا کر بے پور سے بھاگا۔ صاحب دھوکہ دے کر بھاگ گیا۔ کلکتہ آکر ہاؤس کو کتنا مشکل ٹائم دیکھنا پڑا۔ بابا۔ یہ ورلڈ ایک بھیانک جنگل ہے۔ اس میں رہنے والا ہم لوگ بے عقل جانور لوگ ہے۔ دوسرا جانور لوگ اگر چالاک ہو تو بے عقل جانور کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اونٹنی گوڈ سب جانتا والا ہے۔

”امی بتاتی ہیں کہ فلو مینا اسی طرح اپنا ذاتی فلسفہ بیان کرتی گئی جھلیلیوں والی بند گاڑی خواہیدہ شہر کی سنان روشن سڑکوں پر سے گزرتی رہی۔ گھوڑوں کے ٹاپ کے علاوہ مکمل ستانہ۔ سڑک کی روشنیاں جھلیلیوں میں سے چھین کر فلو مینا کے سیاہ فام چہرے پر پڑتیں تو وہ بڑی پراسرار معلوم ہوتی۔ ہزاروں برس پرانی روح۔ ٹینگ والے اجتماعی لاشعور کی مفسر۔

”ادھر امی اپنی بائیس سالہ زندگی کے انقلابات پر حیرت زدہ مہیٹی تھیں۔ ریپن ٹیٹ آگئی۔ فلو مینا نے اوپر جا کر خواہیدہ نواب بانی کو جگایا۔ بانی گوڈ کو تمینک یو بولو۔ اینڈ سی بابا آگیا۔ ایمیر بابا آگیا۔ دوسری صبح ہی سے میرے لیے ایک آسامی کرسمین NANNY کا انتظام کیا گیا۔ نواب بیگم امی سے جدائی اور ان کی شادی کے صدمہ سے نڈھال تھیں۔ صحت بھی بگڑ چکی تھی۔ اب وہ امی کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لہذا جب امی نے ان سے کہا۔ محض اس شرط پر ان کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں کہ وہ انکو پرانی زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں گی نہ تو اسی جب بڑی ہوگی اسے اس لائین کی ٹریننگ دینے کی کوشش کریں گی۔ نواب بانی یہودی مالک مکان کی دوکان میں سا جھے دار بن چکی تھیں۔ خامی آمدنی تھی۔

”امی نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ٹیائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھا۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر ایک اسکالرش فرم میں درخواست روانہ کی۔ وہاں اسٹنو گرافر کا کام مل

گیا۔ یورپین ورکنگ گرل کی وضع اختیار کر کے کلائیو اسٹریٹ جانے لگیں پہلے روز جب دفتر سے خوش خوش لوٹیں ہیٹ اتار کر فلو مینا کو دیتے ہوئے کہا آج زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو ایک کارآمد، باعزت اور خود مختار ہستی محسوس کر رہی ہوں۔

” دفتر کے اسکاٹ نوجوانوں کے ساتھ شام کو پکچر جاتیں گریٹ ایسٹرن جا کر بال روم ڈانس کرتیں۔ فریو میں چارپیتیں اپنی اس نئی من بھاتی زندگی سے بے حد مطمئن تھیں۔ نواب بیگم کو ایک اجنبی لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک یورپین آفس گرل جو گویا بطور انکی PAYING GUEST گھر میں مقیم تھی۔ امی اپنی چھپس سالہ زندگی میں اب تک لوٹو ہاؤس کی ایک یوریشین طالب علم، تھیر کی یوریشین رقاصہ ”مس بلبل“، ایک ہندو ریس کی پابند اور ایک ایل۔ ایم۔ سی مسلمان ہاؤس وائف اہلیہ شکور حسین بن چکی تھیں۔ اور اب ایک بار پھر اینڈی ری نال تھیں۔ کلائیو اسٹریٹ پر ایک ٹوٹ کی فرم میں کام کرنے والی اینگلوانڈین سکریٹری — حیرت انگیز بات تھی نا —؟

” جب سکنڈ ورلڈ وار چھڑی۔ امی نے طے کیا (WAC) جو آن کر کے فرنٹ پر چلی جاتیں۔ نانی اور فلو مینا اور ایک عدد آسامی آیا تو مجھے پال ہی رہی تھیں۔ امی کو میری زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ اپنے آپ میں لگن تھیں۔ بے چاری کو زندگی میں پہلی بار اپنی من مانی کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ اپنی اس نئی آزادی پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔ ایک روز یونیفارم لیکر آئیں اسے پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئیں۔ فلو کہتی تھی کہ بے حد سمارٹ لگیں۔ لیکن فوج میں بھرتی ہونے کی بات پر نانی اور فلو مینا دونوں نے بہت رونا پٹنا مچایا۔ امی نے پلٹ کر کہا۔ جب تک نیل صاحب سے شادی کر کے اسکا ٹیلنڈ چلی جاؤں گی۔ تب تم لوگ کیا کرو گی؟ لڑائی ختم ہوتے ہی ہم لوگ شادی کر لیں گے۔

” نواب بیگم یہ سن کر پھر دم بخود رہ گئیں۔ مگر لڑکی بہر حال انکے ہاتھوں سے کب کی نکل چکی تھی۔

”ان کا اسکاٹش بوائے فرینڈ جو انکے سیکشن کا انچارج تھا، رائیل ایرفورس میں شامل ہو کر فرنٹ پر چلا گیا تھا۔ امی بقراری سے اس کے خطوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ شاید وہ زناۃ امدادی فوج بھی اسی امید پر جو این کرنا چاہتی تھیں کہ اس طرح ممکن ہے کسی محاذ پر وہ مل جائے“

”قطع کلام ہوتا ہے عنبر۔“ منصور نے کہا۔ ”امبا پرشاد صاحب سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہوئی؟“

”امبا پرشاد کو معلوم ہو گیا تھا کہ امی طلاق لیکر نواب بیگم کے ہاں واپس آچکی ہیں۔ میری پہلی سالگرہ پر گڑیاں کھلونے کپڑے اور منے منے سچے زیورات بھجوائے۔ یہ تو لونڈیا کا جہیز معلوم ہو رہا ہے۔ اچھا خاصا نواب بیگم نے کہا۔ لیکن امی نے فون کر کے ان سچارے کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ شاید تین چار سال بعد ہی امبا پرشاد کا انتقال ہو گیا بہت ہی بڑھیا آدمی رہے ہونگے بے چارے۔“

”پانچ برس کی عمر میں میں بھی لورٹیو کا نوٹ میں داخل کر دی گئی۔ نو دس سال کی تھی جب نانائی اماں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ رشتہ میں بہت شاندار بیوی تھیں۔ جیسی تم نے ان کی وہ تصویر دیکھی ہے۔ کیمبو والی۔ بالکل ویسی ہی تھیں۔ بوڑھی ہو چکی تھیں مگر اب بھی بہت حسین تھیں۔“

”کیسے میں؟“

”چہرے کا کینسر۔ ایسا دلکش چہرہ اور سارا گل گیا تھا۔“

”ایک روز میں ہسپتال گئی نواب بیگم پرائیویٹ وارڈ میں بستر مرگ پر پڑی۔ کسی لکھنوی شاعر کا شعر پڑھ رہی تھیں۔“

آیا ہوں جان دے کے، دم آئے تو ظلم کر

اے قبرا بھی یہ کون محل ہے فشار کا

غنودگی طاری ہوئی تو دہرانے لگیں۔۔ ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں

انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے کفن و دفن کے لیے اجازت درکار ہے۔ مجھے ڈر سال کا امامی سے پوچھا کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے برآمدے میں لے گئیں۔ اور یوں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہاری گریہ دینا سے جانے والی ہیں۔ قاعدہ ہے کہ مرتے وقت انسان کو پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ تمہاری گریہ نے ایک بار بتلایا تھا کہ جتن بی جنکی وجہ سے انکی زندگی کا رخ بدلا ایک زمانے میں دنوازدئی والی کہلاتی تھیں اور مشہور سنگرتھیں۔ آج سے سینسٹ ستر سال پہلے وہ کسی دیسی ریاست میں بلانی گئی تھیں اس اسٹیٹ کے نواب بھی مشاہد اور دھکی طرح موت سے ڈرتے تھے۔ اور جانشین کے دربار میں اس کے باپ کی موت ان الفاظ میں اناؤنس کی جاتی تھی جو اس وقت گزرتی دہرا رہی ہیں۔

” لیکن موت ایک کیمیکل ایکشن ہے۔ اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ قاعدہ ہے ہر پرانی چیز بوسیدہ ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کا جسم بھی موٹر کی طرح ایک مشین ہے۔ تمہاری گریہ تو بہت پرانی مشین ہیں۔ اس لیے اب اس مشین کا کام چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔“

” میں کمرے میں واپس گئی۔ اب نواب بیگم کو غنودگی کے عالم میں ایک اور رٹ لگ گئی تھی اور وہ تھوڑی بھٹی بھٹی تھی۔ تھوڑی بھٹی بھٹی۔ دہرائے جا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اس بار امی ذرا پریشان ہوئیں سمجھ میں نہ آیا کہ انکی ماما کیا کہہ رہی ہیں۔“

” نانی نے آنکھیں کھولیں بے نوری آنکھیں جو پانی پانی ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کہا۔ عندی ب۔ کسی مولوی کو بلاؤ۔ کسی جناب کو بلاؤ۔“

” امی کسی جناب یعنی شیعہ مولانا کی تلاش میں فوراً باہر گئیں۔ بہرہ دیر بعد ایک لاکھ مولوی دستیاب ہو سکے۔ ہسپتال کے قریب کی کسی مسجد کے ملاجی۔ رات ہوئی تھی اور نانی اماں تھوڑی کاساگ۔ تھوڑی کاساگ رٹے جا رہی تھیں۔“

” امی نے مولوی صاحب سے پوچھا۔ میری والدہ کیا کہہ رہی ہیں؟ اگر کوئی آخری خواہش ہو ان کی تو پوری کر دی جاتے۔“

” پندرہ تیس سال قبل امی بنظر لبیل دی ڈانسر مشہور رہ چکی تھیں ڈاک انکی شکل

پہچانتے تھے۔ مولوی صاحب بھی پہچان گئے۔ عجیب چیز تھے۔ پلٹ کر بولے آخری خواہش! اجی میم صاحب وہ تو ابھی جہنم میں پوری ہوئی جاتی ہے۔ تھوہڑ کا ساگ اہل دوزخ کو زبردستی کھلایا جائے گا۔ یہ ابھی سے مانگ رہی ہیں۔

”امی طیش سے لال پیلی ہو گئیں۔ مولوی صاحب بولے۔ توبہ۔ توبہ۔ ان کا چہرہ سارا گل چکا ہے۔ اکثر زنان فاحشہ کامرنے سے قبل جسم کا کوئی حصہ سٹر گل جانا ہے۔ فلو مینا کمرے میں موجود تھی۔ مولوی صاحب کو مارنے دوڑی۔ امی نے بھی اپنی چھتری اٹھائی اور ایک اینگلو انڈین گالی دے کر ملاجی کی طرف بڑھیں۔

GET OUT YOU BLEEDING HE-GOAT. DROP DEAD.

مولوی صاحب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میں نے دہل کر رونا شروع کر دیا۔ اس بڑ بونگ میں نانی کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔ اس آٹنایں ان کا دم نکل گیا۔ بے چاری نواب فاطمہ عرف نواب بیگم کو آخری وقت نہ کلمہ نصیب ہوا نہ یسین شریف۔

”تمہارا یہ خالص مذہبی ری ایکشن ہے۔“ منصور نے تعجب سے کہا۔

”ہاں۔ نواب بیگم حد سے زیادہ مذہب پرست تھیں۔ انکے ری ایکشن میں امی بے دین ہو گئیں۔ امی کی بے دینی کے ری ایکشن میں بہت پابند مذہب ہوں۔ اور شاید تھوڑی سی MYSTICAL بھی۔“

”شکور صاحب سے کبھی تمہاری ملاقات ہوئی؟“

”بالکل نہیں۔ طلاق دے کر گھر سے نکالتے وقت انھوں نے امی سے کہا تھا ان کو یقین نہیں کہ لڑکی انھیں کی ہے۔ امی نے جواب دیا تھا بہت ٹھیک اب اس لڑکی کو بالکل CLAIM نہ کیجئے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ انکے آخری الفاظ تھے۔

”چنانچہ جب میں پانچ سال کی ہوئی اور ٹیوہاؤس کے کنڈرگارٹن میں میسرنام محض عنبریں بیگم لکھایا گیا۔ باپ کا نام مسٹر بیگ۔ اپنے نانا مرزا دلدار علی بیگ عطر فروش کا نام امی کے ذہن میں محفوظ تھا۔ لہذا ہمارا گویا خاندانی نام بیگ ہو گیا۔ بعد میں امی خود کو مسز بیگ کہلوانے لگیں۔ نام۔۔۔ عزت کا پاسپورٹ ہے۔“ عنبریں خاموش ہو گئی۔

کچھ وقفے کے بعد منصور نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”عنبر ایک بات بتاؤں۔ میڈیا خیاں ہے تمہارے والد صاحب بقید حیات ہیں۔ میں امریکہ سے واپسی میں کراچی رکھا تھا وہاں۔“
 ”ہو سکتا ہے“ عنبر نے بات کاٹی۔ ”وہ وہاں بہت بڑے آدمی ہوں گے۔“

امیر کبیر۔ عائشان کو ٹھی بنوالی ہوگی۔ اولاد بدل لیسٹ میں۔۔۔“
 ”بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے شاید کراچی جم خانہ میں اسی نام کے ایک بزرگوار سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پارٹیشن کے وقت وہ کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ وہاں سے کراچی۔ ڈپارٹمنٹل پروموشن کے ذریعے اونچے سرکاری عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔
 رائٹ۔ میں ان سے ملا ہوں، ہاتھی کا حافظہ رکھتا ہوں بھائی۔ تمہارے آباد ہاں موجود ہیں“
 ”میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا“

”رائٹ تمہاری امی کے لیے موسیو آندرے جوزف رینال ایک بے معنی نام رہا۔
 تمہارے لیے سید شکور حسین“
 ”بے چاری فلومینا کہا کرتی تھی۔۔۔“
 ”فلومینا کا کیا ہوا۔؟“

”ہو تاکیا مرگتی۔ لمبی عمر پائی۔ چھیٹھی اسی سال۔ نواب بیگم سے بھی دس گیارہ سال بڑی تھی۔ ان کی وفات کے دس سال بعد مری۔ ۱۹۵۵ میں پورے پچاس برس ان ماں بیٹیوں کی خدمت کی۔ بیوہ ہو کر بے پور میں آیا گیری شروع کی تھی۔ اور کیا وفادار پیاری عورت تھی۔ فرشتہ خصلت۔ امی اسے TEASE کیا کرتی تھیں۔۔۔ فلومینا اب تم SAINTHOOD کے لیے APPLY کر دو۔ تمہارے لیے HALO اور WINGS کا آسمان کے کارخانے میں آرڈر دیا جا چکا ہے۔۔۔ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ امی نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا رکھ لی تھی۔ مرنے سے ایک دن پہلے امی سے کہہ رہی تھی۔
 اینڈ سی بابا۔ وہ ٹھاکر مہیشور سنگھ مہاکال بن کی یا ترا کو جاتے جاتے خود اکال بن چلا گیا تھا نا۔
 سالانہ زندگی مہاکال بن ہے۔ اس کے بچوں بیچ مہاکال بھیرو کا مورتی رکھا ہے۔ بھیرو سب

چیز کو خلاص کرنا مانگتا۔ یہ گھورانہ دھیرا جنگل ہے۔ اس میں ہم لوگ سب یہ قوت جانور لوگ کی طرح گھوم رہا ہے۔ ONLY GOD ALMIGHTY سب جانتا والا ہے۔ پھر اس نے امی سے کہا دیکھو اینڈ سی بابا جب ایگر بابا اپنا ایم بی بی ایس پاس کر لے تم ایک دم اسکاٹ لینڈ کا ٹکٹ کٹاؤ۔ میرے کو لپکاؤ شو اس ہے مک نیل صاحب تمکو وہاں مل جائے گا۔

” امی نے جل کر جواب دیا۔ ماما کو موسیو آندرے ری نال چند رنگر میں مل گئے تھے۔ جو مجھے مک نیل اسکاٹ لینڈ میں مل جائے گا۔ فلو مینا۔“

YOU ARE AN INCORRIGIBLE ROMANTIC .

” اس نے تکیے سے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ضرور ملے گا۔ ہم اوپر جا کر تمہارے لیے بڑے زور سے PRAYER کرے گا۔ بس آج کل میں اوپر جاتے والا ہے۔“

” امی رونے لگیں۔ میں بھی خوب روئی۔ فلو مینا نے اسی رات سوتے میں انتقال کیا۔ نواب بیگم کے برعکس اس کی بڑی پرسکون موت تھی۔ چونکہ اس نے زندگی سے کوئی توقعات ہی نہیں رکھی تھیں۔“

امی کو اپنی والدہ کی موت کا زیادہ رنج نہیں ہوا تھا فلو مینا کے مرنے پر وہ روتے روتے بیال ہو گئیں۔ میرا بھی بُرا حال۔ سیاہ فزاک پہن کر چہرے پر سیاہ ماتمی VEIL لگائے شیشے کی تابوت گاڑی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی کیتھولک قبرستان گئیں۔ اس کے لیے چرچ میں بڑا شاندار REQUIEM MASS کروایا۔ پھول لیکر اکثر قبرستان جاتی رہیں۔ اپنی والدہ کی قبر پر مسلمانوں کے قبرستان شاذ و نادر ہی جاتی تھیں۔ مجھ سے کہا فلو مینا مر گئی۔ ہندوستان سے ہمارا LINK ختم اب چیلو ولایت۔ دراصل وہ آزادی کے فوراً بعد جانا چاہتی تھیں۔ کلکتہ کے سارے اینگلو انڈین جا رہے تھے۔ مگر بوڑھی بے سہارا فلو مینا کی وجہ سے نہیں گئی تھیں۔ جوں ہی میں نے ایم بی بی ایس کیا امی نے روانگی کی تیاری —“

”وہ اسکاٹ لینڈ اور مسٹر مک نیل کی کیا بات تھی؟“

”وہ ایک اینگس مک نیل ان کا بوائے فرینڈ تھا نا جو کلائیو اسٹریٹ کی جھوٹ فرم میں انکے سیکشن کا انچارج تھا۔ اس سے شادی طے کر لی تھی۔ مگر وہ سکیڈورلڈ وار چھڑتے ہی ایر فورس میں بھرتی ہو کر ویسٹرن فرنٹ پر چلا گیا“

”فرسٹ ورلڈ وار کے مویلو آندرے رینال کی طرح“

”نہیں۔ میرے نانا جان آندرے رینال تو کوئی عام سے SWINDLER تھے جو ایک بیوقوف ہندوستانی ناچ گراں سے چالیس ہزار روپیہ اور ہیرے کے پر سی پچھم ٹھگ کر بلجیم بھاگ گئے تھے۔ اینگس مک نیل ایک معقول پر خلوص نوجوان تھا۔ مگر پہلے وہ یورپین محاذ پر بھیجا گیا اور برابر وہاں سے خط لکھتا رہا۔ پھر۔۔۔ برا۔۔۔

”ایک سبج امی نے اسٹیمین کھولا تو REPORTED MISSING کی فہرست میں فلائیٹ لفٹینٹ اینگس مک نیل کا نام بھی موجود۔ دن بھر اپنا کمرہ بند کر کے روتی رہیں۔ عزت کا پاپا سپورٹ پھر انکے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ فلو مینا نے دلجوئی کی کہ بہت سے REPORTED MISSING زندہ بچ جاتے ہیں۔ مک نیل صاحب ضرور واپس آئے گا۔“

”دنیا امید پر قائم — امی ہی کی خاطر میں نے لندن کے بجائے اوڈنبرا میڈیکل کالج میں داخلے کا ارادہ کیا۔ آزادی کے بعد امی کی اسکاٹش فرم کے جنرل منیجر مسٹر ڈگلس میسکوڈ اوڈنبرا واپس جا چکے تھے۔ میں نے انکو خط لکھا کہ کوشش کر کے میرا داخلہ میڈیکل کالج میں کرا دیں۔ چنانچہ مجھے وہاں جگہ مل گئی۔ اسکاٹ لینڈ پہنچ کر بھی امی نے مک نیل کی تلاش بے سود سمجھی۔ اوڈنبرا کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ہزار ہا مک نیل تھے۔ میں نے چند ایک کو فون کیا۔ کسی کو فلائیٹ لفٹینٹ مک نیل کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ برسا کی جنگ کو خاصی مدت گزر چکی تھی۔

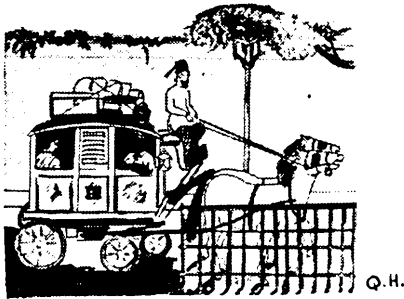
”چھٹیوں میں ہم لوگ سیر کے لیے یورپ گئے۔ اوڈنبرا پہنچتے ہی اب میں نے

آندرے رینال کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ برسوں کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کھنگالی۔ اسیں سیکرٹوں رینال۔ تمک کریہ کوشش بھی چھوڑ دی۔ لیکن امی بار بار بلجیم جاتی رہیں۔“

منصور نے اپنا خود اور گوگلز اٹھائے۔

”کل شام ضرور آنا۔ امی تمہاری دعوت کا انتظام کرنے ابھی بھاگی بھاگی امین آباد گئی ہیں۔“
”کل کیا خاص بات ہے بھئی؟“

”ماتھا ہلیتھ کلب کے افتتاح کا CELEBRATION۔“ عنبر نے شگفتگی سے جواب دیا
”اتفاق سے کل وہ مہینہ اور تاریخ بھی ہے جب امی اور فلومیٹا مع یوزر رول کی ٹوکری کو لوٹو۔
سے پن اسٹریٹ واپس گئی تھیں۔ فلومیٹا بتاتی تھی اس نے امی سے کہا تھا اینڈی بابا
بالکل اسی مافک تمہارا باسکٹ بیکر گھوڑا گاڑی میں تمہاری ماما کے ساتھ ہم اسی بلڈی کیل کٹا
کی روڈ پر تھا جب بائی جے پور سے دھکے کھانے ادھر آیا تھا۔“



تارے والی کوٹھی

” اٹوہ۔ آج تو آپ نے واقعی بڑا اہتمام کیا ہے۔“ منصور نے دروازے سے جھانک کر جھلملاتی ڈنر ٹیبل پر نظر دوڑائی۔
” آؤ کچھ دیر اسٹوڈیو میں بیٹھیں۔ وہاں اس وقت دروازے کھولو تو بڑی خوشگوار ہوا گومتی کی طرف سے آتی ہے۔ بالکل فرح بخش۔“

لیکن اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی مسز بیگ نے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے گرا دیے۔ ایک الماری سے اسکاچ و ہسکی کی چند بوتلیں نکال کر میز پر رکھیں۔ منصور تعجب سے انکی یہ غیر متوقع کاروائیاں دیکھتا رہا۔ عنبریں ناگواری کے ساتھ ایک مصری پوف پٹک گئی۔ منصور نے پنکھا چلایا۔

” کیا پسند کرو گے؟ ROYAL SALUTE BAGPIPER CLAYMORE“

دو جام بھرے۔

منصور نے عنبر پر متفکر اچھتی سی نظر ڈالی۔

غذیب بانو نے قہقہہ لگایا۔

” مولانا نجاری! اطمینان رکھو۔ عنبریں بی بی بڑی پرہیزگار سید زادی ہیں۔ میرا کیا ہے

میں تو ہوں ہی ایک آوارہ یوریشین ریٹائرڈ ڈانسر۔“

” امی!۔“

” ہاف کاسٹ۔ TRAMP جب دل بہت گھبراتے۔ اس جگہ یہ شغل اسٹوڈیو

کے دروازے بند کر کے۔ کہیں حسین بخش نہ دیکھ لیں۔ وہ مجھے کلکتہ کی بڑی بیگم

صاحب سمجھتے ہیں۔ اور بہادر دیکھ پاوے تو سارے محلے میں پھونک آوے۔ عزت —
عزت! عزت کی بڑی دُھن ہے مجھ بندی کو — TO MASHA HEALTH CLUB!

TO AMBER AND MANSOOR'S FUTURE HAPPINESS!!

”چیرز“ منصور نے اپنا جام اٹھایا۔

مسز بیگ کلاس پہ کلاس چڑھائے گئیں۔ ”آہا۔ کلیان!“

شیلف میں سے تلاش کر کے فیض کا ایک ٹیپ نکالا اسے لگا کر چند لمحوں تک سنا
پھر ساغر اٹھا کر بولیں۔ ”پوسٹ میلوں کے نام! جو میرے لیے کبھی کوئی خط نہ لاتے
عبدالباسطوں کے نام۔۔۔! ہمیشہ شنگھوں کے نام۔ آندرے رینالوں کے نام —
شکوہ حسینوں کے نام۔! ”رُوسی انداز میں کلاس فرس پڑھ کر توڑا۔
بل کھاتی اٹھیں اور بانہیں پھیلا کر سر چھبے ڈال، چمکت کو تکنے لگیں۔
گویا ایزا ڈورا ڈنکن۔ گوہراف کیل کٹا۔ یوجین پیٹرسن عرف اندرادیوسی۔

انسان کی سب سے بڑی بد قسمتی اس وقت ہے جب وہ دوسروں کو مضحکہ خیز
لگنے لگے۔ ”منصور“ عنبر نے چپکے سے التجا کی۔ ”اُمی پر ہنسنا نہیں۔“
”استغفر اللہ عنبر۔ آئی انڈرا سینڈ۔“
”نو یو ڈونٹ۔“
”دشت تہائی ڈھونڈ لاؤں؟ گنگناتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

”اُمی کی ٹریجڈی — RIDICULOUS لگتی ہوں تو انہیں معاف کر دینا۔“

واپس آئیں ”نہیں ملا“

دریچے کا پٹ لکھسکایا۔ ”آہا۔ ایسی تاروں بھری کالی رات — آکاش گنگا کیسی
جھلملا رہی ہے۔ مشرق کی پراسرار سیاہ راتوں کی پُرفسوں کہکشاں —! ہا ہا ہا۔ یہ سب

قسمتوں کے ستارے ہیں؟ ہندو کرم کا پھل کہہ کر بچ گئے۔ تم بتاؤ مولانا۔
 ”یہ تو چند ازلی سوالات ہیں میسٹ“
 ”اماں ازلی بھی دیکھ لیا دور بین سے۔ اٹوہ۔ زحل کیساتھ نظر آتا ہے۔ اتنا۔
 دُور۔ اور اتنا تنہا۔“

”ٹیمپو سلطان کی ہیٹ لگاتے“

”ایں۔؟“

”جی ہاں مسز بیگ۔ ایک صاحب رصد گاہ سے اسے دیکھ کر کہنے لگے اسکی رنگ تو بالکل ٹیمپو سلطان کی ہیٹ معلوم ہوتی ہے!“

”ہا ہا۔۔۔ ویری گڈ۔۔۔ دور بین سے ہر ستارہ کتنا اکیلا دکھائی دیتا ہے اور ایسا بے چارہ سائنسچر انسانوں کی تقدیروں کو بھلا کیا متاثر کرے گا؟“

ڈائینگ روم میں داخل ہو کر وہ میز کے سرے پر کھڑی ہو گئیں۔ ”خواتین و۔۔۔
 ”امی بیٹھ جاتیے۔ حسین بخش۔۔۔“

”ہا ہا ہا ڈاکٹر صاحب۔ ہم لوگ دلی والے ہیں۔ حسین بخش سے نہیں ڈرتے۔ ہم چاول پہلے کھاتے ہیں۔ بریانی نوش کیجئے۔ دہرہ دون کا باس متی مینال کوٹھی چوک، کا زعفران۔ اٹا وے کا گھی۔ انگلش چائینا۔ رشن سلور۔ گوان فرنیچر۔۔۔
 نواب جان کی امر کہانی زندہ باد۔“

”منصور۔ پورا امی از کو اٹیٹ ڈرنک۔ تم کو معلوم ہے یہ برسوں کلکتے کی اسکاٹس فرم سکرپٹری رہیں جو بیس سال سے ڈاکٹر ہوں۔ اور یہ ساز و سامان میں نے اپنے نوبل پرفیشن کی حق حلال کمائی سے۔۔۔“ اسکی آواز حلق میں اٹک گئی۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اب اسے اپنی ناممکن قسم کی والدہ کو معاف کرتے رہنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ”امی ہمیشہ تمہارے سامنے میری توہین کرتی ہیں۔ جانے وہ مجھ سے کس چیز کا بدلہ لینا چاہتی ہیں؟“

منصور اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ عنبریں نے آنسو خشک کیے۔

عذیب بانو اب ان دونوں کو گھور رہی تھیں: ”بھاگ ان بردہ فروشوں سے“ انہوں نے ڈپٹ کر بیٹی کو مخاطب کیا۔

”میم۔ ہمارے ہاں لوگ طوائفوں سے شادیاں کرتے ہیں ان کو عزت بھی ملتی ہے۔ کوئی انکا بائیکاٹ نہیں کرتا۔ آپ نے خواہ مخواہ اس مسئلے کو اپنے لیے ایک بکھڑا بنا لیا ہے۔ لکنڈ بھول جاتے یہ قصہ۔ آئیے اس لمحے سے ہم یہ طکر لیں کہ نواب بیگم کبھی تھیں سی نہیں۔“

حسین بخش گرم چپاتیاں لیکر اندر آتے۔ انگریزوں کے زمانے ٹرینڈ خانسا ماں کی حیثیت سے صاحب میم صاحب لوگ کی کیفیات و معاملات سے چشم پوشی کی اور دبے پاؤں واپس گئے۔

مسز بیگ اپنی کہے گئیں۔ ”پچھلے زمانے کے نحاسوں میں مولشی اور لونڈی غلام ایک ساتھ بکا کرتے تھے۔ مولانا — یوں تو مارکیٹ میں تمہارا بھاؤ بھی بہت چڑھا ہوا ہے۔ آج یہاں ڈنڈاڑا رہے ہو کل وہاں۔“

”آئی بگ یور پارڈن“ منصور نے بھٹنا کر جواب دیا۔

خاموشی - عنبریں شرم سے کٹی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اب کھانا زہر مار کر رہا ہے اور جلد از جلد یہاں سے بھاگنا چاہتا ہے۔

آج بہت بُرے پھسنے۔ عذیب بانو ایک بڑی سی سفید مگڑی کی طرح بیٹھی جالا بنتی جا رہی ہیں۔ خود اس جالے سے چمٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جو دوسری مگڑیاں انکے لیے بن گئیں۔ اپنے تلخ تجربات کی بنا پر عذیب بیگ اینٹی مسلم، اینٹی انڈین بنیں۔

اگر انکی زندگی خوشگوار گزری ہوتی۔ مسلمان شوہر اچھا ثابت ہوتا۔ یا کسی بہتر آدمی سے انکی شادی ہو جاتی۔

جہاں ممکنات بیکراں لیکن ہم حقیقتوں میں محصور۔
اولیائے کرام کا ارشاد ہے کہ جو لوگ سماج کی تلچھٹ کہلاتے ہیں انکے دکھ درد جان
دان سے محبت کرنے لگو گے۔

عند آیب بیگ سماج کی تلچھٹ تھیں؟ نفیس، متمدن، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔

وہ چکن کاٹنے میں مصروف تھیں بیلنخت چھراٹھا کر مہمان سے مطالبہ کیا۔

”سہ سینتالیس میں تم کتنے بڑے تھے؟“

”جی — جی اسکول میں پڑھتا تھا؟“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

”یاد ہے اخباروں میں مغویہ لڑکیوں کے ہولناک حالات۔ گھردالوں کا واپس لینے سے

انکار EXTREME SITUATIONS میں بھی عورت کی حیثیت سکندری بے عزتی ہوئی گویا

اسکے مردوں کی“

”آپ کو مسلم سماج میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ لیکن تیبیوں اور یواؤں اور مساکین

کی امداد کے احکام کا سبق ایسا گھٹی میں پڑا ہے ہم لوگوں کی غریب سے غریب مسلمان فوراً

مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے“

”پھر —؟“

”جی مجھے تو یہ یاد ہے کہ الجمیعت وغیرہ میں اسپلیں چھپا کرتی تھیں کہ مسلم نوجوان اپنے

فرقے کی مغویہ لڑکیوں سے شادیاں کر لیں“

”پھر — کیں؟“

”بے شمار نے“

”ارے واہ — واہ بے بانگی کے مرغے!“

”امی جان — پلیز —“ غنبر پھر آنکھوں سے موتی پرونے لگی۔

”نی میں چھم چھم رونیاں — میں چھم چھم — اب میں چپ رہوں گی بڑی مشکل سے ہوتا ہے جین میں دھس داور پیدا۔ باہا۔ سنو فغفور کا شغرانٹا غفیل — عالمگیر سفاکی کا پہلا نشانہ ہمیشہ رناں تے کڑیاں۔ پوسٹ دار جرمنی۔ جاپان۔ اٹلی۔ ویت نام۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ گشتیوں کے پستے لگ گئے۔ ایک روسی بھگیتا کلکتے آیا تھا سفید روسی لڑکیاں خاموش ہندوستانی فلموں میں نچاتا تھا۔ سرجی گرنوف“

”ہولی دوڈ میں ناچتیں تو آپ انلو قابل رحم نہ سمجھتیں،“ عنبر نے آنسو پونچھ کر بحث کی۔

”KEEP YOUR GOB SHUT“ اسکی والدہ خالص جی جی آواز میں چلا تیں۔

منصور نے ترمی سے کہا: ”ساری دنیا میں لاتعداد عورتیں ایسی کبھی ہیں جو مجبوراً

بجائے شوقیہ —

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ عطائی کسبیوں کو سیدخل کر رہی ہیں ہرے“

”اچھا وہ راحت بائی گجر بائی کیا ہوئیں۔ اور مہر و خالہ؟“

”مہر و خالہ — ہر احشر۔ علاج کے لیے پٹنے جا رہی تھیں۔ شد و ماموں کے ساتھ۔ چلتی ٹرین پر ڈاکوؤں کا حملہ۔ ماں بیٹے۔ دونوں —“ عندلیب بانو نے اپنی گردن پر انگلی سے گویا چھری پھیری۔ ”سارا زیور لوٹ کر لے گئے ڈکیت“

”زیور پٹنے کیوں لے جا رہی تھیں؟“

”کہیں شہو بائی انکی میٹی ان پر قبضہ نہ کرے۔ بنک کے بجائے صندوق چھپر کھٹ تلے چھپائے رکھتی تھیں۔ اکتوبر سنہ سینتالیس میں شہو مع آل اولاد دلی سے اڑ چھو،“ عندلیب بانو نے دائیں ہاتھ سے ہوائی جہاز کے ٹیک آف کا نرت کیا: ”چاہنے والے اسپیشل طیاروں پر اڑا لے گئے۔ پرانے قلعے میں پڑے کنبوں کی حق تلفی کر کے گجر بائی کی ایک نواسی انگلیٹڈ

میں لیڈی اف دی مینر بن گئیں“

”اوہو —“

”اسکے امیر خاوند نے انگلستان میں ایک لارڈ کا کاسل خرید رکھا ہے۔ اولاد کیمبرج میں رہ رہی ہے،“ غنڈ لیب بانو نے گویا شورٹ ہینڈ میں بات ختم کر کے نمپکن سے چہرہ خشک کیا۔

”چاند پول بازار سے کیمبرج ڈیم گڈ — آپ جیسی ترقی پسند کو تو ان کی مدگی سنور نے پر خوش ہونا چاہیے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے“ منصور نے کہا۔
 ”میں کب کہتی ہوں بُری بات ہے۔ اگر سہاری اصلیت بھی یہاں کھل جاتے۔
 ن کہیں گے چاند پول بازار سے اڈنبرا — ڈیم گڈ — بڑی خوشی کی بات۔“

”اُمی جان تو اس صورت حال میں آخر مجھے کیا کرنا چاہیے خود کشی؟“
 انہوں نے چھری میسر پڑھتی۔

”خود کشی کریں تمہارے دشمن۔ مرتے وقت ماکویہ GUILT کیوں رہا کہ
 وہ سیدھی دوزخ میں جائیگی جہاں تھوٹر — مرزا سبط احمد — شیخ عبدالباسط —
 اندر سے رینال — وہ کیسے کیوں نہ تھوڑے تھوڑے کی بھجیا؟ کہاروں کی غلطی
 سے انکورات بھر مہرہ کے کوٹھے پر رکنا پڑا۔ انہیں جوتے بار کر گھر سے نکال
 دیا۔ اور بالا خانہ ہی آباد کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اصل گنہ گار شیخ عبدالباسط ہیں یا
 نوابن چھو کرے؟ حضرت مولانا منصور احمد بخاری — مسلم معاشرے کا ایسا بصر صم
 روئیہ کیوں؟“

”وہی بلی گار دولے نواب صاحب کی بات یاد آتی ہے کہ اپنے معاشرے
 کے بزرگوں کو مطعون کرنے سے پہلے ذرا انکے حالات پر دھیان دھر لیجئے۔“
 ”بولو جی — گئی جن کا ہے یہ دھروں دھیان —؟“

”گزشتہ نسلوں کے سماجی رویوں کا ذرا فراخ دلی سے تجزیہ کیجئے تو شاید تنہی
 نلنی محسوس نہ ہو۔ آپکو ایک بات بتاؤں“ منصور نے کرسی پر پہلو بدلا — عرض
 کیا تھا نا میرے ازبک پردادا مسجد فقہوری میں مولوی ہو گئے تھے۔ مولوی نذیر احمد

کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انکار و زنا چہ ابا کے پاس موجود تھا۔ وہ میں نے پڑھا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ایک مرتبہ دہلی کے چیف کمشنر کلارک نے ایک گرلز اسکول قائم کرنے کی تجویز دہلی کے مقتدر مسلمانوں کے سامنے رکھی۔ انھوں نے مسترد کر دی۔ غدر سے قبل پردے کی اتنی شدت نہیں تھی۔ لیکن سنہ ستاون کے بعد مسلم سماج کی تباہی اور DEMORALISATION اور کر سپین مشنریوں کا خوف۔ آپکوان مصائب کا کیا اندازہ ہے۔ آیام غدر میں مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھانجا بھتیجا، بڑھا جوان لنگڑا لولا جو ہاتھ آیا اس سے کر دیں تاکہ وہ بے عزت ہونے سے بچ سکیں۔ میری پر نالی کا ایمر جنسی نکاح اسی طرح کیا گیا تھا۔ ان گنت لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ اسکی یاد مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ خود آپکی دلنواز اور مہر و قتل عام کے بعد چاٹوری جا پہنچیں رائیٹ۔؟ اسیوجہ سے مسز بیگ مسلمانوں کے ہاں غدر کے بعد اتنا شدید پردہ رائج ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے چیف کمشنر کو جواب دیا کہ مسلمان اپنی نوعمر لڑکیوں کو ایک منٹ کے لیے اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے کو تیار نہیں چنانچہ مدرسہ بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

” علاوہ ازیں۔۔۔ نوابین کے معاملے میں شیخ عبدالباسط کے اتنے شدید رسی ایکشن کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ڈپٹی کمشنر کلارک کو یہی بات سمجھائی تھی۔ کہ اکیلی لڑکی گھر سے جاتی ہے اسکول۔ اور وہاں یا کہیں اور پارٹے میں اسکے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے۔۔۔“

” رپ “

” جی۔ یا فرض کیجئے وہ خود کسی چکر میں پڑ جاتی ہے تو اسکی سزا از روٹے شروع بہت سخت ہے۔
” اب دُرے لگتے ہی لڑکی مر جاتے گی۔ سخت جان ہوئی تو زندہ درگور۔“

موشل آؤٹ کاسٹ - دونوں صورتیں بھیانک۔

” اچھا غدر کے بعد انگریزی قانون لاگو ہو چکا تھا۔ لہذا ADULTERY کے مقدمے کے لیے کچہری۔ اس رسوائی کا سامنا کرنے کے بجائے لڑکی کو زہر دینا بہتر۔ تو آپ ملاحظہ فرمائیے۔ گھر سے نکلنے۔ اسکول بھیجنے میں لرزہ خیز ممکنات اور انکے نتائج کا خوف شکست خوردہ مسلمانوں کے دلوں میں اسوقت بیٹھا ہوا تھا۔ انکے ڈیلیما پر غور فرمائیے۔

” یہ کب کا واقعہ رہا ہوگا۔؟ لیجئے میں درک آؤٹ کرتا ہوں۔ کل عنبر نے بتلایا کہ بعمر اڑھٹھ سال ۱۹۲۵ء میں نواب بیگم کا انتقال ہوا۔ اور چودہ سال کی عمر میں وہ شیخ عبدالباسط کے گھر سے نکالی گئیں۔ تو سمجھیے یہ لگ بھگ ۱۸۹۲ء کا واقعہ رہا ہوگا۔ ” آپ ۱۸۹۲ء میں ایک اوسط ذہن کے قدامت پرست دلی والے مسلمان سے یہ سطر ح توقع کرتی ہیں کہ انکی نوعر ملازمہ جو چاؤڑی کے ایک بالا خانے پر رات گزار کر ایک قیمتی شال اوڑھے گھر لوٹتی ہے وہ اسے واپس لے لیں گے؟ جبکہ پچوٹن سال بعد نئی روشنی کے ان گنت ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں نے اپنی مغویہ عورتوں کو واپس نہیں لیا؟ آپکے ہاں کٹ گلاس بہت نفیس ہے۔“

” دی آنا میں خریدتا تھا۔ پیسہ ہو تو کیا نہیں خریدا جاسکتا۔ کٹ گلاس کی کیا حقیقت۔“

” جی ہاں۔ یہ تو بڑی OBVIOUS سی بات ہے۔“

” تم بھی پیسے کی اہمیت کے قائل ہو؟“

” پیشہ۔ پیشہ۔۔۔۔۔ وہ ہنس پڑا۔ ” ایک حد تک۔۔۔ کون نہیں ہے؟ میرا بچپن اتنا افلاس زدہ گزارا کہ جھبی طے کر لیا تھا۔ ڈاکٹر بن کر خوب کمادوں گا۔“

” ڈاکٹر ہی کیوں۔ بزنس مین کیوں نہیں؟“

” وہ - ایسا ہوا بیگم صاحبہ کہ ہمارے محلے میں ایک بچہ دو لہند ڈاکٹر کا تھا۔ رات کو میں اسکول کا ہوم ورک کرنے انکے مطب کی خوب روشن سیڑھی جا بیٹھتا تھا۔ کمنوں نے مجھے اندر آکر پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پھر میں کے ایک کونے میں لیمپ کے نیچے براجتا۔ جب ہی مجھے ڈاکٹری سے بھی شغف پہ ہوا۔ انہی مرحوم نے میرا داخلہ علیگندھ میں کروایا۔ سنہ سینتالیس کے فسادوں؛ بے چارے مارے گئے۔“

دریچے کے باہر کسی کی آواز آئی۔

” کون ہے؟“ عنبریں نے پوچھا۔

سفید رومال میں بندھا کٹور دان ہاتھ میں لیے حسین بخش اندر آئے۔ ”کہ نہیں بیٹیا۔۔۔ بخشو بھائی کے ہاں آج نذر تھی ہمارا حصہ لے کر آئے تھے۔“

” اوہ۔۔۔ بخشو۔۔۔ ابن انارکلی۔!“ مسز بیگ بولیں۔

” بخشو تو انارکلی کے ہیرو ہوا کرتے تھے نہ کہ فرزند۔“ منصور نے کہا۔

” بخشو نہیں۔۔۔ بخشو۔!“ عنبریں نے تصحیح کی۔

” یہ شہزادے نہیں۔ غلام زادے ہیں۔ غلام ابن غلام ابن غلام۔۔۔ تمہارا

اس سرمایہ دار سوسائٹی نے ان گننام و شیعہ دار جیسے شہزادوں کا بھی پلتھین نکا

دیا۔ غلام تو خیر غلام ہی ہے۔“ مسز بیگ نے ایک گہری سانس لی ”تمہارا

اس نسبتعلق دوست کا کہا نام ہے عنبر۔؟“

” رفعت آرا بیگم“

” ہاں۔ رفعت آرا بیگم۔ ضلع ہردوئی کے کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی۔ ایہ

روز آئیں۔ میں بیلٹی گارڈ سے اسکیج بنا کر لوٹی تھی۔ کہنے لگیں کسی ویک اینڈ پر یہ

تشریف لاکر تصویریں بنائیے۔ ہمارے مورث اعلیٰ نواب صدر جہاں کا مقبر

بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پہاڑی اور شاہ آباد میں ان گنت عمارتیں ہیں مغل پیریدگی۔ دادا صدر جہاں اکبر کے وزیر اعظم تھے۔ انکے مقبرے میں ستون بنے شمار ہیں۔ چھت ندارد۔ کہتے ہیں راتوں رات جنات روضے پر چھت ڈال رہے تھے لیکن صبح منہ اندھیرے وقت سے پہلے کینزوں نے چمکی چلا دی۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر غائب۔ ” میں نے کہا اے بیٹیا تو جنات دوسری رات کو آجاتے وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس نے آواز دی۔ انارکلی! میں نے دل میں کہا یہ بی بی تو بہت تاریخی ہیں۔ اکبر اعظم اور انارکلی سے کم بات نہیں کرتیں غرارہ پہنے ایک بوڑھی ملازمہ کار سے اتری عفت آرا ریگم کا پاندان سنبھالے۔ پھر باہر جا بیٹھی۔ میں نے کہا بیٹیا تمہاری تو نوکرانی بھی نہایت افانوی ہے بولی ہماری پرانی کینز ہے۔

” کینز؟ میں نے تجب سے دہرایا۔ بولی جی ہاں۔ ہمارے یہاں کینز میں غلام تو اب تک خریدے جاتے تھے۔ آزادی سے قبل تک۔ میں نے پوچھا انہیں بیٹا کون تھا۔ کہنے لگی غریب کسان اور کون۔ کہنے لگی۔ بیس آنے اور ڈلیا بھر کو دو دن فی لڑکی لڑکا قیمت مقرر تھی۔ پشت در پشت ہمارے ہاں کام کرتے تھے۔ بلا تخواہ؟ میں نے پوچھا۔ بولی بالکل۔ عریٹے میں تخواہ کیسی۔ بس روٹی کپڑا۔ غلاموں سے کینزوں کے بیاہ کر دیے جاتے۔ جہیز دیا جاتا۔

” میں نے جہیز کی تفصیل پوچھی۔ بولی بہت کچھ۔ چاندی کے گہنے۔ بجلیاں۔ ڈھولنا۔ چندن ہار۔ طوق۔ کنٹھ سری۔ چمن چوڑی یا پیری جہم۔ چکن کے کرتے۔ مشروع کے سیرھے پانجامے۔ تن زیب کالال دوپٹہ پیلیے آنچل والا۔ پاؤں میں کلکتہ جوتی۔ بالی پتے اور نتھ سونے کی دی جاتی تھی۔ اتنا جہیز کینزوں کو ملتا تھا۔ میں نے کہا ہاں اور کیا چاہیے۔ بولی۔ ہمارے ہاں کی چند کینز ہیں تو اب تک زندہ تھیں۔ دل سہار۔ پھول کلی۔ حسن بہار۔ دل آفر۔ مین سکھ۔ یہ انارکلی اب بھی جیتی ہیں۔ ہماری دادی کی رادھا کینز اچھی تھی۔ ایک نیولہ پاں رکھا تھا۔ کنویں کی منڈیر ریڑھی رہتی تھی۔ ایک دن اسی کنویں میں گر کے مر گئی۔ ایک اور تھی۔

گورا کینز۔ وہ چکی پیستے دھان کوٹتے متواتر بڑبڑایا کرتی تھی۔ بولتی کبھی نہیں تھی۔ جد
زمینداری ختم ہوئی کینز غلام آزاد ہو گئے۔ انکو زمینیں دے دی گئیں کھیتی کرے
لگے۔ جو وفادار تھے انہوں نے ہماری ڈیوڑھیاں نہ چھوڑیں۔

”انارکلی بھی انہیں وفاداروں میں سے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ کہنے لگی جی ہاں
لیکن انکا بیٹا نجشو لکھنؤ آگیا رکشا چلاتا ہے۔ کلارکس آودھ کے پھاٹک پر اپنی
رکشا کھڑی کرتا ہے۔ میں اس سے کہتی جاؤں گی جب ضرورت ہو بلوایجیے۔
بے زبان ہے کرائے پر جھگڑتا نہیں“

”میں کلکتے میں پئی بڑھی مجھے علم نہ تھا کہ کو دوں کیا شے ہے۔ رفعت آرا بیگ
نے بتلایا۔ ایک حقیر قسم کا چاول۔ اگر گھوں میں مل جائے۔ امیروں کے ہاں
انکو چن کر پھینک دیتے ہیں۔ عزیز غریبا سے کھاتے تھے۔

”سواروپہ اور ڈیالیا بھر کو دوں۔! سمجھے مولانا۔ آج قانونی اور غیر قانونی
TENDER بھی بدل گئے ہیں۔ خریدار بھی مختلف“

”شاب“ بہادر نے گیلری کے دروازے میں سے جھانکا ”شہوار پٹیا کا
فون۔۔۔ پرئی محل۔“

”پوچھو کیا بات ہے“ عنبر نے کہا۔

”وہ بولتی ہیں ششستر کی طبیعت کھراب ہے۔ ڈاکٹر شاب کو زلدی بھیجو۔“

منصور میز سے اٹھا۔ چند سکند بعد گیلری میں سے اسکی آواز سنائی دی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟ ارے۔ اوہو۔۔۔ اچھا۔ ابھی آتا ہوں۔ ہاں ہاں۔ فوراً۔ گھبراؤ

مت بھٹی۔ ابھی پہنچتا ہوں۔ RELAX“

وہ کھانے کمرے میں واپس آیا ”سوری مسز بیگ۔۔۔ عنبر۔ نگار خانم

اچانک بیمار۔۔۔ شاید ENGINA کا کچھ گھپلا ہے۔“

”تم ہارٹ اسپیشلسٹ تو ہو نہیں“ عنبر سرد آواز۔

” انکا پرنسٹن فریشین تو ہوں بھی۔ کیا میرا فرض نہیں کہ فوراً جاؤں۔“
 AND THANKS FOR THE اچھا گڈ نائٹ
 اب بمبئی سے واپسی پر “ LOVELY DINNE

عنبریں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کمرے میں سناٹا۔ عنذلیب بانو ذرا لڑکھڑا کر اٹھیں۔
 اب کمرے کی شمعوں پر ٹھونکیں مارنے لگیں۔ شمعیں ایک ایک کر کے بجھتی گئیں۔
 بار کا سوئس کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔
 ”کیسا بھاگا“ کچھ دیر بعد عنبریں نے کہا۔
 ”جب تمہاری کال آتی ہے تم سارے کام چھوڑ کر اس طرح نہیں دوڑتیں؟“
 نربیگ نے آہستہ سے جواب دیا۔

”جیسے آنے اور ڈلیا بھر کو دل۔! LEGAL اور ILLEGAL اور بدل گئے ہیں۔ آج پوری شام میں آپ نے ایک پتے کی بات کہی!
 اصل مشاعرہ! آپ کو معلوم ہے یہ لوگ کتنے امیر ہیں؟ اور پتہ ہے ڈاکٹر کا شغری کا
 آتی فلسفہ کیا ہے؟ حصول کامیابی۔ نرسنگ ہوم کے لیے ہلکان ہوا۔ اب بلتھ کلب
 کے لیے سرگاڑی پیر پہنیے۔ کامیابی اور دولت کے امریکن فلسفے کا پکا
 تیل۔ یاد ہے ابھی ابھی اس نے کیا کہا تھا؟ پچپن میں اتنا افلاس دیکھا۔“
 ”وہ تو زر پرستوں کا مذاق اڑاتا ہے“

”سب دکھاوے کی باتیں ہیں امی جان۔ اور جب لڑکی بے تحاشا دو تہند ہو۔
 رحین اور کم عمر۔ اور اعلیٰ نسب۔“

”عنبر ڈیر۔ تم خواہ مخواہ شگفتی۔“ مسز بیگ کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔
 ”کیپ کو ایٹ امی۔ عمر بھر آپ مھرائے لیان کی SPHINX کی طرح
 ش رہیں۔ اب آپ کو یہ کتنا بکھانے کے لیے کس حکیم نے کہا تھا؟ لگانا۔
 بھی وہ آئے وہی گراموفون۔ اس نے تو نواب بیگم کی تصویر کے متعلق

کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ اٹا کوئی مغل شہزادی سمجھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔“

چانک اس نے میز پر ٹکڑا مارا۔

”عنبر!۔“

”ایک امیر کبیر شریف زادی۔ ایک یوریشین ڈانس کی اولاد۔ ہا ہا ہا۔
گیہوں کے دالوں میں آکر کودوں مل جائے تو اسے چُن کر الگ کر دیتے ہیں۔“
دوسرا ٹکڑا۔

”عنبر ہوش میں آؤ۔ تم پھر سٹرککل ہو رہی ہو۔“

”کودوں۔“

تیسرا ٹکڑا۔

ایک گلاس سبرک کر چھن سے نیچے گرا۔

بہادر فوراً اندر آکر کانچ کے ٹکڑے چھننے میں مصروف ہو گیا۔

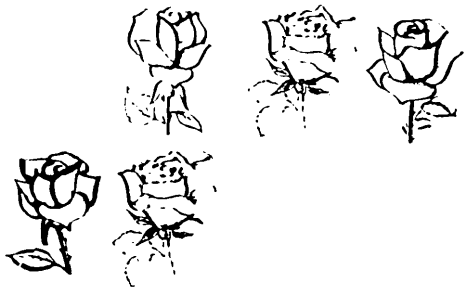
عزراٹھ کراپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ عنذیب بیگ نے دریچے کے پردے برابر کرنے سے قبل حسب عادت باہر نظر ڈالی آسمان پر تاروں کی روشن ندی اسی طرح بہ رہی تھی۔ سالہا باغ معطر تھا۔ گویا نہایت رونمیک رات۔ کلکتے میں وہ کیا نظم مولوی صاحب نے یاد کرائی تھی۔ خدا کی قدرت کے ہیں نظارے۔ زمیں پہ پھول آسمان پہ تارے۔

آکاش گنگا ہے کہ جھلملائے جا رہی ہے۔ لامتناہی۔ افلاک کے تاریک فاصلوں میں
جانے کہاں جا کر گرتی ہے۔

درون ذات کی تارے والی کوٹھی میں دُورین سامنے آئی تو بھاگ گیا۔

الغ بیگ سمرقندی۔

www.urduchannel.in





۳۲۵

(۲۲)

پریمی محل

بخشور کشا والا اپنی سواری بلرام پور ہسپتال سے لا رہا تھا۔ لال باغ کی سڑکوں پر پہنچ کر گڑ بڑا گیا۔ بڑے میاں صحیح پتہ ہی نہیں بتا پا رہے۔ ”اندھیرے میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ بڑے میاں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”سڑکوں کے نام بدل گئے ہیں۔ کالی داس تلسی داس۔“ اسی قسم کا کچھ نام ہے بھائی۔“

”ابھی تو ہم ہالیکسی مارگ کا چکر لگا کر لوٹے ہیں۔“
”ارے بھئی پہلے وہ ریلج روڈ تھی نا۔“ اس کے آگے۔ ہمارے حواس باختہ ہیں۔ اس کوٹھی کے پھاٹک پر املتاس کا پیر کھڑا ہے۔ وہ رہا۔“
بخشور کشا ایک پھاٹک کے قریب لے گیا۔
”کون؟“ چوکیدار لٹکا را۔

بڑے میاں جس انداز سے رکشائیں بیٹھے تھے معلوم ہونا تھا فٹن اور موٹر کار کی سواری کے عادی رہے ہیں۔ ”بڑی خانم۔“ انھوں نے گویا پاس ورڈ دیا۔
”سلام۔ نواب صاحب، چوکیدار بولا۔“

برساتی میں پہنچ کر نواب صاحب نے شام سنگھ سے کہا۔ ”چھوٹی خانم۔“
شام سنگھ اندر گیا۔ بخشور نے رکشالے جا کر ایک تاریک گوشے میں کھڑی کر دی۔
نواب صاحب سیٹ پر بیٹھے دربان کا انتظار کرتے رہے۔

ایک موٹر سائیکل کھڑکھڑاتی ہوئی آئی۔

ڈاکٹر کا شغری۔ وہ سیدھے ڈاکٹر عنبر میں بیگ کے مکان واقع روربنک روڈ سے آرہے تھے اور صاحبزادوں کے دولت کدے تک فاصلہ انھوں نے ریکارڈ ٹائم میں طے کیا تھا۔ ٹیلی فون پر شہو اور خانم نے کہا تھا باجی پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ایسی ایمر جنسی میں یجینیت ایک فرض شناس ڈاکٹر منصور کا شغری اپنے مرلیضوں کے ہاں عطار دکی رفتار سے وارد ہوتے تھے۔

ایک قدم برساتی میں۔ دوسرا سیڑھی پر تیسرا برآمدے میں۔ آبشار والے کمرے سے گذرتے اندر گئے۔

دولوں بہنیں بی۔ وی۔ لاؤج میں چرمی آرام کرسیوں پر نیم دراز خوش گپتوں میں مصروف تھیں۔ نگار خانم بے حد صحت مند نظر آرہی تھیں۔ اور خشک میوے سے شغل کر رہی تھیں منصور کے قدموں کی مانوس چاپ پر کان لگا کر شہو اور نے فوراً دایاں ہاتھ پھیلایا۔ ”بجیا لائیے ایک عدد دہرا پتہ نکالیے۔ میں جیت گئی شرط آپ سے کہا تھا اگر فون کروں گی کہ بجیا سخت بیمار ہیں ڈاکٹر منصور اڑ سے چلے آئیں گے۔ چاہے آدھی رات کو بلائیے۔ ابھی تو سو ادس ہی بجیا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب لاؤج میں داخل ہوئے۔ شہو اور فوراً بولی۔ ”وہ۔ جنون کا کیسیٹ آگیا ڈاکٹر صاحب۔ میں نے سوچا یوں تو آپ آنے کے نہیں باجی کی علالت کا بہانہ۔“

ڈاکٹر منصور دنگ رہ گئے۔ رومال سے چہرہ پونچھ کر آہستہ سے کہا۔ ”یہ آپ نے اچھی بات نہیں کی۔“

“ALL WORK AND NO PLAY MAKES JACK A DULL BOY”

نگار خانم بولیں ”اتنے مصروف آدمی۔ کچھ دیکھنے بھی کبھی نہیں جاتے۔ ہم نے سوچا اسی بہانے۔“

”یہ آپ نے بالکل اچھی بات نہیں کی۔“ منصور نے دہرایا۔

”میں نے تو شہو اور کو سمجھایا تھا۔ یہ بہانہ نہ کرو۔ مگر اس کا پچھنا ہے۔ آپ کو کلنگ

فون کیا — پھر آپ کے فلیٹ فون کیا پھر یاد آیا شام کو تو آپ اکثر اپنی پارٹنر ڈاکٹر ٹرنی کے گھر پہ ہی پائے جاتے ہیں —“

اس اثنا میں شہوار خانم ویڈیو پر جنون شروع کر چکی تھیں۔

”نوش کیجئے۔“ نگار خانم نے خشک میوؤں کی پلیٹ پیش کی۔ ”یہ کابلی بادام آج صبح ہی دلی سے آئے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے کلو۔ افغانستان کی جنگ کی وجہ سے اتنے گراں — بھئی نفیسہ علی کیا حسین لڑکی ہے۔ اس پیکر کی شوٹنگ جب ملیج آباد میں ہوئی تھی ہم لوگ دیکھنے گئے تھے۔ سٹی کیور شبانہ اعظمی، نصیر الدین شاہ جینفر کیور، عصمت چغتائی، سب سے ملے۔ ڈاکٹر صاحب — یہ اخروٹ تو نوش کیجئے۔ آپ نے اپنی پارٹنر خوب منتخب کیں —“

”جی۔ شارڈ اکھنہ عنبر تین بیگ دونوں بے حد لائق اور نفیس خواتین ہیں۔ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہے؟“ منصور نے رکھائی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کھنہ سے تو ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر ڈاکٹر بیگ —“ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نگار خانم نے کہا ”وہ — ایسا ہے — ایسا ہے ڈاکٹر صاحب کہ ہم ایک قدامت پرست جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں P's سے میل جول معیوب سمجھا جاتا ہے۔“

”P —“ منصور نے بلڈ پریشر کے آلے کی سیٹی نگار خانم کے بازو پر باندھتے ہوئے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

”جی۔ آپ جانتے ہیں نا — P —“ شہوار سے GIGGLE کرنا شروع کیا۔

”PEA — یعنی مٹر —؟“

”جی نہیں — P — P — کھی کھی کھی — قہ — قہ — قہ —“

شہوار کی سنہسی — نگار خانم کا تہقہہ۔

”P — نہیں جانتے؟ —! PROS —“ شہوار نے وضاحت کی۔

”PROS AND CONS —“ منصور نے پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی۔ آپ کے امریکہ میں انھیں کیا کہتے ہیں؟ ارے ROS بھئی۔“

”اوہ۔ آئی سس۔“ ڈاکٹر منصور نے انتہائی آزر دگی اور تعجب سے دونوں بہنوں پر نظر ڈالی۔

”آجکل آزادی کا زمانہ ہے۔ شہوار۔ ذرا پچھر کی آواز کم کر دو۔ آجکل آزادی کا زمانہ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سب نے شرافت کی نقابیں اوڑھ لی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر بیگ اور انکی ماں کے بارے میں معلوم نہیں؟ وہ تو کیسے ہمارے منجھلے بھیا بال بال بچ گئے۔ پچھلے سال یہ ڈاکٹر ٹنی دلایت سے لوٹی۔ منجھلے بھیا سے نینی نال میں ملاقات ہوئی بھیا نے گھر آکر ہم لوگوں سے بہت تعریف کی۔ ہم نے کہا حسب دستور پیغام دینے سے قبل ہڈی بوٹی تو معلوم کر والو۔“

”آپ کے بھائی صاحب ORTHOPAEDICIAN ہیں۔“

”جی۔۔۔؟ وہ کیا چیز۔؟ نگار خانم نے پوچھا۔ پھر بولیں ”بڑی چھان بین سے تھوڑا سا پتہ چلا۔ اصل میں ماں بیٹیاں مدتوں فارن میں رہیں اس وجہ سے انکے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں کسی کلکتے والے کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر ٹنی کی ماں بھی P تھی اور نانی بھی۔ شکر کہ ہم بیوں کے خاندان سے بچ گئے۔ ورنہ کیا تھڑھی تھڑھی ہوتی۔ آپ کا تو کچھ اس قسم کا ارادہ نہیں۔“

عصے کی وجہ سے ڈاکٹر منصور کو خود اپنا بلڈ پریشر بڑھتا محسوس ہوا۔ ترشی سے جواب دیا۔ ”میں اپنے ذاتی معاملات DISCUSS کرنا پسند نہیں کرتا۔“

”کم آؤں۔ آپ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ جیسے میں نے منجھلے بھیا کے متعلق آپ کو بتلایا اسی طرح پوچھ بھی لیا۔ لیجئے پسینے کھائیے۔ یہ بھی بے حد ہنگے ملے ہیں۔ منجھلے بھیا کو دراصل یہ سودا ہو گیا ہے کہ گھر میں ایک ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ بیوی ڈاکٹر ہو۔ ایک میٹرنٹی ہو۔ اسکے لئے بنوادیں۔ اپنی نگرانی میں چلائے۔ بہنوئی ڈاکٹر ہو اسے تو پچاس بیڈ کانسنگ ہو۔ بنوادیں۔ ان کے لئے معمولی بات ہے بفضل خدا۔“

”جی۔ ماشا اللہ۔“

”آجکل دو چیزوں سے زبردست آمدنی ہے۔ ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم۔ ایک پرائیوٹ اسکول۔“

کھٹ۔ ڈاکٹر نے کیس بند کیا۔ نگار خانم کو انکے بلڈ پریشر کی اطلاع دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”نرسنگ ہوم تو خیر آپ کا اپنا ہی موجود ہے۔ مگر ساجھے کا ہے۔ آپ اپنی پھٹ پھٹی پر آئے ہیں؟“ باجی پھر گویا ہوئیں۔

”جی۔“

”منجھلے بیٹھانے فیٹیٹ کی ایجنسی لے لی ہے۔ آپ ایک گاڑی منتخب کر لیں۔ پے منٹ کی کوئی جلدی نہیں۔ ہونا رہے گا۔“

شہوار۔ بجیا کی بھونڈی باتوں سے نادم ہو رہی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب کے مستقبل کے سارے انتظامات آپ کو آج شام ہی مکمل کرنے ہیں؟ انھیں بکچر دیکھنے دیجئے۔“ اس نے ”جنون“ کی آواز تیز کی۔ ”نفسہ علی کا کلوز پ دیکھ کر نگار خانم بولیں۔“ اس عمر میں شہوار بالکل ایسی ہی لگا کرتی تھی۔

”تو اب میں کون ایسی ANCIENT سہوگئی ہوں۔“

باجی واقعی سٹھباتی جا رہی ہیں۔

منصور نے شہوار پر نگاہ ڈالی۔ آج شام وہ گلابی غرارے کے جوڑے میں وقتی نہایت دکش اور حسین نظر آرہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ پھر بلوری صوفے پر بیٹھ گیا۔

شام سنگھ حاضر ہوا۔

”بیٹا۔ وہ کتابوں والے بڑے میاں بڑی دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔“

”اس وقت؟ بولوکل صبح آئیں۔“ نگار خانم نے جواب دیا۔

”کہہ رہے ہیں انکا لڑکا بہت بیمار ہے۔ کچھ پیسے فوراً چاہئیں۔“

”ان عزیز لوگوں کا ہمیشہ یہی رونا رہتا ہے۔ آج بیوی بیمار ہے۔ کل لڑکا بیمار ہے۔ شہوار ذرا جا کر دیکھنا۔ تو پچاس^۵ دے کر رخصت کر دو۔ روز آکر سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔“
 یہ نگار خانم نامورنا ولسمٹ بہت ہی بدعورت ہے۔ منصور نے طے کیا۔ اور پھراٹھا۔
 ”میں جا کر بڑے میاں سے معلوم کرتا ہوں۔ انکے لڑکے کو کیا مرض ہے۔ اس کے علاج کی کوشش کروں گا۔ تھرڈ ورلڈ میں۔ بی۔ بی۔“

”کہاں جا رہے ہیں بیٹھے۔“ نگار خانم نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”لڑکے کو ہم نے بلرام پوٹ ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ ان بڑے میاں کو جب آتے ہیں تو پچاس^۵ دیدیتے ہیں۔ آپ کس کس کی مدد کیجئے گا۔ یہاں ہر شخص ہی رونا روتا ہے کہ میرا حال پتلا ہے۔ بیٹھے۔“ نگار خانم نے انکا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھال دیا۔

منصور نے پھر پوچھا: ”یہ بڑے میاں کتب فروش ہیں؟ ابھی آپکے دربان نے۔“
 ”جلد ساز۔ ہمارا کتب خانہ ابھی پردھان پور سے منتقل ہوا ہے۔ چند حسنة قلمی نسخوں کی جلد بندی ان سے کروانی تھی۔ تبھی سے یہ ہمارے پیچھے بڑ گئے۔“ شہوار نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔

اب بسنتی مہری اندرائی۔ ”بڑی بیٹا۔ چھوٹے بھٹکا پھون آدا ہے۔“
 مسکت سے۔

”ادھو۔ معاف کیجئے گا ابھی آئی۔ مسقط سے ٹرنک کال۔“ نگار خانم بھی اٹھ کر مریض زینے کی سمت لپکیں۔

منصور پھر ویڈیو کی طرف متوجہ ہوا۔ ”۱۵۵ کی ایک سچی کہانی۔ ایک یوریشین ماں اور انگریز باپ کی لڑکی سے ایک پٹھان زمیندار کے جٹوں نے عشق کی داستان۔“
 نگار خانم نے چند ورق قبل اس بکچر کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مخصوص میلوڈ ری میڈیکل ٹائٹل میں اسے بتلایا تھا۔

تھبھڑ۔ نگار خانم کے ہاں بھی تھبھڑ کی فراوانی ہے۔ عندلیب بانو کے ہاں بھی۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔ کہ

بے چاری سٹریٹ کے لئے ایک نامعلوم طریقے سے میرے رویے میں فرق آ گیا ہے۔ پہلے میں اپنی ماں یا خالہ یا کسی اور بزرگ عزیزہ کی طرح انکا بے انتہا احترام کرتا تھا۔ اب وہ بات کیوں نہیں رہی؟ کیا میں بھی واقعی بنیادی طور پر شیخ عبدالباسط گولے والے کا وارث ہوں؟ سارا قساد جانکاری کا ہے۔ او دیا بڑی نعمت ہے۔

وہ اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ بالائی منزل پر دونوں بہنیں مسقط سے طویل گفتگو میں مصروف تھیں۔ کسی انسان کے پس منظر میں کوئی غیر معمولی سانحہ پنہاں ہو۔ اس کے کسی قریبی عزیز نے خودکشی کر لی ہو یا کسی کو قتل کر کے پھانسی چڑھا ہو یا اس کی کوئی عزیزہ اغوا کر لی گئی ہو۔ تو اس سانحے کی ایک غیر معلوم پرچھائیں سی اس بالکل غیر متعلق انسان کی شخصیت پر پڑ جاتی ہے۔ اگر دوسروں کو اس کے متعلق معلوم ہو جائے۔ اب بے چاری عنبریں۔ یہ حقیقت — کہ اس کی نانی کا نام نواب بانی تھا۔ ماں کا ”بلبل دسی ڈانسر“ محض اس وجہ سے عنبر بن اب مجھے پہلے سے ذرا مختلف معلوم ہونی ہے کاش وہ لال پٹاری بند زہنی — اسے محسوس ہوا دریچے میں سے کوئی بھیانک سی رچھ نماشے اندر جھانک رہی ہے۔ ذرا خائف ہو کر وہ پیچھے ہٹا۔ وہ شاگردیشے والا سبز پلوش خطی باہر دانت نکو سے کھڑا تھا۔ ایلس ان ونڈر لینڈ کی CHESHIRE CAT کی طرح اندھیرے میں صرف اس کی مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔

باہر کاراگر کی شہوار کے بڑے بھائی ہلدوانی سے واپس آگئے تھے۔

”بھاگ جا بے —“ پاگل دریچے پر دستک دے کر آہستہ بولا — ”بھاگ جا

— ورنہ پھنسا اس اندر جاں میں“ وہ ایک قہقہہ لگا کر CHESHIRE CAT

کی طرح تاریکی میں تحلیل ہونا شروع ہوا۔

شہوار خانم اور انکے پیچھے سنہتی مہری کافی کے ٹرے لئے لاؤنج میں آئیں

پچھے پیچھے قبلانی بہادر۔ رنگ برنگی اشیائے آرائش اور روشنیاں انتہائی
میش قیمت بلوریں فرنیچر پر منعکس تھیں۔ رنگ کے اندر رنگ۔ پرچھائیاں کے اندر
پرچھائیاں۔ اندر جاں کا طلسم۔

”بجیا کے نئے ناول کا۔“ شہوار نے کافی بناتے ہوئے منصور کو مخاطب کیا۔
”جشن اجرا ہونے والا ہے۔“
”مبارک ہو۔“

”سارے اردو اور انگلش پریس والوں کے صبح سے شام تک فون آتے رہتے
ہیں۔ حالانکہ بجیا تو پیسٹی بالکل پسند نہیں کرتیں۔ مجبوراً انٹرویو دینے ہی پڑتے ہیں۔“
”بیشک۔“

”آج بھی ایک اردو اڈیٹر نے ٹیلی فون کیا تھا۔ باجی کے متعلق اسپیشل نمبر کالنے
پر مصر ہیں۔ کل صبح آئیں گے۔ وہ باجی کے احباب سے بھی مضمون لکھوا رہے ہیں۔
یوٹو HUMAN ANGLE باجی بحیثیت ایک پر خلوص دوست آپ بھی کچھ لکھ دیجیے۔
”میں۔۔۔؟ مجھے معاف رکھیے۔ اچھا۔ اب اجازت؟“ کافی کا ایک گھونٹ
بھر کر منصور گھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔ کچھ تو ضرور لکھیے۔ چند الفاظ۔ یا نہنتی پیغام رسالے کے لیے۔
آپ بھی ایک معروف شخصیت ہیں۔ اور باجی کے ذاتی معالج۔“

”بھئی شہوار۔ میں ان چکرروں میں نہیں پڑتا۔ نہ مجھے لکھنا دکھنا آتا ہے۔“
”اچھا انگریزی ہی میں چند الفاظ۔۔۔ کل صبح اس اخبار کے اڈیٹر صاحب
باجی کو انٹرویو کرنے آ رہے ہیں۔ ان سے کہوں گی آپ کو فون کر لیں۔“

دوسری صبح، دس بجے، حضرت زراغ دہلوی، جناب بیٹلموس اور جناب پٹافاٹوس

پنی سائیکلوں سے اترے۔ شام سنگھ نے انکو آبشار والے کمرے میں پہنچایا۔

ایوان نشست کے مصنوعی پہاڑی نما مینٹل پیس سے ایک مصنوعی آبشار جاری تھا۔ جس کا پانی ایک پوشیدہ نالی کے ذریعے پائیں باغ میں جاگرتا تھا۔ کمرے کے وسط میں فوارہ۔ شیشے کی چھت میں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔

”یہ کمرہ اگر نفاست سے سجایا جاتا تو بہت خوبصورت ہوتا۔ اب تو بالکل فخرخجرا کا نوروم۔“ حضرت زاغ نے اظہار خیال کیا۔

”بھائی خاموش رہیے۔“ جناب بطیموس نے آہستہ سے کہا۔

”صاحب انکی فیکٹری میں نوکری آپ کے لڑکے کو ملی ہے۔ خاموش میں رہوں؟“ زاغ نے جواب دیا۔ ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے ایک سنہرے گھوڑے کو چھوا۔ اور بولے۔

”رو میں ہے خوش عمر کہاں دیکھتے تھے۔ نہ ہاتھ پاؤں میں ہے نہ پاؤں۔“

”زاغ صاحب بگلا گئے ہیں۔“ لیفا تو س بولے۔

”حق کو ہمیشہ پاگل کہلاتا ہے۔“ انھوں نے سقراط کے جیسے پرا لنگلی رکھی۔ ”پورے فمرے میں یہی ایک معقول چیز نظر آئی۔ غلطی سے خرید لی ہوگی۔ آئیے حضرات ہم۔ یہاں ماندھی جی کے تین بندروں کی طرح بیٹھ جائیں۔ نہ کچھ دیکھیں۔ نہ سنیں۔ نہ بولیں۔“

”اہل ثروت سے اتنا تنفر آپ کے احساس کمتری کا غماز ہے۔“ بطیموس

نے کہا۔ وہ تینوں ایک طویل سنہرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ٹیپ ریکارڈر سامنے منقش کاغذی ٹیبل پر رکھا۔ مصنوعی جھرنے کی آواز سنتے رہے۔

”صدائے آبشاراں از اطاق شاہوار آمد۔“ زاغ دہلوی نے فرمایا۔

صاحبزادی شہوار خانم ہوا کے جھونکے کی طرح اندرائیں فرسبسی ”اوسیم“ سے معطر۔ آداب عرض کرنے کے بعد تینوں صم بکلم بیٹھے رہے۔ انکی بد تہذیبی پر جزبہز ہوتیں ”اڈیٹر صاحب تشریف نہیں لائے؟“ انھوں نے ایک مرصع اسٹول پر ٹکتے

ہوئے اس انداز میں دریافت کیا جو اپنے سے سماجی طور پر کم تر انسانوں کے لیے مخصوص رکھتی تھیں۔ یہ بے چارے مننی مسکین سے صحافی۔ انھیں زیادہ سر چڑھانے کی یوں بھی ضرورت نہیں۔ فوراً بے تکلفی پر اتر آئیں گے۔ دراصل ہمارے مڈل کلاس مردوں کو اب تک بے پردہ آزاد خود مختار خواتین سے بات کرنے کی نہ عادت ہے نہ سلیقہ۔ اگر ذرا دوستانہ انداز میں بات کی فوراً منگالے میں مبتلا۔ ہمارے ہاں بیشتر لوگ اب تک مخلوط سوسائٹی کے عادی نہیں۔ لیکن بجیا کا حکم کہ اردو پریس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آؤ۔ میں اردو رائیٹر ہوں۔ میرا تعلق اردو پریس سے ہے۔ شہوار مصر تھیں کہ جشن اجراء کے متعلق ایک پریس کانفرنس کلاکس اودھ میں کی جائے۔ اس میں انگلش کے نیشنل روزناموں ٹائمز آف انڈیا، اسٹیشن، ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس وغیرہ کے اسمارٹ، پائپ پیٹے ہوتے نمایندے مدعو ہوں۔ نہ کہ یہ ٹٹ پو نیچے اردو والے۔

”جی۔ اڈیٹر صاحب نہیں آسکے اپنے بجائے ہم تینوں کو بھیجا ہے“ بطلیموس نے جواب دیا اور زآغ دہلوی پر متفکر نظر ڈالی جو نہایت انہماک سے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر DOODLING کر رہے تھے۔ ”نگار خانم اردو فکشن کی لیتنا پوار“ بطلیموس نے کاغذ ان سے پھینا اور پھاڑ کر اپنے بریف کیس میں چھپا دیا۔

”آج صبح نگار صاحبہ نے اڈیٹر صاحب کی یاد دہانی کی تھی کہ انٹر ویو کے لئے منتظر ہیں۔“ زآغ صاحب نے فرمایا۔

”پہلے آپ صاحبان کا تعارف ہو جائے۔“ شہوار خانم بھی رکھانی سے لوئیں۔
 ”خاکسار کا فلمی نام بطلیموس ہے۔ مزاحیہ کالم لکھتے ہیں۔ آپ جناب یقیناً تو س ہیں۔ یہ بھی انکا فرضی نام ہے۔“
 ”جی۔ اتنا تو میں سمجھ سکتی ہوں۔ کسی شخص کا نام سید یقیناً تو س جین تو ہو نہیں سکتا۔“
 بطلیموس اور یقیناً تو س نے تو صیفی قہقہہ لگایا۔ شہوار خانم سنجیدہ رہیں۔

”ہم فیچر لکھتے ہیں۔ زآغ صاحب سنڈے اڈیشن کے لئے مزاجیہ سیاسی غزلیں“
بطلموس نے عرض کیا۔

”اڈیٹر صاحب نے کہلوا یا ہے کہ آپ نے جشن اجراء کے لئے جو تاریخ طے کی ہے اس کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیجئے کیونکہ اس ہفتے چیف منسٹر صاحب اور دوسرے وی۔ آئی۔ پی۔ لکھنؤ سے باہر ہوں گے۔ علاوہ ازیں جس قسم کا شاندار اسپیشل نمبر نگار صاحبہ چھپوانا چاہتی ہیں اس کی تیاری میں بھی دیر لگے گی۔“
”جاگی اسپیشل نمبر چھپوانا چاہتی ہیں؟ خود آپ کے اڈیٹر۔“
”میڈم۔ ہم پریس کے آدمی ہیں۔ ہم سے کیا پرہہ؟“ زآغ صاحب نے فرمایا

یہ شخص بہت ہی بیڈھب تھا۔ بے نکا۔ شہوار خانم کا پارہ تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ جاگی کی نصیحت یاد کر کے خاموش رہیں۔ سرد مہری سے پوچھا: ”اپوائٹمنٹ آپ کے اڈیٹر سے تھا۔ وہ کیوں نہیں آئے۔“
”انہوں نے فرمایا نگار خانم عصمت چغتائی تو ہیں نہیں جو انکو انٹرویو کرنے میں خود جاؤں۔“ زآغ صاحب بولے۔ شہوار کا چہرہ غصے سے لال بھبھو کا ہو گیا بطلموس ادا پفنا تو اس نے زآغ صاحب کو گھور کے دیکھا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔
”اڈیٹر صاحب کو یاد دلا دیجئے گا ہماری فیکٹریوں کے سارے اشتہار آپ کے اخبار کو دیے جاتے ہیں۔“ صاحبزادی شہوار نے ایسی بر فیلی آواز میں جواب دیا جو سیدھی قطب شمالی سے آرہی تھی۔

”بھائی زآغ آج آپ نے ہم دونوں کو ٹوکری سے نکلوانے کا بندوبست اچھا کیا۔“ بطلموس نے رنجیدگی سے بات کی۔
”زہر ہلاہل کو کہا جاتے تعلقند؟“

”خاموش رہتے۔“

میں بھی خاموشی کی سازش میں شامل ہو جاؤں۔ جی؟ شہوار خانم اپنے بھائی کی
ٹیکسٹوں کا رعب ڈال رہی تھیں۔“

”ایک ناول نویس کی فیکٹری تو بڑی بہن چلا رہی ہیں۔ انکے ہر ناول پر پھینچا چاہیے
نگار خانم پروڈکٹس۔“

”زاع صاحب اب آپ خود ایک اخبار نکالیے۔ اسکا نام رکھیے صورِ اسرافیل
بطلموس نے ترشی سے جواب دیا۔“

وہ تینوں امتاس کے نیچے رکھی سائیکلوں کی طرف بڑھے۔

اپنی بائیکل کا تالہ کھولتے ہوئے بطلموس نے سر اٹھا کر درخت کو دیکھا۔ اور
افسردگی سے بولے۔ ”اللہ عنی۔ آج سے چالیس بیالیس سال قبل ہم اس پیڑ کی
چھاؤں میں سائیکل کھڑی کیا کرتے تھے۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہم آج بھی
اسی امتاس کے نیچے کھڑے سائیکل۔“

”یہ خاندان تو دو دو سال قبل ہی یہاں منتقل ہوا ہے۔“ پفنا ٹوس نے کہا۔ ”پہلے تو
یہ لاپلازمیں رہتے تھے۔“

”ہم لاپلازمیں کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں ایک زرد رنگ کی کوٹھی تھی۔ اس میں
دو بہنیں رہتی تھیں۔ لال بیبیاں۔ ہم جوہلی کالج میں پڑھتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں۔
ڈیوشن کرنے یہاں آتے تھے۔ وہ دونوں ہم سے اردو پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن بہت
ذہین تھی۔ تیز و طرار۔ اردو بھی بہت صاف بولتی تھی۔ نور ماڈریک۔“

لال بی بی

نور ماٹورین ڈریک۔ باپ کا نام: جارج نورمن ڈریک۔ سابق نکت چیکرائیٹ انڈین ریلو سے
ساکن لال باغ۔ لکھنؤ۔

لال باغ لکھنؤ میں جو سڑک حضرت گنج جاتی ہے اس کے نکت پر چند کابٹھیں ایک
قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں لال بیبیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا۔ دوسری
جنگ عظیم کا زمانہ — ٹرینیں کھینچ کھینچ بھری ہوئی چل رہی تھیں۔ برج اور ٹینس کے
مشہور کھلاڑی کنور دلشاد علی خان عرف دلن میاں کے چچا ٹھا کر جو ادلی تعلقدار دھاپنور
— اللہ بخشے سیدھے سادے نیٹو جنٹلمین بہت کم سفر کرتے تھے اور انگریزوں سے
گھبراتے تھے۔ ایک روز کانپور سے لکھنؤ واپس آرہے تھے۔ ٹرین چھٹنے سے چند
منٹ قبل کانپور ریلو سے اسٹیشن پر پہنچے۔ ہر سکند اور فرسٹ کلاس میں گورے فوجی۔
اُن سے بچنے کے لئے ایک انٹر کلاس میں گھسے۔ اس میں بے شمار کالین۔ انگریزوں
سے بچنے کے لئے یہ صعوبت اٹھانی تھی دیکھا تو یہاں بھی ایک عدیم موجود۔ راجہ صاحب
کے شوپن بھتیجے دلن چو برٹش اور امریکن فلمی رسالے منگواتے تھے ان میں چھپنے
والی ولایتی ایکٹرسوں کی ایسی۔ بند کی دار فزاک سر پرہ بند کی دار بگڑی نما اسکارف۔
ساتھ ایک بے حد شیر پانچ سالہ بچہ۔ کھڑکی میں بیٹھی ایک گورے ٹامی سے باتیں کر رہی
تھی جو باہر پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اور اسے پہنچانے آیا تھا۔ ٹھا کر جو ادلی فوجی
عہدوں کے نشانات سے ناواقف تھے۔ انکے لئے ہر گور اور دی پوش بڑا افسر تھا۔
انکو میم کے بالکل برابر جگہ ملی۔ دم بخود بیٹھے افسوس کرتے رہے کہ رش کی وجہ سے

بے چاری کو انٹر کلاس میں سفر کرنا پڑا۔ جوں ہی ٹرین چلی میم کا پچھانگی طرف متوجہ ہو اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ ان سے چھینا بھپٹی شروع کر دی۔ انکی ململ کی نفیس دوپٹی ٹوٹی اتار کر خود اوڑھی اور جوتوں سمیت گود میں چڑھ کر کودنے لگا۔ میم اس کا ڈانٹنے کے بجائے اطمینان سے ”فوٹو پلے“ پڑھتی رہی جو گور سے سارجنٹ نے اسے وہیلرز سے خرید کر دیا تھا۔

میم کا رمن میر انڈا کی نئی فلم ”ڈاؤن ارجینٹا دے“ کی کہانی ملاحظہ کر رہی تھی اس کے لڑکے نے راجہ جو ادلی کی طلائی جیبی گھڑی مع طلائی زنجیر جیب سے گھسیٹ لی۔ اور اسے پھر کی طرح گھمانے لگا۔ تب ماں نے گھڑی اس کے ہاتھ سے لے کر ٹھا کر صاحب کو دی۔ ایک نظر ان پر ڈال کر بڑے اخلاق سے معذرت چاہی۔ ٹھا کر صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔ کارڈ نکال کر دیا۔ ”راجہ جو ادلی خاں آف دھان پور“ میم نے اسے پڑھا اور زیادہ اخلاق سے باتیں کرنے لگی۔ بڑی ملنسار عورت تھی۔ کاش ہر انگریز ایسا ہوتا چودھری صاحب نے دل میں سوچا۔ اتنے میں سیٹ سے اٹھتے ہوئے ایک مسافر کا پاؤں میم کے پاؤں پر پڑ گیا۔ وہ بے حد تیز آواز میں چلائی: ”یو بلڈی انڈین آر یو بلا تینڈ“ بلڈی فول بروک مائی بلڈی لو۔“

”بلڈی“ اس کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔

لکھنؤ آ گیا۔ میم نے ٹھا کر صاحب کو اپنا کارڈ دیا۔ اور بولی کسی روز ضرور آئیے گا۔ کیسی خوش اخلاق فرنگن تھی۔ وہ اور اس کا بد تمیز لڑکا اسٹیشن سے باہر تانگہ اسٹینڈ پر بھی نظر آئے میم نے دُور سے ٹھا کر صاحب کو بانی بانی کیا۔

چند روز بعد محرمس ویک آیا۔ جو برطانوی دور کے لکھنؤ میں بڑا پہل پہل کا زما ہوتا تھا۔ راجہ جو ادلی خان اپنی پرانی ڈوچ پر حضرت گنج سے گزر رہے تھے خیال آ

میم صاحب کو سیزن کی مبارکباد دیتے چلیں۔ بے چاری نے بڑے اخلاق سے مدعو کیا تھا۔ گاڑی روک کر اُس بے سودہ بچے کے لئے ایک قیمتی ولایتی کھلونا خریدا اور لال باغ کا رخ کیا۔ ہلیئرز بلڈنگ کے نگر پر پہنچ کر ایک تنبولی سے پوچھا: ”کیوں میاں! یہاں صاحب لوگ کس طرف رہتا ہے؟“ جیب سے میم کا دیا ہوا وزٹنگ کارڈ نکالا۔ ”بس نور ماڈریک“ اور پنواڑی کو کوٹھی کا نمبر بتلایا۔

”جی ہاں سمجھ گئے۔ بہت صاحب لوگ ادھر آتا ہے۔ وہ سامنے جائیے۔ جس بنگلے میں امتلاس کا پیڑ کھڑا ہے“

”کو کا پوچھت ہیں؟“ ایک راہ گیر نے ٹھنک کر سوال کیا۔

”ایک ٹھولال بی بی کا پوچھت ہیں۔ یہاں اور کو کا پوچھت ہیں۔“

”کون سی والی لال بی بی؟ ڈورا میم صاحب؟“

”نہیں نور اس صاحب؟“

”ارے وہی سامنے تو بنگلہ ہے۔“ راہ گیر نے جواب دیا اور آگے بڑھا گیا۔

”لال بی بی“ کا مطلب چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حیر ہوگا۔ آگے بڑھے۔ کرسمس کی وجہ سے ہر کاٹج کا برآمدہ کاغذی رہنوں غباروں اور چمکیلے اسٹار اوف ڈیوڈ سے آراستہ۔ ولایتی موسیقی کی آواز ہر گھر سے آرہی تھی۔

ڈوج امتلاس والی کوٹھی کے پھاٹک میں لے گئے۔ برآمدے میں ایک بوڑھا انگریز آرام کرسی پر نیم دراز پائیر پڑھ رہا تھا۔ پیر کا مگ تپانی پر دھرا تھا۔ ایک لبریری ڈرفزش پر نوا سیدہ راجہ صاحب نے حلق صاف کر کے کہا ”گڈ مورننگ سر۔“

”میری کرسمس!“

بڈھے نے گاڑی اندر آتی دیکھ لی تھی۔ اخبار منہ کے سامنے سے ”ا“ مسکرایا

اور پوچھا: ”ہلو کس سے ملنا مانگتا؟“

”بس ڈریک سر۔“

”نور مایا سیلی؟“

راجہ صاحب نے گھبرا کر پھر کارڈ نکالا ”نور ماڈریک سسر۔ ٹرین میں ملی تھیں۔ ہم نے کہا بابا لوگ کو بڑا دن دیش کر آویں۔“

”اوہ۔۔۔ کم ایوننگ۔۔۔ بڈھا جو شکل سے مس ڈریک کا باپ معلوم ہوتا تھا راجہ صاحب کو ایک نفیس ڈرائنگ روم میں بٹھا کر غائب ہو گیا۔ مگرے کے ایک کونے میں اونچی سچی سجانی کرسی بڑی استادہ تھی۔ آتش دان پر کرسیس کارڈ۔ دیواروں پر گریٹنگ اور لوکلارک گیبیل اور ڈوڈو تھی لیور کی تصاویر۔ ایک کالی چیمپیشن عورت جھاڑن ہاتھ میں لئے اندر آئی جو بعد میں ٹھا کر صاحب کو معلوم ہوا کہ بڈھے کی بیوی اور مس نورما ڈریک کی ماں تھی۔ وہ اس عورت کو آیا سمجھے۔ اب تعلق دارانہ حکم سے فرمایا: ”راجہ صاحب دھان پور۔ ٹرین میں ملے تھے مس صاحب کو سلام بولو“

”یس راجہ صاحب“ چیمپیشن نے مرعوب ہو کر جواب دیا ”مس صاحب ابھی آتا ہے“ باہر چلی گئی۔ دفعتاً خیال آیا اگر یہ مس ڈریک ہیں تو وہ بچہ ان کا لڑکا کیسے ہے۔ خیر ہوگا۔

چودھری جو ادلی بیٹھے اکتا یا کتے۔ صوفے کے نیچے اخبار کا ایک پرزہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں شاید کوئی امریکن فوجی کرسی کا تحفہ پیٹ کر لایا ہوگا لاس اینجلس کے کسی اخبار کا ذرا سا ٹکڑا۔ ٹھا کر صاحب نے اٹھا کر وہی پڑھ ڈالا۔۔۔ سی۔ بی۔ ایس۔ ”بلونڈی“ ”بگ ٹاؤن“ ”شوز۔ ایڈورڈ جی روبینسن۔ لوکل ڈرافٹ بورڈ۔ ٹامس ماسٹر سٹنگر۔ نیگر روحانی نغمے اور ’ڈرنک ٹوٹی ادلی دو داسن آیزز‘ کیری می بیک ٹو اولڈ ویجینی۔ کلیرنس سیل۔ ۶۴۲۵ سن سیٹ بولور۔ کورنڈ بیف، سینٹ۔ وی آنا ساج ۸ سینٹ

تبھی پردہ سر کا اور گلابی ساٹن کے ولایتی فرغل میں ملبوس۔ منقسم اد معطر مس ڈریک داخل ہوئیں۔ ٹھا کر صاحب کا کسی گوری چمڑی والے سے اس گھر پہ ملنے کا اتفاق کم ہوا تھا۔ نہ انکو یہ معلوم تھا کہ کوئی شریف اور شائستہ انگریز خاتو ہاؤس کوٹ پہن کر کسی اجنبی سے ملاقات نہیں کریگی۔

نورما ڈریک انکے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹھا کر صاحب نے کہا ”بابا کیا ہے۔ ہم اس کے لئے یہ معمولی سا کرسمس پریذنٹ —“

”او ہاؤ نائس آف یو — تھینک یو —“ راجہ صاحب۔ مگر جارج بابا تو کل اسکول چلا گیا۔ بارلو گنج۔ مسوری — آپ کیا پیسے گا؟ کوئی ایک —؟“

”مس صاحب ہم محمدن آدمی ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ بس آپ کو بڑے دن کا سلام کرنے چلے آئے تھے، نورما ڈریک زور سے سنہی۔ سمجھ گئی لڑہیں۔“

باہر نکلے۔ اسی وقت ایک سرمئی شیوا گر رکی۔ اودھ چیف کورٹ کا ایک انگریز جج برآمد ہوا۔ ٹھا کر جو ادلی اُسے پہچان گئے۔ دل میں سوچنے اپر کلاس لوگ ہیں۔ انگریز ہائی کورٹ جج ملنے آیا ہے۔

جج نے ذرا ترش روتی سے ان پر نگاہ ڈالی اور سر اٹھائے تاک کی سیدھ ڈرائنگ روم میں چلا گیا —

چند ماہ بعد راجہ جو ادلی نے کلکٹر لکھنؤ اور ایس ٹو ایس لائیڈ کی دعوت پر جھاؤنی میں فوجی دلخوش سبھا کی ایک تقریب میں شرکت فرمانی تو وہاں یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ مس نورما ڈریک اونچا ہنگا اور شیشے کے کام کی چولی پہنے ماتھے پر نگھاڑی اور بوسجائے ایک پنڈال کے نیچے ناچ رہی تھی۔ نام اس کا مس نرملا دیوی اناؤس کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور گوری چھو کر می نے ہندوستانی ناچ دکھایا۔ اس کا ایٹیج کا نام شیلاد دیوی اور اصل نام وینی فریڈ کلیٹن تھا۔ وہ بھی لال باغ کی ایک لال بی بی تھی بے چارے راجہ صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لال بیبیاں کلکتے کی یہودی رقاصہ مس سنیٹس اور یوٹیشن رادھارانی اور ڈورین عرف مس مہجری اور اینڈی رینال عرف مس بلبل کی روایت کی یادگار تھیں۔ اور انکے کہنے شاہی کے زمانے سے لکھنؤ میں رہتے آئے تھے۔ ٹھا کر جو ادلی کو اپنے اوپر بے حد غصہ آیا۔ اس روز کیسے پتوں بنے۔

چودھری جو ادعلی جتنے بھولے اور نیک تھے۔ انکے مرحوم چھوٹے بھائی کا لڑکا دلتن اتنا ہی شاطر اور حرفوں کا بنا۔ — چودھری صاحب بے چارے کی بیوی بچے مر چکے تھے چھوٹے سے تعلقے دھان پور کے مالک تھے۔ اس کی ڈھائی تین ہزار ماہوار کی آمدنی میں فراغت سے گزر کرتے تھے۔ جاہلنگ روڈ پر رہتے تھے اور فارسی ادب اور صوفیائے کرام کی ملفوظات کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ یا اپنے اکلوتے بھتیجے اور وارث دلتن صاحب کی تعلیم و تربیت کی ناکام کوشش میں —

اگر آپ کو ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے اور چارمنگ راسکل کی صحیح اور دلکش تصویر دکھینی منظور ہے تو کسی شام بھی چھتر منزل کلب یا دلکش کلب جا کر کنور دلشاد علی خان آف دھان پور سے ملنا چاہیے۔ یہ نوجوان شخص اس وقت تک لا مارٹیز لکھنؤ سے انسٹریڈیٹ نہیں کر پایا تھا۔ البتہ تاش کا ماہر تھا۔ بیٹہ اچھا۔ بچا تھا۔

اصغر علی محمد علی دالے حاجی اصفیٰ خاں کے ساتھ اسکیٹنگ کرتا تھا۔ اپنے تایا کو بہت مانتا تھا۔ ان کا ادب کرتا تھا۔ اور انکو چونا لگانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

اس روز بڑے باپ فوجی دلخوش سمجھا کے جلسے سے لوٹ کر آئے تو بہت ملول معلوم ہو رہے تھے۔ خداوند ایہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔

دیوان خانے میں آکر اپنی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بھتیجے سے دریافت کیا (جس کی اس ڈپارٹمنٹ سے واقفیت کا انھیں تھوڑا سا علم تھا) —

”کیوں میاں یہ لال بیبیاں کون چیز ہیں؟“

”بڑے آبا آپ معلوم کر کے کیا کہتے گا۔ مخرب الاخلاق شے ہیں۔“

”ہاں مگر اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ گوری بھیج اور بے نچاشا پاؤ ڈر سرخی ممکن

ہے اس وجہ سے عوام نے انکو لال بی بی کہنا شروع کر دیا ہو۔“

”عین ممکن ہے۔“ بھتیجے نے مختصر جواب دیا۔ لیکن بڑے باپ انکا لڑائی

— ان کو ٹوہ لگ گئی تھی۔ عینک لگائی۔ اٹھ کر ایک الماری سے تین ضخیم فرہنگیں

اُتاریں مگر کھولے بغیر واپس رکھ دیں۔ اپنی جگہ پر آن بیٹھے۔

ساتھ پُروڈ لال باغ والی ایک لال بی بی کو تین روز بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی ہیٹ لگا رکھی تھی۔ جس پر رنگ برنگے مصنوعی پھول چسپاں تھے۔ اس سرخ ہیٹ پر نظر پڑتے ہی معادلن میاں کے ذہن میں آیا۔ لال بی بی اسکارٹ وومن کا ترجمہ رہا ہوگا۔ یا ایک زمانے میں انکے مکانات پر شاید سرخ لالیٹین رکھی جاتی ہو۔ عقدہ حل ہو گیا۔

اسٹریٹنگ وہیل کو چلے دیا۔ مڑ کر گھر جائیں اور بڑے آبا کو بتائیں کہ لال بی بی کے معنی معلوم ہو گئے۔ اسی لمحے دل پر چوٹ سی پڑی۔ بڑے آبا تو ملکِ خاک بسا چکے۔

جاپلنگ روڈ کی کوٹھی دھان پور کے مکانات فروخت کیے۔ مرحوم راجہ جو ادلی کا کتب خانہ کباڑی کے ہاتھ بیچا۔ تر کے کا پیسہ اور بونڈ کی قیمت جلد از جلد بخیرو خوبی اڑا کر نوجوان راجہ صاحب دھان پور نے پرتولے۔ ”صاحبزادہ دلشاد علی خان آف دھان پور“ کے وزٹینگ کارڈ چھپوائے۔ پاکستان میں راجہ اور ٹھاکر کے موروثی خطاب سے شاید لوگ کنفیوز ہوتے۔ ایک سہانی صبح لکھنؤ کو خیر باد کہا اور بندریعہ ٹرین لاہور پہنچے۔ اس کے بعد دنیائے دُنی میں حوصلہ آزمائی کیلئے نکلے۔ سوائے اپنی وٹ اور چارم کوئی اثاثہ نہ رکھتے تھے۔

تاش کی مہارت ان کا سب سے بڑا حربہ تھا۔



نورماہِ خانم

جس وقت وکٹوریہ جہاز نے بلیر ڈزیز بمبئی سے لنگراٹھا یا ٹورسٹ کلاس میں بھانت بھانت کے ہندوستانی طلباء بھرے ہوئے تھے۔ اسی مجمع میں کلکتے کی ڈاکٹر اے۔ بیگ بھی شامل تھیں جو اڈنبرا میڈیکل کالج جا رہی تھیں۔ منراے بیگ انکے ہمراہ تھیں۔ متمول پارسی خوجے بوسہرے اور غیر ملکی فرسٹ کلاس میں ٹہلتے پھر رہے تھے۔ بندرگاہ کراچی سے بھی پاکستانی طلبا و طالبات زیادہ تر ٹورسٹ کلاس میں سوار ہوتیں۔ اعلیٰ فوجی اور سویلین افسروں، پاکستانی پارسیوں متمول خوجوں بوسہروں نے فرسٹ کلاس کا رخ کیا۔ درجہ اول کی فہرست میں صاحبزادہ دلشاد علی خاں کا اسم گرامی شامل تھا۔ ٹورسٹ کلاس میں ایک اینگلو پاکستانی عورت بھی موجود تھی۔ بحر پیمادوں کی فہرست میں اسکات نام نورماہِ خانم درج تھا۔ وہ عموماً الگ تھلگ ایک ڈیک چیر پر بیٹھی انگریزی جاسوسی اور رومانی ناول پڑھتی رہتی۔

صاحبزادہ دلشاد علی خان عدل پہنچتے پہنچتے فرسٹ اور ٹورسٹ کلاس کی ہر قومیت اور ہر عمر کی خواتین میں یکساں طور پر مقبول ہو گئے۔ وہ آرام کریسیوں پر چپ چاپ بیٹھی مغز خواتین سے انکی مختلف النوع علالتوں پر تبادلہ خیالات کرتے انکے نانی پوتوں کی تھویریں دیکھتے۔ نوجوان خواتین کو انکے ڈریس سنس اور اسمارٹ نس اور خوبصورتی پر مبارکباد دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مغربی بوڑھوں اور نوجوانوں سے انکی دلچسپی کی گفتگو کرتے۔ بچوں کو تاش اور جادو کے کھیل دکھاتے اڑھیس سالہ صاحبزادہ صاحب اپنی کینٹی کے گرے بالوں اور دجہیہ شخصیت کی وجہ سے ہین لاؤنگ

جمع میں ممتاز نظر آسکتے تھے۔ لائبریریوں کے اس اطالوی جہاز پران کی ہر دلعزیزی باعثِ تعجب نہ تھی۔

عدن پہنچنے سے دو روز قبل صاحبزادہ صاحب کی نورماہ خانم سے ملاقات فرسٹ کلاس بار پر ایک ایسی رومان پرورشام ہوئی جب آسمان اور سمندر پر پونم کا چاند جگمگا رہا تھا۔ اور مسافر لینڈ ڈارنل کی چند سال پرانی فلم "FOR EVER AMBER" دیکھ کر واپس آچکے تھے۔

نورماہ خانم ٹورسٹ کلاس کی مسافر تھی لیکن ایک پاکستانی خوجے بزنس مین کی دعوت پر اوپر فرسٹ کلاس بار پر آئی ہوتی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اپنی جہاں دیدہ نظروں سے بھانپا کہ یہ اینگلو انڈین یا اینگلو پاکستانی ڈرگ باراں دیدہ ان سے چند سال بڑی لیکن انھیں کی طرح ہارڈ بوائیلڈ اور سخت جان ہے۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ اسے پہلے کہیں دیکھ چکے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے خوجے سے بات چیت شروع کی۔ پھر اس خاتون سے پوچھا "کیا آپ لاہور جم خانہ اکثر جاتی ہیں؟ شاید میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے۔"

نورماہ خانم کو اس OPENING GIMMICK کی حاجت نہیں تھی۔ مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ اور انکے اگلے MOVE کی منتظر رہی۔ صاحبزادہ صاحب سوچا کئے۔ کیانتی سے پُربوتل روشن سی ہوئی دفعتاً بڑے ابا مرحوم یاد آئے۔

اللہ جنّت نصیب کرے یہ بڑے ابا مرحوم والی لال بی بی تھی۔ کمال ہے کہاں سے کہاں —! بارمیڈ نے ان کا دوسرا گلاس کیانتی سے بھرا۔ اور ان کو وہ پورا منظر یاد آیا۔ گیارہ سال قبل کا حضرت گنج ۱۹۴۵ء کی وکٹری ڈے کی شام جشنِ فتح کی چہل پہل اور ہجوم۔ دکن میاں اپنے دوست کنور سینڈھی کے ساتھ انڈیا کافی ہاؤس سے نکل رہے تھے ایک موسیقار دوست مدن موہن دروازہ پر مل گیا۔ بولا۔ بار دیکھو

وہ نورما ڈریک جا رہی ہے۔ وہی جو نرملا دیوی کے نام سے ناپتی ہے۔ پٹھو مہاراج کی شاگرد رہ چکی ہے۔

نورما ڈریک زرد جا ربٹ کی ساری میں ملبوس، بھورے سیدھے بال۔ معمولی شکل۔ ایک گورے کارپول کا بازو تھامے برآمدے میں سے گزر رہی تھی۔ دکن میاں سے لگا ہنس چارہو میں تو پرفوشیل انداز سے مسکرائی۔

کنور دلشاد علی خان جو بیگمات راجکار یوں اور صاحبزادیوں کی سوسائٹی کے عادی اور سلیک میں ایک عام اینگلو انڈین رفاصلہ پر نظر ڈالنا کبیر شان سمجھتے تھے بے نیازی سے تہمتے ہوتے آگے بڑھ گئے۔ بے چارے بڑے باپ مرحوم اس لڑکی کو بڑی مہم صاحب سمجھ کر اسے گھر گئے تھے اگلے وقتوں کے لوگ اتنے بھولے ہو کر تے تھے۔

وہ نورما ڈریک عرف نرملا دیوی جو اس شام حضرت گنج کے ایک برآمدے سے گزر رہی تھی۔ بحیثیت نورماہ خانم تر بوزی سنیل کے شلوار سوٹ میں ملبوس اس وقت وکٹوریہ جہاز کی بار پر موجود تھی۔ اب بھی وہ سامنے سے گزر رہی رہی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔

”اگر لاہور میں نہیں تو میں نے یقیناً آپ کو لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ حضرت گنج میں۔ آپ لال باغ میں تو نہیں رہتی تھیں؟“

نورماہ خانم پھر مسکرائی۔ اب اسے اس دلکش اجنبی کو اپنے متعلق کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کی اپنی پرانی دنیا سے نکل کر سطح سمندر پر اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ گو اس وقت دونوں پاکستانی تھے۔

”مختصر دنیا ہے“ نورماہ خانم نے معنی خیز تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

”اور بڑی شہیر۔ آپ پاکستان کب آئیں؟“

”سنہ سینتالیس میں۔ پارٹیشن سے ذرا قبل۔ مجھے لاہور میں پتھوئی فلمز نے اپنی ایک پکچر میں ڈانس کرنے کے لئے بلایا تھا میں وہیں تھی۔ شوٹنگ چل رہی تھی۔ جب پارٹیشن

ہو گیا اور وہ سب مار کاٹ - راستے بند ہو گئے - میری ایک کزن فلیٹیز ہوٹل لاہور میں گایا کرتی تھی - شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو - مشہور سنگر تھی - بمبئی کے تاج میں بھی گایا کرتی تھی - لہٰذا مارک — اس نے مجھ سے کہا یہیں پاکستان میں رہ جاؤ - یہاں انٹریٹن منٹ انڈسٹری بالکل INFANCY میں ہے - ترقی کی بہت گنجائش ہے - ”اور یوں بھی آپ جانتے ہیں انڈیا میں ہم لوگوں کی کمیونٹی کے لئے CHANCES

بہت کم ہیں YOU KNOW THESE BLOODY INDIANS THEY HATE OUR GUTS ہم انگریز لوگوں کے لئے اب ہندو دنیوں کے انڈیا میں گنجائش کہاں تھی“

راجہ دلشاد علی خان زیر لب مسکرائے - ان کو یاد آیا بڑے ابا مرحوم نے بتلایا تھا کہ ”بلڈی“ ”اینڈ اول“ AND ALL مس نور ماڈریک کا تکیہ کلام تھا - بے چارے چودھری صاحب مرحوم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ایک چی چی اینگلو تکیہ کلام ہے -

اپنے میزبان خوجے کو بالکل نظر انداز کر کے نور ماہہ خانم اسی کی خریدی ہوئی کھانسی نوش کرتے ہوتے صاحبزادہ صاحب کو قصہ سناتی رہیں - ”میرے پاپا کی دو سال قبل وفات ہو چکی تھی“

”اور آپکی والدہ —؛ میرے انکل ان سے بھی آپ کے ہاں ملے تھے -“ نور ماہہ خانم ہچکچائیں - ”وہ میری ماں نہیں آیا تھی جس نے ہمیں پالا تھا - میری ماں بیور کا کیشین تھیں - ہمارے بچپن میں مر گئی تھیں - اس بے چارے آیا کا بھی انتقال ہو گیا -“

”آئی - سی —“ صاحبزادہ صاحب نے سر ہلایا - ہم سب کو اپنی اپنی نسل پر تر اور خالص ثابت کرنے کا کس قدر سودا ہے - اور گورے رنگ کی کتنی اہمیت - ان بے چارے قابل رحم اینگلو انڈین لوگوں ہی کو کیوں مطعون کیا جاتے - بڑے ابا مرحوم فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ خالص سورج و لسی راجپوت ہیں -

نورماہ خانم بولتی رہیں۔ ”میں نے اپنی چھوٹی بہن سیلی کو بھی لاہور بلالیا۔ مگر میں نے جلد بازی سے کام لیا۔ لال باغ والی کوٹھی فروخت کر کے جانا چاہیے تھا۔ کوٹھی اتنی بڑی نہیں تھی مگر اس کا کمپاؤنڈ کتنا وسیع تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا باہر سے۔“

”آپکی ذاتی کوٹھی تھی؟“

”جی ہاں پاپا نے خریدی تھی۔ سیلی کے لاہور جاتے ہی کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا۔“

”اور آپکا لڑکا۔۔۔؟“

”آپکو میرے لڑکے کے بارے میں بھی معلوم ہے؟“

”آئی ایم سوری۔ میں نوزی نہیں ہوں۔ دراصل میرے چچا مرحوم نے بتلایا تھا کہ ٹرین میں اس بچے ہی سے انکی دوستی ہو گئی تھی۔ اور وہ اسی کیلئے کرسس پریذینٹ لیکر آپکے یہاں گئے تھے۔ میرے چچا ایک نہایت بھولے پاک باطن انسان تھے۔“

اچانک نورماہ خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”جو بے نے جو کچھ سے کی طرح گردن جھکائے بار پر بیٹھا تھا مکنیکل انداز سے رومال پیش کیا نورماہ خانم نے جلدی سے آنسو خشک کئے۔ تھری کاسٹریٹ جلا یا۔“

”آئی ایم سوری“ صاحبزادہ صاحب نے رنجیدہ آواز میں دہرایا۔

”جارج بارہ سال کا ہو گیا تھا۔ اسے لارنس اسکول میں پڑھا رہی تھی نتیجاً گلی میں ایک روز گھوڑے سے گرا۔ سر میں چوٹ آئی۔ مجھے طوفانوں کے پھیپڑے کھانے کیلئے اکیلا چھوڑ گیا۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔“ نورماہ خانم نے پھر آنکھیں خشک کیں۔

ادھی رات چاروں طرف سمندر۔ اوپر مغموم تنہا چاند۔ بار سنسان ہو چکی تھی۔ اداس آنکھوں والی اطالوی میڈیکلاس سمیٹ رہی تھی۔ اس نے ان بحری مسافروں کے دوران ایسی پر فضا اداس راتوں میں ان گنت مسافروں کی ان گنت المناک داستانیں اس خوش فضا عرشے پر سنی تھیں۔

”بطور رقاصہ نرملادیلوی پاکستان میں نہ چلتا ہذا پروڈیوہو نے نورماہ خانم کر دیا۔“

”سمر بیگ اور ڈاکٹر بیگ —؛ بیتہ ہمیں۔ کلکتے سے آئی ہیں۔ سب سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ماں بوٹ ڈیک پر جا کر تصویریں بنایا کرتی ہیں بیٹی مونی مونی میڈیکل کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ کیا تم ان سے ملنا چاہو گے؟“

”غالباً نہیں۔“

”ہاں بیجا رہو گا۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت زیادہ دولت مند نہیں معلوم ہوتیں دوسرے وہ تمہارا ٹائپ نہیں۔“

بات یوں تھی کہ سوئیز تک پہنچتے پہنچتے نورماہ خانم اور صاحبزادہ دلشاد علی آف دھان پور ایک فلم کے خاموش بزنس پارٹنر بن چکے تھے — نورماہ امیر کبیر مسافروں سے دوستی بڑھاتیں انکو گھیر گھار کر صاحبزادہ صاحب کی کارڈ پارٹیوں میں شامل کرتیں۔ راجہ دلشاد علی ماہر فن کار ڈشار پرتھے۔

نورماہ خانم انکو بتلا چکی تھیں کہ وہ ہمیشہ کیلئے لندن جا رہی ہیں جہاں انکی چھوٹی بہن سیلی ڈریک پہلے سے پہنچ چکی ہے۔ ایک اسٹریٹن یہودی پارٹنر کے ساتھ سوہو ہیں اس نے ایک مساج بار لڑکھولا ہے اور ایک اسٹوڈیو جس میں لوگ اپنے اپنے کیمروں لاکر لڑکیوں کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ کئی فرمی لانسر گوری اور افریقی لڑکیاں سیلی اور ہنری کے اسٹوڈیو اور مساج پارٹنر سے منسلک ہیں۔ نورماہ خانم لندن جا کر اس مسجد منفع بخش کاروبار کی دیکھ بھال میں اپنی بہن کا ہاتھ بٹائیں گی۔

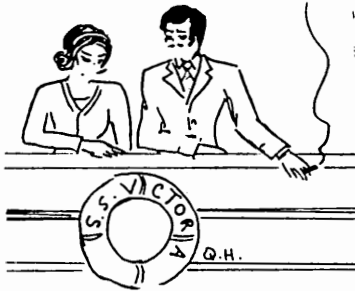
صاحبزادہ دلشاد علی خان نے پاپ پیتے پیتے اسے اسکیم پر ہاد کیا مگر GENOA پہنچتے وقت انھوں نے نورماہ خانم سے کہا: ”اگر تم چاہو تو میرے ساتھ امریکہ بھی چل سکتی ہو۔ میں عموماً کوئین ایلزبتھ یا کون میری پر لندن سے نیویارک جاتے اور آتے ہوئے OPERATE کرتا ہوں۔“

نورماہ خانم نے وعدہ کیا کہ اس آفر پر غور کریں گی لیکن انھوں نے اس خوش گو

بحری سفر کے دوران یہ بھی بخوبی نوٹس کر لیا تھا کہ انکے ساتھ معاشقے کے علاوہ صاحبزادہ صاحب خالص کاروباری انداز میں گونہایت رکھ رکھاؤ اور شائستگی کیساتھ معترام رکھیں اور یورپین خواتین کیساتھ بھی وقت گزارتے تھے۔ فرسٹ کلاس میں متعدد امریکن کروڑپتی بیوائیں سفر کر رہی تھیں۔ جو حسب دستور شوہروں کی چھوڑی ہوئی بے اندازہ دولت خرچ کرنے کیلئے دنیا کی سیاحت پر نکلی تھیں۔

”ہم لوگوں کو۔۔۔“ نورماہ خانم نے جلیو وائس جہاز سے اترتے ہوئے صاحبزادہ دلشاد علی خاں سے کہا۔ ”لکھنؤ کے عوام لال بی بی کہتے تھے۔ تم جیسے لوگوں کو کیا پکارا جاتے؟“

”لال میاں۔۔۔“ انہوں نے سگریٹ سمندریں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔



یہ قصہ ایک نوجوان برطانوی اسکالر کی نظر میں

میری ماں ایک اینگلو انڈین (یا اینگلو پاکستانی) رفاہیہ ہے۔ میرا باپ ایک انڈین (یا پاکستانی) کارڈنار پر اور پروفیشنل جگہ لوہا سے انٹرنیشنل جیٹ سیٹ کا قرب حاصل ہے ایک ریٹائرڈ ہولی وڈ ڈائریکٹس کے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے اس کا تذکرہ ہیڈ لائن ہو چکا ہے۔ وہ زیادہ وقت یورپ اور امریکہ کے درمیان فضائی سفر کرتے ہوئے گزارتا ہے۔ گو بحری سفر اور لکٹری لائنز کے خاتمے نے اسکی بزنس کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مگر وہ متعلقہ کاروباروں میں مصروف ہو گیا اگرچہ ہم اسے بین الاقوامی انڈر ورلڈ کا بادشاہ نہیں کہہ سکتے البتہ وہ ایک خاصہ کامیاب اور سیدھا چارمنگ انسان ہے۔

میری ماں ایک ریٹائرڈ ڈانارٹ کے بجائے ایک سنجیدہ ہاؤس وائف معلوم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے اس جزیبے کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم دلوائی۔ اور اس چیز کا خیال رکھا کہ میں اپنے باپ کے نقش قدم پر نہ چلوں۔

میرا ایک بھائی تھا یعنی نصف برادر۔ اسکا باپ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا کوئی انگریز میجر تھا۔ جو لکھنؤ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ میرا وہ بھائی جارج بعربارہ سال بمقام کوہ مری گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اور اپنی بے چاری ماں کی دنیا اندھیر کر گیا۔ اس حادثے کے چھ سال بعد نورماہ خانم کی ملاقات صاحبزادہ دلشاد علی خاں سے اطالوی جہاز کوٹریہ پر ہوتی اور میں عالم وجود میں آیا۔

میرے والدین ایک دوسرے کے بہترین اور پر خلوص دوست ہیں۔ انھوں نے

آج تک ایک دوسرے سے شادی نہیں کی۔ وہ دونوں اپنے آپ کو آزاد پرندے پکارنے کے شوقین ہیں۔

میری والدہ نورما ڈریک پہلے لکھنؤ (انڈیا) میں سرملا دیوی اور لاسہور (پاکستان) میں نورماہ خانم کہلاتیں۔ اب لندن (انگلستان) میں پھر نورما ڈریک ہو گئی ہیں۔ اسی شہر سے انکے COCKNEY مزدور پیشہ دادا محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میجر بھرتی ہو کر سندوستان گئے تھے۔ اور وہاں ایک ”ہاٹ کاسٹ“ لڑکی سے شادی کی تھی۔ مئی کی ماں شاہجہاں پورٹن کی پروردہ ایک نیپوٹیم لڑکی تھی جسکے ہندو ماں باپ ذات کے کہا تھے۔ ایسے لوگ شمالی ہند میں بنظر حقارت ”احاطے کے عیسائی“ کہلاتے ہیں۔ بحیثیت ایک کلچرل اینٹیٹھروپو لو جیٹ جب میں نے والدہ کے خاندان کی تحقیق شروع کی، بچہ جزیرہ ہوتیوں کیونکہ انکی محبوب فینٹسی یہ ہے کہ انکی عالی نسب انگریز ماں کی موت کے بعد انکو اس کالی عورت نے پالا تھا۔ ہم اپنی ویش فل تھکنگ کے ہاتھوں خاصے مجموعہ راہ لے بس رہتے ہیں اور ایسے قابل رحم ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو معاف کرتے رہنا چاہیے

مئی کی ایک بھوپھیں سرکس میں کام کرتی تھیں۔ دوسری تاج محل ہوٹل بمبئی کے پچھو اڑے جو پڑا سرار گلیاں ہیں۔ ان میں مقیم رہیں۔ وہ بھی لاپتہ ہیں۔ مئی کے مطابق شاید وہ کولابہ سے وائٹ لین منتقل ہو گئی تھیں۔ مئی کے والد ریلوے میں ملازم تھے جو کٹنڈر اور محکمہ ڈاک کی طرح اینگلو انڈین نو جوانوں کے لئے سرکار کا مخصوص محکمہ تھے مئی کا کہنا ہے کہ انکے والد خاصے نام مقبول بزرگ تھے جنکو غبن کے جرم میں سروس نکال دیا گیا تھا۔ گو جرم ان پر ثابت نہ ہو سکا تھا۔ انھوں نے اس روپے سے لالہ با کی لالہ بیبیوں کے محلے میں کوٹھی خرید لی تھی۔ اور اپنی دونوں لڑکیوں کو بڑے اطمینان سے لالہ بی بی یعنی اسکا رٹ وومن بنا دیا تھا۔ تاکہ خود محنت کئے بغیر آرام سے رہیں۔ یہی اس زندگی پر معترض نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ اس میں عیش و آرام تفریح اور پیسہ وافر

میری آئٹا سیلی جو پارٹینن سے قبل لکھنؤ میں ڈانس سرٹیا دیو کی کہلاتی تھیں لاہور سے لندن آکر پہلے ایک سستے ناچ گھر میں ٹیکسی ڈانس بھرتی ہوئیں۔ پھر ایک سنیما گھر میں نلٹ بیچے اس کے بعد کچھ عرصہ کمپیڈی میں اسٹریٹ ڈانسر بھی رہیں۔ مگر بقول انکے یہ بہت مشکل زندگی تھی انکے بس کا روگ نہ تھا۔ بہت جلد ایک یو پیٹن یہودی کی پارٹنرشپ میں مساج پارلر اور اسٹوڈیو کھولا۔ اس کے اشتہار اس قسم کے کاروبار کے دستور کے مطابق پریچوں پر لکھ لکھ کر تمباکو فروشوں کی دکانوں پر لگائے۔

SALLY'S MASSAGE PARLOUR AND HENRI'S STUDIO FOR ARTISTIC PHOTOGRAPHS

کاروبار خوب چلا۔ یہ دو لفنڈن رپورٹ کی اشاعت سے قبل کا زمانہ تھا۔ انہی دنوں نور ماڈریک لاہور سے آکر بہن کی پرنس میں شریک ہوئیں۔ پچھلے چند سال سے انہوں نے ایک ایسکورٹ سروس بھی قائم کر لی ہے۔ اس میں متعدد ہندوستانی پاکستانی لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ جنکے والدین راج صدی قبل یہاں آگئے تھے اور وہ یہیں پیدا ہوئیں یا بہت کمسنی میں ان قدامت پرست ممالک سے یہاں آئیں میرے والد ایسکورٹ سروس کے ایک ڈائریکٹر ہیں۔

مجھ میں اپنے والدین کی دلچسپی اور رنگین روایات کی تقلید کرنے یا انکو آگے بڑھانے کی توفیق کیوں نہ ہوئی؟۔ میں اپنے نانا کی بیرونی بھی کر سکتا ہوں۔ مگر میرے کون سے انگلش کو کینی ڈریک یا اودھ کے مسلم راجپوت پڑکھ میں ادب فلسفہ شاعری اور مختلف خرافات کے جراثیم موجود تھے جنہوں نے میرے اندر عود کیا؟ اٹھارہ سال کی عمر سے میری نظمیں انگلستان امریکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے معیاری رسالوں میں چھپ رہی ہیں۔ میری تیسویں سال گزرے سے ایک ماہ قبل میری نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے مئی مجھ پر بے حد نازاں ہیں۔ میری کتاب پرائٹنگ جتنے ریویو چھے ہیں۔ (ٹائیکسٹ لٹریچر سمیت) مئی نے انکے تراشے ڈیڈی کو نیویارک بھیجے۔ میں نے انکو کتاب روانہ کی

مگر معلوم ہوا کہ اس وقت انسٹرپول مغرب کے چھ ممالک میں میرے پیارے قبلہ و کعبہ کے تعاقب میں ہے اور وہ شاید ساؤتھ امریکہ میں کہیں روپوش ہیں۔ گڈ اولڈ ڈیڈا مجھے یقین ہے۔ وہ جلد پھر سطح پر نمودار ہونگے اور ہم لندن کے کسی پب میں ممتی اور میرے جیجر العقول والد — ساتھ بیٹھ کر میری ادبی کامیابی کا جشن منائینگے۔ مجھے اور میری والد اور خالہ ہم بیٹوں کو خوشی ہے کہ ڈیڈا نے اس مرتبہ لمبا ہاتھ مارا۔ ڈیڈا کو ہمیشہ یہ افسوس رہا کہ وہ آدھی زندگی اس لائن میں گزارنے کے باوجود اب تک BIG TIME پر نہیں پہنچ پائے — میں امید کرتا ہوں کہ غیر قانونی منشیات کی خفیہ فروشی میں اب ڈیڈا اپنے ثواب پورے کر سکیں گے۔

میرے والدین AMORAL ہیں۔ اور میں خود کو ان سے مختلف سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے یہ میرا حسن ظن ہو۔ مگر میں اپنے والدین کے متعلق کوئی اخلاقی فیصلے صادر نہیں کرتا۔ انہوں نے اپنی اپنی زندگی اپنے حالات اور اپنے طبعی رجحانات کے مطابق گزار سی ہیں محض یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ ان حالات کے عمرانی اسباب کیا تھے۔

ہندوستان کے چند شاعروں نے جو انگریزی میں لکھتے ہیں اور ”انڈیا اینگلین“ کہلاتے ہیں اور خود کو ان ادیبوں سے برتر سمجھتے ہیں جو اپنی مادری یا نیٹو زبانوں میں لکھتے ہیں، مجھے ایک کانفرنس کیلئے مدعو کیا ہے میں برٹش کونسل کی طرف سے ہندوستان آیا ہوں، آجکل اپنی رُوٹس ROOTS اور اپنی بیک گراؤنڈ کی تلاش عصری ادبی فیژن ہے۔ میں اپنی ماں کی NON-BACKGROUND کی تلاش اور مطالعے کی غرض سے لکھنؤ بھی جاؤنگا۔

گھر سے روانگی کے وقت میری ماں نے مسافروں کی حفاظت کرنے والے سینٹ گھر کا تعویذ مجھے پہنا دیا تھا۔ روم کے ایک کارڈینل نے خود بلیس کر کے یہ چارم می کو دیا ہے۔ مگر دنیا پاکوں کے رحم و کرم پر زندہ ہے۔ ممکن ہے راستے میں سہانی قزاق نمودار ہوں

اور مجھے موت کے ایئرپورٹ پر اتار دیں۔ اس صورت میں یہ میرا ذاتی روزنامہ اگر بیچ رہا تاہم چھپ جائے گا۔ لہذا یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ اشاعت کے لئے نہیں ہے کیسویں ہنگامہ میں بشرط حیات شاید چھپو اور دوں۔ ایک طویل مدت گزرنے کے بعد ”شرمنگ اسکینڈل“ دلچسپ تاریخی واقعات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مستقبل میں اگر میں ایک سجدہ اہم لٹریچر ہستی بن گیا تو میرے والدین اور انکی قابل اعتراض زندگیاں ادبی مورخین کیلئے ”گہری معنویت“ اختیار کر لیں گی۔ ماہرین نفسیات اور نقاد میری شخصیت کو انکی زندگیوں کی روشنی میں پرکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرے مرحوم اور نادیدہ نصف برادر جارج نے سرہنری لارنس کے قائم کیے ہوئے اسکول پہلے شملہ (انڈیا) اور پھر ممبئی (پاکستان) میں پڑھا تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا می نے اسکی کتابیں اور کھلونے مجھے دیے جو وہ مانتا کی ماری اپنے ساتھ انگلستان لینی آئی تھیں۔ ان کتابوں میں بچوں کی ایک ”بگ اف ناٹج“ بھی تھی جو ۱۹۳۵ء کے لندن میں چھپی تھی اور جس کے سرورق پر بنے اطفال عالم کے رنگ برنگے جلوس میں انگریز بچے سب سے آگے آگے دکھلائے گئے تھے گویا ماسٹر لیں۔ انکے پیچھے باقی یورپین۔ آخر میں ننھے منے چینی۔ جاپانی ماسکیمو۔ عرب۔ پگڑیاں باندھے کالے ہندوستانی۔ اور حلقہ بگوش حبشی۔ گویا حضرات الارض۔

میں آسٹریلیا کو دیکھتا جو کالی تھیں۔ می گوری۔ سمجھ میں نہ آتا۔ ایک بار حال سے پوچھا! انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھٹا کر رہ گئیں۔ اگر آزاد ہندوستان میں ہوتیں۔ ممکن ہے بطور ”شریمتی سریتا دیوی“ کھٹک ڈانسر، اس نئے معاشرے میں انکو عزت بھی ملتی۔

سارے گھیلے کیا محض تاریخی سچویشن پیدا کرتی ہے؟

انگلستان میں نسلی فسادات شروع ہوتے۔ می مجھے خالص انگریز بنانے پر تامل گئیں

جو میں بنا۔

گو میری ماں اور خالہ کا ”بھوانی جنکشن“ والا ”جی جی اینگلو انڈین“ لہجہ اب تک نہیں بدلا

پتہ چلا۔ بنگالی جھی جھی بہت کہتے ہیں۔ کیل کتا یوریشین ”جی جی“ کہتا تھا۔
 آج سے دو سو سال قبل HICKY کے بنگال گزٹ میں ایک اشتہار چھپتا
 تھا۔ ”جی جی میں لوگوں کے لیے سننے آئینے۔“

جی جی —! ہندو کا سٹ سسٹم پر اعتراض کرتے تھے۔ بلومن راسکل اپنے وفادار
 جاں نثار ہم مذہب آدھی گوری قوم کو بلومن آڈٹ کا سٹ بنا دیا۔! بلڈھی ہل۔ کیوں؟

”آئی ٹولڈ یومین — بلومن اکنومکس —“ بوڑھے یوریشین اسکول ماسٹر نے جواب دیا۔
 میں نے ٹیپ ریکارڈ چلایا۔ مسٹر اینڈ ریو جونز آزادی کے کئی سال بعد ”ایلا بیٹ“ سے ریٹائر
 ہو کر آئے تھے۔ سیسی ڈی ٹیچڈ مکان کے پھانگ پر بوڑھا لگا رکھا تھا۔ ”نینی تال“
 ”اوہ — نینی ٹھول —“ مئی نے آنکھیں نیم واکیں۔

بد قسمتی سے یہاں مسٹر جونز کو ایک دو تہندہ پاکستانی کے ہاں ہاؤس میڈینا پڑا تھا۔ وہ
 اس وقت ڈیوٹی پر پارک لین گئی ہوئی تھیں۔ انکے پڑوسی بوئے گوآن سیاہ فام مسٹر ڈی سلوا،
 تشریف لائے۔ وہ زیادہ خوش قسمت رہے تھے۔ انکی لڑکی بی۔ اے۔ اے۔ سی میں ایر پوسٹس
 تھی۔ ”بلیک ازیوٹی فل“ نیا نعرہ ہے (حالانکہ سبکی بٹنگ کے زمانے میں میری آئٹ سیلی
 کو بہت محتاط رہنا پڑا تھا)

میں مسٹر جونز اور مسٹر ڈی سلوا کے بچے بنور سنتا رہا۔

”پروفیسر بگنر — نو —“ مسٹر ڈی سلوا کے موتی جیسے دانت جھلماتے۔

مسٹر جونز نے ہم لوگوں کی خاطر ”ڈول بیٹ اینڈ کری“ ڈزرتیا رکیا تھا۔ وہ کھلے جا رہے تھے
 مدتوں بعد انہیں کوئی ایسا شخص جو انکی گفتگو کو ہم سمجھ کر خاص طور پر ملاقات کرنے آئے۔
 ”بلومن اکنومکس اینڈ اول مین —“ انہوں نے دھسکی میٹھ کرتے ہوئے کہا۔ نئے کی

ترنگ میں وہ مئی سے اپنی اینگلو انڈین اردو بولنے لگے۔ ”تمہارا چھوکر اچھتا۔ کیوں؟“
 میں نے درخواست کی اسید طرح بولتے رہیں۔ مطلب مئی سے بعد میں پوچھ لوں گا۔

”ارڈو؟ ہندوستانی؟ نیٹو لگو۔ ایہہ —؟“

”یس سر— کیری اؤن—“
 ”اسکار یکار ڈبنائے گا پروفیسر مگنہر“ مسٹر ڈی سلوانے دریافت کیا۔ سب می سمیت بیچد مسرورتھے۔

”آہ— یوروپین لوگ پہلے اردو کو بھی مورا بولتا۔ انڈین محڈن لوگ کو بھی مورا بولتا تھا۔ ایسٹویدرا اسکلز—“

مسٹر جونسن زیادہ اینٹی برٹش ہوتے گئے۔ ”ہوم“ اگر انہیں شدید مالی اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”ہندو کو جھٹو بولتا تھا۔ اگنورنٹ باسٹرڈز— مسلمان کو مور— چھی— ہم لوگ کو ہاف کاسٹ۔ ایسٹ انڈین—“

”دیری فنی— بوائے— ہم ویسٹ انڈیا میں رہتا تھا۔ ہمارے کو ایسٹ انڈین بولتا تھا۔ دیری فنی۔“ مسٹر ڈی سلوا اتنا ہنسے کہ انکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”اگنورنٹ بلڈ می سوائنڈ سو۔“

می اردو اور انگلش منغلطات کی ماہر ہیں۔ لیکن اسوقت اپنے شائیتہ ”پکا انگلش مین“ بیٹے کی موجودگی میں گالی گلوچ انہیں خوش نہ آئی۔ خاموش بیٹھی دھسکی پیاکیں۔

”ارے ویسٹ انڈین کیسے بولتا۔ ویسٹ انڈیز تو ادھر تھا— وہ سائیڈ میں انکے باپنے اصلی امریکن کو انڈین بنا دیا تھا۔ تو ہم لوگ کو ایسٹ انڈین بولنا ہی مانگتا—“

مسٹر جونسن نے اٹھ کر باوا آدم کے زمانے کا ریکارڈ لگا دیا جو وہ یقیناً اپنے ساتھ ”ایلابیٹ“ سے لائے تھے۔ می سے ناچنے کی درخواست کی۔ وہ اٹھ کر انکے ساتھ فوکس ٹروٹ کرنے لگیں۔ یقیناً یہ لوگ چالیس سال قبل کے ”لک ناؤ“ اور ”ایلابیٹ“ میں واپس پہنچ چکے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے اپنا سوال دہرایا— ”مسٹر جونسن— انگریزوں نے انڈیا کی دوغلی نسل کے ساتھ ایسا سوتیلنا پن کیوں کیوں—“

انہوں نے چٹکی بجائی— ”پیشہ— بلڈ می پیشہ— ادھر سپولین دُنہ مچاتے

ہوئے ادھر انڈیا میں یہ بارڈورکنگ انٹلی جنٹ ہاف بریڈچیا یا جانا ہے۔ خرگوش کے موافق۔
انڈیا میں اگر ہاف بریڈ ایسے ہی آگے بڑھتا گیا تو انگلینڈ سے آنے والا اینگ مین کیا کرینگا
تمہارا سر — لک ادھر ساؤتھ امریکہ میں کیا ہوا۔“

”ایکدم گڑ بڑ گھٹالا۔“ مسٹر ڈی سلوا بولے۔

”ملا تو لوگ لوکل لوگ سے مسکوٹ کر کے اسپنیش حاکم لوگ کو — بولا گٹ آؤٹ —

آؤٹ کر دیا۔ دیر فور کمپنی کا کورٹ آف ڈائریکٹرز اسی سٹی آف لندن سے ایک فائیل
کیل کٹا ڈیپٹیج کرتا ہے۔ ارجنٹ۔ ۱۹۵۰ میں۔ کیا بولتا ہے کہ آج سے انگلش فادر اوزنیو مدر کا
بنیا لوگ آرمی اینڈ سیول اونچے جو ب کے لیے ان فٹ۔ گورنر جنرل کیل کٹا سے فائیل پر لکھا اسپن۔
ایکشن ٹیکن — اب وہ گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں میں آنے نہیں سکتا۔ انکا کلب، محلہ،
چرچ — سب الگ — چھوٹا موٹا جو ب انکے لیے ریزرو — ڈیر فور ٹو ہنڈرڈ ایریز سے ہم
لوگ آرمی سارجنٹ۔ پوسٹ آفس کلرک۔ اسکول ماسٹر۔ نرس — ٹو ہنڈرڈ ایریز۔“

”جی — جی — بڑا ظلم کیا ہم لوگ کے ساتھ — سو اٹن —“ مئی کو شاید پہلی
مرتبہ اس ظلم کا احساس ہوا۔ اب وہ آنسو بہانے لگیں۔

”جب تم تک لکھے گا ہمارا نام اسمیں ضرور ڈالنا نورمن بوائے۔“

”میرا بھی فل نیم — فل نیم — فرانس زویویر مار یو فرینڈ بڑی سلوا —

نو — ہ نائیس لیڈ — نو — مسٹر جونز —“

”یس یس مسٹر ڈی سلوا — ٹیس ڈرنک ٹو ہنڈرک سیس ایریز این او تھر اینڈ اول

فورسی ازا سے جولی گڈ فیلو — فورسی ازا — ہی ازا اور دن بچے —“

چنانچہ جی جی مس لوگوں کے لیے سستے آئینے!

اب میں نے کمپنی کے عہد دار آخری مغلوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔

میرے نیوز پیپر آفس کی ایک اینگلو انڈین اسٹوگرافرنے اپنے ماموں مسٹر جونسنز کا پتہ بتلایا۔ عا۔ برطانیہ کے جانے مانے سبھار ایکسپرسٹ مسٹر چارلس گریگ سے ایک پب میں اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ وہ شاہ عالم ثانی کے گریٹ گریٹ گریٹ گریٹ گریٹ نکلے — ماں کی طرف سے۔
فاتح مغل مفتوح راجپوت سنڈروم؟ اسی دیک اینڈ پروفیسر ریپول اسپرز سے اس علم دوست فارسی داں پوریشین اسٹوگریسی کے بانیوں کی فہرست حاصل کی۔
جنرل اور سیکم فیض النساء پامہ۔ کرنل ڈیکیم کرک پیٹرک۔ میجر حیدر ہرسی۔ جنرل حمیر ہکنڈ۔
کرنل ڈیکیم کارڈنر۔

مگر اس زمانے کے عالی مرتبت مسلمان اتنے آزاد خیال تھے کہ اپنی لڑکیوں کی شادیاں — یا یہ کہ کلاس ایک تھی۔ اور ان صاحبان عالی شان نے مغل تمدن کیوں اپنایا؟
کہ غالب تمدن تھا۔

مئی کو بتلایا ایک ادبی کانفرنس کے لیے انڈیا جا رہا ہوں۔
”انڈیا ڈیسٹ از بھارت —“ انہوں نے ناگواری سے کہا۔ ”وہاں اب کیا رکھا ہے؟“
”کیا تم نہیں چاہو گی کہ لال باغ لکھنؤ میں تمہاری کوٹھی دیکھ کر آؤں۔ کس حال میں ہے۔
یعنی اسٹائل کا طرز تعمیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور کیتھولک قبرستان میں تمہارے پاپا کی قبر پھول۔
دفتادہ رونے لگیں۔“

”میرا بچہ گھوڑا گلی بھی جانا۔ پاکستان۔ جارج کی قبر بھی —“
مئی نے چلتے وقت یہ بھی کہا تھا بار لو گنج مسوری ضرور جاؤں جہاں ریلوے والوں کے بچوں کے اسکول میں ان دونوں بہنوں نے اپنا معصوم بچپن گزارا تھا۔
مسوری میں مئی ایک ہنس اسکر کو جانتی تھیں انکا پتہ بتایا۔

مسٹر جیمز اسکر بار لو گنج مسوری میں پولیٹری فارمنگ کرتے ہیں۔ انکا ہمنام اسکاٹ مورث
اعلیٰ اٹھارہویں صدی ہندوستان کا نقشہ بدلنے میں مصروف رہا تھا۔ مسٹر جیمز اسکر ضلع مزار پور

کے ایک ٹھا کر زمیندار کی لڑکی — اور ان دونوں کا نامور بیٹا جنرل جیمز اسکزن جو ایک وسیع حرم رکھتا تھا بلند شہر میں قلعہ وجاگیر۔ چاندنی چوک دلی میں ٹاؤن ہاؤس فارسی میں خط و کتابت اسی اولاد میں چھوڑیں۔

صاحبان تازہ ولایت اس دلچسپ مغل یورپین معاشرے کو عجوبہ سمجھنے لگے تھے

۱۸۳۵ میں سرطاس مشکاف کی بیٹی ایڈی کلائیو سیلی :-

”آج ضعیف العمر جنرل اسکزن مع اپنی بیگم ملنے آئے۔ سانو لے ہیں۔ مگر خود کو انگریز سمجھتے ہیں۔

اس خاندان کے مذہب کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا“

اس بوڑھے جنگی گھوڑے کی بہو مسز الگزنڈرا اسکزن نے ایڈی سیلی کو اپنے عالیشان گارڈن ہاؤس

میں پیا نوپر ایک عدد ولایتی گانا سنا یا جو ”انکھے عجیب وغریب لہجے“ کی وجہ سے مہمان خاتون

کے پلٹے نہ پڑا۔ البتہ مہمعصر لندن کے مقبول میوزک ہال گیت ”ولی کنز اور ڈائنا“ کی دھن پہچانی۔

میں دہلی میں ایک اردو داں انڈو اینگلیں شاعر کے ساتھ کشمیری گیت کا علاوہ گھوم رہا تھا

جب جنرل اسکزن کا بتوایا ہوا سینٹ جیمز چرچ نظر آیا۔ اسکے اجاڑے احاطے میں کسی پنجابی کاروباری

کی شادی کا پنڈال سجایا جا رہا تھا۔ سرطاس مشکاف بنگال سول سروس کی قبر پر ایک باجے والا

اکڑوں بیٹھا اپنی کلارنٹ کی کھونٹیاں کسنے میں مچو تھا۔ اسکزن گورستان کے ایک مقبرے پر

فارسی اور اردو کتبے نظر آئے۔ صلیب اور مرمرین فرشتے کے نیچے ”ہو العزیز الرحیم — جو

اردو داں دوست نے پڑھ کر بتایا کہ خدا کا نام لکھنے کا اسلامی طریقہ ہے۔

عجیب وغریب لہجے میں ”ولی کنز اور ڈائنا“ الاپنے والی اس ”گد بانوئے الگزنڈرا اسکزن“

کا نام ایلین اور خطاب سردار مہو تھا۔ وہ ”بہر نجات بطریق عیسوی“ ذہن کی گنتی — شاید مسلمان

رہی ہوگی۔ اور اسکے شوہر نے کہ کس قدر تخلص کرتا تھا، اردو میں ایک قطعہ کندہ کروایا تھا۔

اس کنبے کے مسلمان افراد گورستان نظام الدین اولیا میں مدفون ہیں۔ جس اسکزن

لڑکی سے ممی واقف تھیں ہانسی حصار میں انکی جاگیر تھی۔ مسلمان دادی خاندان لوہارو سے تعلق رکھتی تھیں۔ مسوری میں سینئر مسٹر اسکڑ مندر پر بیٹھے سٹک گڑا گڑا کرتے تھے شہر کے ہندو مسلم فسادات سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ خودکشی کر لی۔ اس قسم کے لوگ تاریخ کے LEFT-OVERS ہیں۔

بیشتر عورتوں کی طرح ممی ایک جذباتی خاتون ہیں اپنے بچپن کی یادگار، کوٹ تیلون میں ملبوس ایک مسخرہ جہتی گڈا بھی سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے یہ ”گوئی ڈوگ“ انگریز بچیوں کے گڑا گھر کا ایک لازمی جزو ہوا کرتا تھا wog ”ویسٹرنائیزڈ اور نیٹل جنٹلمین“ کا مخفف تھا مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے مجاہدین آزادی ”محمدن فنائیک“ کہلاتے ہندوستان کے کھدر پوش قوم پرستوں کا ”بھوانی جنگشن“ میں جان ماسٹرز نے مذاق اڑایا۔ خود اینگلو انڈین تھا لیکن میری طرح اپنے آپ کو انگریز مشہور کر رکھا تھا۔

ممی مسوری کی ایک ہم سبق گاڑنر لڑکی کا ذکر بھی کرتی ہیں جس کا باپ انجن ڈرائیور تھا۔

لونگ اسٹن مینر نیویارک کے کرنل لونگ اسٹن اس شہر کے آباد کاروں میں شامل تھے۔ وہ پونے دو لاکھ ایکڑ زمین دریائے ہڈسن کے کنارے بسنے والے ریڈ انڈین قبائل سے چھین کر اپنی چودہ بیٹیوں کے لیے بے اندازہ دولت کا انتظام بھی کر گئے تھے۔ انکی بیٹی نے ایک آئرش نژاد برٹش کیپٹن ویلنٹائن گارڈنر سے شادی کی۔ ویلنٹائن کا بھائی انگلینڈ کا نامور ایڈمرل ایلن لارڈ گارڈنر جہان نوکی بحری جنگوں میں فرانس اور ہسپانیہ کے خلاف برطانوی فتوحات کے پھر پھر سے اڑاتا پھرتا تھا۔

کولونیل امریکہ نے مدر کنٹری کے خلاف پرچم لہرائے۔ برطانوی شکست کے بعد کیپٹن ویلنٹائن گارڈنر اور امریکن امیرزادی کا نو عمر بیٹا ولیم اس نئی بساط پر وارد ہوا جسکی بازی انگلستان نے جیت لی تھی۔

جان کھینی نے کپٹن ولیم گارڈنر کو بسلسلہ ریشہ دوانی بطور اپنی نواب کھبایت کے دربار میں بھیجا۔ یہ حسین رومین کا ہم جو نوابزادی پر عاشق ہوا۔ باپ سے شادی کا مطالبہ کیا۔ یہ ۱۷۹۶ء کا واقعہ ہے۔ گجراتی نواب نے مجبوراً قاضی بلو اکرم ۱۳ سالہ منظور النساء بیگم کا نکاح ۲۶ سالہ کپتان ولیم سے پڑھوایا۔ بنشپ اف کلکتہ نے از روئے کلیسائے انگلستان اس سنجوگ کو جائز قرار دیا!

مہر گارڈنر اندور، پونا اور جے پور کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دیہنچیں جسے ۱۸۰۱ء میں لارڈ لیک فتح کر چکے تھے۔ پنشن یافتہ اکبر شاہ ثانی نے منظور النساء کو اپنی بیٹی بنایا۔ انکی بہن نھور النساء بیگم کا شوہر میر جہر سی ضلع بدلیوں میں اپنی جاگیر پر برہمچاری تھا۔ میر ولیم گارڈنر نے کمالیوں فتح کر کے ہندوستان کا پہلا ایل ایسٹن الموطرہ آباد کیا۔ اپنی فوج گارڈنر ہورس کے لیے ضلع ایٹھ میں کالی ندی کے کنارے چھاؤنی چھاتی تاکہ اسکے گھوڑے باسانی پانی پیا کریں۔ ماں کی طرف سے نیویارک کی کثیر لونگ اسٹن جایداو شریک تھا۔ اودھ میں اس نے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے ایک چکے دار کی حیثیت سے مال بیورا۔ اپنی پوتی سوژن کا بیاہ مغلیہ تترک و احتشام کے ساتھ سلیمان شکوہ شہزادے کے بیٹے انجم شکوہ سے لکھنؤ میں رچایا۔

اب سلیمان شکوہ۔ اکبر شاہ ثانی کا حقیقی برادر خورد۔ شاہ اودھ کا وظیفہ خوار۔ اسکی ایک بیگم نے اسکے درباری گوئیے مان خاں کی پریر دیجی گودی تھی۔ شہزادہ اسے اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتا تھا۔ شہزادی قمرچہر۔ اسکا عقدا اپنے بیٹھے شاہزادہ سلیم ابن اکبر شاہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے عیاش شوہر سے ناخوش لکھنؤ میں رہتی تھی۔ مرزا سلیم بھی اپنے جلاوطن جوانمرد بھائی مرزا جہانگیر کے مانند ایٹھ برٹش تھا۔ چنانچہ لارڈ مکاف نے اسکے بجائے اسکے سوتیلے مرنجاں مرنج شاعر بھائی کو برائے نام تخت پر بٹھایا اور تہ قمرچہر رنگون میں مرتیں۔

لیکن انکی زندگی ایک اور رخ اختیار کرنے والی تھی جسکا انکو پتہ نہ تھا۔ بطور آوارہ

اپنے راستوں کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ ذہانت جلت سے مات کھاتی ہے۔

۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ سلیمان شکوہ سے کہا قمر چہر کو بھی حرم میں بھیج دیں تو اُنکے وظیفے میں پانچ ہزار مہینے کا اضافہ۔ شہزادے کے غضبناک انکار پر اودھ زرخیز نے قمر چہر سگیم ایک کنٹی کے ذریعے اٹھوالی۔ سلیمان شکوہ نے انگلش ریڈیٹنٹ مقیم سہلی گارڈ سے فریاد کی۔ قمر چہر واپس منگوانی گئیں۔ اُنکے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر شہزادے نے اپنے سدھی کرنل ولیم گارڈن کو اٹیسے سے بلوایا۔ وہ مرد میدان لکھنؤ اگر باپ بیٹی کو اپنے علاقے پر لے گیا۔

کنڑی ہاؤس کا سنگ میں ولیم اور منظور النساء کے نور بصر جیمز اس ماد پیکر پر عاشق ہوئے۔

خوشرو۔ نیم دلایتی، شوہلرس۔ جیمز گارڈن کی معیت اور اس انگلش چھاؤنی میں قیام نے غالباً قمر چہر کو اس سیکورٹی کا احساس دلایا تو قلعہ معلیٰ اور لکھنؤ دونوں جگہ مفقود تھی۔

ہندوستانی مصوری اور گیتوں کی رادھا بھنگی اندھیاری راتوں میں اغیار کی نظروں سے بچتی کہنیا سے ملنے کالی ندی کے تٹ پر جایا کرتی ہیں۔

سلیمان شکوہ نے اس پری کو یہاں بھی اس کے بیڈ جیمز میں قید کر دیا۔ لیکن ایک تاریک اور طوفانی رات وہ چند رکھی اپنے ٹور کے ساتھ اُور فرار ہوئی۔ نالائق فرزند کی اس حرکت سے بوڑھا کرنل شاہ دلی اور اپنے مہمان پناہ گزین بادشاہ زادے کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہا۔ اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا۔

(پریشان حال بے خانماں سلیمان شکوہ اگر سے چلے گئے۔ دس برس بعد وہیں مرے۔ ڈھلتی دھوب میں زندگی کا ٹی۔ نصف النہار کے آفتاب نے آخری پناہ دی۔ اپنے جدِ اکبر کے مقبرے میں دفن کیے گئے۔)

جیمز اور قمر چہرہ دو سال تک مارے مارے پھرے۔ تب جیمز نے خشمگین باپ کا دل نرم کرنے کے لیے ایک نائک رچا۔ وہ بوڑھا سورا مامو پھوپھوں سے چنگاریاں اڑاتا ذاتی بجر سے کروڑوں پروسرار متھر اسے گذر رہا تھا۔ یہ لارڈ لوک نوآر کا تانی ساحل پر پہنچا جنما میں کو دگیا۔ کشتی بند پہنچنے کی کوشش کی۔ ڈوبنے لگے۔ باپ نے ہڑ بڑا کر پانی سے نکالا۔ کاسنگھ لوٹ کر قمر چہرہ کو شہزادہ سلیم سے طلاق دلوانی چھو کرے کے ساتھ اسلامی نکاح پڑھوایا۔

قمر چہرہ محرم میں لکھنؤ جا کر ایک لاکھ روپے سالانہ کی اعزاز داری کیا کیں، بیٹے انکے سلیمان شکوہ گارڈنر قنا باپ دادا کی طرح عیسائی رہے مگر چار بیویاں بھی رکھتے تھے اور لکھ لٹ یعنی خالص مسلم وضع کے رئیس تھے۔

دراصل صحیح معنوں میں ایک رومینٹک معاشرہ تھا۔ ۱۸۵۶ء انڈیا مسلم فیوڈل تہذیب کی شکست کا سال ہے۔ غدر کے بعد روکھی بھیک کی وکٹورین اخلاقیات اور عیسائیت کے فروغ نے برطانوی ہند میں ایک کٹر نسو سائٹی کی بنا ڈالی۔ اس تبدیلی کا اثر گارڈنر میں نظر آتا ہے کہ حضرت قنا کے اگلی سپر پھوں میں محض جوشیلے مشنری پیدا ہوئے۔ یہ رپورٹ صاحبان گرج گرج کر گنہ گاروں کو عذاب جنہم سے خردار کرنے والے ہم عصر امریکن پروٹسٹنٹ پادریوں سے کتنے قریب اور اپنے دلچسپ، مہم پسند، ”زندگی سے وسیع تر“ بزرگوں کے مقابلہ میں کستدر بے رنگ اور منحنی سے معلوم ہوتے ہونگے۔

لیکن اس گذرے ہوئے مغلیہ زمانے کا اثر اس حد تک اب بھی باقی تھا کہ یہ حضرت آ اپنے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے میں اپنے اردو کلام کی بیاضیں تھا مے لکھتے تھے شہزادہ انجم شکوہ اور سوزن گارڈنر کی بیٹی اختر زمانی بیگم یعنی شاہ عالم ثانی کی سسکی پڑ پونی باضابطہ عیسائی ہو گئیں۔ اپنے ایک کزن ایلن سے شادی کی۔

جرمن سردھنہ اور فرینچ کویئل (علیگڈھ) کی طرح کاسنگھ بھی ایک افسانہ رہا ہوگا ”بیگم کے کیتھڈرل“ کے بعد ایٹے کا ارادہ کر رہا تھا جب نئی دہلی میں ایک ڈنر پر الہ آباد بائیکورٹ

کے ایک مسلمان جج صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پروگرام کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہہ کوئی گاڈ ڈر کا سنگج میں سب موجود نہیں۔ انکے سولیلین والد ۱۹۳۷ء تک اس مقام کے حاکم پرکنتھ تھے۔ اسوقت ایک نہایت وجہہ لوکل مفلوک الحال انگریز بطور موٹر ڈرائیو ایٹھ میں انکے ہاں ملازم تھا۔ اسکا نام ولیم تھا اور وہ ایک مسکین سا آدمی تھا اور اکثر انکے باغ میں مالی کی مدد کرتا تھا اور مٹی کے ٹوکڑے سر پر رکھ کر ڈھویا کرتا تھا۔

ایک نیشنل انگریزی روزنامے کے ریڈیڈنٹ اڈیٹر کے ڈرائیوگ روم میں، اُس رات، ”دور ڈرٹن“ پر ایک برمن رقاصہ ادا شرا، مغل پوٹھ غالب کے اشعار کتھک نرتیہ میں پیش کر رہی تھیں۔ لیکن مجھے گاڈ ڈر نے پریشان کر رکھا تھا۔ ڈر کے بعد جج صاحب سے پھر کہا۔ چند سکند مسوج کر انہوں نے دو گھنٹوں کا پتہ بتایا جو اسی ضلع کے باشندے ہیں۔ ان میں سے ایک کنبہ دہلی میں مقیم ہے دوسرا ڈسٹرکٹ ایٹھ کے ایک مشہور مسلم سینٹ کی سٹرائین سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو میں نے دلی میں رہنے والے صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے بھی اسی سٹرائین کا پتہ دیا اور یہ بھی کہ قمرچران مقدس بزرگ کی معتقد تھیں موجودہ کسٹوڈین کا سولیلین لڑکا فلاں جگہ تعینات ہے۔ فلاں محکمے میں۔

آگرہ۔ ہوٹل کلا ریس شیراز کی ”مغل لادنج“ سے تاج نظر آتا ہے۔ بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہم دفعتاً ایک کیمراہ اڈیسکورا میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہ عظیم مغل بھی بہت نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ آخری مغل بہت ڈورجن میں سے ایک سلیمان شکوہ تھا اور اسکی لے پالک لڑکی قمرچراں گاڈ ڈر۔ بنت استادمان خاں کلاونت۔ زوال سلطنت تیموریہ کی علامت۔ برکیفا سٹ کھاتے مغربی سیاحوں کے چٹری کانٹوں کے مہم شوریں ریٹوراں کے فلورنڈیجر سے ایٹے کا راستہ دریافت کیا۔

”ایٹھ۔۔۔؟“ وہ متعجب نظر آیا: ”ڈاکوؤں کے متعلق ٹیلی ویشن فلم۔۔۔؟ بی بی سی؟“
 ”نہیں“ میں خاموش ہو گیا، ایک غیر معروف تاریخی ہستی قمرچراں کی تلاش۔۔۔ بتاؤں تو لوگ مجھے سنکی سمجھیں گے۔

ایک کمرشل فائدہ۔۔ میں بھی انڈیا کے لیے اہل برطانیہ کے موجودہ قومی نوٹسٹیلجیا کو کینٹس کروں۔۔۔ قمرچہر اور جیمز گارڈنر بیگم سمر و۔۔۔ میڈوز ٹیلر۔ کرنل سلیمین اور انکے ٹھکانوں کے بارے میں ایک ٹی وی سیریل کا ڈول ڈالوں۔

لیکن مجھے تاریخ کی اس ہٹسری اور ہٹا فرانس (۱۹۶۰) کی جستجو ہے جو سامنے جون کی دھوپ میں تیرتے تاج کی پرچھائیں سی معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے گرفت —
مصافحے کے لیے ایک ہاتھ سامنے آیا۔ پھر آواز: ”مسٹر نورمن ڈریک؟“
میں نے چونک کر پلیٹ پر سے سر اونچا کیا۔

شرائین سے تعلق رکھنے والے جس نوعمر سلیمین کو اگر چہ پہنچتے ہی فون کیا تھا وہ جیب لیکر لکھا تھا۔

ایٹھ پہنچ کر ضلع ہیڈ کوارٹر سے میرے نئے دوست نے ایک اور افسر کو ساتھ لیا۔ ایک ”تھمیل“ سے ”تھمیلدار“ کو جیب پر سبھالا۔ ایک دور افتادہ اجاڑے موضع میں داخل ہو کر ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے رکے۔ یہ گارڈنر برادران کی تین شاخوں میں سے ایک کی کنٹری سیدٹ رہی تھی۔ اب اس کھنڈر میں محض دو کمرے رہائش کے قابل باقی تھے۔

دو گارڈنر بھائی ایک کمرے میں نظر آئے۔ ایک پلنگ پر لیٹا ٹائمز آف انڈیا پڑھ رہا تھا۔ ہندوستانی پوشاک میں ملبوس انکی نوعمر لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ جو ہمیں دیکھتے ہی فوراً اچلتیں اور کھنڈر سے گذرتی ایک ملحقہ مکان میں غائب ہوتی دکھلائی دیں۔

میں متحیر ہوا۔ منظور النسا بیگم اور قمرچہر کی مسلم تہذیبی روایت کا اتنا دیرپا اثر۔
اضلاع میں انڈین بیورو کریسی کا رعب داب اور اسکی MYSTIQUE مجھے مغلیہ اور
برطانوی عہد کی یادگار معلوم ہوئی۔

میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ انہوں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ ایک بھائی فوراً اٹھا۔
الماری سے انگلش اسٹوکرسی کے نسب نامے ڈبیرے کا تازہ ترین اڈیشن نکال کر ایک صفحہ
کھولا۔ اس پر ان دونوں بھائیوں کے نام درج تھے۔

میں نے کتاب انکے ہاتھ سے لیکر ان اوراق پر نگاہ دوڑائی۔ صوفیہ شکوہ۔ فلاں۔ فلاں۔ فلاں۔ فلاں۔ دانی کاؤٹنس اف ہاورڈین۔ فلاں فلاں۔ رینڈیڈنس: وی اوک لینڈز۔ کنٹربری۔ کلب: یونائیٹڈ سنٹس۔ گارڈز۔
 ”یہ شہزادہ انجم شکوہ کی کرسیچین لوکی جین اختر زمانی والی شاخ ہے۔“ ایک بھائی نے مطلع کیا۔ وہ دونوں ہماری خاطر مدارات میں مصروف ہو چکے تھے۔

پرفضا کنٹربری۔ پھولوں سے بھرے مرغزار۔ اونچے درختوں میں گھبراہٹ کنٹری ہاؤس اعلیٰ ترین کلب۔ یہ گرد آلود گاؤں۔ بے رنگ و بلبہ پیمانہ۔ دو سجد مختلف دینا میں تھیں۔ شاید یہ موسم کا اثر بھی تھا مجھ پر اداسی طاری ہوئی گئی نرس کے سفید یونیفارم میں ملبوس ایک گارڈنز خاتون برآمدے میں سے گذر گئیں ۱۷۹۵ والا سرکاری فیصلہ بھی اتنا دیر پا۔
 دور ام کے باغ میں کوئل کوک رہی تھی۔

”کرنل ولیم گارڈنز“ ایک میزبان کی آواز آئی۔ ”ایک لاکھ درخت لگوائے تھے کہ انکی پیڑھیاں نکمی نکل جائیں تو بھی ایک لاکھ سالانہ کی آمدنی۔“
 ”سب آسٹریلیا جا بے۔ وہ بھی دراصل۔ کرنل کو کیا پتہ تھا محض ڈیڑھ سو سال بعد ملک انکی قوم کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دیکھا جائے تو راج کی مدت خاصی مختصر رہی۔“

عمرانی تفتیش و جستجو۔ سرحدوں میں چھپی تاریخی حقیقتیں انسانوں کی کہانیاں ہیں انکا اچانک سامنا جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے میری اداسی بڑھتی گئی۔ ان خلیق بھائیوں سے رحمت ہو کر باہر نکلا۔ ہو میں تنگی آچلی تھی۔
 آخری بار اس کھنڈر پر نظر ڈالی۔ بھلا زندگی میں دوبارہ یہاں کیوں آؤنگا۔

جیپ شاہراہ پر آگئی۔ دونوں طرف حد نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ زمین۔ زمین۔

زمین۔ انسانوں کو کتنی زمین چاہیے؟ شاید ٹائٹانی نے سوال کیا تھا۔ کتنی — ہارنل لوگک منن اور اسکی قوم کی "ریڈ انڈین" زمین۔ گارڈنر کی قوم کی "بلیک انڈین" زمین۔ اسرائیلیوں کی مقبوضہ عرب زمین۔ اور اب اس دس کی آزاد دھرتی کا منافع بالآخر کس کو پہنچ رہا ہے؟

جمہوریہ ہند کے عالمانِ ضلع کو انکے مقامات پر پہنچاتے ہوئے میرے رہبر دوست نے کہا۔ قمر چہرہ، جیمز گارڈنر اور انکے فرزند سلیمان شکوہ گارڈنر، قضاہمارے مقدس بزرگ کے معتقد تھے۔ انڈین ہولی مین! ہمارے دیوت میں ہولی مین نہیں ہوتے۔ کیتھولک چرچ میں بھی اولیاء کا سلسلہ اس طرح نہیں چلا۔ دوست کے ہمراہ اسکے گھر یعنی اس شہر میں پر جا سکتا تھا۔ لیکن نہیں گیا۔ مسلم شہر میں بھی تحقیق و مشاہدات کا باب نہیں کھول سکتا۔ فرصت نہ دلچپی۔

مغل انگریزی داں ہوتے گارڈنرز وغیرہ کو WOGS بیکارتے — مطلب لٹ ہوتا۔۔۔ ڈیٹرن اور نیڈل انڈینڈ جنٹلمین! میڈیول اسپین کے عیسائیوں جیسے۔

اسی طرح کا معاملہ اسپین و پرتگال میں پیش آیا تھا۔ مگر وہاں بزورِ شمشیر ساری مسلم آبادی کو رومن کیتھولک بنا لیا گیا۔ گو وہ اب تک تمدنی لحاظ سے خاصے مورث چلے آ رہے ہیں۔

فاتح انگریز بھی تمام ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی کر سکتے تھے لیکن وہ انیسویں صدی تھی۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان سے قبل مسلمان فاتحین بھی ساری آبادی کو بزورِ شمشیر کلمہ پڑھا سکتے تھے۔ انہوں نے قرونِ وسطیٰ میں بھی ایسا نہیں کیا۔

میرا نیا دوست اپنی درگاہ کی طرف جانے والی سڑک پر سے جیب موڑ کر مجھے آگرہ پہنچانے کے لئے شاہراہ پر لے آیا۔ راستے میں اس نے کہا — گریٹ گریڈ فادر نے گریڈ پا کو بتلایا تھا کہ قمر چہرہ ہاتھی پر بیٹھ کر اور چاندی کی کھڑاویں پہن کر درگاہ پر آتی تھیں۔ مقدس بزرگ کو پاپا تھی تھیں۔ انکی خواہیں چڑھے کے دستا نے پہنے رہتی تھیں انکے ہاتھوں پر باز کی نسل کے چھوٹے بزنڈ بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ بزنڈ تیری کہلاتے ہیں —

”قمر چہرہ ملکہ زمانی بیگم جیتے کا شکار بھی کھلتی تھیں زمینداری کا سارا انتظام خود کرتی تھیں“

ل کی تجارت شروع کی تھی۔ اولڈ کورٹ ہاؤس کلکتہ میں اسکا دفتر قائم کیا تھا۔ مسٹر
برائین سلیمان شکوہ گارڈن نے کہا۔ ہم لوگ سابق امپریل جم خانہ حال دہلی جم خانہ کے ایک
ڈرائیونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”کرسچین انگلش خاندان کا اثر جس میں انکی شادی ہوئی تھی، میں نے اظہار خیال کیا۔
”جی نہیں۔ مغلیہ شہزادیوں کی روایت، انڈیا نگلین شاعر نے جواب دیا: ”میں سمجھتا ہوں
من، اس نے پاپ سلگاتے ہوئے ابرو اٹھا کر کہا: ”تم کو مشرق کے متعلق اپنے تصورات بدلنے
ہتیں“

میں خاموش رہا۔ میز پر عمر کتنی ہے۔ محض پچیس سال۔ لیکن ایک بوڑھی دنیا اور بوسیدہ
ناشرے کے تخلیق کردہ ایج میرے ذہن میں ابھی سے پختہ ہو چکے ہیں۔ مثلاً — مسلمان
رتوں کی ادنیٰ حیثیت۔ اسلام میں عورت کا کمر درجہ — وغیرہ۔ ان تصورات کو مڈل ایسٹ
مخبروں سے مزید تقویت ملتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا — اینگلو انڈین طبقہ بھی تو غلط ایج
شکار ہے۔ محض چند کسیرے ڈانسرز کی بدولت۔ دوسرے فرقوں میں پیشہ و روزی ہیں، ہوتیں؟

”نورن بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو جاتا ہے“ ایک دوست نے کہا۔

”شاعر —!“ دوسرے مہمان نے جواب دیا۔

سلیمان شکوہ صاحب مسکرائے۔ انکے ہاں شاعری کا سلسلہ بہت طویل رہا تھا۔
ضلع ایٹہ کے ان دو بھائیوں نے دہلی میں مقیم دو قرابت داروں کے ایڈریس مجھے
یہ تھے۔ اس کلب کے ممبر میرے ایڈیٹر دوست نے ہم سب کو یہاں لہج پر مدعو کر رکھا تھا۔
انکی صفدر جنگ لین میں موسم گرما کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ کچھ دور صفدر جنگ روڈ پر
یراعظم انڈیا گاندھی اپنی کوٹھی میں فرکس تھیں۔ انکے بزرگوں کو شہنشاہ فرخ سیر نے پاک
نہر کے کنارے زمین دی تھی۔ اور فاصلے پر محمد شاہی امیر، دوسرا نواب اودھ صفدر جنگ
مقبرے میں خوابیدہ تھا۔ مغلوں کا شاہجہاں آباد۔ لیٹنر کی نئی دہلی۔ سونتر بھارت کی
جدھانی! شہروں اور انسانوں کی شخصیت یکساں ہے۔ اس پر پیاز کے سے پرت چڑھتے

رہتے ہیں۔ اگر انکو اتارنا شروع کیجئے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

میں پھر دونوں گارڈز کی طرف متوجہ ہوا۔ ایسٹ والوں کی طرح کے دو سادھارن مہنہ نیک سے لوگ۔ مرزا مرنج۔ مسٹر ریگی گارڈز شکلاً اینگلو انڈین تھے۔ اردو سے بھی ناواقف طویل عرصہ یورپ اور مڈل ایسٹ میں گزار کر لوٹے تھے۔

”میں دو مہینے وکٹر اسکز کے ہاں رہا۔ بلاسپور ضلع بلند شہر۔ اب سڈنی جا رہا ہوں

”وکٹر اسکز اجزل اسکز کے قلعے میں رہتے ہونگے۔ میں نے مسخو ہو کر پوچھا۔

ریگی صاحب کو ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی کہنے لگے: ”قلعہ؟“

تو کب کا ٹوٹ پھوٹ چکا۔ سکندر صاحب کا کوٹ!

”آپ کو اپنے بچپن کا کاسٹل یاد ہے؟“

”جی ہاں۔ اونچے چار جہن پیل پائے۔ دیواروں پر سبھی تلواریں۔ اور دادی جو کرسی پر تھیں

لیکن ہمیشہ غرارہ پہنتی تھیں۔“

گورارہ۔ میں نے فوراً جوٹ ڈاؤن کیا۔ مسلم ڈریس۔

اوبرائن سلیمان شکوہ شگفتہ مزاج۔ تعلق اور کھلتی رنگت کے ہندوستانی

وہ کہہ رہے تھے: ”لڑاپن میں ہم نے اپنے خاندانی علموں کے سامنے بہت

دعائیں مانگی ہیں۔ جب تک ہمارا امام باڑہ مقفل نہ ہوا،“

مختم اور امام باڑے کا مطلب چند روز قبل نوٹ کر چکا تھا اسلئے سننے میں مصروف رہا

”تو سال تک ہمارے ماں مسلمانوں میں شادیاں ہوئیں۔“

”اس قسم کا دوڑنگا طرز حیات ممکن ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

”اس زمانے میں زندگیاں اتنی پیچیدہ نہیں تھیں رواداری بھی تھی ایمیلیا سلطان۔

نبت مرزا اکبر حسین میری والدہ تھیں۔“

”اوبرائن صاحب! ہم قمر چہرہ ملکہ زمانی بیگم سے کافی دور نکل آئے۔ میں نے انہیں یا

دلایا: ”آپ نے تو وہ امام باڑہ ہی بند کر دیا! ذرا واپس چلیے۔“

”ابھی انکے بہت نزدیک ہیں سنتے جائیے۔ انکے اکلوتے بیٹے سلیمان شکوہ گارڈز فٹا لے بڑے غیر معمولی قسم کے انسان تھے صوفی منش مناصحاب۔ ساری دولت اجاب اور جہتدول پر لٹادی۔ وصعدار۔ ہمیشہ پالکی میں سفر کیا۔ حرم بھی رکھتے تھے اور نامی طوائفوں لے سرپرست بھی تھے“

”واہ۔“ جرنلسٹ دوست نے تو صفا سربلایا۔

”بیر ایڈمرل لارڈ فرانسس گارڈز کی پوتی، کیتھرین جارجینا انکی کر سچین بیوی تھیں۔“ ایام غدر میں سلیمان شکوہ گارڈز فٹا نے روپیے پیسے اور ہتھیاروں سے باغیوں کی مدد۔ جب پدییہ ختم ہو گیا۔ لندن اور کلکتے کی جائیداد بیچ ڈالی۔ انگریزوں سے جان بچانے کے لیے بگڈھ اور درگاہ مارہرہ شریف میں چھپے رہے۔ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی کے وجود ریزوں سے میل جول ترک کر دیا۔ آخر دم تک ان سے ملاقات نہیں کی۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ انکے بیٹے فیلکس گارڈز فلک میرے والد تھے۔ سلیمان شکوہ صاحب خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا: ”کاسنگ میں منظور النساء بیگم کا امام باڑہ کرنل ولیم گارڈز بنوایا تھا۔ وہ ایک بار محرم کے لیے لکھنؤ گئیں وزیر اعظم منظم الدولہ نے حسن باغ ٹھہرایا دبا انہوں نے جس دھوم کی اعزاز داری کی وہ لوگوں کو برسوں یاد رہی۔ اس بہو کے سنگ سرخ کے حمام بارہ دری مقبرے اب کھنڈر ہو چکے۔

”میرے دادا مناصحاب کی بہت ساری بیگمات میں ایک بے انتہا حسین ایرانی اور اہل خانم انکی مجلس راکی مختار کل تھیں۔ میرے بچپن تک زندہ رہیں ایام محرم ہم بچوں کو فقیر بناتی تھیں۔ اعزاز داری انہوں نے جاری رکھی۔ سیرہ گارڈز کو بیٹی یا تھا۔ آٹھ سیرہ پکی مشنری تھیں لیکن امام باڑے کی دیکھ رکھ بڑے خیال سے تھیں۔

”دادی راجیل خانم کے انتقال کے بعد شاید ۱۹۳۷ء میں وہ سونے چاندی کے صریحیں جھاڑنا نوس شمعدان وغیرہ سب امام باڑہ شہید ثالث اگر بھوادیے

گئے۔۔ لے جانے سے قبل باقاعدہ الوداعی مجلس ہوئی۔ ایک سو پچیس سال تک یہ عالیشان امام باڑہ اور اسکا نوبت خانہ آباد رہا تھا۔

سامنے بیٹھے گاؤں کی آواز کس فاصلے سے آرہی ہے۔ میں نور من ڈریک سو رہوں۔ وہ کیسے انوکھے، روادار عیسائی اور مشنری تھے جنکے ہاں سو سو سال تک کھانقارہ بجا، یہ وسیع قلبی اور رچاؤ کس تمدن کی دین تھی؟ شاہان اودھ اور مغلوں کی۔

”کرنل ولیم گاؤں کے خزانے کی ناکام کھوج میں والد مرحوم نے ہمارے اس بوڑھے امام باڑے کا تہ خانہ کھدوا ڈالا تھا۔ اسی رات ایک سفید پوش بزرگ انکے خواب میں آئے اور بولے۔ ایللی مجھ نہ ستاؤ۔ صبح انہوں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ اس جگہ ایک مرمی مزار بنوایا۔ ہر جمعرات کو اس پر چادریں چڑھنے لگیں۔ ایک انجیر کا درخت وہاں خود بخود اگا آیا۔

”پندرہ بیس سال قبل میں کاسنگ ہی میں رہتا تھا۔ کرنل ولیم کے لشکریوں کی اولاد وہاں دیہات میں آباد ہے۔ ایک روز ان میں سے ایک شخص، لال خاں میواتی، گاؤں کے ایک ہندو بھگت یا سیانے کے ہمراہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ صاحب۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ملکہ بیگم کے مزار کے نزدیک فرش میں ایک کندہ گڑا ہوا۔ دینہ اسکے نیچے ملے گا۔

”میں اپنی والدہ کو بتلائے بغیر چپکے سے ان دونوں کے ساتھ اپنی پردادی اور پردا کے مقبرے پر پہنچا۔ مقفل دروازہ کھول کر اندر گیا۔ قمر چہر کا سر ہانہ کعبے کے رخ پر تھا اسکے قریب مرمی فرش میں واقعی ایک آہنی کندہ نظر آیا۔ ہم تینوں نے اسے پکڑ کر تختہ اٹھایا تو نیچے تہ خانہ۔ اسکے اندر سے گرم ہوا کا تیز بھبھکا نکلا۔ بزرگوں سے اس بے ادب کے لیے خدا سے معافی مانگتا سیڑھیاں اترا تو سات فیٹ کی گہرائی میں خزانہ وغیرہ تو نہ

البتہ لائٹن کی روشنی قمرچہرہ ملکہ بیگم کی کھوپڑی اور ہڈیوں پر پڑی۔ ایک ٹانگ کی ہڈی بھر بھری راکھ سی ہو چکی تھی۔ لحد کے برابر دیوار میں ایک کھڑکی دکھلائی دی جو انکے شوہر جیمز کی قبر میں کھلتی تھی۔

”قمرچہرہ جواں سال مر میں تھیں۔ تب مجھے علم ہوا کہ انکے خاوند نے یہ مقبرہ مغلیہ طرز کا بنوایا تھا جس میں مصنوعی مزار ادیر اور اصل تہ خانے میں تعمیر کیے جاتے تھے۔ بیگم کی وفات کے کچھ عرصے بعد ۱۸۴۵ء میں انہوں نے بھی رحلت کی اور وصیت کے مطابق اپنی مسیحی اور بیوی کی اسلامی قبروں کی درمیانی دیوار میں ایک درجی رکھوا گئے۔“

”انکی ماں منظور النساء بیگم کی قبر کی طرح ملکہ بیگم کے مزار پر بھی ہر جمعرات کو قرآن خوانی ہوا کی۔“

”لائٹن کی روشنی میں نواب قمرچہرہ کے استخوان پھر چمکے۔“

”وہ لکھنؤ دہلی اور آگرہ تین شہروں کی حسین ترین سلیم کہلاتی تھیں۔“

”ادیر آگرہ لال خاں میواتی کے کہنے پر میں نے غلہ خیرات کیا۔“

”قمرچہرہ جس قدر خوبصورت اور ذہین تھیں اتنی ہی سٹکی، بے رحم اور ظالم۔ ایک باندی نے انکو پلٹ کر جواب دیدیا تھا تو وہ چھڑی لیکر اسکی زبان کاٹنے کی تیاری میں مصروف تھیں جب عین وقت پر انکے شوہر نے آن کر انہیں روکا۔ دو خواصوں کو جیمز گارڈنر سے ہنستے بولتے پایا تو دونوں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا انکی لاشیں امام باڑے کے تہ خانے میں گڑوا دیں۔ جب میرے والد نے دہلی کی تلاش میں تہ خانہ کھلوا یا تو ڈوڈھا نچے برآمد ہوئے۔“

ماضی کے دہینے میں، نور و مانی شاعر نور من ڈریک قمرچہرہ کو آئیڈیلایز کر رہا تھا۔

مابعد التواریخ کی جستجو اور شناخت میں محو تھا کہ اچانک تاریخ کی مظہریت میرے سامنے آگئی۔ مقتول کینزوں کے پنجر۔ اب مجھے حال میں واپس آنا چاہئے۔

”انجم شکوہ کے داماد ایلن یکے کیوں رنگنے لگے تھے؟“ کچھ دیر بعد میں نے دریافت کیا۔
 ”۱۸۸۲ء میں تیسرے بیرن کا انتقال ہوا۔ انکے واحد نرینہ وارث تھے۔ کاسنگ کی
 جائیداد بیچ کر لندن پہنچے۔ اپنے موروثی خطاب کا دعوائے کیا۔ حکومت کا جواب
 ملا آپکی ہندوستانی شاخ میں بے ضابطہ شادیاں بہت ہوئیں لہذا خطاب منسوخ۔ ڈریک
 صاحب کیا وہ نسل پرست گورنمنٹ ایک ہاٹ کاسٹ شخص کو لارڈ بنا دیتی؟
 ” بے نیل و مرام اور قلاش واپس آئے۔ بازار میں یکے رنگنے لگے۔
 ” آخری لارڈ گارڈنر کی نو اسی البتہ لیڈی اردن کہلائیں و ایسرائے ہند کی بیوی۔“

”فریڈم ایٹ مڈنائٹ“ کافر بیچ یہودی مصنف لاپتیر مسکراتا ہوا سامنے سے گذرا۔
 ”اکثر آیا کرتا ہے۔“ جرنلٹ دوست نے کہا۔ ”اس کتاب کے لیے اس کے اسٹاف نے
 اتنا ٹنوں میٹر بل جمع کر لیا تھا کہ اسی کی بنیاد پر نہر و جناح وغیرہ کے متعلق دو تین بیٹ بسلا اور
 لکھنے والا ہے۔“

”اچھا وہ موٹر ڈرائیور ولیم۔“ سلیمان شکوہ صاحب میرے سوال کا جواب دینے میں مطمئن
 تھے۔ ”نہیں۔ وہ گارڈنر نہیں تھا۔ کوئی انگریز تھا۔ ایک ہر بچین عورت کے ساتھ
 رہتا تھا۔ لہذا انگریزوں نے اسے ٹاٹ باہر کر رکھا تھا۔ زیدی صاحب کے ٹرانسفر
 بعد ادریس لوئیس لائیڈ انکی جگہ آئے۔ وہ انکا شو فر نہیں رہا۔“

ادریس لوئیس لائیڈ۔ فوراً میرے تصور میں می کے الہم کی وہ تصویر آگئی۔ لہنگا چولی پہنے
 ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ فوجی دلچوش سبھا۔ دلکشا گارڈن ۱۹۴۲ء۔
 ”ادریس لوئیس لائیڈ۔“ میں نے دہرایا۔

”جی ہاں۔ غالباً یہودی انگریز تھا۔ لارڈ ریڈنگ کی طرح۔ اس زمانے میں یہودی اپنی
 یہودیت کو چھپاتے تھے۔ اپنے ادرین کو مستقل پوشیدہ رکھنا نہایت مہر آزا ما ہوتا ہوگا۔“
 ”کیا آپ لوگوں کو کبھی اس بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟ میں نے یکلخت ذرا تشریح سے
 پوچھا۔ ”تنقح کا بحران“ ایک جدید اصطلاح ہے۔

”بالکل کرنا پڑا۔ ان سب کو زبردست کو مپلکس تھا۔ وہ دراصل کون ہیں۔ انکی مونوگر کبھی باہر مٹا صاحب نے اس سوال کو حل کر لیا تھا“

دن ڈھل رہا تھا۔ پھانک پر پہنچ کر دونوں گاؤں کو خدا حافظ کہا۔ چند لمحوں تک میں برائیں سلیمان شکوہ گاؤں کو راستہ پار کرتے دیکھا کیا۔ ۱۹۸۲ء کی دہلی میں شہزادہ سلیمان شکوہ اور چہرہ بگیم کے ایک غیر معروف نام لیا۔ راجدھانی کی بھیڑ میں کھوجانے والا ایک چہرہ — میں اڈیٹر دوست کی کار کی طرف بڑھا۔ جم خانہ کے پرسکون باغ میں ایک نور بے نیازی سے گردن اٹھائے، خراماں خراماں، سامنے سے گذر گیا۔

لکھنؤ۔ ممی کی کوٹھی دیکھنے کو نہ ملی۔ اسکی جگہ پر ممی محل کھڑا ہے۔ پانیر اخبار میں یہ اطلاع چھپ گئی ہے کہ ہونہار نوجوان انگلش پوسٹ مسٹر فورسٹن ریک ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد چند روز کیلئے لکھنؤ آئے ہوتے ہیں۔ شاید وہ لوگ یہ خبر پڑھ چکے تھے۔ جب میں نے فون کیا۔ ایک خاتون نے بات کی ان کا SING-SONG انڈین لہجہ دلچسپ لگا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ وہی نامور انگریز شاعر فون کر رہا ہے وہ بہت اکسا سٹیڈ معلوم ہوئیں۔ اور بن بن کر انگریزی بولنے لگیں۔

— محض اتنا کہا کہ میں ایک موڈرن ہندوستانی کہنے سے ملنا چاہتا ہوں، یہ حقیقت لی برٹن کونسل والوں سے بھی اپنی اس فوٹو، ش کا اظہار کیا تھا۔ اب اس کہنے سے ظاہر یہ نہ کہنا چاہتا تھا کہ سینتیس برس قبل جلال بی بی یہاں رہتی تھی اس کا نوٹ نظر ہوں۔

جس وقت میں وہاں وارد ہوا اسی لمحے وہ گھر پہنچی تھی۔

وہ باقہی کے ہودج سے نہیں اتری۔ ایک اسپورٹس کار سے چھلانگ لگاتی میں اسکی

شکل دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ بیاختہ اسکے پیروں پر نگاہ کی۔ اس نے چاندی کی کھڑاویں نہیں پہنی تھیں۔ بلکہ نہایت بھدے بوٹ بگھسی ہوئی جینٹرز۔ میک اپ سے عاری چہرہ ہائے — اس نے ہاتھ اٹھا کر بیفکری سے کہا۔

اسکا نام پری بیگم ہے اور وہ پری محل میں رہتی ہے اور وہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیا آیا مگر چر ایسی ہی رہی ہوں گی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے لئے اتنے زبردست لہجے کا انتظام کرینگے مین بیار خاتون ایک اردو رائیٹر ہیں وہ فضول سے رومانی ناول لکھتی ہیں جو بے حد بکتے ہیں۔ انکا بھائی اونچے کاروباری ہیں۔ لہجے بالکل انگلش تھا (حالانکہ میں ہندوستانی مسلم دسترخوان خواہشمند تھا) جو اعلیٰ درجے کے خانا ماں نے تیار کیا تھا۔ میزبانوں نے شاید مجھ پر میلکم مگر راج کے اس مقولے کی صحت ثابت کرنی چاہی تھی کہ پکا انگریز برآدن صاحبوں کے روپ میں اب صرف ہندوستان میں موجود ہے۔ مہمانوں میں چند اعلیٰ سویلین نوجوان شامل تھے۔ ملک پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ۔ چھاؤنی کے چند اعلیٰ فوجی افسر سینڈھرسٹ ٹاٹپ۔ ناولسٹ خاتون کی بھتیجی پری بیگم ڈوڈسٹاک اسکول مسوری۔ اولڈ میڈ پھو بھیاں نیوسنر ناولسٹ چنٹ اور چھوٹی اپنی عمر کے لحاظ سے چلی۔ جو اپنے فیملی ڈاکٹر منصور کا شغری کے گر منڈلاری تھیں۔ یہ سمجھا قبول صورت شخص اس صورت حال سے گھبرار ہا تھا۔ مگر اس خوش شکل خاتون سے فلرٹ کرنے میں بھی مصروف تھا۔

میں نے پری بیگم کو انگریزوں کے قبرستان چلنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز سہم لوگ مال روڈ کی طرف اس وسیع پکیر سک شہر خوشاں۔ پہنچے۔ گرینڈ فاڈر ڈریک کی قبر آسانی سے مل گئی۔ نام نظر آ رہا تھا۔ باقی عبارت پر گرجی ہوئی تھی۔ میرے اندر ایک شہریر بھجنا جاگا۔ پری بیگم نے اچک کر پڑھنا شروع کیا۔ "جارج فورمن ڈریک"

”سمرز و جردریک کی لائین“ میں نے ذرا بے نیازی سے کہا۔
 ”گوئی! سمرز و جردریک — یو۔ پی کے گورنر تھے؟“
 ”نہیں بھئی بہت پہلے۔ سراج الدولہ کے عہد میں — گورنر فورٹ ولیم کالج۔“
 ”چیرز! تیری بیگم نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔ مرعوب و مسحور۔“
 ”مگر میں نسب پرستی کا سخت مخالف ہوں۔ اسکا ذکر کبھی نہیں کرتا۔“ میں نے اپنے
 باپ والی چارنگ مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلتی محسوس کی — متعجب پر مستشف
 ہوا کہ میں بھی اپنے نانا اور ماں باپ سے مختلف نہیں۔ فرق محض اس چیر کا ہے کہ مجھے
 زندگی میں ان سے بہتر مواقع
 لیکن میرے والد تو چاندی کا چمچہ منہ میں لیے پیدا ہوئے تھے۔ سارے مواقع انہیں
 میسر تھے پھر بھی انہوں نے غلط راہیں اختیار کیں۔ کیونکہ انتخاب انکا اپنا تھا۔

ہندوستانی ”سین“ کے بارے میں دو یا دھرنی پال اور وید مہتہ کی طرح بھی لکھا
 جا سکتا ہے، آندرے مارلو کی طرح بھی۔ میں محض اپنی والدہ کی کمیونٹی کے متعلق حقائق قلمبند
 کرونگا۔ والد کے کثیر الجہت مسلم ورثے سچا گناہوں۔ انسان کتنا کچھ جان سکتا ہے۔ شاید
 گیتا میں سری کرشن نے کہا ہے سمندر کے جس حصے میں خود کو موجود پاتے ہو اسی سے واقف
 ہو جاؤ تو غنیمت ہے۔

ہمارے مغرب میں باغی نوجوانوں کی اصطلاحات بسرعت بدلتی رہتی ہیں۔
 آؤٹ سائیڈرز کی جگہ ڈرویپ آؤٹ آگئے۔ سین اور ٹرپ کا زور رہا۔ پہلے زمانے میں
 ایک ہارٹ وغیرہ مشک بزرگ اپنی روحانیت کے بل پر افلاک کی خبر لاتے تھے۔
 اہل کیلی فورینا نے ذات کا سفر ایل ایس ڈی کی لہروں پر طے کیا۔ جہاں مغرب
 ان دنوں ہندو اور بدھٹ ٹرپ بھی نہایت مقبول ہے، ادھر مڈل ایٹ، پاکستان اور
 (یہاں بھی) اسلامی بنیاد پرست ٹرپ بہت رش لے رہا ہے۔ میں ان دنوں چونکہ

یوریشین ٹرپ پہ ہوں ایک روز پری بگیم کے ساتھ لکھنؤ امیر الدولہ پبلک لائبریری میں
براؤزنگ کرتے ہوئے کلکتہ کا پرتگالی نثر ادہنری ڈیروز یو ڈیسکور کیا۔ جو انمرگ شاعر،
جرنلسٹ۔ وطن پرست۔ رومینٹک۔ سر جوہی نائیڈوکا پیشرو۔ جو وقت اسکے انگریزی داں
نیٹو بنگالی معاصرین مغرب کی بلخار سے متاثر اور مرعوب تھے وہ ملک کی غلامی پر
آنسو بہاتا تھا۔ "سنو پری! وہ دلدار نامی ایک کشمیری ناچ گرل سے کیا کہہ رہا ہے۔"

پری بگیم ناچ گرل نہیں۔ ڈسکو کی ماہر ہے۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

THE HEART ETERNALLY IS BLEST WHERE HOPE

ETERNAL SPRINGS THEN HUSH THY SORROWS ALL TO REST

WE'LL TREAD THE COURT OF KINGS

LIKE BIRDS FROM LAND TO LAND WE'LL RANGE

AND WITH OUR SWEET SITAR

۱۹۸۲ء کی غیر جذباتی پری بگیم ہنس پڑی۔ "یہ حضرت غیب دان بھی تھے!"
"ہاں طیارے پہ میرے سفر اسٹاڈنٹوں کا مع اپنے ستار حسب معمول کسی مغربی
دورے سے ہندوستان واپس آرہے تھے۔" مجھے بھی ہنسی آگئی۔

OUR HEARTS THE SAME THOUGH THE WORLD MAY CHANGE

WE'LL LIVE AND LOVE, DILDAR.

میں نے کتاب بند کر دی۔ پری بگیم نے متفکر ہو کر گھڑی دکھی۔ "اب گھر جاؤں۔"
"اگر آج رات تم میرے ساتھ گھومنے چلی گئیں تو کیا ہوگا؟ میں نے پوچھا۔
وہ بھونچکی سی نظر آئی۔ "رات کو گھومنے؟ یعنی۔۔۔؟"
"یہی۔ میرے قیام پر چلکر ڈنر۔ اسکے بعد۔ کافی وغیرہ۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

”تمہارے گھر والے بہت خفا ہونگے؟“

”محض خفا۔۔۔؟“

دریچوں سے آتی ڈھلتی دھوپ میں نصیر الدین حیدر کا اسٹیچو دمک رہا تھا، اوقس چہر

”تم نے کوئی ڈرگ چکھی ہے؟“

”میں نے تو نہیں مگر کالجوں میں اسکا فیشن چل پڑا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ سنا ہے

”طرح طرح کے منظر دکھلائی دیتے ہیں۔ تم کبھی ٹریپ پر گئے ہو؟“

”نہیں۔ میں نے جواب دیا۔“ آؤ۔ تمہیں گھر پہنچا دوں۔“

مہاراجہ محمود آباد کے قد آدم روغنی پور ٹریٹ کے نیچے سے گذرتے ہم باہر آتے
قیصر باغ کی زرد خستہ عمارتیں سیلی دھوپ میں اور زیادہ اداس نظر آ رہی تھیں۔ لکھنؤ رو کو کو۔
مغلیہ طرز تعمیر کے منزل کا نمائندہ۔ زوال پذیر شفق آلود تمدن ہمیشہ بڑا نظر فریب ہوتا ہے
نصیر الدین حیدر جنرل گارڈز اور ترچہر کا لکھنؤ۔ ۱۸۲۷ میں دو رکلتے میں بیٹھا ہنرمی ڈیروز یو
اسی زوال پر آنسو بہا رہا تھا۔

”ہمارے ہاں بھی تو ایفونی ہو کرتے تھے۔ پیری سگیم نے کہا۔ وہ ابھی تک منشیات
کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کارا سٹارٹ کرتے ہوئے اچانک بولی۔“ پتہ ہے میری شادی ہونے
والی ہے۔“

”اوہو۔ مبارک ہو۔“

”ڈیم۔۔۔ مبارک۔۔۔! ہل۔۔۔!“

”کیوں؟“

”وہ لوگ ڈیڈ کی طرح کاروباری لوگ ہیں کروڑ پتی۔ دارھی والے۔ حاجی۔ لڑکا ستار

میں پڑھ چکا ہے مگر وہ بھی حاجی۔ بور۔ مجھے ذرا پسند نہیں۔“

”تو انکار کر دو۔“

”وہ لوگ ڈیڈ لے بڑس پارٹنر ہیں۔“

لال باغ پہنچا تو ہم لوگ ایک پرانی عمارت کے سامنے سے گزرے۔ ”اس جوہلی میں۔“
 پری بیگم نے کہا ”سیگمات اودھ رہتی تھیں۔ وہی۔ وارن مہٹنگز والا قصبہ۔“ اوہ۔!!
 میں نے اشتیاق سے سر باہر نکالا۔ ایک گریڈنگ لوج کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ کیلے کے پتوں سے سجے
 پھاٹک پر ایک تین، چھہری سی خاتون چند لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اندر دروہیہ لڑکیا
 سڑک پر پولیس کا بندوبست۔

”آداب باجی بیگم۔“ پری نے کار کی رفتار ڈھیمی کر کے انھیں سلام کیا۔ ”یہ پرنسپل
 ہیں۔ آج یہاں یونین منسٹران ایجوکیشن آنے والی ہیں۔ کوئی کلچرل پروگرام ہے۔“
 ”کلچرل پروگرام“ جہاں سوئم کی مخصوص دم غوب اصطلاح ہے۔ میں مسکرایا۔ ہم لوگ
 آگے بڑھ کر پری محل پہنچے۔

اس فیئر می کا سل کے اندر ٹی وی لاونج میں دونوں پھوپھیاں ویڈیو کے سامنے
 اس طرح براجمان تھیں گویا جاگدگیاں اپنی جادو کی جیگی کے سامنے بیٹھی کھدبکھد پکا رہی ہوں۔
 انکا افغان ہاؤنڈ قبلائی بہادر مرمریں فرش پر ڈٹا گویا انکی سازش میں شامل تھا۔ میں
 نے پلکیں جھپکیں۔

خرانٹ قسم کی بڑی پھوپھی نے مجھے سیکھی نگاہ سے دیکھا۔ مجھے کیلنٹ عجیب سے خوف نے
 آدبوجا۔ جنرل اسکرمی راجپوت ماں نے اس غم میں خود کشی کر لی تھی کہ اسکا فرنگی شوہر اپنی لڑکیوں
 کو اسکول بھیج رہا تھا۔ وہ تو دو سو سال قبل کی بات تھی حال ہی میں انگلستان میں رہنے
 والے ایک برکھ نے اپنی لڑکی کو اسوجہ سے قتل کر دیا کہ وہ انگریز لڑکوں کے ساتھ ڈیننگ
 کرنے لگی تھی۔ یہ لوگ بہت موڈرن بنتے ہیں مگر یہ بھی مجھے اور پری بیگم دونوں کو مار ڈالیں گے
 کیلنٹ مجھے منہسی آگئی۔ انگلستان اور انڈیا کے کتب خانوں میں کمپنی کے عہد کی
 کتابیں، اور کرنل میڈوز ٹیلر اور کرنل سلیمین کی تصانیف پڑھتے پڑھتے شاید میرا دماغ ضرورت
 سے زیادہ فعال ہو گیا ہے۔ چند ماہ میں میرا یہ حال ہوا۔ یورپ تو مشرق کے متعلق چار سو سال
 سے طرح طرح کی خرافات پڑھ رہا ہے۔

محض خرافات؟

ادرجو ابھی ایک شہزادی اور اس کے دوست کے سر قلم کر دیے؟

بڑی پھوپھی نے نہایت اخلاق سے بدھ کی شام ڈنر کی دعوت دی — مغربوں
دوستی یہاں اسٹیشن سہل ہے۔ محض گوری چڑھی کیوجہ سے میری اس قدر اوجھلگت!

پھر اسٹریٹ لویٹا پ اور ایج — کیا معلوم یہ پھوپھیاں نہایت نارمل خواتین ہوں۔
بری محل انکے بھائیوں نے بالکل جائیز کمائی سے تعمیر کیا ہو۔ ہر برنس مین بے ایمان نہیں
اس آئینہ خانے میں جہاں ہر چیز ترہی نظر آ رہی ہے، اپنے ذہن کو آئینے کی طرح صاف
ہوں — یہی تو کیتھولک مسٹک بھی کہتے ہیں — میں نے دریچے سے باہر نظر ڈالی — کچھ
صلے پر حضرت عیسیٰ کے نئے فلک بوس رومن کیتھولک کیتھڈرل کی سرخ صلیب سیاہ آسمان
ن لعل بدشتاں کے مانند درخشاں تھی۔

کل اتوار ہے۔ صبح سویرے ماس میں جانا ہے۔ ہوٹل واپس جا کر سونا چاہیے۔

نوجوان ذہن پرستوں کی ایک مغل۔ میزبان ایک امیر زادہ کہ ایک شوقیہ ڈرامہ گروپ
سرپرست ہے۔ یہ منڈلی سائینا نوں میں جمع ہو کر ڈراموں کی جگہ لکڑی کے ڈبے، ہیکٹ میز
ٹیبل کرتی ہے۔ ہاؤکیوٹ! پری بیگم نے ذرا کھینے پن سے کہا۔ اسکا ”آؤٹ ڈور“ حلقہ مختلف ہے
ہ مجھے اس لڑکے کی کوٹھی پر اتار کر نہیں کھیلنے چلی گئی۔

DEN میں ہیرے ڈنر کس سرور کر رہے تھے۔ آرٹھی قسم کی لڑکیاں لڑکے چٹائیوں پر
سے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کا جائیزہ لیا۔ کھادی سلک سے مجلد ”جدید ہندستانی حیات“
سے لبریز انڈوائنگلین نظموں کے مجموعے مغربی مصنفین کی کتابیں۔ دیواروں پر مغربی پوسٹر۔
ک موٹیف کی ایک عریض موڈرن پینٹنگ۔

پر جوش گفتگو۔

”کی گائے یار۔ دس ہڈناٹیس چلڈرن والا۔“
”میرے انکل وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ بانی کار گئے تھے۔“

”نون وائیلنٹ کنٹری! چیزس کرائیٹ۔!!“

”ٹرائی دس مسٹر ڈریک۔ میری اکیسویں سالگرہ پریڈی کی کا تحفہ۔“ میزبان کا چھوٹا بھائی
”ہترے سنی۔ فری براؤن اینڈ ٹوٹینی ون۔ ایو مسٹر ڈریک۔ فری وائیٹ اینڈ
”ٹوٹینیٹ فائیو۔!“

“WASP”

”وہ کیا چیز ہے بیٹا۔؟“ ایک اور نوجوان کا سوال۔

”وایٹرن اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ۔ کائنات کی سب سے زیادہ برنور غلط مخلوق۔“

بارہ سو سال سے دنیا کو جیب میں ڈالے گھوم رہے ہیں۔“

”وایٹرن اینگلو سیکسن کیتھولک۔! میں نے اپنے متعلق تصحیح کی۔“

”او۔ کے۔ او۔ کے۔ چیزس کرائسٹ۔ چار سو سال سے۔“

”میرے انکل وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ آل مائی چیزس۔“

ایسے میں وہ اینگلو انڈین کرسچین بھائی عادتاً اللہ تعالیٰ ماشا اللہ انشا اللہ کہہ رہے تھے

کندھے سے جھولا لٹکائے ایک اور نوجوان کا داخلہ۔ ایک طویل کاغذ پیش کیا۔ سب نے

باری باری اس پر دستخط کیے۔ واپس جانے لگا مجھے دیکھ کر ٹھٹھا کا۔

”ایچ۔ ایم۔ رائٹس کے خلاف ہمارا احتجاج۔ یہ خط۔ انگلش پریس میں چھپے گا۔“

”اس سے کیا ہوگا۔؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”میں تو آرمزریس کے خلاف بھی کسی خط

چھپوا چکا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز لگتی محسوس کی۔

”موجودہ رائیس کے خلاف شہر کے آٹھ سینئر انٹلکچوئیلز کے دستخطوں والا خط توکل ہی انگلش پیریز میں آ گیا ہے۔“
 ”ہاؤنایس“ میری سمجھ میں نہ آیا اور کیا ہوں۔

”کلچر“ کی طرح ”انٹلکچوئیل“ اس خط ارض کا ایک مرغوب لفظ ہے۔ آل انڈیا انٹلکچوئیلز کانفرنس بنگ مسلم انٹلکچوئیلز کانگریس۔ انٹلکچوئیلز فورم۔
 میں نے پوچھا: ”یہ شہر یہاں سے کتنی دور ہے۔ جہاں یہ۔ ایچ۔ ایم۔“
 ”بے حساب مارکاٹ۔“

”میں قنبی سے کاتا نہیں۔ شونی دھاگے سے جوڑتا ہوں۔“

”ڈیم گڈیار۔ یہ کس نے کہا ہے؟“

”ایک شونی سینٹ۔ میڈیول ڈیلیہی“

”ایلی منٹری ہیومنزم یار۔ ایک کونے سے آواز آئی۔“

”چلو اسکا پوسٹر بناتے ہیں۔ ڈیم گڈ سلوگن“

”ایلی منٹری سلوگن یار۔ سارے مذہب ایک رامتہ دکھاتے ہیں۔ سب انسان

ایک ہیں۔ بوگس۔ مٹر ڈریک۔ آپ بتائیے کیا موسک ٹمپل چرچ ایک

دوسرے سے جڑ سکتے ہیں؟ ناممکن۔ ایسٹون اسپنڈرنے کہا ہے۔ کہ یہ حقیقت

کہ ہر آدمی کی ایک آنکھ۔ دونائیں۔ سوری۔ دو آنکھیں ایک ناک دو

کان ہیں اسکا یہ مطلب نہیں کہ میں اور چا پانی ایک ہیں۔؟ آخری تجزیے میں

ڈریک صاحب۔۔۔ سب الگ الگ ہیں۔ رائیٹ۔؟

”اس آخری تجزیے کے بعد تم سالے ہم سب کو آخری نیوکلیئر دھماکے تک بہت

جلد پہنچا دو گے۔ شاہباش۔“

”شو۔ شو۔ شو۔“

لڑکیوں نے نعرہ لگایا

سب نے ملکر اس چھوکرے کو دوڑا دیا۔
نائیس کڈز۔ انکے دل صحیح جگہ پر ہیں۔

پری محل میں ڈنر پر میسر انتظار کیا جا رہا تھا۔

میزیہ بین الاقوامی سیاست کا ذکر چھڑا۔ صاحب خانہ بار بار مجھے مخاطب کرتے
آپ انگریز لوگ — آپ کی انگلش قوم —

جی چاہا انکو بتلا دوں کہ میرے والد ادوہ کے ایک سابق تعلقدار ہیں۔ مگر

اس میں دو قباحتیں ہیں: —

الف، والد محترم کا نام کسی روز بھی بسلسلہ انٹراپول ہندوستان کے انگلش پریس

میں چھپ سکتا ہے۔

ب، ہندوستانی باپ کی اولاد کی حیثیت سے انکے لئے میری شخصیت کا وہ محروراً

زائل ہو جائیگا جو ایک ”انگلش پوئٹیٹ“ میں مضمر ہے۔

بال بال بچا —

اس عجیب و غریب ڈرائنگ روم میں پری کے والد اور چچا اس آبتار کے نزدیک

بیٹھے ایک اعلیٰ سرکاری افسر سے بائیں کر رہے تھے کمرے کے دوسرے حصے میں ایک

پنجابی انڈسٹریٹ نے تاش کے کھیل دکھانے شروع کئے۔ میں اس گروہ میں موجود تھا

کارڈ شارننگ کا تذکرہ نکلا۔ تین چار مہمانوں نے کارڈ شار پرز سے اپنے اپنے این کاؤ

کے قصے سنائے۔ پرسی بیگم کے فیملی ڈاکٹر منصور کا شعری نے کہا ”صاحب جب میں

بوسٹن میں کام کرتا تھا ایک حیرت انگیز پاکستانی کارڈ شار پر سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک

کرورڈیتی ”بوسٹن برسین“ بیوہ کے ہاں مقیم تھے۔ معلوم ہوا ماہر فن۔ —

میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کا شغریٰ نے اپنا بیان جاری رکھا: ”وہ حضرت دراصل اسی شہر لکھنؤ کے باشندے تھے۔ کسی تعلقدار کے بیٹے۔ صاحبزادہ صاحب آف دھان پور۔ خوب چیز تھے۔ سجد دلچسپ فرین گفتگو کے ماہر“

پرسی خانم کی چھوٹی بھوپھی شہوار ڈاکٹر کے نزدیک کشن چیر پر پوز بنائے بیٹھی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے ڈاکٹر اچانک بار بار اچھٹتی سی نظر ڈال کر مجھے دیکھ رہا ہے۔ گویا راجہ دشا علی خان آف دھان پور کی ایک جھلک میرے چہرے میں اُسے نظر آگئی ہو۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں کل ہی دئی جاؤں۔ وہاں سے لندن۔ پرری بیگم نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد انگلستان کا ایک چکر لگائے گی۔

لیکن جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہوتی وہ یہ کہ جب ڈاکٹر کا شغریٰ مس شہوار خانم کو میرے والد کا قصہ سنا رہے تھے کہ وہ آزادی کے کچھ عرصے بعد پاکستان چلے گئے تھے تب سے مغربی ممالک میں ٹھگی وغیرہ کرتے پھر رہے ہیں۔ ما قیاس سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور یہ کہ شاید ما قیاس والوں ہی نے انکو قید حیات سے آزاد کر دیا ہے۔ یہ آخری جملہ سن کر تو میں بے اختیار کہنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ مگر شہوار خانم نے لاپرواہی سے کہا ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ ہمارے کزن تھے، ہمیشہ کے GOOD-FOR-NOTHING۔“

مجھے پرری خانم نے یہ تو بتلایا تھا کہ یہ لوگ بھی پہلے جاگیر دار تھے۔ مگر یہ عجیب و غریب اتفاق ہوا۔ گویا یہ سب میرے رشتے دار ہیں۔ اب پہلی فلائٹ سے برطانیہ واپس آؤ قمر چہرہ! افسوس کہ میں جیمز گارڈن جیسا جیالا نہیں۔ باقی بانی پرری بیگم!

(۲۶)

گھر گھوڑا نچاس مول

کوٹھی ایک بنگالی نے بنوائی لہذا لامحالہ آسمیں ایک تالاب بھی موجود تھا۔ حسین بخسز نے اس کے کنارے بطنیں پال رکھی تھیں۔ جب وہ انکو دانہ ڈالتے وہ موٹی موٹی بطنیں قین قین کرتی ایک ساتھ ان کی سمت لپکتیں۔ اسوقت وہ عندلیب بانو کو کم عقاب عورتیں معلوم ہوتیں۔ بیوقوف خواتین اور بطنوں میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے بطن کو SILLY GOOSE کہتے ہیں۔ میں بھی ایک سلی گوز ہوں۔

پھر وہ اسٹوڈیو کے دریکچے میں کھڑے کھڑے آسمان کا جائزہ لیتیں ان گنڈ پرندے — جو سائبریا سے چلتے ہیں اور راہ میں جبلی طور پر اپنے اسٹیشنوں پہرے منزل پر پہنچ جاتے ہیں یا آندھی چلتی ہے تو راستہ بھول کر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔ عینک لگا کر وہ سفد سائبرین سارس اور قاز اور بگلے اور سنس میں تفریق کر۔ کی کوشش کرتیں مگر اڑتے پرندوں کی انہیں پہچان نہ تھی۔

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ منصور بچی سے واپس آکر صرف ایک بار ملنے آیا ہے وہ ماشا بہلیمہ کلب قائم کرنے اور MADISON AVENUE نیویارک کے اصولو پراس کی سیسٹی کروانے میں مصروف ہے مگر فون پر بھی خیریت نہیں پوچھ سکتا

اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال، دانشور بھی اپنے قدیم، لاشعوری تعصبات حصار کو نہیں توڑ پاتے کسی نے کہا ہے — ہندوستان کے ہر بچن ہی ہندو دنیا واحد اچھوت فرقہ نہیں۔ یہودی۔ عرب۔ شیعہ۔ سنی۔ ہندو۔ مسلمان۔ بہائی۔ نیگرو۔ طوائفیں — سب تعصبات کا شکار ہیں۔ تعصبات ذہن میں جاگزیں،

ہیں پھر رفتہ رفتہ سائیکی میں سرایت کرتے ہیں۔ نسلوں کی جبلت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کی طرح ہم سب اپنی اپنی جبلت کے پابند ہیں۔ جس کے آگے منطق ہتھیار ڈال دیتی ہے۔

چنانچہ راستبازمی اور ایمانداری بھی غلط ہے۔ تقیہ صحیح۔ انسان جبلی طور پر جھوٹ بول کر اپنا دفاع کرتا ہے۔ اپنے آپ کو خطرے سے بچاتا ہے۔ او۔ کے۔ مگر میں نہیں مان سکتی کہ منصور جیسا سمجھدار جہاندیدہ آدمی عنبر جیسی نیک لڑکی سے محض ایسے بدل ہو جائے گا کہ اسکی ماں اور نانی کو عرصہ دراز قبل بحالت مجبوری۔ لیکن انسانی دماغ ایک قطعی ناقابل اعتبار شے ہے۔ انسان کسی بھی وجہ سے آپ سے آپ بالکل بدل جاتا ہے۔

او۔ کے۔ اور کیا یہ بہتر نہ ہو کہ میں نے عنبر کی اصلیت آشکار کی تو اس شخص کی ذہنیت واضح ہو گئی؟

عندلیب بانو درپچہ بند کر کے شراب کی الماری کھولتیں۔ فرانسسیسی اور اسکاج بوتلوں کے لیبلوں پر پھپھے سنہ غور سے پڑھتیں۔ — VINTAGE YEAR فلاں — سنہ فلاں۔ جو شراب جتنی پرانی ہوتی ہی بڑھیا اور نادر سمجھی جاتی ہے۔ VINTAGE میں بھی ہوں مگر ناکارہ۔ فضول۔ ABSURD۔ چپ رہی تو برسوں چپ رہی بولنے پہ آئی تو متواتر بولتی چلی گئی۔ ستر برس جنگل میں گزار دو سر سے جانوروں سے کچھ نہ سیکھا۔ نہ لومڑی سے چالاکئی نہ بھیرٹنی سے فونخواری نہ ہتھنی سے کینہ رہی وہی سلی گوز۔

وہ مے ناب سے غم غلط کرنا شروع کرتیں۔ بھری دو پہروں کا طویل سناٹا۔ میں اپنے کلنک میں حسین بخش، رام سوپ اور رم کلیا شاگردیشے میں محو خواب۔ بہادر مرگشت کے لئے باہر چلا جاتا۔ وہ اپنے تصویر خانے میں بیٹھی پرانی تصویریں دیکھا کرتیں۔ وہ پورٹریٹ جو بنگالی مرچنٹ پرنس کی لگان باڑی میں بنایا گیا تھا۔ وہ تصویر جو ولایتی چکر میں ہو خوری کرتے ہوئے امبا پر شاد نے ایک فولو گرافر سے اتروانی

SNAPSHOT ۵۵ حومخاڈ پر جانے سے قبل وکٹوریہ میموریل کے باغ میں
پائبلٹ افسر اینگلس مک نیل نے کھینچا۔

پرندوں کو اپنا راستہ معلوم ہے۔ دنیا کی بیشتر مخلوق اپنی اپنی منزل پر پہنچ جاتی
ہے۔ الامیرے —

شہراب کی الماری کے نچلے خانے میں رکھے پرانے ریکارڈ ڈالٹی پلیٹیں۔ اس ایبہ
پر کہ شاید نواب بیگم کا کوئی پرانا "توا" ہاتھ آجائے۔ انکو اچھی طرح معلوم تھا کہ نواب بیگم
جے پور سے کلکتے پہنچتے ہی اپنے سارے ریکارڈ چکنا چور کر چکی تھیں مگر ہمیشہ عندلیب
بانو کو یہ آس رہتی کہ شاید ایک آدھ فلو مینا نے پچالیا ہو اور وہ اس انبار میں مل
جائے۔ نواب بانی کے ریکارڈ کے بجائے ایک غزل ہاتھ لگتی جسے ماما بار بار بجا کرتی
تھیں — کیا جہاں برباد گو وہ سرسبز مہاں تھا — فراموش شدہ ماسٹر محمد اسلم
کی گانی ہوئی۔ وہ ٹھٹھک کر سوچنے لگتیں — ماما کی حسین محرومی انگلیوں نے یہ ریکارڈ
چھوئے تھے — وہ انگلیاں مدین گزریں خاک ہو گئیں۔ وہ اپنی انگلیوں کو غور سے
دیکھتیں۔ بہت جلد یہ انگلیاں بھی کیڑوں کی غذا بنیں گی۔ نہیں صاحب۔ میں وصیت
کر جاؤں گی میری لاش کو الیکٹرک کریم کے سپرد کیا جائے۔ دہشت طاری ہوئی
پھر ریکارڈوں کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔ مس دلاری۔ زہرہ بانی۔ عنایت بانی ڈھیر ڈوالی
انور بانی اف اگرہ۔ وہ مسکراتیں۔ یہ سب اپنی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ انکے سامنے
کسی عزت کا ڈھونگ نہیں رچانا پڑتا تھا۔ بہو۔ مجیدن۔ بندو۔

ڈرامہ لیلے انجنوں کے قسط وار تو سے نکلے چلے آتے۔ اور مزہ باغزیں۔ کہ وہ
شوخی جس گھر میں مہمان ہوگا — ماسٹر اعجاز علی۔ اس ڈھب سے جھلک اپنی اس
شوخی نے دکھلانی — پیار و قوال۔ غم جدا، رنج جدا، درد جدا دیتے ہیں —
مس زہرہ جان — میرے درد جگر کی خبر ہی نہیں — مس گوہر جان اف کلکتہ —
ایک بار انھوں نے گوہر جان کا ریکارڈ ریڈیو گرام پر لگایا۔ ایک پھمسی گھسی ہوئی
آواز نکل — میرے درد جگر کی خبر ہی نہیں — میرے — گویا ایک بھوتنی

بھوت کال کے اندھے کنویں میں بیٹھی خنخنا رہی ہو— گوہر کی آواز ریکارڈنگی تیرتی
ابھرتی سیاہ ہروں میں بھی معدوم ہو چکی۔

لیکن کسی چیز کے باقی رہنے کی ضرورت کیا ہے؟ ریکارڈ الماری میں واپس
رکھ کر وہ دوبارہ بیگ پائپر کی طرف متوجہ ہو جاتیس۔

شام کو عنبر کلنک سے گھر آتی تو ماں سے بات نہیں کرتی تھی۔ بات کر دو تو کاٹنے
کو دوڑتی— نرسنگ ہوم میں کام کی زیادتی کی وجہ سے شاید اسکا نروس بریک ڈاؤن
ہوتا جا رہا تھا۔

چند روز قبل وہ تین چار بلیاں تھیلے میں رکھ کر کہیں سے لے آئی تھی۔ اور
اناؤنس کیا تھا۔ میں اب بلیاں پالوں گی۔ قاعدہ ہے OLD MAIDS بلیاں
پال لیتی ہیں۔

وہ بلیاں اب بچوں کے پیچھے پڑ گئیں تھیں۔ تالاب کے کنارے دن بھر سنگامہ
بپا رہتا۔ جس روز بہادر نواب بیگم کی تصویر اور دوسری قیمتی چیزیں چرّا کر بھاگا اس
روز سے منر بیگ نے اسٹوڈیو میں محصور ہو کر دن دن بھر پینا شروع کر دیا۔ آنکھوں
کے نیچے حلقے پڑ گئے۔ ایک شام انھوں نے خود ہی PIZZA تیار کر کے منصور کو فون کیا
— اسکے ملازم نے اطلاع دی۔ بیگم صاحبہ وہ کوئی انگریز شاعر ولایت سے آیا
ہے۔ اسکا ڈنر ہے شہوار بیٹا کے گھر۔ صاحبہ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ پری محل۔

ایک اتوار کی صبح وہ برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں کہ موٹر سائیکل آکر
رکی۔ گوگلز اور خود اتار کر منصور بیٹھیاں چڑھا۔

”تمہارا نام لکھو میں فلائنگ ڈاکٹر پڑ جائے گا— یا فلیش گورڈن—“
عندلیب بانو نے مصنوعی شگفتگی سے کہا اور سنہری زنجیر میں آویزاں عینک اتاری۔
”مزاج عالی بخیر—“

”فاتین۔ تھینک یو۔“

”کیا پچھلے دنوں طبیعت ٹھیک نہیں رہی؟“ ڈاکٹر نے مسز بیگ کے چہرے سے بھانپ کر پوچھا۔

”ہاں۔ ایسے ہی ذرا۔۔۔ بقول شتھے حرج مرج تو لگا ہی رہتا ہے۔ ضیعفی خود ایک لاعلاج مرض ہے۔۔۔ بیٹا۔۔۔“ وہ اخلاقاً ہنسیں۔۔۔ مگر تم بہت دنوں میں راستہ بھولے۔ کیا پھر ہمیں چلے گئے تھے؟“

”جی نہیں۔ وہ۔۔۔ لکھنؤ میں ایک برطانوی شاعر آیا ہوا تھا۔ نگار خانم تقریباً روزانہ اسکے لیے کوئی نہ کوئی پروگرام کرتی رہیں۔ ڈنر۔ چاء۔ پکنک۔ وغیرہ۔ مصرتھیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ بھئی تو میں ابکی بار شاید ایک ماہ کے لئے جا رہا ہوں۔“

”اوہو۔۔۔“

”جی بہت سے کام جمع ہو گئے ہیں۔۔۔ SAUNA کے لئے دوسرا ایمپ خریدنا ہے۔ ایک یوگا ایکسپرٹ تلاش کروں گا۔ شارڈا کا خیال ہے کہ ساتھ ہی ایک اعلیٰ درجے کا بیوٹی پارلر بھی کھول دیا جائے۔ جرٹی بوٹیوں والا۔“

”اس لائن میں تم لوگ سگیم حنین سے مقابلہ نہیں کر پاؤ گے۔“

”مقابلے کے بغیر جیے تو کیا جیے۔“

”تم زندگی کی دوڑ میں بہت آگے جاؤ گے پہلے میرا خیال تھا کہ خاصے سبکے سے انسان ہو۔ اچھا وہ برطانوی شاعر ابھی ہے یا چلا گیا؟ نوٹرن ڈریک؟“

”جی۔ کل گیا۔“

”پائیر میں اسکا انٹرویو پڑھا تھا۔ اسکی ایک نظم بھی چھپی تھی۔ ایک ایسا تر کا گورستان۔۔۔ لکھنؤ کے انگریزی مقابر میں چند لمبے۔۔۔ بڑی اداس خیال انگریز نظم تھی۔ مگر بھئی۔ قبرستان تو ظاہر ہے اداس ہی کرتے ہیں۔ مسرور تو کر نہیں سکتے۔ اچھا

تمہارے لیے کافی بنا لاؤں۔“

”آپ زحمت نہ کیجئے۔ بہادر کہاں ہے۔ ذرا سگریٹ لا دیتا۔“

”بہادر چوری کر کے بھاگ گیا۔“

”چوری —؟“

”ہاں۔ بھئی۔ ہمارے ہاں چوری ہو گئی۔“

”ارے۔ کب —؟ عہتر نے ذکر ہی نہیں کیا کلنگ میں اس سے روز ملاقات

ہوتی ہے۔“

”اسے بتانا یاد نہیں رہا ہوگا۔“

”اننا بڑا واقعہ ہو گیا اور اسے بتانا یاد نہیں رہا! بہت نقصان تو نہیں ہوا —؟“

”بیٹا — وہ — یاد ہے اس شام جب تم نے ماما کو وہ CAMEO دیکھ کر پوچھا

تھا کہ سید قیمتی ہوگا کہاں سے خریدا؟ کس کی تصویر ہے — وغیرہ — یاد ہے —؟“

”جی ہاں۔ قطعی۔“

”بہادر اس وقت کمرے میں آیا تھا۔ کافی کی ٹرے لے جانے۔ اس نے شاید غور

سے یہ بات سنی کہ یہ سید قیمتی تصویر ہے۔ بہت مہنگی خریدی ہوگی — بہر حال۔ اتنے

دونوں وہ شاید موقعے کی تلاش میں رہا — اس اتوار کی صبح جب ہم لوگ سو کر اٹھے تو گھر

میں صفایا۔ ڈرائینگ روم کے ڈیکوریشن PIECES — کھانے کمرے کا سلور —

سب غائب۔ سب سے زیادہ دکھ مجھے ماما کی تصویر کا ہے صدمہ سے میری جان نکل گئی۔

کیسی بھی تھیں میری ماں تھیں۔ اور انکی یہ تصویر میرے لئے انکی بڑی پیاری اور نادر

یادگار تھی۔“

منصور نے فوراً اندھا کر ڈرائینگ اور ڈائیننگ روم کا چکر لگایا۔ دونوں کمرے

خالی خالی سے نظر آئے۔ برا آمد سے میں واپس آ کر پوچھا —

”آپ نے پولیس کو اطلاع کی؟“

”بیکار — پولیس آئی۔ ایف۔ آئی۔ آر لکھوایا — کچھ نہیں ہوا وہ سارا سامان

تو اب تک نجاس میں بک بک لگا گیا ہوگا۔“

”میں ابھی تفتیش شروع کر داتا ہوں۔ ایس۔ ایس۔ پی میرا دوست ہے“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انھوں نے عیب سے کہا ہم بہادر کیلئے ناکہ بندی کروا رہے ہیں۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ میاں لاکھوں کا مال چلا جاتا ہے۔ ڈاکو بکڑے نہیں جاتے۔ ہمارا تو کچھ ایسا بہت زیادہ قیمتی سامان گیا بھی نہیں۔ سو اس تصویر کے۔ چاندی کی زیادہ قیمتی چیزیں مقفل رکھتی ہوں زیور بنک میں ہیں۔ یہ آرائش کی چیزیں میں نے یورپ مڈل ایسٹ وغیرہ میں جمع کی تھیں۔ پھر بھی خریدی جاسکتی ہیں۔ لیکن بے چاری مہا کی تصویر کہاں سے آئیگی۔“

”میں ابھی خود نخاس جاتا ہوں۔ ایک ایک کباڑی اور نیلام گھر میں تلاش کرونگا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔“

”کوشش کر دیکھو گئی ہوئی چیز واپس نہیں ملتی۔“

”میں ابھی نخاس جا رہا ہوں۔ شام کو آکر بتاؤنگا! وہ موٹر بائیک پر بیٹھکر ہوا ہو گیا۔ عندلیب بانو نے رسالہ ”سوسائٹی“ کی ورق گردانی شروع کر دی۔“

چار پانچ دن تک نخاس میں تصویر کی ناکام تلاش کے بعد ڈاکٹر منصور کا شغری چند روز کیلئے بمبئی چلے گئے۔ وہاں کے مشہور عالم چوڑا بازار میں کیمبو کی جستجو بھی اس مرتبہ انکے پروگرام میں شامل تھی ہلیتھ کلب کے لئے مطلوبہ سامان خرید کے منصور کی تلاش میں ناکام رہ کر لکھنؤ واپس آئے۔ گھر پر صاحبزادی شہوار کے ٹیلی فونی پیغامات کا انبار رکھا ملا۔ ڈاکٹر منصور مال ایونیو پر ایک سیلر فلیٹ میں رہتے تھے۔ عمارت کی مالکن انکی پنجابی لینڈ لیڈی راکھی بہن بن چکی تھیں۔ اور انکے سارے پیغامات اور ڈاک بڑی احتیاط سے رکھتی تھیں۔ مسنر پدمابھنڈاری کو اپنے اس متوسط العمر بیچلر کرائے دار اور دھرم بھائی کے نجی معاملات سے از حد دلچسپی تھی بھائی صاحب معمولی شکل والی سیدھی سادی لیڈی ڈاکٹر امبر سے بیاہ کرینگے یا اس کو ورثتی کی اسمارٹ اور سنڈر بہن شہوار سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس اتوار کو ڈاکٹر منصور

ایرپورٹ سے گھر پہنچے ہی تھے کہ گیلری میں سے مسٹر بھنڈاری کی آواز آئی۔ ”نستے جی۔ بھائی صاحب۔ وہ آپکی شہوارجی کے ہاں آپکا بڑا بھائی ہورہا ہے۔ کوئی فنکشن ہے۔ پچیس ہجارتون آچکے ہیں۔“

صاحبزادی نگار خانم کے گھر پر اس طرح انتظامات ہو رہے تھے گویا کسی کی شادی ہے۔ شاید انکے منگھلے بھتیجا کی بات کہیں طے ہو گئی ہو۔ یا ممکن ہے شہوار۔ یا انکی بھتیجی پریمی خانم۔ ابھی تین بیاباہ اس گھر میں باقی تھے۔ نگار خانم کو شامل کر دو چار۔ آبتار والے کمرے میں داخل ہو کر نظر دوڑائی۔ اب وہ مدراس میں سبکی کسی فائوولا مسالہ فلم کا سبٹ معلوم ہو رہا تھا۔ ایرپورٹ لاؤنج یا کسی فرم کے رپشن روم کی طرح صوفے دیواروں کے ساتھ ساتھ نصب کئے گئے تھے۔ سفید پلاسٹک کے ٹکلیوں والے عظیم الجثہ گلوب سفید منقش پلاسٹک کی مصنوعی چھت سے لٹک کر فرش تک آرہے تھے اچانک روشن ہو گئے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ صاحبزادی شہوار خانم۔

”ویلکم ہو ملبا غوط لگا یا سونا میپ خرید لائے ہ ہندوستان میں بنا ہوا خریدا ہے ہ اپورٹ کرتے۔ اچھا آپکے پیچھے ہم نے انٹریئر ڈیکوریٹر بلوایا تھا۔ وجیدہ رحمن، ہیتما، دھرمیندر، امجد خاں وغیرہ سب کے گھر اسی نے سجائے ہیں دیکھیے یہ کمرہ کتنا بڑھیا ڈیکوریٹ کیا ہے اس نے۔ تین لاکھ صرف اس کمرے پر خرچ ہوا۔“ منصور خاموش رہا۔

’دراصل بات یہ ہے کہ۔ ہم لوگ دو سال قبل اس کو تھی میں آئے۔ مطلب وہ پرانی کوٹھی بھتیجانے خریدی تھی دقیا نوسی سی۔ کسی زمانے میں کسی انگریز کی ملکیت تھی۔ اسے گرا کر یہ نئی عمارت بنوائی۔ فلورز کیلئے بہترین سنگ مرمر جبل پور سے منگوایا خیال تھا منگھلے بھتیجا کی بات کہیں پکی ہو جائے تو اس سے پہلے ڈیکوریٹین مکمل کروالیں وہ کہیں طے ہی نہیں ہو پائی۔ آپکو باجی نے بنایا تھا نا منگھلے بھتیجا کو وہ آپکی پارٹنر ڈاکٹر نی پسند آئی تھی مگر وہ ایک P کی لڑکی نکلی۔“

شہوار نے خانم کے منہ سے دوبارہ یہ واہیات جملہ سن کر ایک بار پھر منصور کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ”یہ آبشار والی مینٹل میں بھی اب مکمل ہو گیا ہے۔“ شہوار نے قطب مینار کے نمونے کا تقریبی لیمپ اور چاند نما گلوب جلا یا۔ چاند کے نیچے دیوار پر بنی بارلیف کی برف پوش پہاڑی چمک اٹھی۔ دوسرا سوچ دبا یا۔ پہاڑی کا آبشار جاری ہو گیا۔

”یہ درخت ابھی لگا یا گیا ہے،“ تبسرا سوچ۔ ایک نقلی درخت پر بیٹھی پلاسٹک کی چڑیاں سُری آواز میں چہچہانے لگیں۔

شہوار نے فخریہ منصور کو دیکھا۔ ”ہے ناشانداز چیز!“

الہہ العالمین۔ تم لوگوں کو VULGARITY کا پرم و سیر حکر اور بد مذائق کا پدم بھوشن ملنا چاہیے۔ منصور نے دل میں کہا۔ چپ رہا۔

شہوار نے سوپ آسٹون کا تاج محل روشن کیا۔ ”یہ پورے تیس ہزار میں خریدا ہے۔“ یہ اطلاع دینے کے بعد اس نے پہاڑی نما مینٹل میں کی چوٹیوں پر سے ایک ایک چیز اٹھا کر دکھلانی شروع کی۔ باریک بلوری ہرن، پلاسٹراف پیرس کا بو دھی ستوپدم پانی اور کھجور اہو کی مکتوب نویس عورت۔

اس وقت منصور کی نظر نواب بیگم کی تصویر پر پڑی جو بلند ترین چوٹی پر بڑے ممتاز انداز میں سجائی گئی تھی۔

”ارے یہ تصویر تم کو کہاں سے ملی۔“ آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہی تصویر تھی۔ پھر پوچھا۔ ”تمہیں کہاں سے ملی۔“

”ملتی کہاں سے۔۔۔ یہ ہماری دادی حضرت کی تصویر ہے۔“ شہوار نے بے پروائی سے جواب دیا اور پھلی چوٹی سے ایک مٹا سا جیڈ کا بدتھا اٹھا کر منصور کو دکھلانا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے اپنی جگہ پر جم کر بھونچکی آواز میں دہرایا۔ ”تمہاری دادی۔؟“

”جی ہاں!“

”مگر یہ تصویر تو میں نے تمہارے ہاں پہلے نہیں دیکھی۔“

”دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہمارا سارا قیمتی سامان جاگیر۔ مطلب۔ سابق جاگیر پر۔ پردھان پور پبلس میں مقفل تھا۔ گزشتہ ماہ جب یہاں آرائش کا کام شروع ہوا مٹھلے بھیا نے مسلح پیادے بھیج کر منگوائیں سب چیزیں موروثی کتب خانے سمیت۔ کئی ٹرک بھر کے سامان آیا۔ بہت لمبا فاصلہ اور خطرناک علاقہ ہے۔ بابا مستقیم، مسلم اور پھولن دیوی سب اسی راستے پر OPERATE کرتے ہیں۔“

”اچھا۔؟ پردھان پور اتنی دور ہے۔؟“

”ہاں بھئی پرانی سنٹرل انڈیا ایجنسی میں تھا۔ اب مدھیہ پردیش میں شامل کیا جا چکا ہے کب کا، بس پبلس ہمارے پاس باقی بچا تھا۔ وہ گھنڈر ہو گیا۔ یہ سامان کتب خانہ وغیرہ وہیں موجود تھا۔ بیحد سامان اب تک برباد ہو چکا ہے۔“ صاحبزادی شہوار خانم نے جیڈ کے بدھا کو ہتھیلی پر رکھ کر گھنڈا سانس بھرا ”مہا تمبا بڈھ ٹھیک کہہ گئے تھے کہ سب مایا ہے۔ بہت پانی۔ آپکو تو معلوم ہی ہے ہمارے فیوڈل طبقے پر کتنی بڑی تباہی آئی آزادی کے بعد۔“

”تو آپ کو پریوی پرس تو ملا ہوگا۔“

”نہیں صاحب۔ اسکا بہت لمبا قصہ ہے۔ چھوڑیے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ بیٹوں نے بزنس کر کے حالت سنبھال لی۔“

”میں یہ کھینودیکھ سکتا ہوں۔“

”کیا چیز۔؟“

”یہی کھینو۔“

”اوہ۔۔۔ ضرور۔ سنا ہے۔ ہمارے دادا حضرت نے خاص طور پر ایک مشہور

منصور سے بنوائی تھی۔ لیجئے۔“

منصور نے کھینو ہتھیلی پر رکھ کر ”قطب مینار“ کی روشنی میں غور سے دیکھا، اور

کنفیوز ہوا۔ بالکل وہی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ جانے کیا جکر تھا۔ گویا اسرار دربار

پردھان پور۔ تصویر کو پلٹا۔ پشت پر مرقوم، بہرائی نس دی نوابکیم صاحبہ آف پردھان پور۔

منصور نے آنکھیں ملیں۔ عبارت دوبارہ بڑے غور سے پڑھی۔

ہربائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور
زبردست انکشاف، ”نواب بیگم“ کے شروع میں ”ہربائی نس دی“ اور آخر میں ”صاحبہ
آف پردھان پور“ تازہ اضافہ تھا۔ مگر تقریباً اسی قسم کے قلم اور روشنائی میں۔

”تری شانِ جلّ جلالہ“

”جی —؟“

”کمال ہے صاحب —“

”جی —؟“

”کمال ہے۔“ منصور نے مسکرا کر دہرایا: ”آپ نے یہ نادر فیملی ایر لوم منگوا کر

واقعی بہت اچھا کیا۔“

”جی پچھلے تیس پینتیس سال میں پردھان پور میں رکھے رکھے بہت سی قدیم خاندانی
تصاویر برباد ہو گئیں۔ کل آپکو کتب خانہ بھی دکھلاؤنگی۔ اس میں مصور مخطوطے
بھی موجود ہیں۔ ہمارے بزرگوں کو نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس جزیشن میں
تینوں بیٹے تو کاروبار میں لگ گئے باجی البتہ خاندان کی پرانی روایات کی تجدید کر رہی
ہیں۔ لائبریری اور باجی کی اسٹڈی میں ابھی کام ہو رہا ہے۔ فرسٹ فلور پر مکمل ہو جائیگا
تو دکھلاؤنگی۔“

”چھوٹی بیٹا —“ بسنتی مہری نے کھلے کنول نما دروازے میں آکر کہا مہتری جی

بلاؤت ہیں۔“

”اچھا — اصل میں باجی کے قارئین کے اصرار پر انکے پینتیسویں ناول کی
رسم اجراء ذرا دھوم سے منانے کا پروگرام ہے۔ اسی لئے ہم نے سوچا تقریب سے قبل
گھر کی آرائش مکمل کر لی جاوے۔ معاف کیجئے۔ ابھی آتی ہوں۔ میرے بیڈروم میں
کام ہو رہا ہے۔ ذرا کاریگروں کو سمجھا آؤں۔ دیواروں پر گدیے والی گلابی ساٹن لگوا رہی
ہوں۔ آپکو کون سا رنگ پسند ہے؟ ابھی آئی۔“

شہوار کے جاتے ہی منصور مصنوعی درخت کی شاخ پر ٹھکے نسی وضع کے ٹیل فون کے پاس پہنچا۔ نمبروں کے مٹن دبائے۔

”ہلو—ہلو—“ عنبریں کی آواز آئی۔

منصور نے اہستہ سے کہا ”عنبر تمہاری قبلہ نانی جان کے ایڈوکیٹ اور کبھی تم نہیں جوئے؟“
”کیا مطلب؟“

”وہ یہاں موجود ہیں۔ بر ونٹے سسٹرز کے بھیانک ڈرائیونگ روم میں۔“
”ہائیں—کس طرح—؟“

”سپیل مانی ڈیر لیڈی واٹن۔ نجاس میں بک رہی ہونگی۔ انھیں بھی خرید لائیں۔“
—نواب بیگم اب ہر ہائی نٹس دی نواب بیگم آف پردھان پور بن گئی ہیں۔“
”نو کیڈنگ—؟“

”ان ذہین خواتین نے انکے نام کے دائیں بائیں ان الفاظ کا اضافہ کر لیا ہے۔

مگر یار میں بڑی الجھن میں ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے—یعنی ایک سجدہ REMOTE POSSIBILITY ہو سکتی ہے—کہ واقعی تمہاری نانی نے اپنی طوفانی زندگی کے کسی دور میں کسی نواب صاحب ہر ہائی نٹس آف پردھان پور سے عقد کر لیا ہو—اور یہ کیمپو اس کیمپو کی جو تمہارے پاس تھا اس کی نقل ہو—جو ان نواب صاحب نے بنوائی ہو۔ بحیثیت شرک ہو منر مجھے ان تمام ممکنات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ذرا اپنی امی سے پوچھو کیا انکی ممانے کسی نواب پردھان پور سے نکاح کر لیا تھا؟“

دوسرے سرے پر عنبریں نے با آواز بلند سوال دہرایا۔

”ہرگز نہیں۔“ عندلیب بانو کی آواز آئی۔

”ہرگز نہیں۔“ عنبریں نے دہرایا۔

”توبات صاف ہے۔ جوں ہی میں نے یہ تصویر انکے انتہائی بے ٹیکے مینٹل میں

پر رکھی دیکھی میں ان سے کہنے ہی والا تھا کہ اسے میرے ہاتھ بیچ دو یا یہ کہ چور کا

دارنٹ نکلا ہوا ہے۔ مال مسروقہ کے خریدار کی حیثیت سے وہ بھی پکڑی جائیگی۔
”میں یہ سب کہنے ہی والا تھا کہ شہوار نے نواب بیگم کو اپنی جدہ DECLARE کر دیا
لہذا مجھے خاموش رہنا پڑا۔“

”جدہ؟ — شہوار خانم جدہ جا رہی ہیں؟ ذرا زور سے بولو۔ تمہاری آواز صاف
نہیں آرہی۔“

ارے یا رجدہ۔ جد کی بیوی۔ اس پر یاد آیا کہ جدہ میں اماں جو اکامزار ہے۔
بیچہ طویل اسی وجہ سے وہ شہر جدہ۔“

”اماں جو! —؟ اماں جو! کیا ذکر تھا۔؟“
”اماں یا ر۔“

”صاف آواز نہیں آرہی لائین میں بہت گڑبڑ ہے۔ تم نے ان سے کہا کیوں
نہیں کہ وہ تصویب ہماری ہے۔ کہاں کہاں تو تم اُسے ڈھونڈ آئے۔ نخاس اور
بستی کا چور بازار۔“

”ہاں صاحب۔ گھر گھوڑا نخاس مول۔“

”گھوڑا — کیسا گھوڑا — منصور زور سے بولو۔ تم نے ان سے کہا کیوں نہیں۔“
”اماں کیسے کہتا۔ ایک معقول لڑکی۔ اتنا بڑا سفید جھوٹ بول رہی ہوا دریں لے
بھٹ سے بتا دوں کہ اس کا جھوٹ کھل گیا تو اسے شرمندگی نہ ہوگی؟ غمگین رہی ہو۔؟“

”ہاں ہاں اب لائین صاف ہے۔“

”غمگین یا ر اس ٹیلی فون کے اوپر کی ٹہنی پر پلاسٹک کی رنگ رنگی چڑیاں بیٹھی ہوئی
ہیں جو گاتی بھی ہیں۔“

”نو کیڈنگ۔؟“

یہ پل کھلنے کے بعد شہوار خانم کی طرف سے جو اچانک میرے رویے میں تبدیلی
آگئی ہے۔ کیا میری آواز ہی میں غمگین نے اسے محسوس کر لیا؟ عندلیب بانو نے اپنا پول
خود کھولا تھا کیونکہ وہ زندگی کے انتخابات کے سامنے میں خود کو آزاد سمجھتی ہیں۔ مگر اپنے

پنے آپ کو اور اپنی ماں کو حالات کا شکار بھی تصور کرتی ہیں اور ایک شہیدانہ انداز اپنے غلق رکھتی ہیں۔ مگر شہوار نے اس قدر لالچینی اور بے کار بھوٹ کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا اس لڑکی کی قوت متینہ ضرورت سے زیادہ ہے؟ بڑی بہن نے اپنے تحیل کو ناول نویسوں استعمال کر لیا ہے۔ یہ محض فنیٹی بنانے میں مصروف ہے۔ وہ فون بند کرنے والا تھا۔ عینبر کی آواز آئی۔ ڈاکٹر چنگ شاؤ لو پو۔ وہ معاً عینبر بشاش معلوم ہو رہی تھی۔

رائی عینبر۔

”بولو۔ ملک عینبر۔“

”تم نے انکے تعلقے کا کیا نام بتایا؟“

”پر دھان پور۔“

”اس پر ایک گھنٹی سی جی میرے ذہن میں۔“

”بولو مانی ڈیر میں واسٹن۔“

”ڈکٹوریہ جہاز پر جب ہم ولایت جا رہے تھے۔ ایک صاحبزادہ صاحب اف دھان پور مارے ہم سفر تھے زبردست کارڈ شارپر۔ انہوں نے ایک پاکستانی فلمی ڈائری ماہ لوزنٹا کے ساتھ ہمیں اپ کر لیا تھا۔ GENOA پہنچنے سے قبل جہاز ہی پر ایک بار پکڑے جانے سے لباں بچے۔“

”عینبر۔ میں ان ذات شریف سے واقف ہوں۔ اب سیدھا گھر جا رہا ہوں۔ ہاں سے فون کرونگا۔ تم دس بجے کے بعد لوگ کر لو۔ رائیٹ۔؟ میں بہت عکا ہوا ہوں۔ بھئی سے دلی رات کی فلائیٹ سے پہونچا۔ وہاں سے صبح آٹھ بجے کا جہاز پکڑ لکھنؤ آیا۔ دن بھر میں بہت سا کام نپٹایا۔ پدمابہن جی پیسھے پر گئیں کہ فوراً نکار جی کے ل جاہتے۔ چنانچہ یہاں پہونچا۔ بائی بات گھر سے کرونگا۔ ہاں صاحبزادہ صاحب تھان پور اور نکار خانم کے پر دھان پور سے میرے ذہن میں بھی گھنٹی سی ہے۔“

ڈاکٹر عینبریں بیگ نے فوراً ریسورٹھ دیا اور دیکھے سے باہر نظر ڈالی جہاں

کاغذی گلاب اور مغلیہ گلاب مکان سے چھنتی روشنی میں مقموں کی طرح روشن تھے۔
کی طرح یعنی جب تک اس نے نگار خانم کے پاؤں جانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اسی طہ
زبانی یا فون پر اپنی ساری مصروفیات کی رپورٹ دیا کرتا تھا۔ اب شاید وہ پھر واپس
آ رہا تھا۔

مال ایونیو واپس پہنچ کر اس نے پھر فون کیا۔
”بیڈی ایسٹیرٹ ایبرڈین۔“ فون تکیے پر رکھ کر اس نے بات شروع کی
”مجھے بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔ لہذا فوراً بتاؤ۔“ وہ صاحبزادہ صاحب اف دھان
کے نام پر کیا گھنٹی بجی تھی۔“

”بس کچھ بجی سی تھی۔ تم بتاؤ ڈاکٹر نوہ۔“
”بھئی میرا تو خیال یہ ہے کہ پچھلے دنوں وہ انگریز۔“ میرا خیال ہے کہ اب
انڈین چھو کر ہے۔ بہر حال انگریز کہلاتا ہے۔ وہ یہاں آیا تھا۔ شہزادی درش
کے ہاں۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ایک رات انکے ہاں ڈنر کے بعد کچھ کارڈ شارپرز کا تانا
نکلا۔ میں نے صاحبزادہ صاحب اف پر دھان پور کا نام لیا تو وہ لڑکا چونک
گیا۔ اور میں نے جو غور سے دیکھا تو شکل ان بزرگوار سے کچھ ملتی جلتی معلوم ہوئی۔“

“WOW! THE PLOT THICKENS AND THE MYSTERY DEEPENS!”

”بالکل۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ جب میں نے کہا میں بوسٹن میں انکا معا
رہا تھا۔ اور مافیا والے شاید انکا رشتہ حیات منقطع کر چکے ہیں تو شہوار نے بالکل
BY THE WAY سسر سسر طور پر کہا اچھا اود۔ وہ ہمارے ایک کزن تھے
GOOD-FOR-NOTHING.

”تو صاحبزادہ دلشاد علی خان اف دھان پور صاحبزادی شہوار خانم اف
پر دھان پور کے کزن نکلے اہم نکتہ اچھا خانم عنبریں کل شام کیلئے بڑھیا
ZZA

۴۰۳

اب مجھے رات بھر خواب میں وہ آبشار اور چڑیاں نظر آئیں گی۔ گڈ نائٹ

”امی۔ امی جان۔“ ریسپورر رکھ کر عنبر تیر کی طرح اسٹوڈیو کے دروازے پر
نچی اور زور زور سے دستک دینے لگی۔

منسز بیگ نے شراب کی الماری بند کر کے دروازہ کھولا: ”کیا بات ہے کبوں غل
بارہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“
”امی۔ شہوار خانم بھی EXPOSE ہو گئیں۔ منصور واپس آ رہا ہے“
اندر جا کر وہ ایک کرسی پر دم سے بیٹھ گئی۔

بچھوڑے تالاب کے کنارے حسین بخش نے شاید دانہ پھینکا تھا۔ بطخیں تیں
بیں کرتی بے پناہ شور مچا رہی تھیں۔
”بلیاں۔ کہاں ہیں بلیاں۔ سب کبختوں کو ابھی باہر لجا کر پھینکتی ہوں۔“
”بلیو۔ بلیو۔“ اس نے دریکے میں جا کر چلانا شروع کیا۔

“CALM DOWN AMBER, TAKE IT EASY. RELAX.”

منسز بیگ نے جلدی سے الماری کھول کر کامپوز کی گونی نکالی۔



۴۰۴

(۲۷)

اندرجال

عرف

اسرارِ دربارِ پردھان پور

”رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھے۔ نہ ہاتھ پاؤں میں ہے نہ پاؤں رُکار میں۔“ حضرت زآغ دہلوی نے آبتار والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فرمایا تینوں صوفیوں پر بیٹھ کر مصنوعی آبتار ملاحظہ کرنے لگے۔ شہوار خانم کمرے میں داخل ہوئیں۔ صحافیوں سے کافی فاصلے پر رکھی ایک کرسی پر ٹکیں اور پوچھا۔ ”آعاجباں کی تعریف ہے۔“

”محترمہ آپ ہم تینوں سے چند روز قبل اسی کمرے میں اسی جگہ شرفِ ملاقات حاصل کر چکی ہیں۔“ زآغ صاحب نے ہنسنے لگا کر کہا۔ ”خاکسار زآغ دہلوی: مزاجیہ غزلیں لطیفہ مزاجیہ کالم۔ پفنا ٹوئس مدیر ادبی ایڈیٹن۔ کل نگار صاحبہ نے ہمارے دفتر کو کیا تھا کہ جشنِ اجراء کی نئی تاریخ مقرر کر لی گئی ہے۔ ہمارا اسپیشل نمبر اسی روز ہمانوا تقسیم کیا جائے گا۔ موصوفہ نے آج صبح دس بجے کا وقت دیا تھا فوٹو سیشن کے لئے۔“ فوٹو سیشن۔؟ اس میں تو باجی چاہتی ہیں کہ میں بھی شریک ہوں جیسے وہ مجھ باتیں کر رہی ہیں۔ میرے ساتھ پھول سجا رہی ہیں گلدان میں۔ ہمارے نئے امریکن کچن میں کھانا پکا رہی ہیں۔ وغیرہ۔ آپ فوٹو گرافر ساتھ لائے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

شہوار نے ہانڈس ٹیلی فون کا لمبیور اٹھا یا: ”باجی یہ اخبار والے آگئے ہیں: انہوں اس طرح کہا گیا سبزی ترکاری بیچنے والے آگئے ہیں۔“ آپ انکو انٹر ویو دیجئے۔ ہیر ڈر لمبر کے ہاں حضرت کنج ہو آؤں۔ یہ لوگ میری تصویریں بھی کھینچنے کو کہہ رہے ہیں تو آپ نے خود ہی فرمایا ہے ہم نے نہیں کہا: ”زآغ صاحب نے بات کاٹی۔“

”نہیں تم انٹرویو کے وقت موجود رہو۔ بال خود بنا لو“ نگار خانم نے اوپر سے جواب دیا۔
 ”اچھا بجیا کون سی ساری پہنوں؟ یا پوڑھی دارزہ تصویریں تو کلر میں ہوں گی نا؟“
 ”ہمارا خیال تھا ایک رائیٹر کا انٹرویو کرنے آتے ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوا ایسا مانی اور
 تہ امان کی تصویریں کھینچنے والی ہیں“ زراغ صاحب گویا ہوئے مگر اس وقت تک
 ارفون بند کر کے دوڑتی ہوئی اوپر جا چکی تھیں۔
 ایک ملازم چائے کی ٹرے لے کر آیا اور ڈن ہل اور مارا بر وکے سپیکٹ۔

کچھ دیر بعد نگار خانم کمرے میں داخل ہوئیں تینوں اسی طرح بیٹھے مگر بیٹ پیتے رہے۔
 زراغ سر پرستانہ انداز میں مسکرائیں۔ چھوٹی ٹہن احمق سے جو ان بے چاروں سے چڑھتی
 ، ان سے بنائے رکھنی چاہیے۔ اگر خلات لکھنے پر آگئے تو تو اہ فحواہ کا قصیدہ۔
 قریب کی کرسی پر بیٹھنے ہوئے اخلاق سے کہا ”مزاج شریف۔ میں تو بھی بالکل نہیں
 تھی کہ میرا اسپیشل نمبر نکلے۔ مگر آپ لوگ مہر ہیں۔ روز آپکے ایڈیٹر کا فون آجاتا ہے۔“
 ”مگر آپ تو خود متواتر چیف ایڈیٹر کو —“ بطلموس نے اپنے پاؤں سے زراغ صاحب
 ڈوں دبا یا مگر وہ بولتے رہے ”— فون کرتی رہتی ہیں کہ اسپیشل نمبر نکلاؤ ایسے اس کی
 اعت کا پورا خرچہ میں دوں گی۔ بھائی بطلموس صاحب آپ میرے پاؤں کا انگوٹھا کیوں
 رہے ہیں؟ — میڈم یہ لاگت کا تخمینہ ایڈیٹر صاحب نے بھجوا یا ہے۔“
 ”زراغ صاحب ہمیں بات کرنے دیجئے۔“ بطلموس نے کہا۔

”پچاس ہزار —“ مصنف نے کاغذ دیکھ کر پوچھا۔
 ”جی آپ تمام تصاویر رنگین چاہتی ہیں۔ آرٹ پیپر۔ ہر صفحے پر آرٹ ورک۔ پھر آپکے جو
 ٹاپ لکھوائے جائیں گے انکے لئے مضمون نگار حضرات بھاری معاوضہ طلب کر رہے
 ہیں، زراغ صاحب نے جواب دیا۔

”اوپر چلیے۔ تصاویر کتب خانے میں کھنچو لیجئے گا“ نگار خانم نے اٹھتے ہوئے کہا —
 لوگوں نے چائے پی کچھ کھایا نہیں؟ شریف لائیے۔“

گرینڈ امیٹر کیس پہ انکی قیادت کرنی تینوں کو دوسری منزل پر اپنے کتب خانے لے گئیں۔ چند بڑھئی ایک طرف اگڑوں بیٹھے بیٹریاں پیتے اپنے کام میں مصروف تھے ”تم لوگ اب تھپی کرو۔ جاؤ۔ بٹلیمسون صاحب یہ ہمارا کتب خانہ پردھان پور۔ ابھی پہنچا ہے۔ الماریاں وغیرہ تیار کی جا رہی ہیں“

اخبار نویسوں نے عربی فارسی اردو کی نادر کتابوں اور قلمی نسخوں کا جائزہ لیا ”ہمارا موروثی ذخیرہ ہے۔“

”جی ہاں — جی ہاں —“ بٹلیمسون نے مرعوب آواز میں کہا۔

”خاتمہ ریاست کے بعد ہم لوگ کتب خانے کو پردھان پور سے یہاں منتقل نہ کر سکتے تھے کیونکہ کسی قانونی پیچیدگی کی وجہ سے گورنمنٹ نے سپلیس مٹھل کر دیا تھا۔“

شہوار خانم اندر آئیں اور بڑی بہن کے منہ سے بات چھین کر بولیں ”وہ اصل ایسا کہ ہمارے ایک کزن صاحبزادہ صاحب اف دھان پور پاکستان چلے گئے تھے اس سے کسٹوڈین نے ہمیں بہت تنگ کیا“

اس دوران میں پفنا ٹوس نے نہایت مستعدی سے نوٹ لینے شروع کر دیے تھے۔ اور ٹیپ ریکارڈ بھی چالو تھا۔

”کسٹوڈین نے صاحب بہت ہی ناک میں دم کیا — وہ سردار میٹھل کا زمانہ تھا اب جانے۔“ شہوار خانم نے دبیز چرمی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے بات جاری رکھی ”میر خیر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ باجی بتاتی ہیں۔ باجی بھی خیر اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ انہ نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ان کزن کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے گورنمنٹ اف انڈیا نے سپلیس پر تالا ڈال دیا۔ اب لڑا کیجئے مقدمے۔“

”صاحبزادہ صاحب —؟“

”دھان پور — پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں سے امریکہ۔ وہیں وفات پائی۔ کیا نام بتایا —؟ صاحبزادہ صاحب دھان پور —؟“

”دھان پور اور پردھان پور تو ہم جاگیریں تھیں جیسے یہاں محمود آباد اور۔“

پفناؤس نے جان کاری سے سر ہلایا (وہ خود سینا پور کے رہنے والے تھے) اور تیزی سے لکھا کئے۔

”پھر کسٹوڈین سے پبلیس کس طرح بحال ہوا؟“ زآغ صاحب نے دریافت کیا۔

”لمبا قصہ ہے پڑھنے والوں کو اس میں کیا دلچسپی ہوگی“
 ”قارئین اپنے پسندیدہ مصنف کے ذاتی زندگی کی تفصیلات جاننا چاہتے ہیں اور یہ علم دوست حضرات کے لئے بالخصوص باعث دلچسپی ہوگا کہ کس طرح اتنا نایاب کتب مانہ بر باد ہونے سے بچ رہا۔“ پفناؤس نے عرض کیا۔

”تکلیف کلام معاف یہ ذخیرہ بھی سینکڑوں برس میں جمع ہوا ہوگا“ زآغ صاحب نے کہا
 ”روم ایک دن میں نہیں جلاتھا۔“

”جو بات کی بے تکی۔ قطع کلام معاف اور روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔“
 بطلموس نے آہستہ سے کہا ”نگار صاحبہ ہم کو ایسے دردناک واقعات معلوم ہیں کہ تباہ حال روساء کو محض دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اپنے آبائی کتب خانے اور نوادہ کوڑیوں کے مول بیچنے پڑے۔“ پفناؤس نے کہا۔

”جی اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا کتب خانہ بچ رہا۔“

”اچھا نگار صاحبہ آپ کے کچھ حالات زندگی۔“

”اجی میرے کیا حالات۔“

”انکسار کی ضرورت نہیں۔ قارئین جاننا چاہیں گے۔ سنہ پیدائش۔“

”۱۹۳۵ء۔“

زآغ صاحب نے منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے اچھوٹیا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں۔ اچھوٹ لگ گیا۔ ایک گلاس پانی منگوا دیجئے۔“

شہوار نے گھنٹی بجائی۔

”جی۔ سنہ پیدائش ۱۹۴۵ء“ پفنا توُس نے سنجیدگی سے دہرایا۔ ”تعلیم —؟“
”اعلیٰ —“

”والدین —؟“

”مہر م نواب صاحب پردھان پور و سکیم صاحبہ جنت مکانی۔“
”کھیلیں دھمال خواجہ معین الدین؟“ دیکھو کھیلیں دھمال خواجہ معین الدین۔“
نیچے بنا کر پیشے سے فلک شگاف نعرہ بلند ہو رہا تھا۔
”کون کار رہا ہے؟“ آزاغ نے کان کھڑے کئے۔
”ایک مجذوب ہیں۔ نیچے رہتے ہیں احاطے میں۔“
”اور عزیز واقارب —؟“ پفنا توُس کے سوالات جاری رہے۔

”بس اللہ رکھے تین بھائی ہیں۔“

”کھیلیں دھمال خواجہ کھیلیں دھمال —“

”شہوار! ایک تو ترکھانوں کی کھٹ کھٹ اور ایک یہ بابا جی نے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ دریکے بند کردو۔ جی بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی شادیاں سوچ چکی ہیں۔ چھوٹا بھائی مع اہل و عیال مسقط میں ہے۔ منجھلے والے نے نیننی تال میں سیب کے اور چسپرڈ لگائے ہیں فیکٹریوں کے علاوہ مڈل ایسٹ گوشت پسلائی —“
”جی مگر آپ اپنے متعلق —“

”میں ناول نویس کے علاوہ چند قدیم شعراء پر مضامین لکھ رہی ہوں۔ ارادہ ہے۔“

بی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر ڈالوں۔“

”پڑھنے والوں کو تعجب ہے کہ آپ کو وہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں جو اننگ محققین

کی نظروں سے اوجھل تھیں۔“

”اسی کتب خانے کی بدولت جو اب تک مدھیہ پردیش کے گھنے جنگل میں پھیسے

پردھان پور پولیس میں پوشیدہ تھا۔“

”نگار صاحبہ چند حاسدوں نے اڑامی ہے کہ آپ نے کسی ضرورت مند افلاس زدہ

عالم کے غیر مطبوعہ مضامین خرید لئے ہیں۔ ”زراغ نے کہا۔
 ”جی۔ چلیے تنقیدی مضامین میں نے خرید لئے۔ یہ پینتیس^{۳۵} عدد ناول — یہ بھی میر
 نے کسی سے لکھوائے یا خریدے ہیں؟“

”جی ہاں۔ یہ واقعی کمال ہے، ”زراغ دہلوی نے فرمایا۔ ”نگار صاحبہ کیا میں یہ کہہ
 سکتا ہوں ممتاز شیریں مرحومہ کے بعد آپ پہلی خاتون نقاد ہیں جس نے مردوں کے کان کاٹے“
 ”زراغ صاحب۔ یہ کان کاٹنا وغیرہ شرفاء کی زبان نہیں۔ مجھے انٹرویو کرنے دیجئے“
 پفننا تو س نے بگڑ کر کہا۔

”میں محض اتنا اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ تنقید کے میدان میں کب کو دیں —
 میرا مطلب ہے کب قدم رنج فرمایا یعنی آپ کا پہلا مضمون کب —“
 ”زراغ صاحب آپ ذرا نیچے جا کر انتظار کیجئے۔“ بطلیسٹوس دانت پیس کراہتہ سے
 — ”آؤٹ — آؤٹ —“

زراغ صاحب ڈن ہل کا پیکٹ جیب میں ڈال کر فوراً اٹھے۔ اطمنان سے سر جھکانے
 نیچے چلے گئے۔

”بطلو میاں، ”نگار خانم نے ممنونیت سے کہا ”بعض جیڑقنات لوگ پیدا نشی بد تمیز
 ہوتے ہیں۔ مہمان سمجھ کر میں نے بہت طرح دی۔ مجھے معلوم ہے حاسدوں نے میرے خلان
 سرگوشی کی مہم شروع کر رکھی ہے کہ میں پیسے دے کر مضمون اپنے نام سے چھپوا رہی ہوں۔
 اور اپنی تعریفیں بھی۔ مگر یہ میرا HANDICAP ہے۔ بطلو میاں میری دولت اور سماجی
 پوزیشن میرا ہیٹیڈ می کیپ ہے“

”باجی جان مخالفین کی بہتات اور اس قسم کی کرہہ انواہیں آپ کی مقبولیت اور
 کامیابی کی دلیل ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب“ بطلو میاں نے کہا۔
 ”ہاں صاحب۔ جلنے والے دوروٹی اور کھالیں“ پفننا تو س بولے۔ ”بہار آمد

نگار آمد نگار آمد قرار آمد۔ صدائے آبت راں از اطاق شاہوار آمد“
 ”کیا بات پیدا کی ہے“ بطلو میاں نے ہاتھ اٹھا کر داد دی ”جشن نگار خانم کے بجائے

تقریب کا عنوان ہی کیوں نہ رکھا جائے۔ بہار آمد نگار آمد۔ نگار خانم کا طرز نگارش تو اپیشل نمبر کے پہلے حصے کا عنوان ہو گا۔ تصویر فیچر کا عنوان کیا ہو۔؟
 ”اس نو بہار ناز کو۔۔۔“ پفنا آؤس نے کاغذ پر لکھا۔ بطلیموس نے اس کے نیچے
 اضافہ کیا ”زآع کی طرح ہم آپ کو بھی چلنا کر دیں گے“

شیام سنگھ نیچے سے فوٹو گرافر لے کر آیا۔ دوسرے ملازم نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا۔
 ”جو تصویریں الہم میں موجود ہیں ان میں سے بھی منتخب کر لو اور چند خاندانی تصویریں
 نیچے سے لے آؤ۔۔۔“ فیملی گروپ وغیرہ۔۔۔ نگار خانم نے شہوار سے کہا۔

فوٹو گرافر نے روشنیاں ایڈجسٹ کیں۔ نگار خانم ایک بگ شیلف کے سامنے ایک قلمی
 نسخہ ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئیں۔ فوٹو سیشن شروع ہوا۔
 تھوڑی دیر بعد شہوار تیار ہو کر آئیں۔ بسنتی مہری الہم اٹھائے ساتھ ساتھ تھی۔ شہوار نے
 نواب بیگم کا کیمرہ احتیاط سے میز پر رکھا۔

”یہ لیجئے۔ یہ ہماری دادی حضرت خلد آشیانی کی نادر روزگار تصویر ہے۔ اسے بھی کلر میں
 چھاپیے۔۔۔ CAPTION میں لکھ کر دیتی ہوں“
 بطلیموس اور پفنا آؤس کیمرہ کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہوئے۔ اب وہ نگار اور شہوار
 سے واقعی بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔

شہوار نے لکھنا شروع کیا ”نامور ناول نگار نگار خانم۔۔۔ ہمیں ٹھہریئے۔
 نامور ناول نویس نگار خانم کی دادی ہر ہائی ٹس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور خلد
 آشیانی۔۔۔ یہ پردھان پور کے بعد خلد آشیانی ٹھیک نہیں بیٹھ رہا ہے۔ علیا حضرت
 نواب بیگم صاحبہ خلد آشیانی آف پردھان۔۔۔“

”لایئے مجھے دیجئے۔ یہ CAPTION وغیرہ لکھنے کا کام مجھ پر چھوڑیئے۔ بطلیموس نے
 کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔۔۔“ جشن کی صدارت کے لئے کسی منتری وغیرہ کو بلا یا جائیگا؟
 نواب بیگم کا کیمرہ لفافے میں رکھتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔

”جی منتری وغیرہ ہمارے گھر پر آئیں گے اور ڈنر بھی میری طرف سے کلاکس اودھ میں ہوگا۔ اس کا آپ کے رسالے سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ آپ جن چندیدہ ادیبوں کو دوسرے شہروں سے مدعو کرنا چاہیں انکی فہرست بنا دیجئے۔ ہوائی جہاز سے آمد و رفت کا کرایہ کلاکس اودھ میں قیام و طعام میری جانب سے۔ اس سلسلے میں بڑے بھیا کے سکرٹری کو فون کر لیجئے گا۔“

”جشن کے ساتھ ایک عدد مشاعرہ اور شب افسانہ بھی رکھ لیجئے“ پفنا تو س نے کہا۔
 ”بے شک۔ بے شک۔ اس کا پروگرام آپ مرتب کر دیجئے۔ شہوار چلو اب تم میرے ساتھ آکر اس دیوان پر بیٹھو۔ تصویریں کھنچو ایسے۔ بطلو میاں۔“
 ”پردھان پور پلیس کی تصویریں اور آپ کے دادا حضرت اور والد مرحوم نواب صاحب کے فوٹو گراف بھی مل جاتے تو فیچر مکمل ہو جاتا“

”بطلو میاں جتنا میٹر بل آپ کو دیا گیا ہے اسی کا لے آؤٹ بنو ایسے باقی تصاویر تلاش کرنے کی کوشش کروں گی۔ ہمارا آدھا سامان ابھی تک سینکڑوں میل دور مدھیہ پردیش کے اس علاقے میں پڑا ہے جہاں ریل بھی نہیں جاتی“ نکار خانم بولیں۔
 ”خطرناک ڈاکوؤں سے پر گھنے جنگل اور دشوار گزار گھاٹیاں“ شہوار نے کہنا شروع کیا۔ ”ابنک دہاں کجلی بن میں شیر اور جیتے موجود ہیں۔ ہمارا اپنا علاقہ شیر اور بارہ سنگھے کے لئے مشہور تھا۔ ہمارے کزن اور نامور شکاری صاحبزادہ صاحب آف دہان پور۔“
 پفنا تو س تندہی سے نوٹ لیتے رہے۔

نیچے باغ کی ایک سنگی بیچ پر متمکن زاغ ڈن پل پہ ڈن پل چھوٹے کے جارہے تھے گمنام نواب صاحب رکشا پر بیٹھے پھاٹک میں داخل ہوئے۔
 ”آدمیاں گم شدند ملک خدا تر گرفت زاغ صاحب سوچ رہے تھے۔ بطلو تو س اور اور پفنا تو س دونوں دونوں بہنوں کی چاپلوسی میں مصروف ہیں۔ خوشامدی ٹو۔ بھاڑے کے ٹو۔ ٹو کو خوشامدی کیوں کہا جاتا ہے۔ کس کی خوشامد کرتا ہے بے چارہ

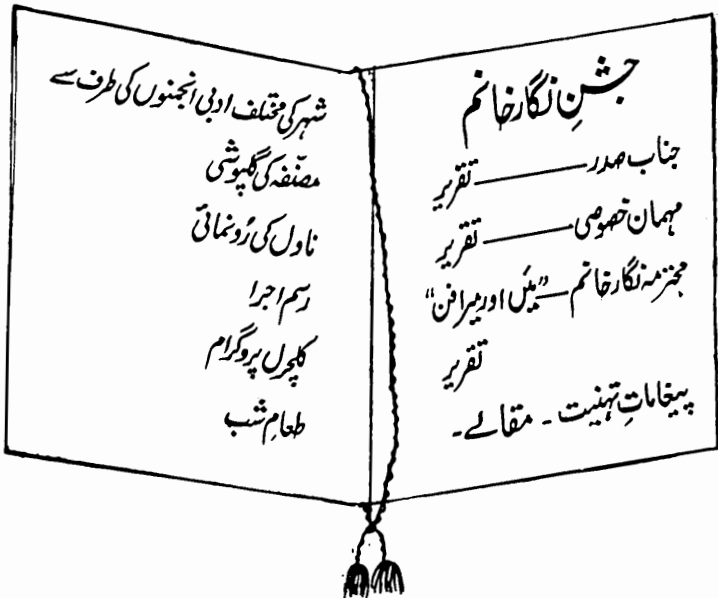
نہایت مسکین غیور جانور ہے۔ ان بڑے میاں کی طرح۔ جانے کون ہیں۔ ان سے انکا نام پتہ پوچھ کر انکو شرمندہ نہیں کروں گا۔ رکشا سے اتر کر نواب صاحب نے شام سنگھ کو آواز دی۔ پھر حضرت زارع کو مخاطب کیا۔ ”میاں عنایت ہوگی اندر بڑی بیٹا سے کہلو دیجئے ابھی ابھی ڈاکٹر نے کہا ہے لڑکے کا گردہ فوراً بدلو ایسے۔ بڑی بیٹا نے ارشاد کیا تھا آج کچھ رقم عنایت کرینگے۔“ نواب صاحب بے حد سراسیمہ نظر آتے تھے۔

زارع نے سراٹھا کر دیکھا بطلیموس و لفناٹوس سامنے کھڑے تھے۔ بطلیموس نے لفناٹوس سے کہا۔

”بھائی لفناٹوس شخصیت پر مضمون لکھنے کے لئے پوائنٹنگ انکار خانم خاموشی کے ساتھ حاجت مندوں کی امداد وغیرہ“

”رسالے کا کام اتنا بڑھالیا۔“ لفناٹوس نے جواب دیا۔ ”نگار صاحبہ نے یہ

دعوت نامہ چھپنے کو دیا ہے۔ تاریخ بھی مقرر کر لی ہے۔ ۴۴ جنوری ۱۹۵۷ء۔“



میتاش کا محل

ساؤتھ ہیرو
۲۳ نومبر ۱۹۸۲ء

میری پیاری نگار خانم

اس بے تکلفی کیلئے معذرت خواہ نہیں آپکا ابن عم ہوں۔ میرے لڑکے کنو بہزاد علی خان عرف نورمن ڈریک نے ہندوستان سے واپس آکر بتلایا کہ لکھنؤ میں اسے چند گمشدہ رشتہ دار ملے — یعنی آپ لوگ۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ میری عزیزہ میں بھی یہ علم نہ رکھتا تھا کہ میرے کچھ اعزہ اس جہان فانی میں ابھی بقید حیات ہیں۔ میرے مرحوم والد اور مرحوم تایا نے بھی کچھ تذکرہ نہیں کیا وجہ اس کی غالباً وہی زمینداری کے جھگڑے رہے ہونگے۔ جو ہر فیوڈل مسلم گھرانے کے نفاق اور بربادی کا باعث ہوتے۔ مزید برآں ہمارا تعلقہ دھان پور (جو میں اعتراف کرونگا کہ بہت معمولی چھوٹا سا تعلقہ تھا) آپکی بڑی ریاست پر دھان پور سے سینکڑوں میل کی دوری پر واقع تھا۔ ہم اودھ میں تھے آپ شاید سی۔ پی میں۔ ہم دلی تم آگرے۔ تو کیسے بچے گی بانسری۔

الغرض یہ نیرنگ زمانہ ہے کہ میں آپکا ایک قریبی عزیز آپکا ابن عم عرصہ دراز شہر نیویارک میں گزارنے کے بعد اب شہر لندن میں رہتا ہوں۔ اپنی سابق گرل فرینڈ اور موجودہ بزنس پارٹنرس نورما ڈریک عرف نورما خانم (جو میرے لڑکے راجکار بہزاد علی خان عرف نورمن ڈریک کی ماں بھی ہیں) اور انکی بہن سیلی ڈریک عرف سرتینا دیوی کے ساتھ ایک ایبکورٹ سرورس چلاتا ہوں۔ اور آپ لوگوں سے اب تک ناواقف تھا۔ اور آپ سے بھی شاکی ہوں کہ آپ نے کبھی ہماری خبر نہ لی۔

ہم لوگوں کا دفتر سوسہ ہیں ہے۔ مکان سا ڈھکھہ ہیر و میں۔ میرا اور نوڑ ماہ خانم کا بیٹا ہم لوگوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا۔ اسکی دلچسپیاں ذہنی قسم کی ہیں (جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں)۔ علاوہ شاعری کرنے کے وہ فیلٹ اسٹریٹ کے ایک اخبار میں سب اڈیٹر ہے شہر میں رہتا ہے۔

آپکی پیاری بھتیجی پری بیگم جسے عرصہ تین ماہ کا ہوا آپ پیارے لوگوں نے لفظ اعلیٰ تعلیم لندن بھیجا تھا۔ میرے بیٹے کے ساتھ مقیم ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں اسکی ”روم میٹ“ یا LIVE-IN-FRIEND

اس نے آپ لوگوں کو ظاہر ہے اسی لئے اطلاع نہیں دی کہ آپ قدامت پرست ہندوستانی اس پیاری بچی کے موجودہ سماجی و اخلاقی نظریات سے متفق نہ ہونگے۔

یہ بھی کیا حسن اتفاق ہے (جبنا سوچتا ہوں کارخانہ قدرت کے ایڈمنسٹریشن پر حیرت ہوتی ہے) کہ میرا لڑکا برٹش کونسل کے زیر اہتمام انڈیا جاتا ہے۔ لکھنؤ پہنچتا ہے آپکو فون کرتا ہے کیونکہ ایک موڈرن ہندوستانی خاندان کے طرز رہائش کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے (کلچرل اینتھروپولوجی اور سوسیولوجی اس بچے کا کیمبرج میں مضمون تھا)۔ بطور ایک ادیب آپ کو وزٹنگ مغربی اہل قلم سے ملاقات کرنا پسند ہے۔ اسے اپنے دولت خانے پر اکثر مدعو کرتی ہیں۔ وہاں ایک طرف تو اس کی ملاقات آپکی بھتیجی سے ہوتی ہے (خیر وہ تو آجکل کے نوجوانوں کی دنیا ہی جداگانہ ہے اسے ہم آپ کھلی تانتی والے ہند سمجھ سکتے)۔ مگر جو اہم بات ہے وہ یہ کہ آپ کے ہاں ایک ڈنر کے دوران بات سے بات نکلتی ہے اور کوئی ڈاکٹر منصور صاحب اس ناچیز فدوی کا تذکرہ فرماتے ہیں اور میرا نام سنکر آپکی ہمیشہ خور دے پروا ہی سے سرسری طور پر کہتی ہیں کہ وہ ہمارے کزن تھے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی اطلاع میرے متعلق صحیح نہیں تھی۔ انہوں نے سنا تھا کہ میرا انتقال یرملا ہو گیا۔ مگر جیسا کہ اس عرصے سے ثابت ہو گا میں بفضل الہی ابھی

زندہ سلامت ہوں اور اس تھیرزا اور دلچسپ جہان رنگ دلو سے کوچ کرنے کی ابھی قطعی جلدی نہیں۔

میرے نور نظر نے اس وقت آپ لوگوں پر یہ منکشف نہیں کیا کہ وہ اس ہیچمدان کا تحت جگر ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر منصور کا شعری موصوف امریکہ کے شہر بو سٹن میں میرے معالج تھے۔ مجھے خوب یاد ہیں، اور شہوار صاحبہ نے میرے متعلق زیادہ توصیفی کلمات استعمال نہیں کئے تھے۔ اس صورت حال میں اگر وہ بے چارہ لڑکا یہ انکشاف کرتا کہ یہ دونوں اس کے والد محترم کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں تو آپ سوچ سکتی ہیں کہ اسکی میزبان شہوار خانم اور میرے سابق معالج ڈاکٹر کا شعری کو کتنی ندامت ہوتی۔ لہذا خاموش رہا پھر بھری بزم میں راز کی بات کیسے کہتا۔

اس وجہ سے بھی خاموش رہا کہ وہ بطور ایک انگریز شاعر نورمن ڈریک ہندوستان گیا تھا اور اسی نام سے یہاں اسے شہرت ملتی جا رہی ہے اپنے دو تہائی ایشین بچے کا نام میں نے بہزاد علی خان اور اسکی اینگلو انڈین ماں نے نورمن ڈریک رکھا۔ لہذا نسل پرست برطانیہ میں وہ بطور نورمن ڈریک ہی کیوں نہ مشہور ہوتا۔ جیسے شو بزنس میں نصف گجراتی کرشنا بھان جی بن گنگز لے!

نورمن نے مجھے وہ تھاویر دکھلائی جو آپکے دولت خانے پر آپ سب کے ساتھ کھینچیں۔ ان میں آپ بھی موجود ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی تھاویر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسم باسٹی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ دیا مغرب میں گزارنے کے بعد اب اپنی کلچر شدت سے یاد آتی ہے اور آپ سے بڑھکر اپنے تمدن کا دلاویز نمائندہ اور کون ہوگا۔

معاف کیجئے گا ادھی عمر پچھم میں بسر کرنے کی وجہ سے میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں نہ بات کو گھما پھر کر کہنا جانتا ہوں جو اہل مشرق کی خصوصیت ہے۔ صاف بات کرنے کا

عادی ہوں۔ میری پیاری بنتِ عم — واقعہ یہ ہے کہ جب آپ کی تصاویر دیکھی ہیں اور نوزین بچے نے آپکے اخلاق اور دیگر اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا ہے اکثر آپ کے متعلق سوچتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کروں۔

نورمن راوی ہے کہ شہزادہ نوری نے جس وقت صرف ایک جملہ میرے متعلق کہا — ”ہمارے کزن تھے — ہمیشہ کے گڈ فور تھنگ —“ اس وقت آپ وہاں موجود نہ تھیں (کچھ قاصدے پر ایک مصنوعی ان ڈور واٹر فال کے نزدیک جلوہ افروز تھیں) ممکن ہے آپ اپنی بہن کی رائے سے متفق نہ ہوں کیونکہ ہم اودھ میں اور آپ ڈوردراز سی پی میں ایکومیو میرے بارے میں یوں بھی زیادہ علم نہ ہوگا۔ باقی یہ کہ اس دوڑ میں سبھی مسلمان زمینداروں کے لڑکے عموماً گڈ فور تھنگ ہوا کرتے تھے۔ بہر حال ناچیز کی مختصر سوانح حیات یوں ہے کہ والدین کی رحلت کے بعد شفیق تائی نے پالا۔ بڑے آبا کی وفات حسرت آیات کے کچھ عرصے بعد ہی زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ ساری عمر پیش و عشرت میں گزری تھی۔ بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بونڈز وغیرہ فروخت کر کے ۱۹۳۵ء میں لاہور چلا گیا۔ وہاں ایک کاروبار شروع کیا ۱۹۳۵ء میں انگلستان گیا اور اسی کاروبار کے سلسلے میں بحری جہازوں کے ذریعے سال میں دو چکر لندن نیویارک بمبئی کراچی کے لگاتار ہوا۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء میں کراچی سے لندن جا رہا تھا جب جہاز پر پاکستانی ڈانسر نورماہ خانم سے ملاقات ہوئی جو لاہور کو خیر باد کہہ کر عازم برطانیہ تھیں —

نورماہ خانم دراصل لال باغ لکھنؤ کی ایک اینگلو انڈین رقاصہ تھیں اور وہاں لال بیبیوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ نورما ڈریک کہلاتی تھیں۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور آگئی تھیں — یہ کوٹھی جو آپکے پیارے بھائیوں نے خرید کر دوبارہ تعمیر کروائی ہے دراصل انہی کی ملکیت تھی جو انکے والا مسٹر جارج نورمن ڈریک سابق بی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی نے ایسٹ انڈین ریلوے کی کچھ رقم غبن کر کے خریدی تھی۔

نورمن ڈریک ہمارا یعنی نورما اور اس خاکسار کی آنکھوں کا تارا جو ۷۵ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا (اور بڑا ہو کر ایک غیر معمولی اٹھلکچوتل ثابت ہوا) دراصل اسی کو ٹھی کو دیکھنے لکھنو گیا تھا۔ وہاں اسکی جگہ آپکا طرز جدید کا دولت خانہ دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ خاموش رہا۔

نورمن شاعر ہے اور ذہن پرست اور اسکالر۔ وہ اپنی ماں سے محبت بھی کرتا ہے اور ماں کے ادیب، اس کے طبقے اور پیٹھے اور کمیونٹی کے بارے میں ایک خالص کیڈنگ اور معروضی رویہ بھی رکھتا ہے اور یہ ارادہ کرنا ہے کہ برطانوی ہند کی اس FRINGE SOCIETY یعنی یورینین فرقے اور اس کی SUB-CULTURE پر ریسرچ کرے اور کپتئی کے عہد میں بنی ہوئی تصاویر حاصل کر کے ایک کتاب شائع

میں اصل موضوع سے بہت دور چلا گیا۔ غرضیکہ عزیز می نورمن کی ولادت کے بعد بھی اس کی والدہ نے اور میں نے یہ ارادہ کبھی نہ کیا کہ ہم باضابطہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ کیونکہ ہم دونوں پیدائشی آزاد پرندے تھے۔ علاوہ ازیں میں اپنے نہایت منفعت بخش کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رہتا تھا (گو پاسپورٹ برٹش رکھتا ہوں)۔ نورما اپنے فائدہ مند بیوپار کی خاطر لندن میں مقیم رہی پھر ان بہنوں نے مل کر ایک ایسکورٹ سروس قائم کرنی۔

عرصہ چار سال کا ہوتا ہے میں بوٹن سے لندن آ گیا اور اس ایسکورٹ سروس میں اپنے وسیع تجربات اور تعلقات کی بنا پر ڈریک سسٹرز کیلئے ایک قابل قدر بزنس پارٹنر ثابت ہوا ہوں۔

میں نے یہ طویل خط پر سوں یہاں تک تحریر کیا تھا۔ کل آپکی پیاری بھتیجی پرسی سگیم

میں اُسے اپنی کومن لا بہو کہنے پر حق بجانب ہوں) کسی اردو اخبار یا رسالے کا وہ ضخیم یا تصویر خصوصی نمبر لیکر آئی جو آپ کے فن و شخصیت کے بارے میں ابھی شائع ہوا ہے اور جو آپ نے اُسے بذریعہ ایمریل لکھنؤ سے ارسال کیا ہے (آپ لوگ جس پتے پر اُسے خط بھیجتے ہیں وہ نوٹرن کے فلیٹ کا پتہ نہیں ہے وہ اپنی ایک سہیلی کی معرفت اپنی ڈاک منگوا رہی ہے۔)

بہر حال وہ رسالہ میں نے رات بھر میں ختم کر لیا۔ اسکی رنگین اور مونو کرم تصاویر بلاخط کس چند مضا میں پڑھے۔ آپکی سوانح حیات کے بارے میں جو انٹرویو آپکی بہن شہوار خانم نے رسالے کو دیا ہے اس میں خاکسار کا ذکر بھی موجود ہے! یعنی دو جملے مندرجہ ذیل شائع ہوئے ہیں:

”ہمارے کزن صاحبزادہ دلشاد علیخان آف دھان پور نامور شکاری تھے ہماری اسٹیٹ کے جنگلوں میں انہوں نے بارہ شیر مارے (متردہ سو عزیز بہنو کہ بارہ شیر جو میں نے مارے سو مارے اب تیر ہوں شیرنی کا شکار کرنے عنقریب لکھنؤ آ رہا ہوں) دوسری جگہ پر شہوار بیٹا ایک سوال کے جواب میں فرماتی ہیں ”صاحبزادہ دلشاد علی خان کا دھان پور اور ہمارا پردھان پور توام ریاستیں تھیں جیسے محمود آباد اور بلہرہ۔“

یہاں بی بی سے ذرا سی چوک ہوئی کیونکہ دھان پور اودھ میں تھا۔ پردھان پور اگر صوبجات متوسط میں واقع تھا تو اس جغرافیائی فاصلے کے باعث انکو توام ریاستیں نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال اہم نکتہ یہ ہے شہوار بیگم کے بیان کے مطابق میرے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے آپکے پردھان پور پولیس کو کسٹوڈین نے منقل کر دیا۔

اے عزیز بہ۔ آپکی ہمیشہ کے اس بیان کی بنیاد پر میں آپکی جائیداد منقولہ وغیرہ منقولہ میں اپنا حصہ طلب کروں ؟۔ لیکن چھوڑیے جانے دیجئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ شہوار خانم نے خاکسار سے رشتے داری کا یہ سارا قصہ کیوں گھڑا۔

اسکی وجہ سمجھ سکتا ہوں کیونکہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیسا ہے اور انواع اقسام کی سنگل خواتین سے سابقہ پڑا ہے۔ شہوار خانم ضرورت سے زیادہ خیال پرست ہیں۔ بے ساختہ جھوٹ بولتی ہیں دروغ گوئی فطرت ثانیہ بن چکی ہے اور جھوٹ وہ محض لفرجاً بولتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر کا شغری میرا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ اسکا انتقال ہو چکا ہے وہ بے ساختہ کہتی ہیں۔ ہمارے کزن تھے۔

سو جا ایک کھر فل شخصیت کا ذکر ہو رہا ہے اس کا پورا حال سن لیا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جسکا نہ جو رو نہ جاتا اللہ میاں سے نانا۔ سمندر پار رہتا تھا۔ کوئی عزیز اقارب نہ رکھتا تھا۔ مرحکا ہے۔ سو جا کون تقنینش کرنے جا رہا ہے۔ جھٹ اُسے اپنا کزن بنا لیا۔ بے ضرر

جھوٹ — JUST FOR THE HECK OF IT

وہی نام ذہن میں رہ گیا تھا تو رسالے کے انٹرویو میں ”کزن دلنا د علی خاں“ بطور نامور شکاری تخیل کے پٹارے میں سے کوڈ کر نکل آتے۔ اب اسہوں نے ایک نہ دو کجلی بن میں پورے بارہ شیر مارے۔ !!

مبالغہ۔ گپ اور فیٹنسی۔ یہ تین عناصر مجھے پیاری بیٹا شہوار کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں۔

مگر ان کو علم نہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ کزن زندہ سلامت ہیں بلکہ انکے بیٹے ہی سے وہ بیبات کہہ رہی ہیں۔ لڑکا بے چارہ اس گپ کو صحیح سمجھا کیونکہ آپ فیوڈل لوگوں کی مجھ سے رشتے داری عین ممکن تھی۔

نہ آپکو یہ معلوم تھا کہ آپکی بھتیجی اس لڑکے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ یا پڑنے والی ہے۔

اب معاملہ یہ ہے کہ مجھ سے آپکی ”رشتے داری“ کا ذکر رسالے میں چھپ چکا ہے خود شہوار خانم کی زبانی — وہ اس بیان سے منکر نہیں ہو سکتیں اور پری سگم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اوپری فینشن پرستی اور موڈرن ازم کے ملمع کے نیچے اصلیت میں

آپ لوگ کافی قدامت پسند ہیں۔ بالخصوص رشتے ناتوں کے معاملے میں۔ آپ کا منجھلا بھائی ایک بہت نیک شریف لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر آپ لوگوں نے منع کر دیا۔ محض اس لئے کہ ”اس کی ذات میں گڑ بڑ تھی“ یعنی شاید اس کی ماں طوائف رہ چکی تھی۔ اب یہ حقیقت کہ آپ کی نوربصر لندن میں ایک طوائف زادے کے ساتھ رہ رہی ہے جسکی سگی خالہ باقاعدہ پکیڈی سرکس کی اسٹریٹ ڈاکر بھی تھی اور دونوں بہنیں برسوں لندن میں ایک فیشن ایبل قحبہ خانہ چلاتی رہیں جسکی آمدنی سے اس گڑ کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، تو یہ اطلاع آپ سب کو بیہوش کرنے کیلئے کافی ہے۔

مزید برآں پری بیگم نے یہ بھی بتایا کہ اسکی منگنی آپ لوگوں نے کانپور کے ایک قدامت پرست پابند صوم صلوة کروڑ پتی پنجابی سوداگر چمڑہ فروش خاندان میں کر دی ہے۔ عقد کی تاریخ طے ہونے والی تھی مگر پری بیگم ضد کر کے آگے پڑھنے کیلئے یہاں آگئی۔ اب قصہ یہ ہے پری بیگم کے سسرال والوں کو بھی نورمن کے متعلق اطلاع پہنچ سکتی ہے۔ چھوکر اندا کا کسی گذشتہ امیر زادی قمر چہر اور یوریشین گارڈنر کے طوفانی رومانس کی مثال دینے کے علاوہ پوچھتا ہے کہ چور محل اور مسٹریس کی پرانی منافقت بہتر ہے یا پیڈ کا اعلان اور اخلاقی دیانت داری۔ آداب بجالاتا ہوں۔

مندرجہ بالا کو ایف کے مد نظر اگر آپ فدوی کو سر دست مبلغ سچا س ہزار پاؤنڈ جلد از جلد روانہ فرمائیں تو اس میں سب کا بھلا ہے۔ گو یہ یاد رہے کہ پری سلمہا بائخ سے اور میر سے غیر قانونی لڑکے کے ساتھ غیر قانونی طور پر رہ رہی ہے۔ مگر اس کا آپ قانونی طور پر کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس کا یہاں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیوں ہندوستان کے برعکس یہاں اس نئے لائف اسٹائل کو سماجی اجازت مل چکی ہے۔

لیکن ہندوستان میں آپ کے خاندان کی بدنامی وغیرہ کی روک تھام کے خیال سے ہی میں تجویز کرتا ہوں کہ فی الحال مبلغ سچا س ہزار پاؤنڈ جو آپ کے ملک لتیاری بھائیوں کیلئے کوئی بڑی رقم نہیں۔ انکا کاروبار منڈل ایسٹ میں بھی ہے۔ مسقط میں مقیم آپ کا چھوٹا بھائی بنک ڈرافٹ مجھے بھیج سکتا ہے۔

در نہ عین ناول کے جشن اجراء کے روز حاضر خدمت ہونگا۔ بولوں بھی آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔

پس نوشت: تماش کے پتوں کا ماہر فن میں کہلاتا ہوں۔ مگر تماش کے محل شہوا زانم اور آپ تعمیر کرتی ہیں۔ اَلَا مَآ شَا اللّٰہ۔

میں ہوں آپ کا دور اقادہ ابن عم
دشاد علی خان (سابق ٹھاکر صاحب آف دھان پور راج۔ اودھ)

”بلڈمی بلیک میلنگ باسٹرڈ — بد معاش کریمیل کروک — حرام الدہر —“
”شہواریہ شریف زادیوں کا طرز گفتگو ہے؟ خاموش۔“
”لندن کی پیوں سے رشتہ داری قائم ہو چکی۔ شریف زادیاں! — ہینہ — اور
یہ کیہ — بلیک میلر — چار سو بیس پر ڈیشنل جگ لو اب آپ کا سمدھی ہے —
شریف زادیاں!!“

”شٹ اپ۔ قصور تمہارا۔ بھگتیں ہم۔“
”قصور؟ — میں نے تو محض ایک چھوٹی سی گپ ہانک دی تھی۔ مجھے کیا پتہ
تھا بکھت زندہ ہوگا۔ مگر آپ کی مار سے انٹلکچوئل پن کے حالت خراب۔ مشہور ناولسٹ
جو ٹھہریں۔ وزٹنگ انگلش پوٹ کی روز دعوتیں۔ بھتیگی کو اسکے ساتھ ڈرائیو پر دکشا اور
چنہٹ بیج رہی ہیں۔ وہ نکلا P کا لڑکا — اور کراس بریڈ۔“

”لاؤ خط مجھے دو۔ بھیتوں کے ہاتھ لگ گیا تمہاری میری ناک چونی کاٹ کر —“
”اجی وہ کیا ناک چونی کاٹیں گے۔ وہ تو آپ کی چہیتی بھتیگی ہی نے کاٹ دی۔ کیا یہ
بات چھیننے والی ہے۔ اس روز بہت بڑھ بڑھ کر منصور کو سنا رہی تھیں۔ ہم ڈاکٹر عیسیٰ
بیگ سے نہیں ملتے — ہمارے یہاں طوائف زادیوں سے میل جول پسند نہیں
کیا جاتا — عبرت —“

بس خاموش۔ آہستہ۔ سب آواز باہر جا رہی ہے۔
 ”ہمارے یہاں کی آوازیں باہر نہیں جاتیں۔ کالے دھن سے بھتیوں نے بہت
 سا ڈنڈ پُروف گھرنوایا ہے۔“

”مگر عقل کی پتلی تمہیں سوچھی کیا تھی جو کسی اجنبی دلنشاہد علی خاں کو اپنا کزن بتایا اور
 اخبار والوں کو یہ سن گھڑت سنانے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”مجھے کیا معلوم تھا کہ منصور نے غلط سنا کہ ما فیا والوں نے اُسے مار ڈالا۔ مجھے کیا
 خبر تھی کہ کجنت مرا نہیں اور یوں بلیک میل کریگا۔ کچھ بھی ضرورت نہیں تھی تم کہوں اوٹ
 پٹانگ ناول لکھتی رہتی ہو؟ وِس فل تھنکنگ ہی نو کرتی ہو۔ میں بھی وِس فل تھنکنگ
 کرتی ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بد معاش کو پچاس ہزار پاؤنڈ۔“
 ”کیوں انکو گالیاں دیے جا رہی ہو۔“

”اے۔ بے۔ اُس پر فیشنل جگ لوانے چار چینی چپڑی باتیں لکھ دیں۔ ریشہ خطمی
 ہو گئیں۔ اے باجی تمہاری یہ نوبت اگتی ہے کہ ایک بین الاقوامی شہرت کے کارڈ شارپر
 اور کوکین فردش نے تمہاری تعریف کر دی اور تم لہلوٹ۔ عبرت۔ عبرت۔
 میرا توجی جاہ رہا ہے کہ یہ خط ڈی۔ آئی۔ جی کے حوالے کر دوں۔ منصور اسی ڈنڈ والے روز
 بتا رہے تھے کہ جب یہ بوسٹن میں تھا انکے زیر علاج۔ اس وقت بھی انٹرویو کی فہرست
 پراسکانام تھا مگر ما فیا والوں کا اُسے پروٹیکشن ملا ہوا تھا۔“

”مگر تمہارا تو یہ حال لگ رہا ہے DESPERATION کا کہ وہ یہاں پہنچا اور تمکو
 سونے کی چیز یا سمجھ کر پیغام مناکحت دیا تو اسے منظور بھی کر لوگی۔“

”وہ میرا معاملہ ہے۔ اگر وہ لڑکپن سے بُری صحبت کی وجہ سے بگڑ گئے۔
 ریس زاد سے بگڑ ہی جاتے ہیں۔ تو انکی اصلاح بھی کی جاسکتی ہے۔ بے چارے
 نے خود خط میں لکھا ہے کہ والدین بچپن میں مر گئے تھے۔ تنایا نے پالا۔ اصلاح بھی
 ہو سکتی ہے۔“

”پینتیس سالہ عادی مجرم کی اصلاح۔! اے باجی میری تم تو بالکل سٹھیا گئیں۔“

”تو بے لڑکی میں تو مذاق کر رہی تھی اور تم کو کیا معلوم کہ انکی عمر پینیسٹھ سال ہے؟“
 ”خود حساب لگا لو۔۔۔ لکھنا ہے بد معاش کہ پہلی بار تیس سال قبل۔۔۔“
 ”انتیس۔“

”بھئی انکو ہماری بہن کو نورسرا خط ازبر ہو گیا۔ اچھا انتیس سال قبل۔۔۔ وہ انگلستان گیا تھا تو اس وقت دودھ پینا بچہ تھا منحوس؟ ارے جب ہی کم از کم پینیسٹھ برس کا تو رہا ہوگا۔ اور بچیا سنو تو سہی۔ یہ تم کو اس روز کیا سُو بھی جب وہ اخبارچی انٹرویو لے رہے تھے تو اپنا سنہ پیدائش ۲۵ء بنا دیا؟ انھوں نے بڑی شکل سے اپنی سنہی ضبط کی۔“

”تم نے کہہ تو دیا کہ میں وِس فل تھنکنگ کرتی ہوں۔“
 ”اے مگر کچھ خدا سے ڈرو باجی۔ تم کو سنہ پینتالیس کی پیدائش کون سمجھے گا ساری بنیا سنس رہی ہے یہ انٹرویو پڑھ کر۔“

”کہہ دو نئی کتابت کی غلطی ہے۔ میں نے ۲۵ء کہا تھا۔“
 ”۲۵ء۔۔۔ اے باجی ۲۵ء میں تو اللہ رکھے منجھلے بھیا پیدہ ہوئے تھے پ تو اللہ رکھے بڑے بھیا سے بھی دو سال بڑی ہیں۔۔۔“
 ”تو یہ میری تو شہرت میرے لئے عذاب جان ہو گئی۔ چلو میں ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئی تھی لوگوں سے مطلب؟ جان کھالی ہے۔۔۔ ہاں نہیں تو۔۔۔ اور بھنو دوسری ات یہ کہ تم بھی ننھی مٹی بچی نہیں ہو۔ ڈاکٹر منصور تم سے دس پانچ سال چھوٹا ہی ہوگا بس پر تم لہلوٹ۔“

”خیر۔۔۔ وہ میرا معاملہ ہے۔ یہاں بات اس جراثیم پینتھک کی ہو رہی ہے۔“
 ”تم کو کیا معلوم پروفیشنل جگ لو ہے؟“
 ”منصور ہی نے بتایا تھا۔ منصور بوسٹن ایک فیشن ایبل اسپینال میں ڈاکٹر تھے۔
 نہی دولتمند امر بچنوں کی سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ کنٹری کلب اور یہ اور وہ۔
 وہ بھی اُسی سوسائٹی میں گھومتا تھا۔“

”چلو خیر یہ وہیمینز لیب کا زمانہ ہے۔ اگر مرد WOMANISE کر سکتے ہیں تو غور میں

MANISE کیوں نہیں کر سکتیں۔ اور کیوں نہ ہوں جگ لوز۔“

”سبحان اللہ باجی۔ ڈاکٹر منصور کے سامنے تو تم بڑی روایت پرست بنتی ہو اس

منافقت کی کیا ضرورت ہے؟“

”بیٹا تمہارا تو سنس اف سیو میر بھی غائب ہو گیا۔ مگر اب پچاس ہزار پاؤنڈ۔“

”باجی جان۔ ابھی چکی بیٹھی رہو۔ منصور سے رائے لیں گے۔“

”منصور تمہاری حماقت پر ہنسنے کا نہیں؟“

”پھر کیا کیا جائے؟ وہی ایک قابل اعتبار شخص ہے۔ جس سے راز کی بات کہی

جاسکتی ہے۔ فیملی ڈاکٹر تو اچھے خاصے فادر کنفیسیر ہوتے ہیں۔“

”میرا تو یہ خط پڑھ کر بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا ہو گا کہ۔“

”نہیں بڑھا۔ اس راسکل نے خط کے ذریعہ ہی آپکو مسحور کر لیا ہے۔ منصور بتائے

تھے سید دلکش شخص ہے۔ پروفیشنل چارمر۔“

”جو اس مت کرو۔ کوئی مسجور و مسجور نہیں کیا اور ڈاکٹر منصور کو فون کرو کہ کلینک سے

سیدھے یہاں آئیں۔ میرا بی۔ پی دیکھنے۔“

”دیکھ لینا۔ وہ بھی یہی رائے دینگے کہ اس خطرناک آدمی کو بالکل خط مت لکھو۔ اگنور کرو۔“

”اور اگر اس نے اخباروں میں نکلوا دیا۔ پرسی خانم کے بارے میں؟“

”اگر اُسے مزید بلیک میل کرنا ہے تو وہ اتنی جلد اپنا ٹرمپ کارڈ نہیں چلے گا۔ واہ با؟“

کارڈ شمار پر کی مناسبت سے کیا بات کہی ہے میں نے۔! ہونہہ۔ لکھتا۔“

راسکل کہ آپناش کے محل بناتی ہیں۔ شاید اس چند کو یہ معلوم نہیں کہ۔ وہ منصور اپنی

کسی مریض کا کیا تکیہ کلام سناتے ہیں۔ پیشہ۔ پیشہ۔ ہر مرض کی دوا ہے تو بڑ

بہن ہمارے پاس بھی خدا کا دیا اتنا پیشہ موجود ہے جو ناش کے گھر کو کاخ مرمر میں بد

سکتا ہے۔ ٹھہرو میں منصور کو فون کر لوں۔“

نواب سیم کی واپسی

کلاس اودھ ہوٹل
لکھنؤ ۲۸ فروری ۱۸۷۳ء

میری بہت پیاری نورما

فرینک فرٹ سے پالم پہنچ کر لکھنؤ کیلئے انڈین ایر لائنز کا جیٹ۔ صبح کا سہانا وقت۔ تیز سرخ گرم آفتاب کا نظارہ بھول چکا تھا۔ جب اموتسی کے گرد پھیلے آم کے باغات پر پہنچا جی بھر آیا۔ اودیس میں رہنے والے بتا۔ کیا امریوں میں اب بھی جھولے پڑتے ہونگے لڑکیاں گاتی ہونگی۔ اب کے ساون گھرا جا۔ اور امواتلے ڈولار کھدے سے مسافر آئی ساون کی بھوار۔! نورما۔ نورما۔ تم جو کبھی مرحوم جارج کو یاد کر کے چکھو پھو روئی ہو اب ہندوستان کی سرزمین پر اترتے ہوئے سمجھ میں آیا کوئی اہم پیاری قیمتی شے ہمیشہ کیلئے کھو جائے اسکا کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ ہم نے وہ پرانا ہندوستان کھویا اور اپنی معصومیت کھوئی۔ ایک بار جب آدم گریس سے گر گیا تو اب کیا غم۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ جیسے ہارڈ بوائے سخت جان آدمی بھی جذباتی ہو سکتے ہیں۔ کچھ شرم سسی آتی آکتیس سال بعد گھرا آیا تو کس مقصد سے۔ دو احمق چھپواری اسپنڈسٹروٹوں کو انکی بے ضروری سخی کی بنا پر بلیک میل کرنے۔ تبھی طیارے نے اموتسی پر لینڈ کیا۔ تم مضر ہو کہ میں تم کو ہمیشہ اردو میں خط لکھوں۔ تم کہتی ہو تمہیں اس زمانے کا بہت ٹوٹلیجیا ہے جب ریٹلیج روڈ پر جو ملی کالج کا ایک غریب طالب علم تم کو اردو پڑھانے آتا تھا اور تم پچھوہا راج سے کٹھک سیکھتی تھیں۔ میں بھی تو اسی زمانے کی یادگار ہوں۔

جہاز نے اموسی پر لینڈ کیا اور مسافر اترنے لگے تو مجاز یاد آگئے۔ ہائے بیچارہ مجاز۔ میں نے فوراً من بجے کو ایک بار اس کے بارے میں بتلایا تو وہ کہنے لگا بلا نوشی اور جو انگری کے اعتبار سے تو یہ شاعر اردو کا ڈی لن طامس معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اسے کہاں دیکھا ہو گا ہالا لکنہ بہ تمہارے زمانے ہی میں لکھنؤ میں برا جاتا تھا اور ہمارے حلقہ احباب کو رونق بخشتا تھا۔ طیارے کی سیڑھیاں اترتے ہوتے میں بے اختیار گنگنایا۔
رخصت اسے سہ سفر! شہر نگار آہی گیا۔

شہر نگار پر نگار خانم یاد آئیں جسکی ادبی تقریب میں بلائے بے درماں اور آفت ارضی و سماوی کی طرح ناگہانی نازل ہونے کیلئے بندہ بہاں وارد ہوا ہے۔ کیا سمجھیں؟ لغت دیکھ لو۔ میں اس وقت مؤڈ میں ہوں خوب لکھو لگا۔ میرا ہی لڑ پیری ٹیلیمنٹ چھو کرے میں آیا ہے۔ کاش میں ایک COMMON CROOK کے بجائے ادیب بنا ہوتا۔
مگر پھر تم کہاں اور ہم اور نورمن کہاں اور یہ خط کیسا۔ وہی ہونا ہے تو منظور خا

شہر نگار پہنچ کر تمہارے مکان یعنی لال بی بی والی کوٹھی گویا شہناز لالہ رخ کے کاشانے پر جانا تھا۔ جواب نگار کے بھائیوں کی ملکیت ہے۔

شہر نگار کی اقتصادیات بدلی ہوئی نظر آتی۔ طیارے سے ہمارے ساتھ چند برقعہ پوش عورتیں اور انکے شوہر بے تحاشا ولایتی سامان (مع ٹوائن و ن) کے ساتھ اترے۔ سعودی عرب وغیرہ میں بجلی کے مستری تھے جھٹی پر آتے تھے۔ ان ان پڑھ خوشحال مستریوں کو دیکھ کر نگار خانم کے ملک التجار بھائی یاد آتے اور پھر اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کیلئے گویا کمر کسی

ایر پورٹ کے چھوٹے سے ہال میں داخل ہو کر سوچا ایر لائنز کی کوچ یا ٹیکسی سے شہر جاؤں اور کسی ہوٹل میں قیام کا پر بندھ کروں کارٹن، برنگٹن یا راسیل۔ اگر اتنک موجود ہوتے۔ وگرنہ کہیں اور بعد ازاں نگار خانم کو فون کروں۔ مگر تین چار لو جو ان جنسن

لگاراں“ کے بلے لگاتے مستعد نظر آتے۔ طیارے سے چند حضرات ایسے اترے تھے جنکو فوراً پہچان کر بڑے تپاک سے انکی جانب لپکے۔ معلوم ہوا اردو کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ واقعی لگتا ہے اس تقریب کیلئے لگاراں کے بھائیوں نے بہت پیسہ خرچ کیا ہے۔ انکی برنس کیلئے پیک ریلیشنز کی یہ بھی بہترین ترکیب —

جی جاہان رضا کار چھو کروں کو مطلع کروں خاکسار کو دشا دہا نیوری کہتے ہیں شاعر میں شرکت کیلئے آیا ہوں۔ مگر سر دست اپنی IDENTITY مخفی رکھنا منظور تھی۔ میرے ولایتی سوٹ کیس اور بی۔ او۔ اے۔ سی کے ایئر بیگ پر رضا کاروں کی نظر پڑی۔ میں نے اپنی چارمنگ مسکراہٹ سوچ آن کر کے ان سے پوچھا معاف کیجئے گا یہاں ٹیکسی مل جائیگی؟ بندے کو ڈی۔ اے۔ چودھری کہتے ہیں برطانیہ کی اردو انجمنوں اور اردو رسائل نے مجھے اس تقریب میں نمائندگی کے لیے بھیجا ہے۔

میرا یہ جملہ کھل جاسم سم کا اثر رکھتا تھا۔ ”برطانیہ کی اردو انجمنوں“ سے سامعین بے انتہا مرعوب نظر آتے۔ ایک نوجوان نے فوراً اسباب میرے ہاتھ سے لیا۔ دوسرے نے اردو ادیبوں سے مجھے ملوایا وہ بھی متاثر دکھلاتی دتے۔

ہم لوگ موٹروں میں سوار کیے گئے۔ قافلہ شہر روانہ ہوا۔ بھینسوں کی لیگار۔ بے انتہا ٹریفک۔ حضرت گنج اور مال پر مویشیوں سے گلے۔ یاد آیا ہمارے لڑکپن میں وہاں انگریزوں کا ولیر یوریٹوریاں تھا۔ سی۔ مل فوٹو گرافر کی دوکان کے آگے لکھنؤ ٹب جہاں ہمارے چند ساتھی اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں جایا کرتے تھے پھر انڈیا ”نی ہاؤس“ کا دور آیا جو ہم طلباء کے لئے اپنے اندر ایک معصوم سا رومانس رکھتا تھا۔

پرائی ELEGANCE غائب۔ راستوں میں گوبر کے ڈھیر۔ لکھنؤ پر اب گائے بھینسوں کی حکومت ہے۔ معلوم ہوا — سابق جتتا سرکار کے ایک منتری نے اپنے دو لڑکوں کو اجازت دے دی تھی کہ سارے لکھنؤ کو اپنا طویلہ اور چرکا گاہ سمجھیں۔ در دیوار کی صورت نہ رہی وہ افسوس میں وطن میں کبھی پہنچا تو وطن یاد آیا

اس فاتیوا سٹار ہوٹل کے کمرے میں ”جشن نگاراں“ کے تجاویف میرے منتظر تھے۔ گو بن بلا یا مہمان تھا۔ حسن انتظام کا معترف ہوا۔ ایک زبردست گلڈسٹن، ایک نفیس ٹوکری میں سیب۔ ٹوکری کے ربن پر نگار خانم کے بھائیوں کے نینی تال والے اور چرڈ کا پتہ۔ انکی پلائی ووڈ فیکٹری میں بنی چند ہلکی پھلکی فینسی چیزوں کے ایک سیٹ۔ یہ ایشیا دوسرے مہمانوں کے لئے بھی انکے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ ہاں۔ اور اس رسالے کا وہی نگار خانم نمبر جو لندن میں پری سیگم نے مجھے دیا تھا اور جو اس سفر کا محرک بنا رسالہ کیا۔ SOUVENIR۔ چکنے کاغذ پر ان گنت اشتہار اور دوسرے بزنس ہاؤسوں کی طرف سے ہنستی پیغامات۔ آرٹ اور انڈسٹری کا سبجو مغرب میں ہو چکا ہے۔ ادب اور ہائی فائی ٹیکنیکل ٹال میل یہاں دیکھنے کو ملا۔

رسالے کے ساتھ دوسرا ایکٹ۔ بڑھیا گفٹ سپرا اور سنہرے ربن سے بندھا۔ کاغذ کھولا اندر سے وہ ناول برآمد ہوا جسکے ”اجرا“ کے لئے یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ عنوان پڑھ کر چونکا۔۔۔ ”ایکے ساون گھر آجا۔۔۔“ ہم تو ساون سے پہلے ہی حاضر ہو گئے! اب دھم سے آکھوں گا صاحب سلام میرا!!

شام کو جب سورج نیچے گومتی میں ڈوب رہا تھا مندوین SUNDOWNERS کیلئے چھٹی منزل پر بار میں جمع ہوتے۔ اسی وقت دونوں میزبان بہنیں تشریف لائیں پیش قیمت ساریوں میں ملبوس۔۔۔ میں نے دونوں کے ایک ایک SOLITAIRE مہرے کی قیمت فوراً ذہن میں کمیٹیوٹ کی۔ ماشا اللہ۔ بندہ جیسا کہ تم جانتی ہو بفضل خدا ہر جمع میں اپنی وجاہت اور سلور گرے بالوں کی وجہ سے ممتاز نظر آتا ہے (کھنکارا)۔ دونوں میری طفر متوجہ ہوئیں۔ عرض کیا ڈی۔ اے۔ چودھری برطانیہ کی اردو انجمنوں کا نمائندہ۔ دونوں کھل اٹھیں۔ چھٹکی زیادہ تیز ہے۔ اس نے باتیں کرنے کرتے دوبارہ دُزیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اے شاید کچھ شک ہو گیا ہے۔

دوسرے روز وقت مقررہ پر نگار خانم کے موجودہ اور تمہارے سابق مکان پر پہنچے تو شادی کا سامنظر نظر آیا۔ بینڈ باجے کی کسر تھی۔ عمارت اور سارے درخت برقی قمقموں سے فروزاں۔ شامیانے کے نیچے بڑھیا قالین اور صوفے۔ شاندار ایٹیج۔ پہلو میں ”پریس“ کی طویل میز پر صحافیوں کی قطار۔ مقامی ٹیلی ویشن کیمیرہ ذاتی ویڈیو کیمیرے۔ ہر چیز تیار۔ شہر کی سوسائٹی کے کریم یعنی بالائی طبقے کی بالائی آکر صوفوں پر جمی۔ آرک لائٹس اور فلیش بلبوں کی چکاچوند میں مصنفہ (اے کے ساون گھر آجا) کی مناسبت سے دھانی غرارے کا جوڑا اہمان خصوصی کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لائیں۔ بڑھیا شیروانی اور چوڑی دارپا بجائے میں ملبوس دونوں بھائی (ان دونوں سے میری ملاقات اب تک نہ ہوئی تھی) اور شوہار خانم (پڑاٹے کی گوٹ کا عزارہ) ہمراہ — وہ سب ایٹیج پر پہنچے۔ مجھے ڈائیس کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھا لایا گیا تھا۔ میرے برابر جو صاحب بر اہمان تھے وہ ڈاکٹر منصور کا شغری نکلے۔ چھ سال قبل بوسٹن میں میرے معالج تھے۔ انھیں حضرت نے میرا تذکرہ شہوار خانم سے کیا تھا۔ جسکی بنا پر میں اپنے نامناسب مقاصد کی تکمیل کیلئے یہاں موجود ہوں — ایک اردو ادیب نے جو میرے دائیں جانب تشریف رکھتے تھے میرا تعارف ڈاکٹر سے کرایا۔ ”مسٹر ڈی۔ اے چودھری۔ برطانوی ڈپٹی گیٹ“

ڈاکٹر نے ابرو اٹھا کر مجھے دیکھا۔ خیف سی حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ وہ بھی ایک گھاگ ہے۔ بولا ”چودھری صاحب آپ سنہ پچھتر میں امریکہ میں تشریف رکھتے تھے؟“ عرض کی ”اشتیاق بہت ہے لیکن آج تک اس حیرت انگیز ملک کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا۔ لندن میں رہتے ہوئے بس اتنا ضرور سنا ہے کہ پارلیمنٹ ہے ویس سنہرا!“

”جی۔ اور قدم قدم پر آنا اپنا روپ انوپ دکھاتی ہے۔ ایڈاکٹر نے کہا۔“

انکا فقرہ نظر انداز کر کے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”اردو کا عاشق ہوں شعر بھی کہتا ہوں۔ قوم کا جاٹ ہوں۔ لہذا سر پہ کھاٹ رکھ کر قسمت آزمائی کے لئے انگلستان چلا گیا تھا۔ برطانیہ کی کئی اردو انجمنوں کا فعال ممبر ہوں۔ انھوں نے چند کئی، یہاں بھیج دیا۔ حالانکہ مدعو نہ کیا گیا تھا، سو جا وطن عزیز کے درشن کا اچھا موقع ہے۔ سو آگیا۔“

۴۳۰

چودھری دھیان سنگھ بندے کا نام ہے۔ آرزو تخلص۔ اسی لئے ڈی۔ اے چودھری کہلاتا ہوں۔
ڈاکٹر نے توصیفاً سربلایا۔ گویا میری فنکاری کے قائل ہو چکے ہوں اپنے برابر بیٹھی دو
خواتین کو مخاطب کیا ”مسز بیگ۔ عنبر۔ چودھری دھیان سنگھ“ پھر مجھ سے کہا ”مسز بیگ۔
ڈاکٹر بیگ“

میں نے اخلاق سے انکو نمکار کیا۔ فوراً پہچان گیا۔ یاد ہے وہ دو ماں بیٹیاں
جو کوٹلیہ جہاز پر ٹورسٹ کلاس میں تمہاری ہم سفر تھیں۔ اڈنبرا جا رہی تھیں سنہ پچیس
میں۔ مسز بیگ کا سفید ہو چکا ہے گو چہرے پر اب بھی رونق ہے۔ اتنی عمر رسیدہ نہیں لگتیں
شتر سے کیا کم ہونگی۔ لڑکی اس وقت کم سن چھو کری تھی اب ایک باوقار خاتون۔ ماں کے
برعکس کافی کم رو۔ ان دونوں نے بھی مجھے ذرا غور سے دیکھا۔

ابھی تقریب کی کاروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ شہوار خانم مہمانوں کی دیکھ بھال
کرتی ہماری جانب آئیں۔ میں نے فوراً بھانپ لیا کہ ڈاکٹر عنبریں بیگ اور صاحبزادی
شہوار خانم کے درمیان برف کے پہاڑ حاصل ہیں۔ کارن: ڈاکٹر منصور کا شغری۔
آہ۔! یہ ابدی مثلث —!!

اب چند رضا کاروں نے (مجھے بعد معلوم ہوا کہ وہ سب نگار خانم کے بھائیوں کے
دفاتر اور کارخانوں میں ملازم تھے) چکر لگا کر حاضرین جلسہ کو اسی گفٹ پیس اور بن میں
بندھا رسالے کا خصوصی نمبر اور تازہ ناول کی ایک ایک جلد پیش کی گلاب کے عظیم المجتہ باد
ڈائسن کی میز پر رکھے تھے۔

مدیر رسالہ ایٹج پر بلائے گئے۔ ناظم جلسہ نے مائیکروفون پر یہ بھی اعلان کیا کہ
برطانیہ کی اردو انجمنوں اور دور رسالوں نے خاص طور پر اپنے نمائندے مسٹر ڈی۔
اے چودھری کو لندن سے بھیجا ہے۔ اس اطلاع پر خوب تالیاں بجیں۔ ڈاکٹر منصور
کا شغری نے پہلو بدل کر دوسرا سگریٹ سلگا با۔
لمبی لمبی تقریریں شروع ہوئیں۔

منسٹر کا بھاشن اردو اشعار سے پُرز یو۔ پی گورنمنٹ فرورغ اردو کیلئے جو کچھ کر رہی ہے — (کیا کر رہی ہے؟ مجمع میں بھنبھناہٹ)۔ نگار صاحبہ کی ادبی خدمات وغیرہ کا ذکر۔ انہی کی کتاب انکو پیش کی۔ مصافحہ۔ مصنفہ کی گلبوشی۔ تصویریں۔
تالیاں۔ مزید تقریریں۔

باپ رے۔ اہل ہند کو ابھی تک مرضِ تقریر سے افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ اب تو یہ
مارضہ لا علاج معلوم ہوتا ہے۔

اے میری پیاری نور ماڈریک عرف نرملادیوی عرف نور ماہ خاتم — تم نے
اور میں نے اپنی رنگارنگ اور مختلف النوع مصروفیات سے پُر زندگی میں بہت کچھ دیکھا
اور سنا ہے۔ لیکن اب ایک ایسا واقعہ پیش آیا عجیب و غریب اور BIZARRE جیسے یاد
کر کے مجھ جیسے پُرانے پانی کے روگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے بڑے باپ —
مروم چودھری جو ادلی خان آف دھان پور کہا کرتے تھے بیٹا اللہ تعالیٰ ہر سزا دے
میرا بازار سوانہ کرے —

اب جو واردات ہوئی اس کے مقابلے میں میری اسکیم گویا بچوں کا کھیل تھی جو میں
نے ملتوی بلکہ منسوخ کر دی۔

خصوصی نمبر کے مدیر کی تقریر جاری تھی۔ جب تین نفر نیند ال میں داخل ہوئے۔
یک سوٹ بوٹ میں۔ دورا جتھانی یگڑ۔ مارواڑی انگرکھے دھونی پوش (ایک بوٹھا ایک
زان) ان میں سے ایک نے ایک بڑا سا فوٹو گراف کوئی $2\frac{1}{4} \times 3\frac{1}{2}$ سا سز کا بادامی کاغذ
میں پلٹا اٹھا رکھا تھا۔ وہ تینوں تصویر سمیت اسٹیج کے سامنے پہنچے۔ حاضرین میں
سے کسی نے کہا راجتھانی فوک آرٹسٹ۔ شام کے کلچرل پروگرام میں گائیں گے۔ کسی نے
وآبا سرگوشی کی نہیں کوئی فوٹو گراف مصنفہ کی تصویر پیش کرنے حاضر ہوا ہے۔
وہ تینوں مح تصویر کھٹ کھٹ کرتے اسٹیج پر چڑھ گئے۔ اڈیٹر صاحب نے مائیک

پیر کہا۔ ”خواتین و حضرات — یہ ہمارے مشہور آرٹسٹ — آپ کا اسم گرامی ہے۔“
 ”محمد شرف الدین۔ اور یہ دونوں شہری کنوڑیا اینڈ سن — جے پور، کوٹ پتلون
 والے نے جواب دیا۔ اور تصویر کو میز پر کھڑا کر کے اس کا با دائمی کاغذ اتارا۔ اندر سے وہ
 رنگین پورٹریٹ برآمد ہوا جس کے مختصر کیمپو کا بلاک بعنوان ”ہربائی لنس دی نواب بیگم
 صاحبہ آف پردھان پور“ نگار خانم نمبر میں شائع ہوا تھا۔

بڑی شاندار تصویر تھی۔ ایک حسین مہ جبین بیگم صاحبہ مغلیہ لباس اور زیورات
 میں سچی نمکت سے جلوہ افروز۔ حاضرین جلسہ نے بے ساختہ کلمات تحسین ادا کئے اور اپنے
 اپنے خصوصی نمبر کا وہ ورق کھولا جس میں اس کا کیمپو شائع ہوا تھا۔ سارے شامیائے میں
 ایک ساتھ ورق گردانی کی آواز بلند ہوئی۔

اڈیٹر صاحب نے مائیک پر آ کر کہا ”جناب صدر۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ یہ میرے
 دو معزز راجتھانی دوست ہیں۔ جے پور میں انکے یہاں محترمہ نگار صاحبہ کی گریڈ مدرکی
 یہ تصویر موجود تھی جو چند رنگر کے ایک فرینچ فوٹو گرافر موسیو آندے رینال نے ۱۹۱۱ء میں
 کھینچی تھی بڑا نادر فوٹو گراف ہے اُسے ہمارے متر شہری گوڈو دھن داس رنچھوڑا مل کنوڑیا
 اس مبارک موقع پر مصنفہ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے جے پور سے تشریف لاتے ہیں۔“
 دونوں بہنیں متحیر اور کنفیوزڈ نظر آئیں۔ لیکن نگار خانم نے فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا
 ”میں آپ کی مشکور ہوں۔ ہم کو فوڈ عرصے سے اس کیمپو کے اور کھیل کی تلاش تھی۔ آپ کو علیا حضرت
 دادی جان مرحومہ کے اس پورٹریٹ کی منہہ مانگی قیمت دی جا سکیگی۔“
 ”منہہ مانگی قیمت ہے“ بوڑھے مارواڑی نے آنکھیں پھاڑ کر دہرایا۔ اسکی باجھیں
 کھل گئیں۔

”بیٹھ جی۔ یہ پرانے رسا ہیں۔ آپ تو خود جے پور والے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا۔“
 ختم ہو گئیں مگر ان کے وارثوں کی دریا دلی اور آن بان تو باقی ہے۔ ”مدیر رسالہ
 ارشاد کیا۔“

اب نور ما ڈیر مجھے دو مختلف رد عمل نظر آتے۔ نگار خانم کے دونوں بھائی ڈاکٹر
پر موجود ہتکایت کا کبھی اس تصویر کو دیکھتے کبھی اپنی بہنوں کو اور کبھی تینوں اجنبیوں کو۔
ادھر میرے نزدیک بیٹھی مسز بیگ یعنی ڈاکٹر عنبر بیگ کی والدہ مہوت و سحر اس
پورٹریٹ کو تنکے جا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے سرگوشی میں ڈاکٹر کا شعر پڑھا اور عنبریں کو مخاطب
کیا: "آج میں نے مدتوں بعد کسی اور کی زبان سے آندر سے رینال کا نام سنا ہے۔"

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس اثنا میں اسٹیج پر ہنگامہ بپا ہو چکا تھا۔ ہوا یوں کہ نگار خانم
نے شیریں اور ممنون آواز میں نوجوان مارواڑی سے دریافت کیا "اپکو یہ فوٹو کون کہاں
سے ملا۔؟"

اس نے جواب دیا: "تمہاری دادی نواب بانی جب جے پور میں تھیں تب ہی کھینچا
تھا۔ ٹھا کر مہیشور سنگھ کی گڑھی پہ۔ یہ بہار سے سیکھتے باشی دادا جی کے پاس رکھوا دیا تھا۔
یہ تو ہمیں اس اردو پتھریکا میں چھپی اس کی کاپی سے جان پڑا کہ نواب بانی —
"کون نواب بانی؟ کیسی نواب بانی؟ کیا بکتا ہے پا جی۔ مردود — بد معاش —"
نگار خانم کے بڑے بھائی نے اچانک آگ بگولہ ہو کر مارواڑی کو ایک زوردار جھانپڑ سید
کیا: ظاہر تھا کہ انھوں نے اپنے عزیز بہن کے بارے میں نہ وہ خصوصی نمبر پڑھا تھا نہ اس
میں چھپی تصویر ملاحظہ کی تھی۔ حاضرین جلسہ کو سانپ سونگھ گیا۔ سب دم بخود اسٹیج کو تک
رہے تھے کہ دیکھتے اب غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

جوان مارواڑی تھپڑ کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ بگڑھی سنبھال کر بولا: "اجی بہار سے
کو مارے کیوں چھو۔ چلو نو اس کے اندر چل کر بات کر لو۔ یا کارن تو آتے ہیں جے پور سے۔"
شرف الدین صاحب نے فرمایا: "حضرت یہاں تماشہ نہ بنا سیتے اندر چلتے ہیں۔"

دونوں بھائیوں نے اپنی بہنوں کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اگر وہ حیا دار ہوتیں پٹ
سے گر کر جاں بحق تسلیم ہو جاتیں۔ انکے رنگ فق برقی گم۔ شرف الدین صاحب نے تصویر اٹھائی۔

اسٹیج سے اترے۔ دونوں مارواڑی اترنے لگے۔ تو ایک کاپادوں مائیک کے تاروں سے الجھ گیا۔ منسٹر صاحب بھی اپنے حوالی موائیوں کیساتھ فی الفور پھاٹک کی طرف سرک لے لے۔ مدیر رسالہ نے مائیک پر آکر آواز دی: ”بطلیموس صاحب یفنا ٹوس صاحب اسٹیج پر تشریف لائیں۔“

ایک منخرے سے کیر بیٹرنے جتنا شاید قلبی نام بطلیموس یا یفنا ٹوس تھا فوراً مائیک پر پہنچ کر اناؤنس کیا: ”خواتین و حضرات۔ ایسا لگتا ہے کہ محترمہ نگار خانم کی مقبولیت اور سماجی حیثیت کی وجہ سے انکو بلیک میل کرنا بہت آسان ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس وقت بھی نہایت کمریہ قسم کی افزا پردازی اور بلیک میل کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو جوہ صورت حال میں جلسہ جاری رکھنا ممکن نہیں۔ کل شب مشاعرہ اور پرسوں شام افسانہ پروگرام کے مطابق منعقد کی جائیگی۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ افتتاحی جلسہ برخاست کرنا پڑ رہا ہے۔ آج رات ساڑھے نو بجے کلارکس ادوٹیں پروگرام کے مطابق ڈنر ہوگا وہاں تشریف لائیے۔ شکریہ۔“

اب یفنا ٹوس (یا بطلیموس) صاحب اچیک کر ڈائیں پر آتے اور اناؤنس کیا: ”ڈنر بھی کینسل ہو گیا۔ جگہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر منصور۔ ڈاکٹر منصور کاشغری۔ جہاں ہوں مہربانی فرما کر ایشیا رو الے کمرے میں تشریف لے جائیں۔“

ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوتے۔ آہستہ سے مجھ سے کہا: ”ماجزادہ صاحب۔ میں سمجھتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ اندر تشریف لے چلیں آپ بخوبی فوراً پہچان لیں گے آیا یہ بلیک میل ہے یا اصلیت۔“

منسٹر بیگ چپکے سے بولیں: ”ارے بیٹا مگر تم کو تو پورا قصہ معلوم ہے۔“

ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا: ”بیگم صاحبہ آپ دونوں اب گھر جاتیے۔“

”تو بہ ہے۔ آج یہاں ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ گھر پہ کھانا بھی نہیں پکوا یا۔“ دونوں ماں بیٹیاں اٹھ کر جمع میں کھنکھنیں۔

تہاڑی پرانی کوٹھی کا محض موٹر خانہ اور شاگرد ہمیشہ باقی ہے۔ وہ پابجولان دیوانہ رقص اسبٹرف جاتا نظر آیا۔ شامیانے میں بڑھتیناک سناٹا طاری تھا۔ ڈاکٹر کا شعری اور میں مکان کی سمت روانہ ہوئے۔ کچھ دیر قبل پری محل میں جشن منایا جا رہا تھا اب یہاں موت کی ایسی خاموشی طاری تھی۔ سب بھونچکے۔ حیران پریشان۔ بہت سے زیر لب مہتمم۔ کچھ رنجیدہ اور شرمسار۔ عجیب و غریب منظر تھا۔

ڈاکٹر کا شعری کی قیادت میں گیلری سے گذرتا ایک والٹ ڈزنی کی فیسی نما کسٹ میں داخل ہوا۔ سامنے کی دیوار سے مصنوعی بھرتا گر رہا تھا۔ وسط میں رنگین فوارہ ایک کونے میں مصنوعی درخت پر مکینکل چڑیاں چھپا رہی تھیں۔ میں اس مجنوں ڈانس کورٹول کر اس نئے عجوبے کی سیر میں محو ہو گیا۔ ڈزنی لینڈ غلط کہا۔ یہ تھان متی کا بڑا سا پٹارا تھا جس کے اندر میں نے دفعتاً اپنے آپ کو موجود پایا۔

العجب! پرانے شہری روساء اور قصباتی زمیندار اپنی نفاست اور خوش ذوقی کے لئے مشہور تھے۔ ہم دھان پور والے بہت زیادہ دولت مند تھے لیکن جاپلنگ روڈ پر بڑے آبا کی کوٹھی کس خوش ذوقی کی آئینہ دار تھی۔ مگر ان سابق جاگیر داروں نے تو بیہودہ ٹیسٹ کی حد کر رکھی تھی۔

پہاڑی نما مینٹل پیس پر قبیلہ دادی جان کا کیمپور کھانا نظر آیا۔ سامنے ساٹن بروکیٹ کے صوفوں پر مسٹر شرف الدین، دونوں مارواڑی، صاحبان خانہ اور انکی دونوں مسائل خیر بہنیں فردکش تھیں۔ ہمارے پہنچنے کے بعد دروازے اندر سے بند کر دئے گئے۔ بہنوں نے چونک کر مجھے دیکھا گویا کہتی ہوں ایک نہ شد و شد۔ میں نے برجنگی سے کہا: ”میں لندن میں بیسٹر ہوں۔ اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب مجھے بھی ساتھ لیتے آئے۔ اب بتائے پورا معاملہ۔ آپکو اس طرح یہاں پہنچ کر اس معتزذ خاندان کی بے عزتی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے محسوس کیا کہ نگار و شہوار

نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا جو وہ مجھے سمجھیں تھیں وہ میں نہیں تھا
 ”بے اجتی؟ بالشر صاحب؟“ چھوٹے کنوڑیا نے جواب دیا ”ہم نے کوئی بُری
 بات نہیں کہی۔ بڑے بڑے بادشاہوں مہاراجوں نوابوں نے نرنکیوں سے سیاہ کیئے۔
 اگر سُشری نگار کھانم کے پوجیہ داداجی نے بھی نواب بانی جے پور والی کو اپنی بیعت
 بنایا تھا تو اس میں بے اجتی کیا ہوئی؟ ہم تو ایک اور کام سے آتے تھے اور اسکی چرچا
 پنڈال میں تھوڑا ہی کرتے۔ وہاں تو ہم کیوں یہ پھوٹو پر سنت کرنے آئے تھے۔ وکیل صاحب
 اب آپ بولو۔“

شرف الدین صاحب نے بریف کیس سے دو عدد دفانونی دستاویزیں برآمد کیں۔
 انکو کافی ٹیبل پر پھیلایا۔ میں نے نگاہ ڈالی۔ پرانی جے پور سٹیٹ کے اسٹامپ سپر
 اردو خط شکست میں مرقوم: —

منکہ مسماتہ نواب بیگم جے پور والی، قوم کھنچی۔ عمر جو تینتیس برس۔ بالغ، اقرار کرتی ہوں
 کہ مبلغ — آگے پڑھانہ گیا۔ خط شکست پڑھنا آسان نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ لوگ باہر
 کان لگاتے کھڑے ہیں۔ وکیل صاحب سگار سلگا کر بولے — ”دیکھتے صاحبان۔ سُشری
 گووردھن داس رنجپور مل کنوڑیا اور انکے پتر سُشری جے رام داس کنوڑیا میسر موکل ہیں۔
 انکا کیس مختصر ایہ ہے کہ سُشری گووردھن داس کے والد سورگباشی گردھاری لائن کنوڑیا
 جوہری بازار جے پور کے مہاجن اور نواب بانی چاندپول بازار جے پور کی نامی گائیکہ اور نرنکی
 تھیں جنکالین دین سُشری کنوڑیا سے رہتا تھا۔ نواب بیگم عرف نواب بانی بہت خراج تھیں۔
 اسوجہ سے مقروض رہتی تھیں رام گنج بازار میں ایک جوہلی سنگِ سُرخ کی کاٹھیا واڈ کے کسی
 دربار صاحب نے انکو عنایت کی تھی۔ اس کے علاوہ کثیر زبورات طلائی اور جڑاؤ کی مالک
 تھیں۔ مگر زلفند کی ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ جس زمانے میں وہ ایک تباہ حال جاگیر دار ٹھا کر
 مہیشور سنگھ جی کی ملازم تھیں انہوں نے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں پچاس اور چالیس ہزار
 روپے میں جوہلی رہن رکھی۔ دوسری بار جب وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھیں — شرائط

میں یہ بھی مرقوم تھا کہ مدتِ معینہ کے اندر رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں انکی موت کے بعد اصل مع سود در سود انکے وارثان ادا کریں گے۔

”اس دوسرے اسٹامپ پیپر پر وکیل اور گواہوں کے دستخط کے بعد نواب بیگم نے سیٹھ گردھاری لال سے کہا کہ وہ ان کے فوٹو گراف کو بھی جو ایک یورپین فوٹو گرافرنے کھینچا تھا۔ ساتھ لے جاویں اور اسکے ثنایان شان فریم بنوادیں۔ سیٹھ جی وہ تصویر اپنے ساتھ گھر لے آئے“

”اب بالشر صاحب۔ پن مہاری سنو۔“ بوڑھے مارواڑی نے بات کاٹی۔ ”مہارے باپو جی جو تھے وہ اپنے سارے کالج پتہ اپنی تجوری میں رکھیں تھے۔ وہ دن گھر آکر وہ تجوری کھولنے سے پہلے انکی طبیعت کھراب ہوگئی۔ دونوں اسٹامپ پیپر پھلا والا اور یہ دوسرا والا اکٹھے ایک لفافے میں رکھے تھے۔ سوچا ہوگا ابھی یہ لفافہ پھوٹو کے اندر رکھکا دو۔ بھوجن کر کے آرام سے تہہ کھانے میں جائے پانچے تجوری کھول لینٹری۔“

”تو مہاراسنو۔ انہوں نے پھوٹو گراف کا ٹمپر واری فریم کھول کر کالج اسکی دفنی کے اندر سرکا دینیتے اور کھوکھے واپس جڑ کر چوکے میں جا براجے۔ پیٹ میں اٹھا جو رسکا درد۔ وہیں چٹ پٹ ہوگئے“

”کیا ہوگئے۔“ ”شہوار خانم نے پوچھا۔“

”اجی مرگئے۔ دیہانت ہوگیو۔ بیکنٹھ سدھارے مہارے باپو جی۔ واسے میں انکا اکوٹنا چھو راجھہ مینے کا تھا۔ میرے چاچا مرنی دھرجی نے بیکانیر سے آکر گادی سنبھالی۔ واقوٹو کسی جا کرنے اٹھا لینٹری۔ اور گو دام میں رکھ دینٹری۔ پانچے گھر کے لوگ رورا کے کیا کر میں لگ گئے۔ اب مہارے کو بتاؤ۔ چاچا جی ٹوکچہ نہ جانیں۔ نواب بیگم سے کس پر کار نکا جا کرتے؟“

”داکوڑے چھی؟“ بیٹے نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

”جی۔“ ”میں نے پوچھا۔“

”انکا مطلب ہے وہ تمہیں کہاں۔“ شرف الدین صاحب نے ترجمانی کی۔
 ”ہاں ہاں وہ تھی کہاں راتوں رات اڑ بچھو ہو گئی۔“
 ”کہاں۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”بھگوان جانیں کہاں۔ ادھر مہارے چاچا جی کو جب منیم جی اور وکیل صاحبے
 رہن کی بات معلوم پڑی۔ سارا گھر چھان ڈالا وہ کالج پتھر نہ ملے۔ ملتے کیسے وہ تو فوٹو کے
 پانچھے رکھے تھے اور فوٹو ہماری چاچا جی نے گودام میں ڈال دی تھی۔ گودام کے سامان
 پر وہ کجا کرنا چاہیں تھیں۔ دامیں تلف ڈال کر تالی اپنی موٹی کمر میں لٹکائے پھرتی تھیں۔“
 بوڑھے مارواڑی نے جواب دیا۔ ”ادھر صاحب نواب بانی بھاگ گئی۔ اپنا سامان بیچ
 باج کر شان آیا اور چھو کرمی کو لیکر نو دو گیارہ۔ جو بیلی چھانڑ گئی۔ اسکو بولی نیلام کرا کے رقم
 وصول لیتے پن وہ کالج کہاں تھے؟ انکل نکل باپو جی محافظ کھانے میں جمع نہیں کروا پاتے
 تھے۔ کس برتے پر وارنٹ نکلو اتے؟ مہارے پاس تو ثبوت ہی کونٹری چھا؟ بھاگ
 پھوٹ گئے مہارے۔ ایک لاکھ روپیہ واجمانے کا اور بیاج واکا بیاج۔ سو چوکنٹی
 تنگڑی رقم تھی۔“

”نواب بانی کا کچھ پتہ نہیں چلا؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”صاحب وہ راجو تانہ کونہ آئی۔ ما پھ پھر مایے نواب صاحب آپکی پوجیہ دادی جی
 لوٹ ہی کے نہ آئیں۔“
 ”خاموش مردود۔ اگر کسی گانے والی کو میری دادی جان کہا زبان گڈھی سے کھینچ
 لونگا۔“ نگار کے بڑے بھائی نے پھر بھٹنا کر جواب دیا۔
 ”سرکار گلتی آپ کے دادا جی کی ہے۔ ڈانٹ آپ مجھے رہے ہو۔ پھر یہ کہ جو بندھیگا
 سو موٹی۔ اب کا ہے کا گتہ۔ پرانی بات ہو گئی۔ آخر کو ابھی دادی تھی۔ آپ انکی سننان ہو۔
 انکے نام کا پھاتمہ درود کراتے ہو گے۔“
 بڑے بھیا اٹھکر بوڑھے مارواڑی کی ٹھکانی کرنا چاہتے تھے میں نے اور ڈاکٹر

منصور نے پکڑ کر واپس بٹھایا۔ بڈھا مارواڑی بولتا رہا — ”مہارے کو ستر سال بعد — وکیل صاحب — اب آگے تم بولو —“

”دیکھئے ایسا ہے — شرف الدین صاحب نے دوبارہ بات شروع کی؟“ چندرہ قبل کا ذکر ہے میں راجستھان اردو اکیڈمی کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ تازہ روز محترمہ نگار خاتم صاحبہ کے بارے میں خاص نمبر میگزین پڑا دیکھا۔ اٹھا کر ورق گرداؤ شروع کی۔ میں کنوڑیا اینڈ سنز کا قانونی مشیر ہوں۔ نواب بانی کا فرار اور اسٹامپ بیس کی گمشدگی انکے ہاں ایک فیملی لیجنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان بے چاروں کا المیہ یہ ہے کہ روایتی پونجی پتی مارواڑیوں کے برعکس یہ لوگ خاصے مفلوک الحال ہیں۔ انکے گھرانے کا زوال انکے والد گردھاری لال کے اچانک موت کے بعد ہی شروع ہو گیا۔ انکے چچ

بھی انکو چوٹا لگا گئے۔ بہر حال تو IRONY یہ ہونی کہ آج سے کوئی پندرہ سال قبل جے رام داس جی نے اپنے چچا زاد بھائیوں سے مقدمہ بازی کے بعد وہ کبھی حاصل اور گودام کھولا تو سارا قیمتی سامان تو انکی چچی غائب کر چکی تھیں۔ کاسٹ کباڑ کے علاوہ یہ فوٹو گراف برآمد ہوا۔ فریم اور پھیلی دفنی سفر گل گئی تھی تصویر شیشے اور دوسری دفن کے درمیان محفوظ تھی۔ جب انھوں نے اسے اٹھایا تو بوسیدہ دفنی کھٹ سے گر پڑی اور یہ اسٹامپ بیس برآمد ہوتے نواب بیگم والے جو پیش خدمت ہیں — جب سے یہ لوگ سرگرداں ہیں کہ نواب بانی کے وارثوں کو تلاش کریں۔ انکی جوہلی پر قبضہ مخالفانہ ہو چکا تھا۔ اسیں عرصے سے بندھنی کی چھپائی کا ایک کارخانہ قائم ہے۔ بہر حال تو بے لوگ صبر کر کے بیٹھ رہے — اب جو میں نے ریڈنگ روم میں اس رسالے کے ورژ اٹے تو یہ تصویر مختصر کیس کی صورت میں اس کے اندر موجود مع اس CAPTION کے — ملاحظہ کیجئے — ہر بانی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور — میں فوراً کنوڑیا اینڈ سنز کے ہاں جوہری بازار پہنچا —“

”وکیل صاحب بھائے ہوتے آتے بولے سیٹھ جی جیت لی پالی — نواب بانی“

گئیں۔۔۔ اجی وکیل صاحب کیسے مل گئیں۔ ۱۹۱۲ء میں پچیس سال کی تھیں تو یا ایک سو چار سالہ بڑھیا کوڑے چھٹی تھی؟ انہوں نے پتربیکا دکھلائی۔ بولے یا جو یہاں سے بھاگی سو اس نے سی۔ پنی کی کسی ریاست پر دھان پور کے نواب سے بیاہ کر لیا۔ نواب یا بات صاچھ ہو گئی۔ نواب سے بیاہ رچانے کے بعد پردے میں بیٹھ گئی ہوگی ہر بانی نس بیگم صاحبہ بن کے۔ اب واکو تو کیسے چلے پھر مر گئی ہوگی۔ اس پتربیکا سے جان پڑا کہ اس کی پوتی۔۔۔ ماچھ کرنا۔۔۔ انکی پوتی مہان لیکھکا ہیں۔ وچتر اپنیاس لکھتی ہیں۔ پھلاں پھلان دیوس کو لکھنو میں انکے پچاسویں اپنیاس کا اود گھاٹن ہونے جا رہا ہے۔ انکے بھائی بڑے بھاری پونجی تپتی ہیں۔ وکیل صاحب بولے۔۔۔ چلو سیٹھ جی یہ پھوٹو پھر ہم کر واکے لکھنولے چلیں۔ انکو پربھنٹ کرینگے۔ ایک ہتجار روپیہ ہم نے لگایا۔ نیا پھر ہم۔ جے پور سے لکھنولے کا بھارا۔ یہاں ہوٹل کا کھر جاسوا لگ۔ اب آپ انصاچھ کر و۔ آپ سب شریمان جی کمار جی۔ ۱۹۱۲ء سے لیکر آج تک آپکی دادی جی کے کارن ہم گھاٹے ہی گھاٹے میں رہے ہیں کہ نہیں؟ پھر آج سب کے سامنے مار بھی کھائی۔ قصور تھار و دادی جی کا چھو کہ ہمار و؟“

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ منصور بھی مسکرا ہٹ ضبط کر کے مصنوعی چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دونوں بھائی غصے سے لال پیلے بیٹھے کھولا کیے۔

”نواب آپ کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

مسٹر شرف الدین بولے۔۔۔ ”صاحب آپ لندن میں بار پریکٹس کرتے ہیں میں زیر لب مسکرایا۔ منصور نے بھی سراٹھا کر ہتھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اب یہ اچھا خاصہ FARCE ہو رہا تھا، میں ٹھیرا محض جے پور کا ایڈوکیٹ۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہونگے کہ اس معاملے کے قانونی پہلو کے علاوہ ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔“

”نواب بانی کا اخلاقیات سے کیا تعلق تھا۔۔۔“ میں نے سوال کیا۔

”نواب بانی کے پوتے پوتیوں کا تو ہے۔ اصل رقم مح سود در سود ستر سال میں کتنی بنتی ہے؟ وہ کھپو ٹرتا دلیگا۔ مگر اخلاقی طور پر۔“

اب دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے بھائی نے پتے کی طرح لرزتے ہوئے گرج کر کہا۔ ”آپ سب کان کھول کر سن لیجئے۔ یہ سارا قصہ جو رسالے میں چھپا ہے شروع سے اخیر تک سراسر سفید جھوٹ اور میری مجبوظ الحواس بہنوں کے خالتو زرخیز تخیل کی پیداوار کیو اس ہے غور سے سن لیجئے۔ ہم کسی نواب پردھان پور کی اولاد نہیں ہیں۔ اس نام کی کوئی ریاست موجود نہیں تھی۔ نہ کسی نواب بانی نے کسی نواب پردھان پور سے شادی کی تھی۔ یا اگر کوئی پردھان پور ہندوستان کے نقشے پر موجود تھا یا ہے تو ہم اس سے واقف نہیں۔ ہم معمولی مدل کلاس شریف لوگ بھانسی سے یہاں آئے۔ بزنس شروع کی اس میں فائدہ ہوا۔ ہماری عزیز بہنوں کو اسٹوکرٹ کہلانے کا شوق چرایا۔ نام کیساتھ صاحبزادی لکھنا شروع کیا۔ یہاں اونچے طبقے کے نئے حلقہ احباب میں مشہور کیا کہ ہم بڑے زمیندار تھے۔ جاگیروں کی ضبطی کے بعد یہاں آگئے۔ میں خاموش رہا رئیس زادی بنا چاہتی ہیں۔ اونچے طبقہ داروں اور سابق تعلقداروں کے اس سوشل فریم ورک میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ اگر وہ اس فرضی جاگیر داری کے پس منظر کو مبہم رکھتیں تو خیریت رہتی۔ ہم تینوں بھائی اپنی بزنس میں حد سے زیادہ مصروف۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان گدھیوں نے کیا کچھ ہی رکائی۔ خیالی پلاؤم کتے۔ خاص نمبر پھینے لگا تو کیا ہوائی قلعے بنائے۔ کیوں ری شہوار۔ شیخ چلی کی بچی۔ یہ تصویر کہاں سے آئی؟ اس کا یہ قصہ کیوں گھڑا؟ ایک جھانپڑونگا۔ طبیعت صاف ہو جائیگی ساری دنیا کے سامنے میرے چہرے پہ کالک پوت دی۔“

شہوار تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گلا خشک۔ رنگ فق۔ بولی ”بھیا میں اور جیسا پھیلے دونوں ڈیکوریشن کیلئے CURIOS خریدنے نخاس گئے تھے۔ یہ کمیونٹری بڑا سوراہے

۴۴۳

میں خرید لیا۔ اس کے پیچھے صرف ”نواب بیگم لکھا تھا۔ تفریحاً اسے“ ہربانی ٹیس دی
نواب بیگم —

”پر دھان پور کیسے خیال شریف میں آیا؟“

”ڈاکٹر منصور نے کسی صاحبزادہ دلنشا علی اف دھان پور کا تذکرہ کیا تھا۔“

”جنگلو آپ نے اپنا کزن ظاہر کیا۔“ شہوار نے چونک کر مجھے دیکھا مزید سٹی گم۔

ڈراکنٹ سے کہا ”بس میں نے دھان پور کے وزن پہ پر دھان پور — ایجاد کر لیا۔

ON THE SPUR OF THE MOMENT رسالے والے آتے تو انٹرویو میں بالکل

سی پی کے جنگلوں میں چھپا پر دھان پور بلیس۔“

”کیوں —؟ بڑے بھیا دہاڑے۔“

میں نے سوچا بدھیبہ پریش ہندوستان JUST FOR THE HECK OF IT

کا سب سے بڑا صوبہ ہے گھنے جنگلوں سے بڑی آزادی سے قبل وہاں ٹیکرڈوں پھوٹی

پھوٹی ریاستیں جو اڑے تھے کون تحقیق کرنے جائیگا۔ علاوہ ازیں —

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ گویا کٹہرے میں کھڑی ملزمہ کا بیان جاری رہا۔

”علاوہ ازیں میں نے سوچا نچاس میں یہ تصویر کیسے آئی ہوگی کم از کم دو تلو سال پُر آتی کسی

مغل شہزادی کی مجھے کیا پتہ تھا کہ نواب بیگم اتنی RECENT تھیں اور طوائف تھیں۔ میں

تو اُسے ایک فرضی کمیو سمجھی تھی۔ بلکہ میں نے دوکاندار سے پوچھا بھی کس کی تصویر ہے۔

بولا معلوم نہیں۔ پرانے زمانے کی کسی بیگم کی ہے۔“

”اے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام —“ میں نے کہا۔

اب ڈاکٹر منصور کی بازی تھی۔ انہوں نے شہوار کو مخاطب کیا ”سب سے پہلے

جب میں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی تو آپ نے

بڑی بے پروائی سے کہا — آئی کہاں سے ہماری دادی جان کی تصویر ہے۔“

”وہ بھی میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا اس کا مقدمہ کھڑا ہو جائیگا۔“
 ”جتنی بے عزتی اور بدنامی ہوتی تھی وہ تو ہو گئی۔ کل یہ خبر سارے اخباروں میں ہو
 گی خاص طور پر اردو اخباروں میں۔ مع ان مارواڑی حضرات کے سو در سو دے کھڑے
 کے۔ العظمتہ اللہ۔۔۔“ بڑے بھیانے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔

”اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے“ چھوٹے بھائی نے (جو اب تک سر نہوڑائے فرش
 کوتاک رہا تھا) دریافت کیا۔ ”اگر تم پریس میں یہ بیان دیتے ہیں کہ سارا قصہ جھوٹا ہے
 یہ لوگ ہمیں بلیک میل کرنے آئے تھے۔۔۔“

”رام دہائی۔۔۔ رام دہائی۔۔۔ ہم بلیک میل۔۔۔ ہاؤس ہم انصاف مانگتے
 آئے تھے۔ بوڑھے مارواڑی نے لجاجت سے ہاتھ جوڑ کر احتجاج کیا۔

چھوٹے بھیانے بات جاری رکھی۔۔۔ ”تو یہ معاملہ اتنا شفاف ہے اور
 فول پروف کہ اسے کوئی جھوٹ مانے گا نہیں۔ اور ایک بار نواب بانی کی کہانی عام ہوئی
 تو جس طرح یہ سیٹھ صاحبان انکے واقف نکل آئے۔ اسی طرح چند اور بڑھے ٹھڈے
 نواب ٹایپ لوگ ریٹائرڈ عیاش تماشین یا سنگیت کے ریا اپنی اپنی عمر رفتہ کو آواز دیئے
 اخباروں میں انکے خط چھپیں گے۔۔۔ فلاں سنہ میں۔۔۔ فلاں مجرے میں نواب بیگم
 سے قدریساگی ایک ٹھمری جیسی سُنی تھی پھر کبھی نہ سُنی۔۔۔ چنانچہ ایک بیک گراؤنڈ
 حاصل کرنے کے چکر میں میری خواہران عزیز نے ہم نجیب الطریفین لوگوں کو دلالتاً
 بنا دیا۔ شاباش۔۔۔ جس لیڈی ڈاکٹر سے میں شادی کرنا چاہتا تھا میری بہنیں اسکا
 کچھنی کی جینی کہتی تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں طوائف زادی بن گئیں۔“

دریچے کے باہر ایک سایہ سا ڈولا۔ ایک آدمی شیشے سے ناک چپکائے جھانک
 رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ شکل صاف نظر نہیں آرہی تھی۔
 ڈاکٹر منصور نے قہقہہ لگایا اور بے رحم آواز میں بولے:
 ”گمنام نواب کا۔۔۔ سٹیج کے دنگ میں داخلہ!“

”یہ کون صاحب؟ اللہ رحم کرے۔“ بڑے بھائی نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔
 ”آپکی باجی جان نے،“ ڈاکٹر جو شبلی غضبناک آواز میں گرجا۔ ”انکانا درموزی
 کتب خانہ۔ کوڑیوں کے مول خریدا۔ انکا واقعہ بھی سنیے گا؟“ اٹھ کر کمرے کا ایک چکر
 کاٹا۔ مصنوعی پرندوں کی چہکار کا سوچ بند کر کے فوارے کے قریب گیا۔ پلٹ کر بولا۔
 ”صاحبان۔ پچھلے سال کا ماجرا ہے۔ ایک ثقہ، افلاس زدہ غیور بزرگ
 سے بیل گارڈ کے باغ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بھی ہم سب کی طرح
 زندگی کے تھیسٹر کا دلدادہ ہے۔ اسوقت وہ خود ایسٹج کے سنٹر میں موجود تھا اور ایک
 FIGURE OF TRAGEDY کو متعارف کر رہا تھا۔ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے
 ہیں۔ غیرت کی وجہ سے اپنا نام پتہ نہیں بتلایا۔ گذشتہ لکھنؤ کے بارے میں عالمانہ
 گفتگو کیا کیے۔ پھر اپنی راہ لی۔“
 ڈاکٹر اب بید مضطرب تھا۔ مجھ سے پوچھا۔ ”وہ کیا ہے یا دہے آپکو آمنت باللہ
 — وہ اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لانے والی بات۔؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اپنے اضطرابی کیفیت کی وجہ سے کاشغری کو یاد نہ رہا تھا
 کہ دین اسلام سے متعلق یہ سوال مجھ سے نہ کرنا چاہیے۔
 کیونکہ میں اسوقت ”چودھری دھیان سنگھ“ تھا

اسے دفعتاً دھیان آگیا۔ بولا: ”سوری۔ بہر حال۔ کہنے کے مطلب یہ کہ میں
 انسانوں کی اچھی اور بُری تقدیر کا قائل ہو چکا ہوں۔ کس طرح۔؟ سماعت فرمائیے
 اس روز سیاسی اور ادبی بحث مباحثے کی رو میں میں نے نواب صاحب کو اپنا نام محض
 مرزا منصور احمد بتایا۔ ڈاکٹر ٹیگ بھی میرے ساتھ موجود تھیں۔ لیکن اس بد قسمت شخص کو
 یہ نہ معلوم ہو سکا کہ دو ڈاکٹروں سے ہم کلام ہیں۔ ورنہ یقیناً اپنے لڑکے کی علالت کا ذکر
 کرتے اور ہم لوگ فوراً اسے اپنے نرسنگ ہوم لجاتے۔“

”بیلی گارڈ کی اس ملاقات کے بعد اگلے ہفتے ہی وہ آپکے دولت کدے پر تشریف لائے
 ”میں بھی اس وقت یہاں پہنچا تھا۔ آپکے دربان نے اندر آکر اطلاع دی کہ وہ
 کتابوں والے بڑے میاں آئے بیٹھے ہیں۔ انکا لڑکا بہت بیمار ہے کچھ پیسے چاہئیں۔ میں
 نے پوچھا کون ہے؟ انسان دوست ناولسٹ ننگار خانم نے فرمایا ایک جلد ساز ہے۔
 قدیم مخطوطات کی جلد بندی اس سے کروائی ہے۔ میں فوراً اٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا کہ
 لڑکا اگر زیادہ بیمار ہے مآشا میں اسکے مفت علاج معالجے کا بندوبست کر دوں۔ ننگار باجی
 نے زبردستی روک لیا۔“
 ”کیا یہ بھی امر تقدیری تھا؟ ننگار خانم کی ممانعت کے باوجود آپ باسانی یہ چند رقم
 کا فاصلہ طے کر کے برساتی تک پہنچ سکتے تھے۔“ میں نے کہا۔

منصور کا شغری نے اپنا بیان جاری رکھا ”ابھی گذشتہ منگل میں کسی کام سے بلرا پڑ
 ہسپتال گیا۔ وہاں پھانک پر نواب صاحب مل گئے۔ جن ویاس کی تصویر زبان لنگ۔
 چند سکند تک مجھے دیکھا کئے پھر پہچان کر بولے ”مرزا صاحب میرے جوان بیٹے کا انتقال
 ہو گیا۔ اسکے بیڈ کے آگے اسکرین لگا دی گئی ہے۔ صبح سے میں تجھیز و تکفین کے انتظام
 کے لئے سرگرداں ہوں تب انھوں نے سارا قصہ سنایا۔ والد کی عیاشی کی بدولت انکا
 گھر تباہ ہو چکا۔ شیعے کی رقم گھٹتے گھٹتے قلیل رہ گئی۔ اکلوتا لڑکا آوارہ نکل گیا تھا۔ سکھڑیٹیاں
 چکن کاڑھ کر گھر چلا رہی تھیں۔ کسی ذریعے سے انکو پتہ چلا کہ ننگار خانم قیمتی کتابیں خرید رہی
 ہیں۔ بشتینی کتب خانہ ابھی انکے پاس موجود تھا۔ لیکن اب نواب صاحب کو لڑکیوں کے بیاہ
 کرنے تھے۔ تاریخیں طے ہو چکی تھیں۔ لیکن پیسہ — پیسہ کہاں تھا؟ چنانچہ ان پیش بہا
 کتابوں کو دو گٹھڑوں میں باندھ کر اس عشر تکدے پر پہنچے۔ انھوں نے جو چند قلمی نسخوں کے
 نام بتائے میں دنگ رہ گیا۔ ایک ایک نسخہ حاصل کرنے کے لئے برٹش میوزیم یا امریکہ
 والے پاؤنڈز اور ڈالرز کے دریا بہا دیتے۔ ننگار خانم نے پورا اثناک صرف دس ہزار روپے
 میں اسطرچ خرید لیا۔ نواب صاحب پرا حسان کرتی ہوں۔“

”مزید سنیں۔ اس قسمت کے پیٹے انسان کے لکھے ہوئے سارے تنقیدی مضامین بھی انہی پلندوں میں چلے گئے ہماری نگار باجی اب انہیں اپنے نام سے چھپوا رہی ہیں۔“
”لڑکیوں کو رخصت کرنے کے بعد نواب صاحب پھر کھکھہ ہو گئے۔ لڑکا بیمار پڑا۔
ڈاکٹروں نے کہا اسکی کڈنی بدلوائیے۔“

”کڈنی کیا — گروہ —؟“ نگار خانم کے سوالات لاجواب ہوتے ہیں۔

”جی۔“

”اب مجھے کیا معلوم کسے گروہ بدلوانا ہے کسے کلیجی۔ وہ بڑے میاں تو جب بھی آئے
میں نے ہمیشہ تو پچاس —“

”جی۔ ان جیسا خود دار آدمی بیٹے کی بیماری سے مجبور ہو کر بار بار یہاں آیا کہ وہ ذخیرہ
ایک حاجتمند سے اپنے اتنا سستا خریدا اب کچھ اور رقم بطور قیمت ہی عنایت کریں۔ یا کم
از کم لڑکے کے علاج کا انتظام کروادیں۔ جب کہ آپ کے ہاں ایک ڈنر پارٹی پر ایک
شام میں ہزاروں روپیہ —“

”لو صاحب یہ تو کمیونسٹوں والی تقریر کرنے لگے۔ ہماری ڈنر پارٹیوں میں تو آپ
بھی شامل ہوتے ہیں آپ کون سی پارٹی میں ہیں۔ سی۔ پی۔ ایم یا سی۔ پی۔ آئی۔؟“
نگار خانم نے منہس کر درباغت کیا۔
”خاموش۔“ بڑے بھیّا گرے۔

”نواب صاحب نے یہ بھی بتلایا کہ آپ نے انکو خبردار کر رکھا ہے۔ موروثی تخت خانے
کے اس لین دین کا راز افشا کیا نہیں اور یہ تو پچاس بھی القظ —“
خاموشی۔

یکلخت نگار خانم کی رعوت واپس آگئی۔ انہوں نے پانی پیتے ہوئے کہا ”دیکھتے
جناب۔ آپ کا خیال ہے یہ سب ٹپو نیچے مل کر مجھے پرسیکیوٹ کریں گے یا بلیک میل۔
— تو آپ غلطی پر ہیں۔“

۴۴۸

”اب چونکہ نواب جان منظر عام پہ آچکی ہیں یہ نواب صاحب بھی کسی اردو اخبار میں محض ایک خط چھپوا سکتے ہیں ان تنقیدی مضامین کے متعلق — اور کتب خانہ تو ظاہر ہے انکا بھی ٹرمپ کارڈ — اگر وہ چاہیں —“ میں نے کہا ”ٹرمپ کارڈ پر دونوں بہنیں تقریباً اچھل پڑیں۔ پھر نگار خانم نے تو اس مجمع کر کے بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔

”بھئی مجھے بھی بولنے دو۔ یہ ساری اسکیم سوچی سمجھی میرے دشمنوں کی ہے۔ وہ RIVAL ناولسٹ فرح خانم —“

”فرح خانم تو دراصل مرد ہے۔“ چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ — ”اسکا اصل نام لکھی رام پوٹڑہ ہے۔“

”جیسی تو — اسکی بزنس چوہٹ ہو گئی میرے ناول گرم کیک کی طرح بک رہے ہیں۔“

”مگر فرح خانم تو جاسوسی لکھتا ہے۔ تم رومانی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کوئی فرق نہیں البتہ — کوئی فرق نہیں البتہ —“ دریکچے کے باہر سے آواز آئی وہ گناہ نواب صاحب نہیں تھے۔ کلا دنت دیوانہ تھا جو بیڑیوں سمیت شاگرد پیشے سے نکل بھاگا تھا۔ کیونکہ بار بار انہیں گھنگر وکی طرح بجا رہا تھا گویا اپنی کمنٹری شروع کر چکا تھا۔

”سردست لکھی رام پوٹڑہ ہمارا مسئلہ نہیں — سوال یہ ہے کہ اب بیلک کو کیا منہ دکھائیں۔ اگر نواب بائی کی کہانی کی تردید نہیں کرتے تو اپنی نجابت اپنے ہاتھوں برباد کی کینچی کی اولاد کہلائے۔ بروز حشر اپنے بزرگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔“

”اماں روز حشر تو دور کی بات ہے۔ تم اپنے بزرگوں کو سردست کیا منہ دکھا رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گلابی ہو گئی ہیں۔ سر پر نوکیلے کان اُگ آئے ہیں۔ اور چہروں پر تھوٹھنیاں اور پیچھے مڑی ہوئی دُمیں۔ یہ آئینہ دیکھو —“ سبز پوش

نے زور سے کھڑکی کا پٹ کھول دیا جس کے پلیٹ گلاس میں کمرے کا منظر منعکس ہو گیا۔ اس نے اس ہولناک انداز میں یہ بات کہی کہ گو اس نے مجھے مخاطب نہ کیا تھا۔ گھر آکر غیر ارادی طور پر میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ خیر نور ماتم تو ہمیشہ ہی پیار سے مجھے ”سُور“ پکارتی ہو۔

میں اٹھ کر دریچے میں گیا۔ وہ نیچے گملوں میں کھڑا بڑی معصوم سی ہنسی منہں رہا تھا۔ اس وقت وہ بالکل نارمل تھا۔ بشرے سے نہایت صحیح الدماغ دکھلائی پڑتا تھا۔ اپنے غیض و غضب پر تاپا چکا تھا۔ اور ٹیکسپر کے PUCK کی طرح کمرے کے اندرونی منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اچک کر دریچے کے اندر سر ڈالنا ننگار کے بھائیوں کی جانب اشارہ کر کے ایک انگلش نرسری رائیم پچوں کے انداز میں سنانے لگا

THESE LITTLE PIGS WENT TO MARKET

THIS LITTLE PIG STAYED HOME — بھیر اپنی طرف اشارہ

THIS LITTLE PIG HAD ROAST BEEF,

THIS LITTLE PIG HAD NONE
AND THIS LITTLE PIG CRIED

WEE-WEE-WEE-WEE-WEE
I CAN'T FIND MY WAY HOME

سر باہر کر لیا۔

میں اپنی کرسی پر واپس آیا۔

بوڑھے مارواڑتی نے آہستہ سے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ ”رام بھو — رام بھو

— یا ماملو بڑے جبر معلو دنیڑے۔ بیٹا یا گھر تو نہانے اندر جاں ساما لوم پڑے۔ یا پاگل

یا میں سے نکل بھاگا چھے —“

تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی بہن بھائی نے اٹھ کر نہ کھڑکی بند کی نہ اسے دوبارہ پکڑنے کے لئے آدمی بلائے۔ ایسا لگتا تھا کہ شام کے ان تابڑ توڑ سانحات سے انکے ہاتھ

پاؤں پھول گئے تھے۔

پاگل کو نظر انداز کر کے چند منٹ کے سکوت کے بعد بڑے بھائی نے پھر اپنی درناک گفتگو کا آغاز کیا۔ ”اور اگر ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ریاست پر دھان پور من گھڑت ہے تو غور فرمائیے ہم لوگ کس قدر بُترے، واہیات اور ناقابل اعتبار معلوم ہونگے۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے حصول دولت کے بعد اپنے لئے ایک فرضی نوابی ایجاد کی فرضی تصویریں چھپوائیں۔ ایک فرضی پولیس۔“

”اور رونی کتب خانہ۔“ ڈاکٹر منصور نے لقمہ دیا۔

دونوں بھائیوں نے سر جھکا لیا۔ بہنوں نے شعلہ بارنگا ہوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ اگر ان شعلوں میں اثر ہوتا ڈاکٹر وہیں بھسم ہو جاتا۔

میں نے تپائی پہ رکھا میوزیکل سگریٹ باکس کھولا۔

AULD LANG SYNE

کی دُھن بجنے لگی۔ باہر کھڑے ”دیوانے“ نے فوراً بڑی دلدوز آواز میں دُھن کے ساتھ

SHOULD AULD ACQUAINTANCE BE

FORGOT AND NEVER BROUGHT TO MIND

الاپنا شروع کر دیا۔ میں نے سگریٹ باکس کا پٹ بند کیا۔ ادھر جھٹ سے وہ بھی خاموش۔ کھٹک بھرت ناٹیم۔ لچکا گانا۔ اسکاٹش گیت۔ کیا صاحب کمال شخص تھا۔

نگار خانم کا چھوٹا بھائی پھٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بابی سوچ کر کل تک جواب دیجئے پریس کو کیا بتلایا جاتے؟ آپ نواب بائی کی پوتی ہیں یا پردھان پور پولیس ہوائی قلعہ تھا؟“

”پھنس گئے۔ خود ہی چوہے دان بنایا اسمیں گئے پھنس بیٹا۔ پراسرار سبز پوش

نے نعرہ لگایا اور باغ کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دور سے اسکا

دوسرا نعرہ سنائی دیا۔ تن من دھن سب راکھ بھینو

لگ گئی آگ بھنچو ر میں

”راکھ بھینو“ اس نے اس جگر پاش انداز میں کھینچا کہ میں نے اپنے منہ اور حلق میں

یت سی بھرتی محسوس کی۔ راکھ اور ریت راکھ اور ریت — میں نے سر جھٹک کر چاروں
رت دیکھا۔ آبتار والا کمرہ اسپرٹ جگمگا رہا تھا۔ ایک طرف دار مہری اس بائچکن اور ٹھٹے
سے کافی کی ٹرائی دھکیلتی اندر آرہی تھی گویا کنگ نصیر الدین حیدر والی دھنیا مہری کی
بانشین وہی ہو۔ اہل ثروت کی زندگیوں کے تمام نشیب و فراز سے واقف۔

دوسری صبح اخباروں میں تو کچھ نہ نکلا۔ بطلموس وغیرہ صاحبان نے اس کا انتظام
رہا ہوگا۔ مگر خصوصی نمبر والے انبار کا مخالف روزنامہ اس اسکیمنڈل کو لے اڑا۔ سارے
شہر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ آبتار والے کمرے کی مینٹنگ کی اطلاع بھی باہر پہنچ گئی
ہے۔ اب پچھلے چند روز ”گنڈہ تصویر کاراز“ کے عنوان سے انگریزی اردو اور ہندی
پریس میں جتہ جتہ چھپنا شروع ہو گیا ہے۔ گو خاندان کا نام دینے سے احتراز کیا گیا ہے۔
یہ مقتدر لوگ ہیں۔ بڑے بھائی نیتاگیری بھی کر رہے ہیں۔ اس خبر سے انکی نیتاگیری کو سخت
دھکا پہنچ سکتا ہے۔

چنانچہ پیاری نور ماہ خانم میں نے پلان ملتوی کر دیا۔ میرے اندر بھی کوئی خوابیدہ
برائی خاندانی شرافت نجابت وغیرہ جاگ اٹھی۔ سوچا یہ دونوں بھائی اس قدر شرمندہ
اور پریشان ہیں۔ آگ پرتیل چھڑکنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس شام جب انکے اطاق آبتار سے ہوٹل لوٹا رات کو خواب میں دیکھتا ہوں نگار
خانم کے بڑے بھیا کہہ رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب مجھ سے پچاس ہزار پاؤنڈ بھی لے
لیجئے ہیں آپکی ایک کورٹ، سروس کا ڈائریکٹ بھی بنا جانا ہوں۔ آپکے اور نور ماڈریک کیلئے
ایک پرائیویٹ یاٹ بھی خرید دوں گا۔ بطور جہیز باجی کے جسے کاروپہ ایک سوئس بینک میں
منتقل کر دوں گا۔ بس آپ اتنا کیجئے ان سے عقد فرما کر اپنے ہمراہ لے جائیے آپ سے انکی
سی التجا ہے۔ وہ اس مارواڑی بڈھے کی طرح ہاتھ جوڑے ایک ٹانگ پر میرے سامنے
کھڑے تھے۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔

آج یہ خط بالآخر پوسٹ کرنے والا تھا کہ نور من کا کارڈ ملا۔ اس نے صورت حال کو

بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "تم کو بھی علم ہو چکا ہوگا کہ وہ اور پری بیگم یہ بہتر ترین دوستوں کے" ایک دوسروں سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ پری بیگم ایک سویڈش دوست کے PAD میں منتقل ہو چکی ہیں۔ لہذا وہ پچاس ہزار پاؤنڈ کی اسکیم عت ربود پر اخلاقیات والے لوگ حصول زر کیلئے جدید ترین غیر اخلاقی تکنیک استعمال کرتے ہیں مجھے تفصیلات معلوم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ مساجد بھی تعمیر کر رہے ہیں اور سیاسی لیڈر بھی ہیں۔ یعنی جہاں سوئم کے اعلیٰ کرپشن کی کلاسیکل تصویر اور انکی طرح ان گنت ہندو مسلمان اس ملک میں پھیل پھول رہے ہیں۔ انکے معاملات کے مقابلے میں میری کارڈ شارپنگ اور دھوکہ دہی تو بچوں کا کھیل ہے۔

ہاں تو حصول زر کیلئے غیر اخلاقی کارروائیاں جائز سمجھتے ہیں مگر اپنی خواتین سلسلے میں قدامت پسند ہیں۔ پری بیگم کو ایک امریکن اسکول میں پڑھایا مگر اس کے مؤثر زحیات سے انکو شدید صدمہ پہنچ گیا۔

یہ لوگ نگار شہوار حماقت کی وجہ سے ایک پیوز ہو گئے محض سوشل سطح پر گوسپ کی حد تک۔ انکی ایمپائر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ بائی فائی نینس ان باتوں سے ماورا ہے۔

انکے اس واقعے کو تم ایک قسم کی جدید اخلاقی حکایت سمجھو یعنی MODERN PARABLE جس طرح میں اپنے نیک نہاد خاندان میں ایک کالی بھیڑ نکل گیا۔ اور نصیب آموز ثابت ہوا۔

پری خانم کے متعلق ابھی یہ لاعلم ہیں اور جب جانیں گے تو انکے سامنے بھی سوال کھڑا ہوگا کہ لڑکیوں کو کس حد تک آزادی دینی چاہیے مشرق و مغرب کا این کاؤ تو ہمارے ہاں دو سو سال سے جاری ہے اس میں اب مغرب کو کس حد تک غا آنے دیا جاتے بہت ممکن ہے شہوار اور پری بیگم کے واقعات کے شدید رد عمل کے پر یہ تینوں بھائی اسلامی بنیاد پرست بن جائیں۔ وارٹھیاں رکھ لیں اور تبلیغی جماع

شامل ہو جائیں EXTREME SITUATIONS کے رد عمل اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ بڑی بیگم ہندوستان کے نئے دو متحدہ طبقے کے نوجوانوں کی ”ڈسکو کلچر“ پر درود تھی۔ لندن پہنچ کر اگر وہ PERMISSIVE سوسائٹی میں شامل ہو گئی تو اسے کیوں بورڈا ٹھہرایا جاتے؟ اخلاقیات کی اقدار ہر عہد اور ہر طبقے کی اور فرداً فرداً مختلف تی جاتی ہیں۔ تمہارے پاپا نے تمہنوں کو آرام دہ زندگی اور دولت کی خاطر سٹی بی بنانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا حالانکہ تم بتاتی ہو کہ عادی مجرم نہیں تھے۔ پابندی بے جرح بھی جاتے تھے۔

اب میں بھی اپنے بنائے ہوئے ایک چوہے دان میں پھنس گیا ہوں۔ جیسے وہ پاگل رات بنکار رہا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ نگار خان تمہارے اس دیرینہ خادم کی گرویدہ ہو چکی۔ آتش آواز دالے کمرے میں انکشافات کی اس خوفناک رات وہ بھی تاڑ گئیں تھیں کہ وہ وہی شخص ہے جس نے انکو وہ ایک قسم کا محبت نامہ ارسال کیا تھا۔ دراصل یہاں ہر کچھلے چند روز میں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس بے چاری خنک مزاج عورت سے ایک کسی خدا کے بندے نے فلرٹ تک نہیں کیا۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے انکو یہ احساس دیا کہ انہیں بھی پسند کیا جاسکتا ہے۔ نہایت مشتبہ قسم کی ادبی حیثیت۔ بے نجاشا ست۔ معمولی شکل و صورت۔ خوشامدیوں کا ہجوم۔ جو سب انکو بیوقوف بنانا چاہتے ہیں اور جانتی ہیں کہ لوگ انکو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ سب ایک سے ایک چوٹ قسم کے بطلیموس آؤس ٹائپ لوگ۔ نواب بیگم کے غیر متوقع DISASTER سے پہلے تک بھائیوں کو اطمینان ناول نویسی کے بے ضرر مشغلے میں مصروف ہیں۔ ورنہ ہوشل ورک یا نینٹا گیری شروع۔ اور انکے لئے شاید کچھ پراہم مزید کرتیں۔

چنانچہ خاکسار جیسا کھر فل شخص کلا رگ گیل کا ہم شکل، لندن سے وارد ہوتا ہے۔ بلیک کی ایک اسکیم جیب میں ڈالے۔ ساتھ ہی بڑی شائستگی کیساتھ ان سے فلرٹ بھی کرتا ہے

اور وہ اپنے راہوار نخیل کو جو اب تک اصطلیل میں کھڑا گھاس کھا رہا تھا سرپٹ دوڑا دیسی پیر
اب وہ طرح طرح سے چارہ ڈال رہی ہیں۔ کلارکس اودھ میں اب تک انکا ہمان ہوا
کل کہہ رہی تھیں۔ ایک سوئس بینک میں انکے بھائی انکے نمبر کا گنام اکا ونٹ کھول چکے ہیں۔
عبرت کجا ست و بختزب درائے جزمین گرتیر۔ پس چہ باید کردا توام اناث۔ یعنی وہ ایک
جرائم پیشہ سے بھی شادی کرنے کیلئے تیار ہیں۔ (اس میں یہ روماننگ نصب العین بھی مضممت
کہ بطور نیک پردین ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے کی اصلاح کرینگے)۔
تم کو پکا یقین دلادوں میرا قطعی کوئی ارادہ نگار خانم سے مناکحت کا نہیں ہے۔
اور تم اپنی چپٹیں سالہ برس پانز شپ میں اس نوع کے متعذر مراحل سے گزر چکے ہیں اور سب
نفع میں رہے۔

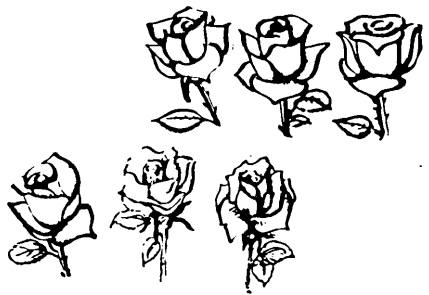
تمہارا دلشاد

پس نوشت

شہوار خانم SULK کر رہی ہیں کیونکہ ڈاکٹر منصور ڈاکٹر عنبر کی طرف پھرتوجہ ہو گئے۔ کل بتلارہ
تھے عنبر آجکل شدید ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ جو ایک قسم کی نفسیاتی بیماری ہے۔ کل انکی عیادت
کیلئے جاؤنگا میں جلد واپس آنے والا ہوں۔ ۱۹۸۳ء کا لکھنؤ کافی دیکھ لیا۔ شہر نگار — ہا ہا ہا
آج صبح ہوٹل کے پھاٹک سے نکلا تو چند بھگینتے اور انکے ساتھ دو بچے گلابو شابلو لیے فٹ پار
پراکڑوں بیٹھے دکھلائی دیے۔ مجھے بڑی پرامید نظروں سے دیکھا۔ شاید صبح سے کوئی راہ گز
انکا بے بضاعت تماشہ دیکھنے کیلئے تیار نہ ہوا تھا میں ٹھٹھک گیا تو دونوں کٹھ پتلیاں بچا
کر یکسانیت سے دہرانے لگے۔ — بچیاں لال ملوں گی — منیاں لال ملوں گی — ۱۱
غریب بچوں نے بھی مجھے اداس کیا۔ خدا حافظ!



www.urduchannel.in



www.urduchannel.in

MASHA NURSING HOME
&
HEALTH CLUB



ہیلتھ کلب

”کامریڈ لن یونانگ۔“

”بولو۔ شمامتہ العنبر۔“

”وہ چینی شاعر کیا کہہ گیا ہے کہ میں نے آدمیوں کی سبتی میں گھر بنایا ہے؟ تو اس کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہیے۔“

”رکھ لو گل عنذلیت۔ یا THINKER'S DEN۔ امبرنیا۔ کدم کی چھاؤں۔ دریا نما۔“

”قطب نما بھی ہو سکتا ہے۔ آئیے۔ آئیے تشریف لائیے۔“

”ڈاکٹر کھنہ۔“ ”ایک بیچر فریبہ چنیا بطح نما خاتون نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔“

”جی وہ ابھی آتی ہونگی۔ تشریف رکھیے۔“

خاتون نے طشتریوں جیسی گول عینک پہن رکھی تھی جسکی وجہ انکی شکل پرالو کی گول آنکھوں کی جھلک آگتی تھی۔

”میں نے کل فون پران سے اپوائٹمنٹ لیا تھا۔ میں کلکتے سے آئی ہوں۔“

مسنز بری مایا بھٹنا گر۔“

”ہاؤ ڈو یو ڈو مسز بھٹنا گر۔ تشریف رکھیے۔“

خاتون صوفے پر فروکش ہوئیں۔ ”آپ ڈاکٹر کھنہ کے مسٹر ہیں؟“

”نہیں صاحب۔ پارٹنر۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپکی مسنز ہیں؟“

”نہیں صاحب۔ پارٹنر۔“

”ادہ۔“

”ہاں بھئی۔ دریا نما ہی ٹھیک رہے گا۔“

”اُوں نما۔“ عنبریں نے دنگ کیا۔

”درست۔ لیکن دریا نما رکھ لو۔ بمبئی میں بھی چوپائی پر ایک عمارت کا یہی نام ہے۔“

”وہاں دریا کہاں ہے؟“

”فارسی میں دریا سمندر کو کہتے ہیں۔ بمبئی کے عوام بھی سمندر کو دریا۔“

”وہ ایسی مفترس زبان بولتے ہیں؟“

”ہاں۔ اور مقرب۔ انڈے کو بید کہتے ہیں قلی کو جمال۔“

”ہائے آپ لوگ کتنی اچھی ہندی بولتے ہیں! میں نے سنا تھا لکھنؤ والے بڑی اچھی

ہندی بولتے ہیں۔“ مسز بھٹناگر نے داد دی۔

”جی ہم لوگ اردو بول رہے ہیں۔ منصور نے حل کر جواب دیا اور اہل لکھنؤ

اردو بولتے ہیں۔“

”اردو۔؟ ہاتے اردو تو میں بھی تھوڑی تھوڑی سمجھ لیتی ہوں۔ بڑی سوتیرٹ

لینگوتیج ہے۔ میرے تاؤ جی ڈیکول اردو ہی جانتے تھے۔ ہم لوگ عرصے سے کلکتے میں

رہ رہے ہیں لکھنؤ ہمارا پرانا وطن تھا۔ میں نے یہاں آکر آپ کے ہیلتھ کلب کی بڑی دھوم

سُنی۔ فوراً پہنچ گئی۔ ڈاکٹر لکھنؤ شادی شدہ ہیں؟“

”جی نہیں۔“ منصور نے جواب دیا۔

”آپ۔؟“

”جی نہیں۔“

”آپ۔؟“ عنبر سے سوال۔

”جی نہیں۔“

”میری طبیعت لکھنؤ آکر خراب ہو گئی۔ آب و ہوا کی تبدیلی۔“ فوراً خیال آیا کہ

مستقل اردو بول رہی ہیں۔ سامنے پڑے ہوئے FEMINA پر نظر ڈال کر کہا۔

”یہ۔ بیگم حبیب کتنے چیز لیکھ لکھتی ہے۔ ہیلتھ اینڈ بیوٹی پہ اس پر کارکی سیمیا میں بہ مہلا کو ٹر بل کرتی ہیں SKIN وغیرہ کی — آپ لوگ سب فارن میں رہ کر آئے ہیں نا؟ کسی نے یہی سوچا دی۔ آپ کے ہیلتھ کلب میں دُیلا ہونے کا کورس کتنے سپتہاہ کا ہے؟“

”ڈاکٹر کھنہ اسکی انچارج ہیں وہی آکر بتلائیں گی“

مسٹر بھٹنا کرنے انگریزی اردو اور ہندی کے ہفتہ وار رسالوں کی ورق گردانی شروع کی۔ جو ”گمشدہ تصویر کاراز“، ”نواب بیگم کون تھی —“؛ ”ایک معزز خاندان کو بلیک میل کرنے کی ناکام کوشش“ قسم کے عنوانات سے پُر تھے۔

”آجکل اس اسکنڈل کی ہر جگہ چرچا ہے۔ مسٹر بھٹنا کرنے نے کہا۔

عسبرین نے ناشتے دان کھولا۔ نوش فرمائیے۔ ”منصور نے اخلاقاً ان کو مدعو کیا۔

”آپ کھائیں۔ میں تو اپنی CALORIES گنتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر باہر باغ میں چلی گئیں۔

”ہر شاخ پہ اُتو بیٹھا ہے اب رنگ گلستاں کیا ہوگا —“ منصور نے

بتاؤت سے کہا۔

”تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ مجھے پھر ڈپریشن شروع ہو گیا۔“

”کیوں؟“

”اُتو نے نواب بیگم کا تذکرہ جو چھیڑ دیا۔“

”تم سے مطلب؟ تم اپنے پر اہل خود CREATE کر رہی ہو۔ بروٹے سے سسٹرز کیلئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ تم تو خوشی کے شادیاں بجاؤ۔“

”یعنی اگر اسی طرح ساری دنیا کو معلوم ہو جائے کہ نواب بیگم میری نانی تھیں تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا؟“

“AMBER—I DIDN'T MEAN THAT—FOR GOD'S SAKE.”

منصور نے ہنسنے لگا کر جواب دیا۔

منصور بھٹنا گرباع کا ایک چکر لگا کر واپس آئیں۔

”امی نے آج کونسا دقیا نوسی ٹفن باکس نکال کر بھیجا ہے“ عنبہ نے چڑک کر کہا۔
”کلکتے کے زمانے کا۔“

”سہ ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھاتے کلکتہ ٹولڈن میں ٹفن“

منصور نے پھر انشاء کا ایک شعر پڑھا۔

منصور بھٹنا گرنور سے سن رہی تھیں۔ بولیں ”ہائے۔ مجھے تو شاعری بہت پسند ہے۔
میرے تاؤ جی بھی مشہور شاعر تھے“

”اچھا۔“ منصور نے نیکیں نکالنے ہوئے پوچھا ”کیا تخلص فرماتے تھے؟“
”احقر۔“ رائے بہادر امبا پرشاد۔ ”وہ اطمینان سے کہتی رہیں۔“ جب
میں نے یہ نواب بیگم کی فوٹو والی خبر پڑھی تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ اسی ویشیا کی لڑکی نے
میری تانی جی کی جان لی تھی۔“

عنبہ میز پر سے چچہ اٹھا رہی تھی۔ ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ ہیبت زدہ سی ہو کر
اجنبی خاتون کو تکیے لگی۔ منصور نے گھبرا کر انکو دیکھا۔ ملا گیری ٹمپل۔ سائی۔ کلائیوں
میں پلیٹیم کے عبا سے مزین درجنوں چوڑیاں۔ کانوں میں سچے موتی۔ گلے میں سچے موتی۔
کوئی ڈھائی من کا وزن۔ اسوقت یہ قصہ چھپرتے ہوئے وہ دنیا کی مسرور ترین اور مطہین
ترین ہستی معلوم ہو رہی تھیں۔ منصور کو لگا رخانم کے منہلے بھائی کی پیش گوئی یاد آئی
جو اس نے اس رات آبشار والے کمرے میں کی تھی۔ کہ جب یہ داستان پر لیں میں
آبگی نواب بانی کے واقف کار کہاں کہاں کے کونوں کھدروں سے نکل آئیں گے۔

اس مٹلی کو یہ کتھا شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کاش میں نے اسکے تاؤجی کا تخلص نہ پوچھا ہوتا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

مسنر ہرئی مایا بھٹنا کرنے اپنے بیگ میں سے سونف برآمد کی۔ ایک پھنکا لگایا اور گویا ہوتیں — ”تاؤجی کلکنہ کے بڑے شوقین مزاج رہیں تھے۔ نواب بیگم دیشیا کی راکھی بلبل انکی رکھیل تھی۔ دو تین سال انکے پاس رہی پھر انکو خوب لوٹ کر ایک محمدن ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی۔ ڈاکٹر کھنہ کب تک آئیں گی؟ میں چاہتی ہوں وہ مجھے جلدی سے REDUCE کر دیں آپکو پتہ ہے میرے کزن بردر کی راکھی مس آنڈیا کے FEMINA والے CONTEST میں جا رہی ہے مس دارجلنگ بن چکی ہے اور میں بھی اپنے کالج میں بیوٹی کونین رہ چکی ہوں بس مسبرج کے بعد مٹایا چڑھ گیا — وہ مس بلبل کا قصہ مجھے میری ماما جی بتاتی ہیں۔ میرا تو جنم نہیں ہوا تھا اس سے۔ تاؤجی نے بلبل کو بہت سر چڑھا رکھا تھا۔ اینگلو انڈین پھوکری فراک پہن، ہیٹ لگاتاؤجی کے ساتھ موٹر پر دلا تیتی چمکے کے چکر لگاتی۔ کبھی گریٹ ایسٹرن کبھی گھوڑ دوڑ — تاؤجی نے اسے پیروں سے لاد دیا۔ ہماری تانی جی اسی عورت کی ڈاہ میں پیمار پڑ گئیں۔ ٹی۔ بی۔ ہو گئی۔ اگلے زمانے کی پتی دزناستی ساؤتری — کیا کرتیں گھلتی رہیں — گھلتی رہیں —“

مسنر بھٹنا کرنے ڈرامائی نائز پیدا کرنے کے لیے آہ بھری۔ عنبر دم بخود بیٹھی تھی۔

”پھر صاحب۔ بھگوان کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ خود ہی اپنے محمدن ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی۔ مگر ڈاکٹر صاحب —“ انھوں نے چاروں طرف دیکھ کر آواز نیچی کی گویا اب گہرا راز افشا کرنے والی ہوں — ”ہماری ماما جی بتاتی ہیں کہ تاؤجی کو معلوم ہو گیا تھا کہ کیا بات ہے کیا نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے بڑی خوشی سے خود ہی بلبل جان کا بیاہ کر دیا تاکہ مستان اس ٹیچر کی سمجھی جاوے۔“

عنبر کا رنگ سفید پڑ گیا۔

منصور نے جرح کی۔ ”معلوم کیسے ہو گیا تھا؟ کیا خود بلبل لے بتلایا تھا؟“
 مسنر بھٹنا گرنے پھر ادھر ادھر دیکھا حالانکہ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی
 موجود نہ تھا۔ آہستہ سے پولیس۔ ”آپ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا۔ بلبل کی
 ایک اڑتی بہترانی تھی۔ بھنگن۔ وہ ہماری تانی جی کی جاسوس تھی۔ وہ ڈالی گنج
 والے منگٹکے سے آکر رتی رتی بات انھیں بتلا جاتی تھی۔ اسی نے تانی جی کو بتلادیا تھا کہ کیا
 معاملہ ہے کیا نہیں۔“

عقب میں اچانک میز پر سر جھکا کر آگے کو گریسی گئی۔ منصور نے لپک کر اسے سنبھالا۔
 بولی: ”ڈونٹ ڈری۔ چکر آگیا۔ مجھے بھی ہانی بلڈ پریشر ہو گیا ہے۔ جی مسنر بھٹنا گرنے۔ سوری
 پھر کیا ہوا۔“

منصور نے میز کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر اسکا سر دہاتھ تھا م لیا۔ مسنر بھٹنا گرنے بولتی
 رہیں۔ ”بس جی۔ پھر بلبل نے اس مسلمان ٹیوٹر کے ساتھ میرج کر لی۔ پھر کیا ہوا کیا نہیں
 ہوا۔ جانے ہماری بلا۔ تانی جی البتہ اچھی نہ ہوتیں۔ مرگتیں ٹی۔ بی سے۔“ انھوں نے
 اس لہجے میں کہا گویا تانی جی کے مرنے سے انھیں بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔
 ”چار پانچ سال بعد تاؤ جی بھی مر گئے۔ انہی کی تو یہ پوتی ہے جو مس دار جلنگ بتی تھی۔
 بڑی بڑھیا کتھک ڈانس رہے۔ فارن میں جا کر بھی ڈانس کرتی ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے نا۔
 ہماری تانی جی پردے میں رہتی تھیں۔ انکی پوتی کتھک ناچتی ہے جو پہلے بلبل جیسی دیشیاؤں
 کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔“

”اچھا جناب WOULD YOU BELIEVE IT میں نے بھی کالج میں مٹی پوری
 ڈانس سیکھا تھا۔ میں اتنی تیلی تھی۔ ڈاکٹر کھنہ اننگ نہیں آتیں۔ وہ مجھے کتنے دنوں
 میں ریڈیوس کر دینگے؟“
 عقب سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہی۔

”ایک بات بتائیے ڈاکٹر صاحب،“ مسنر بھٹنا گرنے سونف کی شیشی منصور کو پیش کرتے

ہوئے دریا فت کیا۔ ”آپ محمدن لوگ میں پردہ سٹم اتنا زیادہ تھا اور اب بھی کافی ہے۔
یہ کیا بات ہے۔۔۔ ویشیا میں بھی محمدن ہی ہوتی تھیں۔۔۔“
باہر کارا گر رکی۔

”جی ہاں۔ یہ نکتہ قابل غور ہے۔۔۔ منصور نے جواب دیا۔ ”جیسے ڈاکٹر کھنہ آگئیں۔
آئیے آپکو انکے دفتر تک پہنچا دوں۔۔۔“

مسٹر ہری مایا بھٹنا گر کو نشانہ داکھتہ کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آنے کے بعد
منصور نے دیکھا کہ عین اسی طرح بت سنی بیٹھی تھی۔ خالی خالی نظروں سے اسے تک کر
عجیب سی آواز میں پوچھا۔۔۔ ”منصور۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔؟“

”وٹ ڈیوین تم کون ہو۔۔۔؟“
”منصور امی نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔۔۔؟ وہ تو تمہاری شہوار خانم سے
تو گنا جھوٹی نکلیں۔ ساری عمر میں نے انکو اتنا کھرا اتنا سچا سمجھا تھا۔

I HATE HER I HATE HER I HATE HER .”

اس نے میز پر زور کا مکہ مارا۔ اگر جدار قہقہہ لگا کر چند منٹ بعد وہ آہستہ آہستہ لاپٹے لگی۔

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

FALLING DOWN, FALLING DOWN,

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

FALLING DOWN, FALLING DOWN,

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

MY CROOKED LADY

ڈاکٹر منصور کا شغری سنائے میں آگیا۔ ڈاکٹر عین بیگ پر جوتوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

جھاڑو تارا

”کہو بھتی میلک عنبر۔“

”ہاں بھتی میلک کا نور۔“

”کیا حال تے چال ہے۔“

”بُرا۔“

”آوازیں۔“

”ہاں۔ مسلسل۔ جیسے کان کے اندر ریڈیو بج رہا ہو۔ اور چیزیں نظر آتی ہیں۔“

”نگار خانم کے شاگرد پیشے میں داخلے کی تم بھی کینڈی ڈیٹ ہو۔ خوب گذرے گی بابا

سبز پوش کے ساتھ۔“

”پھلیٹ جوک۔“

”جون آف آرک کو بھی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔“

”پھلیٹ۔“

”تم سے اتنا کہا نور منزل ہو آؤ۔“

”گنتی۔“

”انکے ہاں امریکہ سے ایک بڑا توپ سائیکٹر سٹ۔“

”میں بھی کچھ کم توپ ڈاکٹر نہیں ہوں۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔“

”کہنے لگا بس آپ کو اور ورک کا اسٹریٹن ہے۔ اور کچھ ایجنٹل ڈسٹریبنس۔“

”میں بھی یہی کہتا ہوں۔ مہاری اپنی تشخیص کیا ہے؟“

”مجھے ہفت نظری کی نظر لگ گئی ہے۔“

”ہفت نظری کون بلا ہے؟“

”بلا ہی تو ہے۔ جس طرح گجر آبائی کی لڑکیوں نے نانی کے خلاف کلوا ایبر کے ذریعے تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تم متحیر نظر آ رہے ہو۔ تم سوچ رہے ہو مجھ پر جنون کا دورہ پڑا۔ ہسٹریا کی اگلی اسٹیج پاگل پن۔ کیوں؟ اجی چھپ چھپ کے مت دیکھو جی بھنورجی۔ ہم کو بخر لگ جائیگی۔“

”میں یہ سب نہیں سوچوں گا۔ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔“

”دیکھو جی کنورجی۔ تم نے ابھی سے میرے ساتھ نرمی کا وہ برتاؤ شروع کر دیا جو ہم ڈاکٹر لوگ اعصابی اور ذہنی مریضوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ سنو جی کنورجی۔ کیوں ہنسے۔؟“

”ٹھا کر دلشاد علی خاں یاد آگئے۔“

”وہ انٹرنیشنل کروک؟“

”دلچسپ آدمی ہے۔ کل جب میں تم کو فون کر رہا تھا کلا آرکس اودھ سے۔“

”ملک ارجن منصور وہاں کیوں گیا تھا؟“

”صاحبزادہ دلشاد علی سے ملنے۔“

”وہ اب تک یہاں براجتے ہیں؟“

”جب میں نے وہاں سے تم کو فون کیا اور ملک عنبر کہہ کر تم سے بات شروع کی اور بعد ان کو بتایا کہ تم کو کبھی ملک عنبر کو بتا ہوں تم مجھے ملک کا فوریا ملک ارجن منصور یا کاشغری، مناسبت سے کوئی انٹ سنٹ جینی نام۔ اور اسکا ٹینڈ کی مناسبت سے تم کو کبھی لیڈی آف ایبر ڈین پکارتا ہوں۔ تو راہہ دلشاد علی نے تو اس نکتے کو بہت ایجو اسے کیا مگر رخانم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کیوں اسکی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جواب دیا کیونکہ لوگ بہت جوٹیلے ہیں۔ پوچھا جو کیلے کیا؟“

”ہا ہا ہا۔ نکار خام وہاں راہہ دلشاد کے چکر میں آئی ہونگی۔“

”ظاہر ہے۔ وہ انکے مہمان ہیں۔“

۴۶۶

”بہت خوش تھیں؟“

”شاد کام۔“

”اور شہوار؟“

”ناشاد۔“

”کیوں۔“

”اسلئے کہ اب میں انکے یہاں نہیں جاتا۔“

”جھوٹ تو رچی۔ تم بھی مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔“

”کیسا جھوٹ۔ کیسا سچ۔ سب ہری کی مایا ہے!“

”ہری کی مایا۔ ہری کی۔ ہری مایا بھٹنا گر۔“

YOU LOW-DOWN SWINE. TRYING TO HIT BELOW THE BELT—
GET THE HELL OUT OF HERE—DROP DEAD. ”

”منصور۔ منصور۔ حضرت سلیمان کی عصا میں۔“

”دیمک لگ گئی۔“

”کمال ہے۔“

”ہاں خاتون جوتی۔“

”کیا اس دن میں بالکل BUNKERS۔“

”ہاں۔ تم اسی طرح CALMPOSE پر چڑھی رہیں تو اسکا اڈکشن ہو جائے گا۔ خطرنا

”منصور دراصل مجھے IDENTITY CRISIS ہو گیا ہے۔“

”تم اس کرائس میں تنہا نہیں ہو HONEY۔ تھرڈ ورلڈ کے بہت

انٹلیکچوئلٹ اور رابٹر بھی IDENTITY—CRISIS—WALLAHS بن چکے ہیں۔“

”تم میری ہر بات ہنسی میں اڑا دیتے ہو۔ میرا مسئلہ اب یہ ہے کہ میں کون ہوں۔
شکوہ حسین یا مس امبا پرشاد۔“

”تمہارا تو بہت محدود ذاتی مسئلہ ہے لیڈی آئیمر۔ سموچی قومیں آجکل IDENTITY
CRIS میں مبتلا ہیں۔ کہ انکے اندر امبا پرشاد نے کس حد تک سرایت کیا ہے
رکس حد تک شکوہ حسین۔ وہاں امبا پرشاد کو بالکل مسترد کر دیا گیا ہے۔ یہاں
ت سے لوگ شکوہ حسین کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں۔ تمہارا معاملہ اردو
بھی ملتا جلتا ہے۔“

”پھلیٹ چوک۔“

”اور تم اس گھیلے کو بالکل بھول جاؤ تو کیسا رہے۔ بغیر کامپوز کھاتے۔“
”نصیحت کرنا آسان ہے۔ اب بتاؤ موجودہ صورت حال میں میسر می اہل
SETTI کیا ہے؟“

”سنو امبرینا۔۔۔ جب سے انسان غار سے نکلا ہے۔ ایک دوسرے سے ہل چل کر ہی
س اور تہذیبیں بنتی گتی ہیں۔“
”ہاں مگر کتنے خون خرابے اور نفرتوں کے ساتھ۔“

’جو ہوا سو ہوا۔ اب تم اسکے متعلق کچھ کہ نہیں سکتیں۔ تم ماضی کو کس طرح بدل سکتی ہو؟‘
”بھوت کال کے بھوت تو موجود ہیں۔“

’اگر تم کماری امبا پرشاد ہی ہو تو کیا حرج ہے؟ لیکن اس صورت میں مسز ہری مایا
جیسی محفول کی کمانڈر انچیف یو۔ کے۔ پی کی فرسٹ کزن البتہ ثابت ہوگی۔ افسوس۔
امبا پرشاد۔ تو انکے بارے میں جو کچھ اب تک سنا مجھے تو نہایت پھلے آدمی معلوم ہوتے۔“
’بکو اس۔ ایک سے ایک نام معقول لوگوں کی ناجائز اولاد ہونا میری قیمت میں لکھا
ندے رینال۔ نانا۔ ایک چالو BIRD OF PASSAGE۔ ایک بیوقوف
قلب ڈانگ گریل کو چونا لگا کفایت ہو گئے۔ نانی ایک ہارڈ یو ایبلڈ نائیکہ۔ والد

مخترم امبا پر شاد جنہیں اپنی اولاد سویکار کرنے کی سہمت نہ ہوئی۔ یا والدہ ایک نمبر کا منافق۔ دروغ گو۔

”اب میں آپ کے اس غیر معمولی اور دلچسپ شجر سے کو مثبت طور پر پیش کرتا ہوں۔“
 نانا ایک DASHING مہم جو آرٹسٹ فولوگر اور فر۔ نانی ماہر فن مطر اور باکمال رفا
 مانڈ اور ٹھہری ایکسپرٹ۔ والد راتے بہادر امبا پر شاد احترام ایک وضع دار ا
 نیک طبیعت رئیس جنہوں نے اپنی طرف سے تمہاری بہتری کی کوشش کی یعنی تم کو ایک
 مسلم شخص دینے کی خاطر سید شکور حسین سے تمہاری والدہ کی شادی کروادی۔
 منسر بھٹنا گر والی روایت صحیح ہے۔ مگر راوی ضعیف ہے مجھے یقین ہے کہ اس اڑ
 مہترانی اور منسر بھٹنا گر کی تانی جی اور ماتاجی اور دوسری بیوقوف عورتوں کی بنائی ہو
 GOSSIP۔ منسر بھٹنا گر جس قسم کی ذہنیت کی نمائندہ تھیں انہوں نے جو طومار باندہ
 اسے سچ ماننے میں مجھے تامل ہوگا۔

”لہذا اب UNUS آیا مسٹر شکور حسین پر۔ وہ البتہ نہایت چڑچڑات ثابت ہو۔
 مگر اس میں بھی اللہ میاں کی مصلحت مضمر تھی۔ تم انکے گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے
 نکلیں۔ بہترین تعلیم و تربیت ہوئی۔ وغیرہ۔“

”لیکن میں انکی جائیز اولاد تو ہوئی۔ انکی بیٹی کی حیثیت سے پستی بڑھتی۔“
 ”ایل۔ ایم۔ سی ماحول اور شدید پردہ۔ سب منظور ہوتا؟“

”بیشک۔ اس IDENTITY CRISIS کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ یاد ہے ایک روز
 جب گوہر جان کے اوصاف بیان کر کے کہنے لگیں کہ یہ اسکے یورپین خون کا اثر تھا وہ
 میں نے کہا تھا شکر ہے میں نہ ہوئی کسی قسم کی MIXED BREED اس ایک COMPLEX
 سے تو بچی رہی۔“

”جو حالات شکور حسین صاحب کے گھر کے تم نے بتائے ان میں تمہارا وہاں
 کر بڑا ہونا ناممکن تھا۔ چلو ہو گیا قصہ ختم۔“

”تم ہی بتلاتے ہو شوکور صاحب کا ماحول پاکستان جا کر بالکل بدل گیا۔ کایا پلٹ“
 ”ہاں۔ کولوٹولہ سے کراچی جمخانہ۔ ۳۳۳ میں انکے روئے انکے طبقے کے معاشی اور
 سماجی حالات نے تخلیق کیے تھے۔ لاکھوں لوگوں کی طرح پاکستان میں رفتہ رفتہ انکی کلاس
 بدل گئی۔ اپ ورڈلی موبائیل۔ اسکے ساتھ انکے سوشل روئے۔“

”تمہاری ماں کو انہوں نے طلاق نہ دی ہوتی اور تم دونوں انکے ساتھ ڈھاکہ چلی گئی
 ہو تیں تو ڈاکٹر صاحب تمہاری زندگی کے تین مختلف منظر نامے ممکن تھے۔ تم جنگ بنگلہ دیش
 میں ماری گئی ہو تیں۔ یا ریفیوجی بنکر دوبارہ کلکتہ آتیں۔ یا براہ نیپال کراچی پہنچتیں اور آج
 بہر حال وہاں کی چمکدار کنزیومرسوسائٹی کی ایک SMUG رکن ہو تیں۔ آؤ گنج چل کر
 کافی پی آئیں۔ چلو اٹھو۔“

”تہیں۔ امی نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ ساری عمر جھوٹ بولتی رہیں۔ وہ اڑیہ بھنگن
 جی تھی۔ تم مجھ سے ہمدردی کر رہے ہو۔ سوڑ جی — STOP BEING SO BLOODY

PATRONISING— GET LOST YOU TWO—TIMING RASCAL.

ر نہ جو تا کھینچ کر ماروں گی۔ بد معاش۔
 ”نون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ شہوار خانم نے بلایا ہو گا۔ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔
 ”شام مجھے گومتی پر جھاڑو مارا نظر آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کوئی منحوس بات ہونے
 والی ہے۔“

”منصور بیٹا اسے پھردی لے جاؤ۔ آل انڈیا میڈیکل انسٹیٹیوٹ۔ سنو وہ لوگ۔
 — وہ کہیں راپنی وانچی تو تجویز نہیں کر رہے؟ تمہاری بے چاری پدمابھن جی اسکی
 طرہ جعمرات کو شاہ مینا صاحب جاتی ہیں۔ تروپتی کے مندر جانے کو کہہ رہی ہیں وہاں
 منت مان لی ہے۔“

”کیا حماقت ہے۔ میں نے پدماکو سختی سے منع کر رکھا ہے مگر وہ باز نہیں آتیں
 ہیں نا؟ مگر منصور بیٹے عتبر جیسی ہوشمند پڑھی
 لڑکی کا یہ حال کیوں ہوا؟“

”نروس بربیک ڈاؤن پڑھے لکھے لوگوں ہی کا ہوتا ہے“

”مگر عتبر ہی کیوں؟“

”یہ مجھے بھی تعجب ہے۔ بیحدیت ڈاکٹر اسے اس جائیزا جائیزا اولاد کے چکر کو اتنی اہمیت
 نہیں دینی چاہیے تھی۔“

”یہ بات میں سمجھ سکتی ہوں۔ اسوجہ سے اس نے ہمیشہ SUFFER کیا ہے جب
 سے بڑی ہوتی اسے خیال رہا ہے اسکی جو UNFORTUNATE بیک گراؤنڈ ہے اسکی و
 سے کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ کلکتہ میڈیکل کالج میں ایک ہم جماعت سید زادہ
 نے پیغام بھجوایا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ صاحب جائیداد اعلیٰ خاندان
 نیک لڑکا تھا۔ میں نے بیاہ کی تیاریاں کر لیں تاریخ طے ہونے سے ذرا قبل ان لوگوں۔
 منگنی توڑ دی۔“

”میں نے پھپھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر ان لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ لڑکے کی والد
 ٹرین میں پٹنہ سے کلکتہ واپس آرہی تھیں ایک شناسا بیوی ہمسفر تھیں۔ ان سے ذکر کیا۔ فلانا
 لڑکی سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ ڈاکڑی پڑھ رہی ہے دلی کے مغل لوگ ہیں۔ ان پنجابی بیوہ
 نے ناک پھانگی رکھ کر جواب دیا۔ اے بہن نہ مغل نہ ووغل۔ آپ کس گندی موری
 کرنے جا رہی ہیں وہ تو کجیڑوں کی اولاد ہے۔ لیجئے صاحب۔ انھوں نے کلکتہ پہنچے
 نسبت توڑ دی۔ ایک اور بیوی میری شناسا کمپارٹمنٹ میں موجود تھیں۔ انھوں نے یہ وا
 مجھے سنایا۔“

”اسکے بعد ہی میں نے طے کیا لعنت بھیجو اس معاشرے پر۔ ہم یہاں رہیں گے ہی۔
 برطانیہ چلی گئی۔“

”پھر واپس کیوں آتیں؟ وہیں رہے جاتیں۔ وہاں تو یہ مسئلہ بیک گراؤنڈ کا پیدا نہ ہوتا

”یہ مسئلہ وہاں بھی خوب پیدا ہوا وہاں ہندوستانیوں پاکستانیوں کا اپنا سماج بن چکا ہے۔ کچھ پرانے دئی والے موجود تھے۔ کچھ کلکتے والے۔ جے پور والی گجربانی کی ایک نواہی بھی وہیں رہتی ہے۔ اس کجمنت نے سارے میں پھونک دیا۔“

”تعجب ہے۔ آجکل تو لوگ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ خصوصاً باہر رہنے والے۔“
 ”خوب کرتے ہیں۔ عنبر کو اپنے اس ہینڈی کیپ کا OBSESSION ہو چلا تھا —
 — لیبیا سے یہاں آئی۔ اسی سال نگار خانم کا منجھلا بھائی — دونوں بہنیں ایسی اول بول
 ہیں۔ وہ آدمی بہت سمجھدار ہے۔ اس نے پیام دیا۔ عنبر نے منظور کر لیا۔ مگر ان بہنوں نے
 بھی اسی بنا پر رشتہ نہ ہونے دیا۔ انہوں نے بھی کہیں سے پتہ چلا لیا تھا —

”اسی وجہ سے جب میں نے محسوس کیا کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو میں نے طے کیا
 اس سے قبل کہ تم کو کسی اور ذریعے سے پتہ چلے اور تم بھی بدک جاؤ اور عنبر غریب کو ایک
 اور زبردست دھکا پہنچے بہتر ہے کہ میں تم کو خود ہی بتلا دوں۔ بلا کم و کاست۔“

”لیکن مجھے حیرت یہ ہے کہ جب ایک عجیب و غریب QUIRK OF FATE کے ذریعے
 خیاط فلک نے نواب بانی کی زرنکار ٹوٹی نگار و شہوار کو اڑھا دی۔ عنبر کی نانی ان
 دونوں کی دادی بن گئیں۔ جگ ہنسائی ان کھنڈھی بہنوں کی ہوئی۔

”تو میرا خیال تھا کہ BOTH OF YOU WILL HAVE THE LAST LAUGH
 مگر اسکے بجائے عنبر کی حالت روز بروز تیزی سے بگڑتی جا رہی ہے۔ کیا اسکے خاندان میں
 سی پست میں دیوانگی تھی —؟“
 ”دفعاً وہ چپ ہو گیا۔ خاندان کون سا —؟ امبا پیر شاد کا یا
 سید شکور حسین کا؟“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ مسر بیگ نے جواب دیا۔
 ”اس پر پہلے ہسٹریا کے دورے پڑ چکے ہیں؟“
 ”نیوروسس شاید اس نے نواب بیگم سے ورثے میں حاصل کیا ہے وہ بجد اعصاب نہ
 تھیں۔ بات بے بات رو پڑتی تھیں۔ انکے حالات زندگی ہی ایسے رہے تھے بلکہ
 میں عنبر کی اس لڑکے سے منگنی ٹوٹی تب بھی اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چلا تھا۔ فوراً ہی

ہم لوگ اڈنبر اچلے گئے۔ وہاں ماحول بدلا۔ ٹھیک ہو گئی۔ اب اس کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ شہوار اسے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے۔
 ”یہ تو ذہنی مریضوں کا عام خوف ہوتا ہے۔“

”وہ مجھے بھی اپنا دشمن تصور کرتی ہے۔ جب دورہ پڑتا ہے مجھے گالیاں دیتی ہے یقین نہیں آتا یہ عبرت ہے۔“

”آپ نے فرمایا تھا آپ کو بھی اپنی والدہ نواب بیگم سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے۔ کہ آپ کو انکا کبریکٹر اور طرز زندگی ناپسند تھا لیکن، مسز بیگم، میں آپ کو ایک بات بتاؤں عبرت کی اس موجودہ حالت کی ذمہ دار آپ نہیں میں ہوں۔ جی نہیں۔ شہوار کی وجہ سے نہیں۔ محض اپنے زیادہ بولنے کی بدولت۔ جب اس چٹیا بطن مسز بھٹنا کرنے کہا میرے ناؤ جی مشہور شاعر تھے مجھے اس وقت انکا تخلص دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہ وہ تخلص بتائیں نہ پٹاری میں سے امبا پر شاد دوبارہ نکلتے بطور پتاجی۔ نہ عبرت کی یہ حالت۔“

”مگس کو باغ میں جانے نہ دینا، نہیں بھی۔ وہ مسز بھٹنا گرتور سالوں میں نواب بیگم کے فوٹو والی خبریں پڑھ کر خود ہی یہ قصہ چھڑ چکی تھی۔ باقی تفصیلات بھی اسی طرح بیان کر دیتی۔ ہونی کو کوئی مال نہیں سکتا۔ مگر واقعی کاش یہ بات نہ نکلتی اور عبرت مجھے ریاکار اور دروغ گو نہ سمجھتی۔“

”اب آپ اسے باور نہیں کر سکتیں کہ یہ قصہ غلط ہے؟“
 ”بیٹا اگر کوئی نہ ماننا چاہے تو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے؟“
 ”آج کل وہ رسی تلاش کرتی پھرتی ہے۔“
 ”خودکشی کی خواہش؟“

”وہ کہتی ہے تم اور شہوار ملکر اسے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ وہ ہیوسو نیشن دیکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے جس طرح شہوار نے اپنے سب سے بڑے بھائی کو پاگل کر کے شاگردیشے میں بند کر دیا اس طرح وہ اسے بھی پاگل کر کے چھوڑے گی۔“

”وہ شاگرد بیٹھے والا خطی ان لوگوں کا بڑا بھائی ہے؟“
 ”عینتر کو اسکی ایک مریضہ نے بتلایا جو ان لوگوں کی ہم وطن ہے۔ علاوہ ازیں انکی بسنتی
 مہری نگار خانم کی دوا میں لینے تمہارے کلنگ آتی جاتی رہتی ہے۔ وہ دونوں طرف خبریں
 پہنچانے میں مصروف ہے۔“

”گڈ ہیونسنز۔۔۔!“

”اسی بسنتی مہری نے عینتر سے کہا کہ انکا بڑا بھائی گھر سے بھاگ کر سادھوؤں کی
 ٹولی سے جا ملا تھا۔ برسوں ہمالیہ کی گچھاؤں میں رہا۔ شمشانوں میں بیٹھ کر کپالیوں سے
 متنزک عملیات سیکھ رہا تھا جیسی اسکا دماغ چل گیا۔“
 ”مسٹر بیگ۔ مجھے اس بیان میں شہوار کی افسانہ طرازی نظر آرہی ہے۔ چلیے۔ خبر

پھر۔۔۔؟“

”بیٹا یہ ممکن ہے۔ کلکتے میں قاضی نذرا لاسلام کے لئے یہی مشہور تھا کہ وہ متنزک
 علم سیکھتے سیکھتے کوئی چیز اٹھی کر بیٹھ اسوجہ سے انکا دماغ ماؤف۔“

”آپ بھی اس قسم کی NONSENSE پر یقین کر لیتی ہیں؟“

”قطعاً نہیں۔ لیکن یہ تو عین ممکن ہے کہ ایک آدمی روزانہ آدھی رات کو شمشان گھاٹ
 پر جا کے بیٹھے گا تو وہاں کے ہولناک ماحول کی دہشت سے دماغ آپ سے آپ ہی چل
 جائے گا۔“

”چلیے مان لیا۔ پھر۔۔۔؟“

”بسنتی مہری راوی ہے کہ اس نے شہوار سے سنا کہ بڑے بھائی بنا برس کے
 پینچ گنگا گھاٹ پر مردوں کی راکھ کے ڈھیر پر برسوں بیٹھ رہے۔“

”شہوار خانم کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنا چاہیے برائے نکلشن۔“

”چنانچہ عینتر کو اب یہ وہم ہو گیا ہے کہ شہوار خانم نے اسی متنزک بھائی کے ذریعے جو
 اب خطی سبزہ لوش باباجی کہلاتا ہے تم کو آٹا گوشت کھلوا دیا ہے۔“

”کسے۔۔۔؟“

” تمہیں۔ یعنی ڈاکٹر منصور کا شغریٰ کو۔ مزید برآں شہو آرخانم موٹھ بان کے ذریعے اسکا یعنی ڈاکٹر عنبریں بیگ کا کام تمام کیا چاہتی ہے۔“
” موٹھ بان کیا شے ہے؟“

” بقول بسنتی مہری دیوالی سے ایک رات قبل اپنے اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے ساحروں کے ذریعے موٹھ بان چلائے جاتے ہیں۔ جادو کی ہنڈیاں اڑتی ہوئی آکر۔ VICTIM کو لگتی ہیں اور وہ پٹ سے مرجاتا ہے۔ یعنی ایک قسم کا جادوئی فلائنگ بم۔ روکٹ۔“

” اللہ رحم کرے۔ یہ تو عجیب گورکھ دھندا ہو گیا۔ عنبر انڈیا کو کیری کنسٹری کہتی تھی فوڈ CRAZY ہو گئی۔ میں اسے جلد از جلد یہاں سے لے جاتا ہوں بوسٹن۔ چند مہینوں میں اچھی ہو جائیگی۔ بسنتی کے علاوہ وہ اور کین لوگوں سے ملتی ہے؟ پدمابہن جی کو تو میں نے منع کر دیا ہے کہ بھارت پھونک ٹونے ٹوٹکے کی بات اس سے نہ کریں۔ اور کون؟“
” تم لوگوں کے کلنک میں طرح طرح کی خواتین آتی ہیں۔ ایک سے ایک تو ہم پرست وہ اسے جانے کیا کیا بتلاتی رہتی ہیں۔“

” مگر میں نے اسے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کلنک نہ جائے۔ گھر یہ آرام کرے۔ اور میں نے تو اسے وہاں کبھی موجود نہیں پایا۔ نہ شاردانے۔“

” دیوانہ بکار خویش۔ اسے معلوم ہے تم اور شاردانے وہاں دس بجے صبح سے پہلے نہیں آتے۔ وہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ۔“

” میں نے آپ سے کتنی بار کہا کہ کار کی کنجیاں چھپا کر رکھیں۔“
” چھپادی ہیں بیٹا۔ وہ مجھ سے کہتی ہے ذرا چہل قدمی کر آؤں۔ تھوڑی دور جا کر رکشا لے لیتی ہے۔ کبھی کہتی ہے ذرا کا پوز خرید لاؤں۔“

” کا پوز۔؟ میں نے اسے کا پوز کی بھی ممانعت۔“

” میں نے بخشو رکشا والے کو منع کر دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں نہ لے جائے۔“
” بخشو کون۔؟“

”وہی۔ رفعت آرا بریگیٹ کی کنیز انارکلی کا بیٹا۔“
”MY GOD—WHAT A MESS.“ مگر یہ بسنتی مہری بھی بڑی نمک حرام عورت ہے۔
اپنی ماکن کے بتلائے راز جا کر باہر اگل آئی۔
”اسکی نمکحرامی ہمارے کام آگئی۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ عنبر کے ذہن پر کن واہموں کا فوف
مسلط ہے۔“

”میں ابھی جا کر دو کام کرتا ہوں۔ نمبر ایک عنبر کو پوسٹن لے جانے کی تیاری۔ نمبر ۲۔
راجہ دلشاد علیخان کو شہوار کے ہاں بھیجتا ہوں کہ وہ جا کر ان باباجی سے انکی اہلیت معلوم
کریں۔ اور یہ بھی کہ یہ پاکھنڈی باباجی وہاں بیٹھے بیٹھے کیا فرادہ کر رہے ہیں۔ راجہ صاحب
کو روک آدمی میں اہلیت فوراً پہچان جائیں گے۔ علاوہ ازیں ان دنوں وہ خاندان بنگلور
گیا ہوا ہے لائین کلیر ہے۔“

”لیکن انکی کوٹھی پر تو گورکھے پہریدار بھی موجود ہیں اور کتا بھی اور باباجی کو ہمیشہ منقل
رکھا جاتا ہے۔ راجہ صاحب ان تک پہنچ پائیں گے؟“

”صاحبزادہ دلشاد علی خان۔؟ منریگی۔ جو میرا شیر آج تک WEST کے
سات ملکوں کی INTERPOL کی گرفت میں نہ آسکا وہ شہوار خانم کے سر و منٹس کو آرٹ
تک نہیں پہنچ سکتا؟“



جہانِ مستور

”السلام علیکم باباجی۔“

”وعلیکم السلام۔ ٹھا کر صاحب۔“

”آپ ناجیز سے واقف ہیں؟“

”آپکے نام نامی اور ذات گرامی سے کون واقف نہیں آپ مثل آفتاب کے ہیں جو دنیا کے تاریک ترین گوشوں کو منور کرتا ہے۔ کل شام ہی آپ سے پائیں باغ میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”پائیں باغ میں؟“

”تاریک سڑنگ کے دوسرے سرے پر ایک سہانا چمن ہے۔ گلاب کے پھولوں اور بلبُل ہزار داستان کے نغموں سے معمور۔ اسی گلستان میں جہاں ع — ارٹنی ہے شراب پھول بن کر۔ ان دنوں بے چاری عبرتین چہل قدمی کرتی نظر آتی ہے۔“

”بہت خوب تو آپ معمول میں بات کرنے کے عادی ہیں لیکن۔ بندہ معے حل کر لینے کا عادی ہے۔ کوئی نفل ایسا نہیں جو کھولا نہ جاسکے۔“

”جناب والا۔ چند نفل ایسے ہیں جنہیں نہ آپ کھول سکتے ہیں نہ میں۔“

”مثلاً۔۔۔؟“

”مرزا غالب نے فرمایا تھا۔ صنوع عالم دو ہیں! موصوف گنتی میں کمزور تھے۔ عالم بے شمار ہیں۔ یہ سبز رنگ جو آپ میری پوشش کا دیکھتے ہیں فی الحال۔ ایک عالم اور ہے۔“

جھٹ پیسے کا دیس۔ وہاں سورج نہ ڈوبتا ہے نہ نکلتا ہے۔ اسی سڑنگ سے ادھر۔ سہانے باغ سے ملحق۔ جہاں ممت۔ جی۔ آیا خیال شریف میں؟“

”جی۔۔۔“

”بڑا نفیس پائپ ہے۔“

”شکریہ۔“

”سلفے سے شوق فرمائے گا؟“

”جی نہیں۔ شکریہ۔ میں سلفہ نہیں پیتا۔“

”میں بھی نہیں پینا۔ تو وہ لوگ سبز فام ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد سب کی رنگت سبز۔
واجگان سبز رنگ۔ خواتین سبز فام۔ میں نے ایک ولایتی کتاب میں یوں پڑھا تھا کہ سترھویں
صدی میں — ریٹوریشن پیریڈ — جی؟“

”جی —“

”آپکے لئے چاء بناؤں؟ کوٹھی میں تو آپ کو نفیس چاء ملتی ہوگی۔“

”جی نہیں۔ عنایت۔ وہ فہمہ سنائیے۔“

”کون سا —؟“

”وہی۔ ریٹوریشن پیریڈ۔“

”OH I SEE. WELL, MY DEAR FRIEND, I

HAPPENED LONG LONG AGO—IN THE SEVENTEENTH
CENTURY ANNO DOMINI.

دو تہے۔ بہن بھائی۔ سبز فام۔ اس بھٹ پٹے کے دیس سے بھٹک کر عالم آب و گل میں
آنکے تھے۔ انھوں نے پرسان حال کو بتلایا کہ ایک سیاہ ندی ہے۔ اسمیں ایک کشتی پڑی ہوئی
ہے۔ بے پروا کی ناؤ۔ اس پر غلطی سے بیٹھ کر وہ اس کنارے آپہنچے۔ وہ کھیتوں میں بھٹکتے
پھر رہے تھے۔ ایک کسان انکو اپنے گھر لے آیا۔ عالم آب و گل کا وہ خط انگلینڈ بھلاتا تھا۔
اس کسان نے دونوں بچوں کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ وہ ان بے چاروں سے بہت شفقت کروانا۔
اور وہ محض سیم کے بیج کھاتے تھے — وہ کھیتوں میں محنت کرتے کرتے کھل کھل
کر مر گئے۔ یعنی دوبارہ مر گئے۔ اور اس کتاب میں یوں مرقوم تھا کہ عیسائیوں کے ہاں
مرنے والے کی فاتحہ وغیرہ کی رسوم کے لئے بھی جرج میں BEANS ہی پکائی جاتی ہیں۔

اور وہ سبز فام بچے بھی محض BEANS کھاتے تھے۔ ہے نالرزہ خیز بات ؟
 ”جیسی تو ولیم صاحب کہہ گیا ہے کہ زمین اور آسمان پر بہت سی چیزیں ایسی ہیں
 جنکے متعلق تم بالکل نہیں جانتے۔ تم نے انگلش لٹریچر پڑھا ہے ہو ریشو — ؟“
 ”تھوڑا سا۔“

YOURS TRULY IS M.A. IN ENGLISH BRACKET FIRST CLASS
 GOLD MEDALLIST BRACKET CLOSED.

”پھر آپ اس لائین میں کیوں کر آتے ؟“
 ”آجا مورے بالما لائین کلیر ہے — کون سی لائین — ؟“
 ”یہی — فلنڈری — با با گیری — وغیرہ۔“
 ”آپ اپنی لائین میں کیسے آتے ؟“
 ”میری لائین ؟“
 ”دہی جو آپ نے اینکر لائین پہ شروع کی تھی — لائین مارنے والی — پچھ۔ خبردار۔
 — دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے۔ تاک تاک تھتی —“
 ”آپ تو گانے اور کٹھک کے بھی بلند پایہ استاد ہیں۔ کہاں سیکھا ؟“
 ”پچھ۔ ہیراگی کی ٹوہ لینے آیا ہے ؟ بطلیموس اور پفنا ٹوس کا بھائی چرپٹا ٹوس۔ ارے
 وہ دونوں تو تم سے بہتر ہیں کہ لقمہ حلال کھاتے ہیں۔ ڈونٹ وری۔ ہیراگی صاف بات کہنے
 کا عادی ہے۔ آج عرصہ ۲۴ ماہ کا ہونا ہے کہ ایک رشتے جوگی کو اس چاہ تاریک میں برادران
 یوسف نے قید کر رکھا ہے۔ اور خود چاہ زریں پڑے ڈکیاں لگا رہے ہیں۔“
 ”وجہ — ؟“

”دنیا میں ہر چیز بلا وجہ ہے۔ بے مطلب۔ لایعنی۔ ہر مصیبت ناگہانی۔“
 ”کچھ آفات کی وجوہات تو بڑی صاف ہوتی ہیں۔ اسباب و نتائج علت و معلول۔“
 ”نہ۔ انھوں نے کُن ہی کیوں کہا۔ ارے جب بنیاد ہی کج ہے تو اب جو حال ہوا سو ہوا۔“
 ”آپ تو بابا جی کفر —“

”باخدا دیوانہ باشند۔“

”یہ دیواروں پر آپ نے کیا کیا سجا رکھا ہے؟“

”چاہ یوسف کو چاہ باہل بنا دیا ہے۔ وہ قبائلی ہے یہود کا۔ وہ تنترک ہنود کا۔ وہ منڈل بنتی لامادوں کا۔ اس طرف ہتھ لوگ کی پوتھیاں رکھی ہیں گی وہ کالی جلد والی پُتک اندرجال۔ پرانی ہندی میں لکھی ہوئی۔ بنارس میں ایک کباڑی سے خریدی تھی۔ نایاب کتاب ہے۔ کالے جادو کے متعلق۔“

”اچھا۔ بابا جی یہ تو تنتر کیا چیز ہے؟ اردو جنریلوں میں اسکا اشتہار بہت دیکھا ہے۔“

”وہ بھی ایک علم دریا ہے۔ وہ اس کو نے میں علی گادھونا سنگ رہا ہے۔“

”آپ کی کنڈلنی شکتی جاگ گئی ہے؟“

”قطعاً نہیں۔ مگر انی دلشاد۔ تم آدمی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو اب میں خاموش رہوں گا۔“

”کیوں؟“

”بعد مدت آپ پہلے شخص ہیں جو بندے کے پاس آن کر بیٹھے ہیں۔ بات چیت

کرنے۔ اب میں خاموش رہوں گا۔“

”لیکن کیوں؟“

”میری مرضی!“

”ابھی ابھی تو آپ بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہے تھے۔ خاصے نارمل۔“

”تو کیا تو ہمیں ABNORMAL سمجھتا ہے بے؟ آؤٹ آؤٹ۔ بھاگ جا بے

لقندرے۔ عیار۔ چھندر۔ لوگو ہے بے۔“

”اچھا یہ علی گادھونا کیا شے ہے؟“

”من کنت مولاه فعلی مولاه۔ در تو م تانا نانا در تو م تانا نانا۔ الالی الالی

اللی اللہ یاللی الالی الالی یاللی من کنت مولاه فعلی مولاه۔“

(۳۳)

علی کا دُھونا

’اسلام علیکم شاہ جی!‘
’وعلیکم السلام! کیوں بھائی۔ کل بھی آئے آج پھر نازل۔ آج دُڈو۔ ٹو۔ منکر نکیر۔
کہئے حضرت آپ کو کیا تکلیف ہے؟‘
’باباجی۔ یہ ڈاکٹر کا شعری۔‘
’محتاج تعارف نہیں۔‘

’ایسا ہے کہ کل یہاں سے جا کر میں نے ان کو بتلایا تو ان ترانہ علی مولانا من کنت
مولانا نے یوں الاپا کہ میں نے کسی بڑے سے بڑے تو آل سے ایسا نہیں سنا یقین
جانئے مجھ پر تو لرزہ طاری ہو گیا۔‘
’جھوٹ مت بک۔‘

’واللہ! ڈاکٹر صاحب بھی آپ سے کچھ سننے کے خواہشمند ہیں۔‘
’اللہ کے ترک امیر خسر وعلیہ الرحمہ کا ترانہ سننے کی غرض سے آپ تشریف لائے ہیں!
یا آپ صاحبان مجھے واقعی دیوانہ سمجھتے ہیں۔ یا پرلے درجے کا بیوقوف۔ فرمائیے۔ آپ مجھ
سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔؟ اور یاد رہے اگر دفعتاً مجھ پر جنون کا دورہ پڑ گیا تو
آپ دونوں کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔‘

’باباجی! ہمیں اپنا پر خلوص دوست سمجھیے۔ ہم آپ کی مدد کے خواہاں ہیں۔‘
’پُر خلوص۔ بابا۔ واٹ اے جوک۔ اور ڈاکٹر صاحب اپنے حساب آپ ذہنوں
کو کوریدتے ہیں مگر ہمارے حساب آپ بھی اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مارتے ہیں۔
اصلیت آپ بھی نہیں جانتے۔‘

”آپ جان گئے ہیں باباجی؟“

”نہ۔“

”تو پھر ہم یہ کیوں رعب ڈال رہے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ کل آپ نے ٹھا کر صاحب کو تو ادھ گھنٹے ہی میں بھگا دیا۔ میں ڈاکٹر ہوں اور آپ سے مدد لینے آیا ہوں ٹوہ لینے نہیں۔“

”ہم اپنی مدد ہی نہیں کر سکتے تمہاری کیا۔“

”پامال جملہ ہے۔ باباجی۔ کام کی بات ہو جائے۔“

”پامال تو سارا کارخانہ قدرت ہی ہے۔“

”باباجی۔ کام کی بات۔ ہم مانتے ہیں کہ آپ بالکل صحیح الدماغ ہیں۔ بن رہے

ہیں۔ مستقل بن رہے ہیں۔“

”صاحب۔ بنایا گیا ہوں۔“

”یہی سہی۔ مگر کیوں بنائے گئے ہیں؟ وجہ؟“

”کوئی حسب حال شعر پڑھوں یا با موقع گیت چلے گا؟“

”کاش آپ کے بھائی بہنوں میں اتنا سنس اف ہیومر ہوتا۔“

”تو آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ وہاں ہوتے۔“

”مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟“

”بد نفسی، خود غرضی، اور حالات اور ناگہانی حادثات کا مجموعہ آفات۔“

”کچھ نہیں بھی بتلائیے تاکہ ہم لوگ عبرت اور نصیحت پکڑیں۔“

”ڈاکٹر صاحب آپ تو شاید پکڑیں نصیحت مگر صاحبزادہ صاحب چکنا گھڑا ہیں۔“

یہ بتائیے آپ کو وہ لوگ ادھر آنے ہی کیسے دیتے ہیں؟“

”آپ کو تو معلوم ہے وہ سب بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے موقع غنیمت جانا۔“

”اور پھاٹک کے پہریدار۔ اور قبلائی؟“

”بسنٹی مہری زندہ باد۔!“

بستی مہری۔ وہ پیر بخارا کی شہدین!۔
”جب میں اس طرف آیا۔ تو خوش قسمتی سے منشی جی سامنے ہی نظر پڑ گئے۔ پہچان گئے۔
پہلے پہل آپکے دو لٹانے پر حاضر ہوا۔ ان سے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ امرود تو مکر دیا تھا۔
” اچھا۔ اباجی سے آپکی بھینٹ ہو چکی ہے۔“
” آپکے اباجی؟“

” ٹھہریئے۔ ذرا وہ فوٹو گراف اتار دیجئے گا۔ بہت اُوپر لگا ہوا ہے۔ اس الماری
پر چڑھ جاتے۔ اور اوپر۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ جس طرح آپ نے اس روز امرود توڑا تھا۔
جی۔۔۔ چڑھ جا بیٹا سٹولی پر۔ رام بھلی کریں گے۔ شاباش۔ تھینک یُو۔ اب اپنے
نفیس رومال سے اسکی گرد صاف کیجئے۔ کُڈ۔ تھینک یُو۔ اب دیکھئے آپکو اسمیں کیا
نظر آتا ہے؟“

” کھیریل کا ایک برآمدہ ہے۔ اسکے سامنے کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ شاید
میاں بیوی اور انکی اولاد۔“
” جی اور بتائیئے۔“

” ایک جوان لڑکی ہے۔ ایک کمسن۔ تین کمسن لڑکے اور ایک کوئی پچیس سالہ
نوجوان۔ کوٹ کے کالر پر گولڈ میڈل لگائے۔“
” کرسیاں کیسی ہیں؟“

” معمولی۔ جیسی کرسیاں ہوتی ہیں۔“

” گھر کیا ہے؟“

” اوسط۔ جیسے شرفار کے گھر ہوتے ہیں۔“

” کرسیوں کے نیچے ایرانی قالین بچھا ہے؟“

” نہیں باباجی۔ دھاری دار درسی۔“

لے پیر بخارا لکھنؤ کا ایک محلہ ہے جہاں کی عورتیں اپنی تیز زبانی اور طراری کے لیے مشہور ہیں۔

”حضرات ایتھویر بے بی براؤن سے کھینچی گئی تھی۔ آج سے تیس سال قبل جب میں نے ناگپور کی ایک میوزک کانفرنس میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ یہ میرے والدین ہیں۔ دونوں چھوٹی بھینیں اور تینوں چھوٹے بھائی۔ مقام اللت پور۔ وقت۔ ۱۹۵۶ء۔ دیگر احوال: والد اوسط درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ بیدایماندار اور مستشرق۔ چند ایکٹرز میں پرکاشت ہوتی تھی۔ اولاد مقامی اسکولوں میں زیر تعلیم۔

”میری والدہ اباجی کی پہلی بیوی ہیں دوسری سے یہ پانچوں۔ یہ لوگ بڑے ہو چکے تھے جب انکی ماں کا انتقال ہو گیا۔ انکو انکے نہایوں نے یہ سٹی پڑھائی کہ میں نے اباجی اور اپنی والدہ کے ساتھ سازش کر کے انکی ماں کی دوا میں زہر ملا دیا تھا۔ اس بہتان نے والد کو دل شکستہ کر دیا۔ میں نے پرداہ نہیں کی۔ نہ ان پانچوں کی محبت میرے دل میں کم ہوئی۔

”ہم اپنی میڈیوکر قانع زندگیاں گزارے جاتے اگر ملک میں REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONS نہ آیا ہوتا اور مجھے پکا گانا سیکھنے کا شوق نہ ہوتا میں کالج میں پڑھتا تھا اور شام کو گانا سیکھنے ایک گوالیاری استاد کے پاس جاتا تھا۔ وہ استاد ایک بندلیکھنڈی نواب زادی کو ستار سکھلاتے تھے۔ اس طرح اُس نیک بخت سے اس بد بخت کی ملاقات ہوئی۔ عشق صادق دونوں طرف پیدا ہوا۔ باپ کے خلاف مرضی شادی پر تیار ہوئی۔ سن رہے ہیں ؟“

”ہم تن گوش“

”ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ مجبوراً بندے کے عقد میں اسے دیدیا۔ وہ کثیر زیورات اور جہیز لیکر عزیز خانے پر آئی۔ بہت جلد میری بہنوں نے اس غریب کی زندگی اجیرن کر دی۔ والد صاحب کی نیشن ہو گئی۔ مہنگائی تیزی سے بڑھی۔ میں مقامی کالج میں انگریزی کالیکچر رہو گیا۔ شام کو ٹیوشن کرتا۔ تاکہ بھائی بہنوں کی تعلیم مکمل کر سکوں۔ تمنا تھی کہ ایک روز سنگیت سمرٹ کہلاؤں۔ سارے عالم پر اپنے فن کی دھاک بٹھاؤں۔

”سنئے کیا آپ حضرات کو واقعی میرا گانا پسند آیا؟ عرصہ گزر گیا مجھ سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہاں تم ایسے ماہر فن ہو۔ کسی نے مجھ سے گانے کی فرمائش نہیں کی۔ آپ جو کہیے سناؤں گا۔ مگر وہ لوگ نہ آجائیں۔“

”ڈریئے مت باباجی۔ ہم لوگ آپکے ساتھ ہیں اپنا قصہ پورا کر دیجئے“

”سمتیرگان نے یہ ضد کی کہ میرا نڈ ہاؤس دہلی میں پڑھیں گی۔ بیوی کے چند زیور فروخت کر کے انہی یہ فرمائش پوری کی۔ ایک بار باباجی ان سے ملنے دلی گئے۔ ہوسٹل کے پھانگ پر تانگے سے اترے۔ معمولی شیروانی پہنے مسکین سے آدمی۔ بہنوں نے کالج میں بڑھانگ رکھی تھی کہ بندریلکھنڈ کے جاگیردار کی بیٹیاں ہیں۔ والد کو دیکھ کر دوسری لڑکیوں سے کہا ہماری ریاست کے منشی جی آتے ہیں۔ باباجی نے یہ بات سن لی۔ اس دن سے انکا جی دنیا سے اچاٹ ہوا۔ رفتہ رفتہ SENILE ہو گئے۔“

”ابھی میرا دل دنیا سے اچاٹ ہونا باقی تھا۔ اب باقی کل“

”یہ غضب نہ کیجئے باباجی — کیا پتہ وہ لوگ آج شام کی فلائیٹ سے ہی لوٹ آئیں؟“

”پھر کہاں ہم کہاں آپ دونوں؟ بہت خوب سنئے۔ نیک بخت کے ہاں پہلو مٹھی کے بچے کی ولادت کی ساعت آتی۔ میں ضروری کام سے جھانسی گیا ہوا تھا۔ والدہ نے بہو کے لئے ڈاکڑنی بلانا چاہی۔ بہنیں دلی سے آئی ہوتی تھیں بولیں لیڈی ڈاکڑ فیضول خرچی ہے۔ محلے کی قابلہ۔ بلوانی گئی جو کیس سنبھال نہ پائی۔ جب میں گھر پہنچا ماں اور نوزائیدہ بچہ کھیریل کے نیچے کھڑی چار پائی پر مردہ پاتے۔“

”بیوی اور بچے کی موت کے صدمے سے، بہن بھائیوں کی یحسی اور بے رحمی سے میرا کلیجہ الٹ گیا۔ قلب لوٹ گیا۔ آپ جانتے ہیں کس طرح لوٹتا ہے قلب؟ نہیں جانتے — حضرت دیوانہ ہو گیا۔ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ قبرستان کے نزدیک ایک درگاہ میں جا بیٹھا۔“

” اس خطے میں بھی اولیاء کے مزارات کی کثرت تھی۔ میں نے ان بزرگوں سے گفتگو شروع کی۔ ایک طرف سُن رکھا تھا آدھی رات کو اولیاء ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ رات رات بھر سرگراں رہا کہ انوار کی جھلک مجھے نظر آجائے۔ مگر نہیں صاحب۔ پردے اتنی آسانی سے تھوڑا ہی اٹھتے ہیں ورنہ سبھی واقف اسرار ہو جاتیں۔

” بیابانوں میں مارا مارا پھرا۔ ایک سنان گھنے جنگل کے وسط میں الاؤ جلتا دکھلائی دیا۔ چند ملنگ اسکے گرد بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ وہ الاؤ علی کا ڈھونڈنا کہلاتا ہے۔ اور قلندر اسے چوبیس گھنٹے سلگائے رکھتے ہیں۔ وہ ملنگ اپنے دستور کے مطابق لوہے کے کڑے اور زنجیریں پہن رہتے تھے۔ میں بھی ان کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ انکے ساتھ ایک بڑے جہان مستور کی سیر کی۔ ایک درویش ایسا دیکھا جو اچانک اُڑ کر اونچے درخت کی پھننگ پر جا بیٹھا تھا۔ پھر واپس آجاتا تھا اور بالکل خاموش رہتا تھا۔

” مسکرائے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ ایسوجہ سے میں آپ لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خیر تو اب میں دن دن رات رات بھر بھوکا رہتا۔ طرح طرح کی ریاضتیں کرتا۔ چلے کیھنچتا۔ اس عالم میں مجھے HELLUCINATION نظر آنے لگے۔ چاروں قسم کے۔ بصری۔ سمعی۔ حسی۔ لمسی۔ خوشبوؤں کی پیٹیں آنے لگیں۔ درگاہوں میں جب تو آل ترانہ شروع کرتے — علیؑ مولا من کنت مولا — میں وجد میں آکر رقص کرتا — خواجگانِ چشت کی پیروی میں۔

” گھومتے پھرتے بندیلکھنڈ سے روہیلکھنڈ پہنچا۔ وہاں بھی درگاہوں کی افراط پائی۔ گاؤں میں رات کے وقت روہیلے پٹھان دف پر چہار بیت کے مقابلے کرتے۔ انکی ٹولیوں میں شامل ہو جاتا۔ جہاں کہیں کسی طرح کی موسیقی کی آواز سنائی دیتی میں اس طرف لپکتا۔ چند ماہ ایک قوال پارٹی کے ساتھ بھی گھوما۔

” مگر آپ ایک ماہر گویئے ہیں کہیں کسی میوزک کالج میں ملازمت کر لیتے۔ اس طرح کوچہ گردی سے کیا حاصل ہوا؟“

”کوچہ گردی اور صحرا نوردی کا لطف عاشقانِ پاک طینت سے بوجھو سے

تن من دھن سب راکھ بھینو

لگ گئی آگ بھینور میں“

”باباجی آپ ڈرامہ بھی اچھا کھیل سکتے ہیں۔ افسوس ایک فرسٹ ریٹ پرفورمنگ آرٹسٹ کی زندگی اس قید خانے میں رائیگاں جا رہی ہے۔“

”اور شجاعت کے جنگل کے شیر علی کا کوئی نام ایسا مجھے چھڑانے نہیں آتا۔ سینے ایک بار میرا گزر رامپور کے ایک گاؤں سے ہوا۔ جہاں لوگ رات کے وقت الاؤ کے گرد جمع ایک قسم کی آٹھا گارہے تھے۔ ہمارے بندیلکھنڈ کی آٹھا اودل جیسی بناؤں —؟ افسوس میرے پاس کوئی ساز نہیں وہ تعالیٰ اٹھا دیجئے۔ دف کا کام دیتی ہے۔ حضرت میں اردو ہندی بھوچپوری پنجابی رقم رقم کے گانے گاسکتا ہوں۔ بنارس کے ایک گرو سے کتھک سیکھا ہے۔ جب لٹ پور کالج میں پڑھتا تھا جھانسی ریلوے کو لوہی کے اینگلو انڈین چھوکروں چھوکریوں کے ساتھ انگریزی گانے گاتا تھا۔ اس وقت آپکی خدمت میں ایک روہیلکھنڈی آٹھا پیش کرتا ہوں — سینے گا — محمد بن حنیفہ پسر علی دیوؤں سے کس طرح لڑے تھے۔ ایک غلام بادشاہ توران سے جا کر عرض کرتا ہے

اک لڑکا مسلم کا شاہ گھس گیا شاہی بارغ میں آئے

ڈراور نا کچھ خوف تھا اسکو پسر علی کا ہے بتلائے

”تو شاہ اپنے سپہ سالار سے بولا۔ کیا بولا —؟

لشکرے جا ساتھ تو اپنے پسر حیدر کا ہیں بتلائے

بیٹا ہے گر شیر علی کا اکلے سے مارا نہ جائے

غضبھی ہے اور بڑا کھلاڑی بتلا میں حیدر کا لال

باپ نے اس کے دنیا بھر سے دیوی دیوتا دیئے نکال

بولا آگے بڑھ کر حاکم سُن رے لوندے کان لگائے

کیوں توڑے ہے خدا ہمارے سانچی ہکودو بتلائے

”باباجی۔ بات سینے۔“

”اب سینے صاحب۔ عمر عیار شہزادی ماہ پروین کو بیاہنے کی مہم پر چلے۔“

باباجی۔ ایک بات سینے۔ وقت ہمارے پاس کم ہے۔“

”پہلے مسجد نبویؐ میں پہنچے۔ وہاں کیا دیکھا۔؟“

ابوبکرؓ نے کو بیٹھے دھورے انکے عمر فاروقؓ

پاس انکے عثمان غنیؓ ہیں اور بھی بیٹھے شاہ ملوک

حسن حسین آئے گئے ہیں شیر علیؓ کے دونوں لال۔“

”باباجی۔“

”ابے کیا باباجی کی ٹانگا رکھی ہے۔ بڑے آپ طرم جنگ بنتے ہیں۔ ہے آپ میں

اتنا بوتاکہ ایک بیگناہ بے قصور آدمی کو ان موزیوں ان دیو و دوز کی قید سے چھڑوا لیں؟

نہیں ہے نا۔؟ اب آگے بات کیجئے۔ کہنے لگے ہم آپ کے پر خلوص دوست ہیں۔

”صاحبان ذی شان مہربان پانڈان خاصدان۔ اب آگے کا سین احوال۔ عمر عیار

کا شاہ توران کے سامنے رسولِ خداؐ کی چھٹی پیش کرنا۔

آ۔۔ سرخ ہوا غصے میں کافر سکر اس چھٹی کا حال

پھاڑ ریاض احمدؓ جی کا ٹکڑے ٹکڑے کیے فی الحال

بکھرے پھر نو ایسے عمر و ایک ہاتھ میں لیتے تلوار

لات کسی کے ڈھال کسی کے مارن لاگے عمر عیار۔“

”ارے رے رے باباجی یہ کیا۔ ارے آپ تو ہمیں کو مارنے لگے۔“

”گڈ گڈ۔ ارے بھئی بس کیجئے۔“

”دیو ہوں میں اور بھنگا ہے تو مجھ سے کیوں لڑنے کو آئے

بیجھ تو لڑنے نبی علیؓ کو تو کیا جانے رن کی سار

۔۔ زندہ ہے جب تک یہ لونڈا نبی علیؓ کیوں لڑنے آتیں۔“

”باباجی — باباجی صاحب — بس کیجئے — دیکھئے آپکی ڈاڑھی کا احترام ہے
ورنہ ہم بھی آپکو ٹھیک کر دیتے۔“

”ابے جاسالے۔ مجھے بھی تیری کچھڑی مونچھوں پر ترس آگیا۔ ایک گھونٹے میں
ہانپنے لگا۔ بڑا عمر و عیار کا جانشین بنتا ہے۔ آیا تھا اپنے حسابوں انگلیڈ سے چل کر میری احمق
الذی بہن کو ٹنگنے — ابے بڑھو گلہ فام — تیرے تو میں دھوئیں اڑا دوں — گاجر
کے حلوے گل خیر و کے پھول —“

”آپکو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس سیز بخارا کی شہدن نے آپکو یہ اطلاع صحیح نہیں پہنچائی۔
”چپ بد معاش۔ اور ٹوڈا کڑ بوگس کا شعری۔ میں شاہ توران ہوں تجھ تورانی
طیب کا بھی حلیہ ٹائیٹ کر دوں۔ ادھر بے چاری ڈاکرٹی کو سبز باغ دکھلاتا ہے ادھر
میری چھوٹی بہن۔ اس بھولی بیوقوف لڑکی پر ڈورے — ایک ٹکٹ میں دو تمسٹا
— کیوں؟ اچھا جاؤ بچہ۔ تمہیں بھی معاف کیا بیٹھ جاؤ۔ سالے نقلی امریکن —
آئے تھے۔ ہماری مدد کرنے۔ ارے آپ کیا مدد کریں گے ہماری —
”پھر وہی اچھا اچھا تشریف رکھیے۔ صراحی کہاں ہے؟ پانی پیئے۔“

”معاف کرنا مسٹر۔ میں نے تم لوگوں کو پہلے خبردار کر دیا تھا اگر ایک بارگی مجھ پر پڑ
گیا دورہ پھر تمہاری خیر نہیں۔“
”باباجی اگر دوبارہ ہماری ٹھکانی نہ کرنے کا وعدہ کیجئے تو عرض کروں آپ بہترین
ادا کار بھی ہیں۔ واقعی کاش آپکا اتنا اور سٹائیل ٹیلنٹ اس طرح برباد نہ ہوتا۔“
”اچھا اب باقی قصہ سنو گے؟“

”بالکل لیکن بیچ بیچ میں کچھ گائیے بجائیے گا نہیں۔ یہ عادت آپکی خطرناک ہے
”ٹھیک ہے۔ جاؤ معاف کیا۔ علی کے دھونے کے دھورے بیٹھ جاؤ۔“

”اچھا صاحب۔ تو میں حضرت سلطان العارفينؒ کی سرزمین روہیلکھنڈ سے نکلا۔“

لکھ جگاتے جوگیوں کا ساتھ ہو گیا۔ گنگاپار کی حضرت سلطان الاولیاء نظام المشایخ کے ودھی یاروں کے ملک میں داخل ہوا چندے زرد پوش دارثی فقرا کی صحبت اٹھائی۔ یہاں سے پورب کا رخ کیا۔ بنارس جا پہنچا۔“

”جہاں آپ نے پنج گنگا گھاٹ پر اگھوڑیوں اور کپالیوں سے متنترک لوگ سیکھا۔“
 ”بالکل غلط۔ جھوٹ سراسر جھوٹ سفید جھوٹ۔ متنترک سیکھنا جان جو کھوں کا کام ہے۔ پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ یہ ہوائی بھی میری گدھیا بہن شہوار نے اڑائی ہوگی۔“
 ”سنا ہے آپ لوگوں کو الو کا گوشت کھلا دیتے ہیں۔“

”جو لوگ پیدا نشی چُغند ہیں انکو مزید لحم چُغند کھلانے کی کیا ضرورت ہے۔ گو تھاس کے چڑھیاروں کے ہاں ایک اچھا اُلو واجی قیمت پر مل سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے؟“
 ”باباجی۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ۔“

”جی صاحب سمجھ گیا۔ کچھ بعید نہیں شہوار نے پیر بخارا کی اس شہدن کو پٹی پڑھا دی ہو کہ جاکر ڈاکٹر عنبرین کو اس طرح کی لغو باتوں سے ڈراتی رہے۔“
 ”مگر آخر کیوں۔؟“

”عورات کے ذہنوں کے بھید کون جان سکتا ہے؟ عورت عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ نہیں صاحب۔ خاطر جمع رکھیے۔ OCCULT کا شوق بہت تھا۔ ہاتھ کچھ نہ آیا بس مارا مارا بھرا۔ تو اپنیوں اور کیرنوں میں بے تکان گایا۔ نوٹنکیوں میں سوانگ بھرے۔“

”مرزا پور میں ایک نوٹنکی لیلے مجنوں دکھا رہی تھی۔ اس میں شامل ہو گیا۔ مجنوں کا پارٹ کرنے لگا۔ ذکیہ جنتی کی یاد سے دل میں ہوک اکٹھی۔ مجنوں کے بھیس میں ایسے لغے لگائے کہ منڈوے کی چھت اڑ گئی۔“

”ذہیں پر میرے بھائیوں کے کسی شناسا نے مجھے پہچان لیا۔ فوراً انہیں اطلاع دی۔ وہ لوگ لت پور سے آئے۔ پکڑ کر گھر لے گئے۔“

”یہاں تو انہوں نے سوتیلا پن نہیں دکھایا۔ خون کی محبت نے جوش مارا۔“
 ”حضرات! اس وقت میں بھی ہی سمجھا تھا۔ مگر دراصل یہ میری مرحومہ بیوی کے
 زیوروں کی محبت کا جوش تھا جسکے لاکر کی کچی اس غریب کی جوانمردی کے بعد جوش جنوں
 میں نے کہیں پھینک دی تھی۔ اور وہ میری عدم موجودگی میں تلاش بسیار کے باوجود
 انکو نہ ملی تھی۔ ملتی بھی تو لاکر میرے نام کا تھا۔ قصہ کو تاہ قلب پہلے ہی گداز ہو چکا تھا۔
 والدین اور بھائی بہنوں کی محبت میں روتا پٹینا وطن پہنچا۔ گھر کی حالت ناگفتہ بہ نظر آئی۔
 سات آٹھ سال غایب رہا تھا۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔
 انکی خالہ کی لڑکیوں سے۔ دونوں کو معمولی سی ملازمتیں مل گئی تھیں۔ گرائی بڑھتی جا
 رہی تھی۔ میرا نڈا ہاؤس سجد مہنگا کالچ تھا۔ دونوں بہنیں کوئی ڈگری ایسے بغیر واپس
 آگئی تھیں۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے انکے بیاہ نہیں ہو پائے تھے۔ جس قسم کے عالی مقام
 شوہر وہ چاہتی تھیں۔ ہم کم حیثیت لوگوں کو اس وقت دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ دونوں
 ایک مقامی گریڈ اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ ذکیہ مرحومہ کے جہیز کی بیش قیمت اشیاء
 فروخت کر کے انہوں کو دونوں بھائیوں کی شادیاں رچائی تھیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ
 میری تلاش ان لوگوں کو بنک والے زیورات کی وجہ سے تھی پھر بھی، میں خوش ہوا کہ
 انہیں میری یاد آئی۔ گھر واپس بلایا۔

” بڑی بہن کا اصل نام خوشنودی ہے۔ چھوٹی کا آبادی۔ بڑی لکھنے کی خداداد
 صلاحیت رکھتی تھی۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے اس نے رومانی ناول لکھ کر دو دو سو
 روپے میں نگار خانم کے فرضی نام سے دلی کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کیے۔ میں
 یہ ضرور کہوں گا ان دونوں نے بڑی بہادری اور محنت سے اتنے دنوں گھر کی گاڑی
 چلائی۔ تینوں بھائی ایسوجہ سے انکے بہت ممنون تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کی
 تعلیم انہوں ہی نے پوری کروائی۔ میں نیم دیوانہ کسی نوکری چاکری کے لائق نہ رہا
 تھا۔ گھر والے بھی مجھے مجزوب سمجھنے لگے تھے۔“

”ایک رات، رمضان شریف کی گیارہویں تاریخ میں نے خواب میں ایک ہرا بھرا نکل دیکھا۔ برف پوش پہاڑ اور لکڑی کی ٹالیں۔

”صبح اٹھ کر بھائیوں سے کہا۔ ہلدوانی جاؤ اور لکڑی کی تجارت کرو۔ اللہ برکت دے۔ اسی روز مندوچہ زیورات بنک سے نکال کر انکے حوالے کیا اور کہا اسے فروخت کر کے ٹمبر کام شروع کرو۔ وہ تینوں ہلدوانی پہنچے۔ لکڑی کا بیوپار کیا۔ جنگلات کے ٹھیکے لینے لگے۔

”حضور علیگڑھ اور نیڈمڈل کلاس کو باجماعت پاکستان سدھارے جگ بیت تھے۔ دیوبند بریلی اور نیڈمڈل چھوٹے بڑے سرمایہ دار نے اسکی جگہ لی۔ جنگلات۔ ٹرانسپورٹ۔ صنعتیں جنگی فنکاری مغل انکے اجداد کو سکھلا گئے تھے۔ نورجہ فیروز آباد۔ بیدر۔ مری پور۔ لم گڑھ۔ مراد آباد۔ نگینہ۔ اور صاحب سارا کوشل ساؤتھ۔ اور کانپور کا پنجابی سوداگر ربمبئی کا نوجو بوہرہ ٹائیگون۔ گجرات کے چھپی۔ یو۔ پی کا جولاہا۔

”ڈاکٹر صاحب۔ زمیندار اور پروفیشنل کلاس کی جگہ ایک باہمت بارش الحاج رخانے دارہمارے سامنے کھڑا ہے۔ بھیا نک فساد ہوتے ہیں۔ وہ انہیں بہادری سے چھیل لے جاتا ہے۔ وہ نئی مساجد تعمیر کرتا ہے سیاسی اور سماجی اعتبار سے زیادہ تر دائیں بازو کا حامی۔ عموماً دیانت دار۔ اوسط درجے کے زمیندار جو ابولیشن کی زد میں آئے انہوں نے اپنی زمینوں پر بھٹے، کولڈ اسٹوریج چھوٹے کارخانے لگائے ہیں۔

”شاہ جی مسلم انٹیٹینیا اور پروفیشنل کلاس میں بھی توتیزی سے اضافہ ہوا ہے“

”شیر۔ شیر۔ اور رکشا والوں کی تعداد میں بھی۔ ڈاکٹر صاحب“

”آبادی بے پناہ بڑھ رہی ہے شاہ جی“

”ڈاکٹر صاحب ہم اس سیمینار کو مختصر کر کے باباجی کی داستان پر واپس آئیں؟“

”شاہ جی۔ کاش آپ۔“

”جی ہاں حضور۔ اے کاش۔ کبھی میں بھی تصور کرتا ہوں یونیسکو پیرس کے موسیقی میں بیٹھا خیال کے اور چین پر ریسرچ میں منہمک ہوں۔“

”خیال کے ادیبین پر ریسرچ۔ لطیف نکتہ ہے!“
 ”شکریہ۔ کبھی سوچتا ہوں اڈینر افسٹوں میں تانیں اڑا رہا ہوں۔ اور البرٹ
 ہال لندن — دنیا ان مواقع سے انہی لوگوں کو ہمیشہ محروم رکھتی ہے جنکے وہ سب سے
 زیادہ اہل اور مستحق ہیں۔“

”باپاجی ممکن ہے اس شک کی وجہ سے بھی آپ کے بھائیوں نے آپ کو اور خود اپنے
 باپ کو ایسی کڑی سزا دے رکھی ہے۔“

”کون سا شک و حسرت دنیا شکوک ہی پر قائم ہے۔“

”وہی کہ انکی ماں کو خدا نخواستہ آپ نے — یعنی! — YOU DID HER IN!“

”ممکن ہے۔ ایک شرمی رشتے دار میرے نانا سے ایک مقدمہ ہار گیا تھا اسکا بدلہ اس نے
 یوں لیا کہ ہمارے خلاف ان پانچوں کے کان بھرے اور خود کراچی نکل گیا۔“

”بھائی اسمگلر وغیرہ نہیں لیکن سرمایہ داری کے اندر جال کے ماہر جادوگر۔ میری
 شدید ایمانداری انکے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے رانچی بھجوا دیا۔ اپنے
 ذاتی ڈاکٹر کے ساتھ اسٹیشن روانہ کرتے وقت مجھ سے بولے بھائی جان پوری سوسائٹی
 اوپر سے نیچے تک بے ایمان اور کرپٹ ہو چکی ہے آپ ہمیں ہی ایمانداری کی تلقین کیوں
 کرتے ہیں۔ وہی کلیشے جو آجکل ہر شخص دہرا رہا ہے۔ لو صاحب۔ مجھے پاگل خانے بھیج کر
 خود یہاں آگئے۔“

”سال بھر رانچی میں بند رہا۔ اس صدمے نے والدہ کو قریب المرگ کر دیا۔ انہوں
 نے ان لوگوں سے التجا کی کہ مجھے واپس بلوائیں۔ چاہے بیٹریاں پہنا کر رکھیں۔“

”میری دیوانگی اور رانچی جانے کی خیران برادران یوسف کے لیے بھی ایک پرہیزگار
 تھی۔ اگر یہ مشہور ہو گیا کہ بڑا بھائی سڑھی فاتر العقل ہے تو پاگل پن موروثی سمجھا
 جائیگا۔ بہنوں منجھلے بھائی اور آگے چل کر پرسی بیگم اور دوسرے بچوں کی شادی بیاہ
 کھنڈت پڑے گی۔ لہذا مجھے واپس بلا لیا گیا۔ لیکن والد انکی مفروضہ سابق جاگیر کے

درمیں انکا بیٹا بتلایا گیا۔ یہ جاگیر والی بات بہنوں نے مشہور کی تھی۔ بھائیوں کا اس من گھڑت میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن اسے نبھانا پڑا۔ ارے سربراہ آج اشتہار ایک دیکھا کہ ناچیس گئی شب کو مس آقبال پتلی۔

”چنانچہ جیسا کہ آپ نے اس جشن اجراء کی شام بس آقبال پتلی — سوری — مس نواب بانی کی تصویر کے فراڈ کے انکشاف کے موقعے پر ملاحظہ فرمایا — دیوانہ میں نہیں میری بے چاری بہنیں ہیں۔ اللہ انکا محافظ ہو۔ اللہ میرے بھائیوں کا بھی محافظ ہو۔ میں اس اندھیری سُرنگ کے آگے جو باغ ہے اس میں اپنا وقت گزارتا ہوں۔ شاید کوئی خدا ہے — شاید کوئی عالم روحانی ہے۔ ورنہ سب ذہن کے الجھٹے — گتھیوں کی گتھیاں — امید پرست دماغ جو سبز باغ دکھلاتا ہے — ورنہ سب سبز فام مُردوں سے آباد جہانِ مہمات —“

”مگر یہ آپ کے بھائی —“

”یہ اخوان الشیاطین —“

”مطلب یہ کہ کیا وہ واقعی اتنے بد نفس اور بے رحم ہیں؟ آپکے بھائی بہن تو اس داستان کی روشنی میں بدی کے پتلے معلوم ہوتے ہیں۔“

”گو یا ابتلائے مسیح کے ایلز تبصن ڈرامے میں شیطان اور اسکی ڈریاٹ —؟ بیشک وہ ایسے ہی ہیں۔ انکی شخصیتوں کا وہ پہلو جس سے میرا سابق پڑا ایسا ہی ہے۔ خود غرضی انسان کو پیٹ بھر کر بد اور احسان فراموش بنا دیتی ہے۔“

”صاحبزادہ صاحب۔ آپکو ایک نہایت خوش اطوار خوش مزاج دلکش اور دلچسپ آدمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اندر سے آپکی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی ہے —“

”جی۔۔۔؟“

”جب وہ انگریز لونڈا یہاں آیا تھا وہ شاعر چھو کر اور اس کے ڈنر کے موقعے پر ڈاکٹر صاحب آپ نے میری چھوٹی بہن کے سامنے ذکر فرمایا کہ صاحبزادہ دلشاد علی خاں

کو مافیما دنیا و ما فیہا سے بے نیاز کر کے عالم بالا کی طرف چلتا کر چکی ہے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہے؟ کیا مسلسل قید تنہائی انسانوں کو واقعی PSYCHIC

دیتی ہے؟“

”نہ سائیکلک نہ پائیکلک۔ بندے کی عادت ہے کہ کن سوتیاں بتا ہے“

”—۶۶—“

”جب کوٹھی میں کوئی اہم ڈنر پارٹی ہوتی ہے خاکسار چپکے سے جا کر اس کھڑک کے نیچے جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہے۔ حضور والا آپ بھی مجھے وہاں دوبار دیکھ چکے ہر اسی طرح راجہ صاحب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائیوں نے آپکے مخفی احوال کے متعلق اپنے کھوجیوں کے ذریعے ساری انکوائری مکمل کروالی ہے“

”جی—۶۷—“

”جی ہاں۔ مگر فکر مت۔ وہ آپکو کوئی گزند نہ پہنچائیں گے کیونکہ اس صورت

میں انکی مزید بدنامی کا خدشہ ہے“

”باباجی ایک بات بتائیے۔ جب آپ اکثر اس قید خانے سے نکل بھاگتے ہیں تو یہاں

فرار کیوں نہیں ہو جاتے۔؟“

”ڈاکٹر صاحب۔ پھانک کے گورکھوں سے بچ کر اگر نکل بھاگوں تو جاؤں کہاں۔

پھر در بدر بھٹکوں۔ بھیک مانگوں۔ اب اس عمر میں مزید آوارہ گردی کی ہمت نہیں بھننا

ہوں اور تنہائی کے عفرتوں سے بیٹھا لڑا کرتا ہوں“

”باباجی— چلیے آپکو مغرب میں انٹروڈیوس کر دیں JET-AGE سوامیوں کے

سرکٹ میں۔ میں آپکا منیجر بن جاؤں گا۔ واقعی اس تجویز پر غور کیجئے۔“

”راجہ صاحب۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بنوایئے میرا پاسپورٹ اور لے چلیئے سا

سوامی تو نہیں ایک استاد گویئے کی حیثیت سے۔ مگر مجھے نکلنے کون دینگا۔؟ میں ان لوگو

کے معاملات کے بہت سے راز جانتا ہوں۔ اور باہر کی دنیا میں جا کر اب کروں گا بھی

میری ہمت شل ہو چکی ہے۔ مجھے اپنی ہولناک تنہائیوں، تاریکیوں اور اندرونی آوازوں

اور سنناتے سناٹوں کی عادت ہو گئی ہے۔ میں موسیقی کی خاموش آندھیوں کی زد میں زندہ ہوں۔ میں ایک دھوئیں کی لکیر یا ہولے کی طرح ایک سوراخ میں رہتا ہوں۔ جب اس سوراخ پر گندگی انڈیلی جاتی ہے۔ تو برا فروختہ ہو کر جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہوں۔ جیسے اس شام نکلا تھا جب نواب بانی کی تھویر کے وسیلے سے میرے خاندان کے ناموس پر سیری جاہ پرست ہمشیرگان نے کچھڑا انڈیلی تھی۔

”چوبیس گھنٹے یہ اس کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل رہتا ہے۔ میں کھڑکی میں سے جھانکتا رہتا ہوں۔ بسنتی یا دوسرے ملازم کھانا اور چائے لیکر آتے ہیں تب یہ دروازہ کھلتا ہے۔ یہ غریب لوگ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور باہر کی رتی رتی خبریں مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔ الامان والحفیظ۔“

”مگر خدانہ کرے جو ڈاکٹر عزیز کی یہ حالت ہو۔ وہ مجھے ایک ہوز مشرنگ کے اس پار باغ میں ٹہلتی نظر آئی تھی۔“

”باباجی۔ آپ بالکل صاف باتیں کرتے کرتے پھر اپنے استعاروں میں چلے جاتے ہیں۔“

”جی ہاں کیوں نہیں۔“

”کیوں نہ؟“

”کیا آپ سب نارمل صحیح اندماغ لوگ اکثر و بیشتر ایسا نہیں کرتے؟ پوری طرح“

صاف بات کون کرتا ہے۔ سوائے پاگلوں کے۔؟“

”باباجی۔ کیا عجب اس باغ سے لوٹ آئیگی؟“

”یقیناً۔ اسکا مرض لا علاج نہیں۔ کیونکہ اس سے محبت کرنے والی دو ہستیاں“

ہیں۔ اسکی ماں اور آپ۔ ڈاکٹر کا شغری۔ آپ دونوں مضبوط ہستیاں ہیں۔ مجھ سے“

محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ سوائے میری کمزور اور لاچار ماں کے۔ باپ خود۔“

”باباجی۔ آپ رو رہے ہیں۔“

”اب آپ صاحبان تشریف لے جائیں۔ آؤٹ۔ آؤٹ۔ آؤٹ۔ بھاگ جاوے۔“

بھاگ بے لٹو — جلدی جھٹ پٹ — وہ خواجگان مہنر نام تمہاری گھات میں
 ہیں۔ کالی ندی پر کالی ناؤ بندھ گئی ہے۔ تمہاری منتظر۔ راجہ دلشاد علی خاں آپ بھی بے
 نیل و ملام یہاں سے لوٹ رہے ہیں۔ میرے بھائیوں نے آپکے متعلق اپنی انکو ایئر میکل
 کروالی ہے۔ اور خوشنودی عرف نگار خانم پر آپ سے ملنے کی پابندی لگا دی ہے اس
 وجہ سے وہ اسے اپنے ساتھ بنگلور لے گئے ہیں۔ تاکہ اس دوران میں انکا جنرل منیجر یا
 کوئی سکریٹری آپکو نہایت عزت و تکریم کے ساتھ دلی لیا کر لندن والے ہوائی جہاز پر
 بٹھال دے۔

”اب ٹوٹکی۔۔۔ قاصد آیا لیکے پاتی جس میں مطبل سارا۔ بانچے کون اب چل دیا
 آپ ہی باچن ہارا۔۔۔ خبر آئی ہے واں سے، ہوگئی ہے یاں خبر پہلے۔ اجی یاں خبر
 سوچ سوچ کے بن ناحق کو مور کھ تو ہے روتا۔ تجھے لازم تھا۔ اے تجھے لازم تھا اپنے
 کام کرنا سوچ کر پہلے۔

”آپ یہاں سے ناکام لوٹ رہے ہیں۔ ٹھا کر صاحب۔ اور جب آپ کا ہوائی جہا
 یہاں اوپر سے گزرے گا میں اس کھڑکی میں سے رومال ہلا کر آپکو ٹانگڈ بانی کہوں گا۔

بھاگ جا بے THE PITY OF IT, IAGO, THE PITY OF IT.

— ذرا اس کھوٹی پر سے میری ترکی ٹوٹی اتار کر دیتے جانیے۔ اب میں دی ڈانینگ درویٹر
 آف تو نیہ بنتا ہوں۔۔۔ بشنو۔۔۔ بشنو۔۔۔ از نے چوں حکایت می کند۔ چوں۔۔۔“



(۳۴)

بن دیوی

” — ہے عشق اور جنوں بھی — کہیں آہ سرد — کہیں دل میں درد —
کہیں رنگ زرد — ہے یوں بھی اور —“
” پناہ بجزا — یہاں بھی فوشنگی ہو رہی ہے۔ جدھر جاؤ ادھر فوشنگی
” ہے یوں بھی اور یوں بھی —“
” عنبر — یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“
” اک مہ جبین نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے —!“
” کیا تم خطلی لوگ گائے بغیر بات نہیں کر سکتے؟“
” — ہے مگر اداس — نہیں پی کے پاس —“
” عنبر تم پھر گھر سے نکل بھاگیں — یہ کیا رلیٹ —“
” نہیں پی کے پاس — غم و رنج و یاس دل کو پڑے ہیں سہنے۔“

“ STOP SHOUTING AMBER YOU CANT SING FOR NUTS ”

” پھولوں کے زرد گہنے — اک مہ جبین نے پہنے۔“

“ AMBER, HONEY, I'M SORRY, BUT YOU' CANT DANCE EITHER ”

” پائپ ڈاؤن۔ میں نواب سگیم اور بلبل دی ڈانسر کی اولاد ہوں۔ ان سے بہتر
ناچ سکتی ہوں“

” عنبر۔ پلیز۔ بات سنو۔ تمہاری امی مسجد پریشان ہیں۔ تم کارے کر بھرنکل بھاگیں۔“
” تم لوگ مجھے بابا سبز پوش کی طرح قید میں رکھنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری سازش
کا میاب نہیں ہونے دوں گی — لو پھر سنت آئی۔“

”بیٹھ جاؤ۔ اس صوفے پر — آرام سے۔ شاباش۔“

”مجھے زنجیروں سے تو نہیں باندھو گے؟“

”ہرگز نہیں۔“

”تھینک یو۔“

”یہاں کیسے پہنچیں —؟“

”لوگ کہیں سے کہیں کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ طیور آوارہ۔ سائبریا کے پرندے۔“

”ناٹک بند کرو عنبر۔“

”امی جان کار کی کنجیاں چھپا دیتی ہیں۔ گملوں میں — گملے بدلتی رہتی ہیں۔ میں بھی

جنگلی چوہیا کی طرح لگی رہتی ہوں۔ سارے گملے میں نے کھو ڈالے۔ نکال لیں کنجیاں۔“

”تم کو پتہ ہے تمہاری والدہ کس قدر پریشان —“

”اوہ FORGET HER اچھا تم نے مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا؟“

”جیسے تم نے کنجیاں تلاش کر لیں۔ لیڈی واٹسن —“

”یہ اس پاجی چوکیدار نے فون کیا ہوگا۔“

”رائیٹ۔ اس نے کہا نکھلتو والی ڈاکٹر صاحب یہاں بیٹھی ہیں ڈاک بنگلے میں۔“

”ضلع سینٹاپور میں — محمود آباد جانے والی سڑک پر۔“

”اور کیا بتایا؟“

”اور یہ کہ مگرہ اندر سے بند کر رکھا ہے اور باجہ لگا کر ناچ رہی ہیں — عنبر کتنے افسوس

کی بات ہے۔ سارے یو۔ پی میں تمہاری اہمقانہ حرکتوں کے چرچے ہو جائیں گے۔“

”اور ماشائزنگ ہوم کی بدنامی ہوگی۔ جب اس کی ڈاکٹر ٹی ہی سٹرٹن ہے تو وہاں

علاج کروانے کون جائے۔ اور تمہاری آمدنی کم ہو جائے گی۔ — HEY DOC!

GET BACK TO BOSTON—GET BACK TO WHERE YOU BELONG”.

”میں تم کو کبھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

” NO WAY — میں تو سیتا پور کے جنگل میں رہوں گی سیتا جی کی طرح —
 — اور گمشدہ الفاظ کے معانی تلاش — ارے حسن، حسین، بڑے اولیا — جنگل ما
 بلہ لاگے — رے دیا — ہمرے اللہ — میں دھے رو رہی ہوں — تم میرے
 بچھے پیچھے یہاں کیوں پہنچے، یاد رکھو یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے۔“
 ” تمہیں زرد و بوی سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے جنگلی چوہیا — جنگلی بطخ — اچھا
 موضوع کا اخبار دیکھا؟“

” موضوع گفتگو تبدیل مت کرو۔ بناؤ میں اصلیت میں کون ہوں؟“
 ” سنو تو عنبر۔ آج صبح کے اخباروں میں چھپا ہے کہ نامور برطانوی شاعر نورمن ڈریک نے
 لندن میں پیری سیگم سے سول میرج کر لی اور پیری سیگم کے والد نے اسے عاق کر دیا۔
 س اناؤنٹمنٹ کے ساتھ اخبار والوں نے ایک فٹ نوٹ بھی چھاپا ہے کہ نورمن ڈریک
 زادی قبیل کے لکھنؤ کی مشہور اینگلو انڈین رقاصہ نورما ڈریک عرف نورملا دیوی کا بیٹا ہے
 زرد کچھ عرصہ قبل یہاں آیا تھا — یہ اطلاع ان بے چاروں کی بدنامی کے تابوت میں
 نرمی گیل — سن رہی ہو — بے چارے بیوقوف لوگ — دنیا کو خریدنے چلے تھے۔
 ہے ناز و دردا آج کی نازہ خیر۔“

” ذرا وہ بن دیوی والی نظم سنا دو نا۔“

” عنبر تم حد سے زیادہ خود غرض ہو گئی ہو — خود پرست۔“

” ہاں میں تو ہوں ہی بری۔ کسی کو میری پرواہ نہیں۔ میری اتنی سی خواہش کوئی پوری نہیں
 تا۔ سب چاہتے ہیں انکی مرضی پر ہمیشہ انکی مرضی رہتی رہوں کیا میں اپنی آزادی سے کہیں
 م پھر نہیں سکتی جو تم پولس کانسٹیبل کی طرح مجھے گرفتار کرنے آن پہنچے؟ — کیا میں تنہا ڈرائیو
 لئے جنگلوں میں نہیں جا سکتی — کسی خاموش ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر ملکہ کپھراج کے
 یا نہیں سن سکتی۔ بالوں میں زرد پھول اڑس کے — تم سب منافق چار سو بیس
 ن سے دور — مجھ سے توکل کی چھو کر می پیری سیگم ہی اچھی۔ اپنی مرضی سے جو چاہتی
 کر رہی ہے۔“

”تم کو ساری زندگی مکمل آزادی ملی رہی اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔؟“
”اپنی ماں کے ماضی کے رمی ایشن میں۔“
او۔ کے۔ تو وہ تمہارا اپنا انتخاب تھا۔ اب اس سے آزاد ہو جاؤ۔“

”NOW IT IS TOO LATE. ساری عمر دوسروں کی خدمت۔ ہسپتال نرسنگ ہو
آپریشن تھیٹر۔ اڈبورا۔ لندن۔ اصفہان۔ بن غازی مہر جگہ زیادہ سے زیادہ پاؤنڈ
تومان پٹرو ڈالر کمانے کی مشین۔ کیا اب میں ذرا جنگوں میں نہیں گھوم سکتی۔؟“
اس چوکیدار نے تم کو فون کس طرح کیا؟“

”I.A.S. کا کوئی چھو کر ایہاں موجود تھا۔ احمد۔ وہ ہم لوگوں سے واقف ہے۔ چلو
اب گھر چلیں۔ یار بورمٹ کرو۔ بہت ہو لیا۔ تم اپنی ماں کو پرسیکیوٹ کر کے کس قسم کی
سزا دینا چاہتی ہو؟ اور اپنے آپ کو کیوں پرسیکیوٹ کر رہی ہو یار۔“

”میں اپنے مکان کی صحیح SETTING بنانا چاہتی تھی۔ تو دھیری SETTING میں
گر پڑ ہو گئی۔ میں امبیگا دیوی ہوں یا شاگرہ خاتون؟“

”پھر وہی مرے کی ایک ٹانگ۔ عنبر تم امبیگا دیوی ہو نہ شاگرہ خاتون

”تم ایک نہایت TROUBLESOME اڑیل ٹٹو خاتون ہو جو اب دوسروں کو
تنگ کر کے خوش ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم نے میں بائیس برس ایک بے چہرہ
ہستی کی طرح دوسروں کا علاج معالجہ کیا انکے COMPLEXES کو جھیلا ہے۔“

— اب تم خود سنٹراف اٹنشن بننا چاہتی ہو۔ عنبر میں تم دنیا کی واحد مخلوط النسل اولاد
نہیں جو تم نے یہ آفت جوت رکھی ہے۔ سچ ہے۔ عورتیں بعض دفعہ اگر چاہیں تو منطق
بالکل استعمال نہیں کرتیں۔“

”تم SEXIST ہو۔ MALE CHAUVINIST PIG“

”تمہاری والدہ کے شدید FEMINIST رو سے نے تمہارا یہ کبار کیا۔ بھئی
تم تو واقعی جھاڑ کا ٹاش بن گئیں“
”جھڑک کر بات مت کرو۔ کیسے ڈاکٹر ہو۔“

”دماغ کے ڈاکٹروں کی رائے میں تمہارے ذہن کے کل پُرزے ٹھیک ہیں تم نے اگر اپنی یہ ایکٹنگ نہ چھوڑی تو تمہاری امی تو تم سے دستبردار نہیں ہو سکتیں۔ میں ہو سکتا ہوں۔“

”تم — تم بھاگ جاؤ گے؟“

”قطعاً۔ رات کو بار بار فون کر کے جگاتی ہو۔ فلاں دو اکام نہیں کر رہی فلاں گوئی لے اثر ہے۔ فلاں دو الے کر اسی وقت پہنچو جو دو دوائیں میں نے منع کر رکھی ہیں وہی ٹھونستی رہتی ہو ہر وقت۔ تم کو پتہ ہے جب تم کار لے کر آدھی رات کو مال آئیو بیہنچ جاتی ہو اور میری کھڑکی کے نیچے مسلسل ہارن بجاتی ہو تو سارا ایریا جاگ اٹھتا ہے اور مجھے کس قدر شدید کوٹ ہوتی ہے۔ اس وقت۔ پہلے سب کو تم سے ہمدردی تھی اب لوگ تنگ آگئے ہیں۔ پتہ ماہن جی لے چاری سب کو سمجھانی پھرتی ہیں۔ پہلے لوگوں کو نواب بگم کی تصویر ایک موضوع گفتگو مل گیا تھا اب GOSSIP یہ ہے کہ ڈاکٹر بیگ کا دماغ چل گیا — اور اس کی طرح طرح کی وجوہات بیان کی جا رہی ہیں — یاد رکھو عنبرین تم علاج کے لیے میرے ساتھ چلو نہ چلو اگر تم اسی طرح پریشان کرتی رہیں تو میں ماشائیں اپنا حصہ فروخت کر کے جلد از جلد امریکہ چلا جاؤں گا واپس —“

”نہیں — نہیں — تم ایسا نہیں کر سکتے۔ منصور تم مجھے چھوڑ دو گے؟ — پلیز — اچھا بس ایک دفعہ وہ بن دیوی والی —“

”تم بن دیوی چھوڑ مہا بن دیوی ہو۔ تم کال بن کی دیوی ہو۔ تم سارے گوریلاؤں کا جدہ ہو — تم بور سے لدے آم کے درختوں سے گذرتی ہو تم خود بور ہو۔ دوسروں کو ور کر رہی ہو۔“

”ہرے — جُولی گڈ — چلو باہر چلو — میں آم کے جھرمٹ میں سے گذرنگی تم مجھے دور سے دیکھ کر بتانا کیسی لگتی ہوں —“

”تم ہمیشہ ہر جگہ اچھی لگتی ہو۔ تم ایک دلکش خاتون ہو۔“

”میرا دل رکھنے کے لئے کہہ رہے ہونا — میں ایک ضعیف العمر کم روڈاکٹرنی

ہوں جسے اکتیس سال کی عمر سے لے کر آج تک برابر ریجیکٹ کیا گیا ہے۔“

”بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ چلو لکھنؤ واپس چلیں۔“

”نہ۔ اب میں بنوں میں رہوں گی۔ انسانوں کی سستی سے دور۔ میں نے انسانوں

کی سستی میں غلط گھر بنایا۔ وہ تمہارا چینی شاعر۔“

”چینی شاعر کو مار دو گولی۔“

”وہ تو ڈھائی ہزار سال پہلے ہی مر گیا۔ جانے کس طرح مرا ہو گا عزیز۔ تمہیں

پتہ ہے برٹش ڈاکٹر مصری میوں کو ایکڑا من کر رہے ہیں یہ معلوم کرنے کیلئے وہ کن

امراض سے مر رہیں۔“

”امریکن ڈاکٹر بھی کر رہے ہیں۔“

”ہنیمہ۔ امریکن ڈاکٹروں کو کچھ نہیں آتا جاتا۔ ہمارے برٹش ڈاکٹروں نے تینک

معلوم کر لیا ہے کہ تو تے عنخ آمن کو پچھن رہی تھی بیٹھیمیاں کس طرح مر رہیں ان کو معلوم

ہو گیا ہے۔“

”میاں مر رہیں اور مرے۔ اور پہلی بات تو یہ کہ وہ مرنے کے بعد میاں بنے۔

یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا ہر حسین عورت دو بار مرتی ہے۔“

”تمہاری والدہ نے تو یہ مفروضہ غلط ثابت کیا۔“

”ہنیمہ۔ پھر میری والدہ۔ ساری عمر انھوں نے مجھے بیک گراؤنڈ میں رکھا۔ ہر جگہ

ہر ملک میں ہر سوسائٹی میں لوگ انہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔“

”کمال ہے یار۔ بعض ماؤں کو اپنی جوان لڑکیوں کی وجہ سے COMPLEX ہو جا

سے یہاں اٹا حساب۔“

”ظاہر ہے تم تو یہ کہو گے ہی۔ تم بھی امی ہی کو ایڈمائیر کرتے ہو۔ مسز بیگ

مسز بیگ۔ میں تو یونہی ایک فالٹو سکڈری چیز رہی ہوں ہمیشہ میں کسی

میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اسی لئے اب میں بن باسی بن جاؤں گی۔ میں بن دیوی ا

اور بن پروا پس جانا چاہتی ہوں۔“

”کافی کیا ہوتی ہے؟“
”عنبر تم نے باقی کیسیٹ کہیں راستے میں پھینک تو نہیں دیے؟“
”کیسیٹ کیا؟“

”اب اس نے ایک اور ریکٹ شروع کر رکھا ہے۔ وہ چیزوں کو پہچاننے سے
منکر ہے۔ مثلاً میں نے پوچھا عنبر تم نے آج کا ٹائمیگز آف انڈیا پڑھا؟۔
”لولی ٹائمیگز آف انڈیا کیا؟“
”کہا فریڈہ خانم کے ٹیپ منگوائے ہیں۔ بولی فریڈہ خانم کیا ہوتی ہے؟ اس سے
میں تازگیا اس نے فریڈہ خانم کیا ہوتا ہے نہیں کہا۔ بن رہی ہے۔ شارڈا نے کہا میں
عنبر جی یہ پورج کھالیں۔ بولی پورج کیا ہوتا ہے؟
”میں نے کہا تمہاری ساس کا سر ہوتا ہے۔ کھاؤ سیدھی طرح ورنہ ایک جھانپڑ
دول گا۔ بولی تمہارے اندر عورت کو DOMINATE کرنے کی خواہش موجود ہے
میں نے شارڈا سے کہا اسے اس کی والدہ کے ویمنز لیب نے برباد کر دیا۔ فوراً گرج کر
بولی میری ماں کو بُرا نہ کہو وہ دنیا کی بہترین ماں ہیں۔ شارڈا نے خوش ہو کر مجھ سے
کہا اب عنبر اچھی ہو جائے گی۔“

”سبز بیگ۔ اس وقت میں بے حد فکر مند ہوں۔ اب وہ بعض لوگوں کو واقعی
نہیں پہچانتی اور الفاظ کے سچے بھولتی جا رہی ہے۔ کل صبح میں اپنے کلنک میں بیٹھا
تھا۔ نرس اس کے کمرے سے اس کا پرچہ لائی یہ دیکھئے۔ ڈیبر منسور۔ تم کو یہ معلوم کر کے
خشش ہوگی کہ آج میں بے ہتہر ہوں۔ اردو افضالوں کی کوئی کتاب بھجوا دو۔ پڑھنے
کے لئے۔“

”اب وہ انگریزی بھی اسی طرح لکھتی ہے۔ چھوٹے پتوں کی طرح۔ ذہن کے تباہ

ماؤن ہونے کی یہ پہلی علامت ہے۔ ٹھا کر دلشاد علی عیادت کے لئے نرسنگ ہوم تشریف لائے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے بوسٹن لے جانے سے پہلے لندن آجائیے ہارلے اسٹریٹ کے ڈاکٹر روزن باؤم بڑے نامور سائیکسٹرسٹ ہیں۔ راجہ صاحب بین چارڈن بعد انگلستان واپس جا رہے ہیں۔ وعدہ کر گئے ہیں پہنچتے ہی روزن باؤم سے اپوائنٹمنٹ لے کر مجھے لکھیں گے۔ ہاں اور یہ بھی کہا کہ آپ لوگ قیام و طعام کے متعلق فکر نہ کریں۔ ساؤتھ سیر میں غریب خانہ موجود ہے۔ جتنے عرصے چاہیں وہاں رہیے۔ بہت بڑا مکان ہے۔ نورما آپ لوگوں کی بہت خاطر میں کرے گی۔ بے حد بھلی عورت ہے۔

”چلو مکان کا مسئلہ تو یوں حل ہوا۔ لندن کی مہنگائی سے ڈر لگ رہا تھا۔“

”جی ہاں خدا کا شکر ہے۔ وہ بڑا کار ساز ہے۔“

”خدا۔۔! بیٹا یہ اتفاقات کا ایک اندھا دھند سلسلہ ہے۔ سارا معاملہ لٹ پیچ۔“

”یوں ہی سہی۔ مگر بہر حال۔ واقعی جن لوگوں کے متعلق ہم اتنے بدگمان ہوتے ہیں آڑے وقت میں وہی کام آتے ہیں۔ اب بتائیے۔ دلشاد علی خاں اور نورماہ خانم۔ ان سے زیادہ ردِ خلائق ہستیاں اور کون ہوں گی۔ اور وہی اس وقت۔“

”ذرا نرسنگ ہوم فون کرو۔ عنبر کیا کر رہی ہے۔“

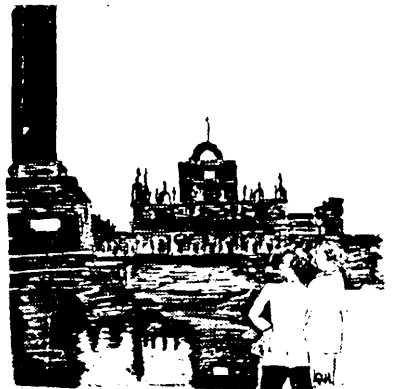
”جب میں وہاں سے چلا تھا تو نوٹسکی میں مصروف تھی۔ منواتر بیٹھی رٹ رہی تھی کوئی ایسی سکھی چا تر نہ ملی۔ ہلو۔ ہلو۔ لیجئے۔ عنبر۔ ہلو۔ لیجئے سن لیجئے اب بھی وہی رٹ۔ کوئی ایسی سکھی چا تر نہ ملی جو پی کا دو اور بتا دیتی۔“



www.urduchannel.in



www.urduchannel.in



(۳۵)

مارٹین کوٹھی

خواجہ سبزوئی کے آخری الفاظ تھے — راجہ صاحب آپ یہاں سے بے نیل و مرام واپس جا رہے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر سخت ڈپریشن طاری تھا۔ گذشتہ ہفتے نورما کو مطلع کیا تھا لندن روانہ ہو رہا ہوں۔ مگر اس اثنا میں ایسا واقعہ ہوا جس کے متعلق کاش میں اپنے انٹیکوویسٹ لڑکے نورمن سے کچھ دیکس کر سکتا۔ گو وہ میرے اس ذہنی ورثے سے قطعی ناواقف ہے جو میرے تایا ٹھا کر جو ادیبانوں کے کتب خانے میں بھی محفوظ تھا لیکن میں جسے مسترد کر کے پچھتم کے چکوروں کی دنیا جا پہنچا تھا۔ زوال کے بعد اس فردوس گمشدہ کی بازیافت کا خیال بھولے سے بھی نہ آیا۔

نورما کو خط پوسٹ کر کے لوٹا۔ کلاس اودھ کے پھانک پر دو ننھے مٹے نٹوں کو کھپتیاں نچانے دیکھا۔ لکھنؤ کی رنگا رنگ دلفریب دنیا سے کلینت؛ اکتا کر ہوٹل کے اندر گیا۔ بابا سبزوئی کا الٹا اعلیٰ جملہ کانوں میں گونجا۔ راجہ صاحب آپ یہاں سے بے نیل و مرام — رنگا شہوار اینڈ کوہنوزنگلو میں ہیں ٹیلی فون پر ڈاکٹر کا شغری سے ڈاکٹر ٹیگ کی خیریت دریافت کی۔ خدا حافظ کہا۔ لیفٹ کی طرف بڑھانا کہ اپنے کمرے میں جا کر سپیکنگ شروع کروں۔ خیال آیا پہلے ہوائی جہاز کا وقت دریافت کر لوں۔

سامنے حضرت محل پارک پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ریسپشن کا ڈسٹر کے پیچھے اپنی تصویر کے BLOW-UP میں بیگم حضرت محل تلیان کی نئے ہاتھ میں تھا مے جہان گذراں کا نظارہ کر رہی تھیں۔

میں انڈین ایر لائنز کے متعلق کلرک سے بات کرنے ہی والا تھا کہ بلوآپ کے مقابل میں ایک جانی بچپانی سی بارعب و جہہ صورت دکھلائی پڑی۔ کینیوں پر گرے بال۔ بڑی

بڑی ٹوکسیل مچھیں۔ کھلے کالر کے اندر سبز رنگ کا اسکارف منہ میں پایپ۔ ذرا سا گنجا اور فریب

پڑانا 'HUNTING SHOOTING FISHING' ٹائپ

وہ بھی ٹھٹھک کر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ارے وہ تو اپنا پرانا یا زنگلا۔ لڑکپن کا ساتھی۔ لا مارٹنڈس کا ہم سبق — کنور سینڈی اینڈریش نرائن سنگھ!! اپنے باپ دادا کی طرح اردو فاکا اسکی بھی گھٹی میں پڑی تھی۔ ”بہتر ہے ملاقات میچا و خضر سے“ کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ جب سگھہ میں پاکستان گیا تھا اسکی بے چارے نے ویزا پاسپورٹ وغیرہ کی دوڑ دھوپ کی تھی۔ گالیاں دیں۔ ”بدمعاش کہاں غائب ہو گیا تھا۔ پاکستان جا کر ایک پوسٹ کارڈ تک نہ لکھا۔ پھر ہم نے سنا کہ ولایت میں جا با ہے“ وغیرہ وغیرہ۔

دادا نانا بن چکا ہے۔ تعلقہ داری کے خاتے کے بعد علاقے پر فارمنگ کرتا ہے۔ میں نے اسے مہم سابتلایا کہ لندن میں اپنی بزنس ہے۔

ہم لوگ ہوٹل کے گل فام ریٹوراں میں جا بیٹھے۔ میں نے کہا بارہ چلو۔ بولا شراب چھوڑ دی ہے۔ تعجب ہوا۔ ہم پرانے احباب کا تذکرہ کرنے میں ایسے مجھوئے کہ کنور نے مجھ سے مزید ذاتی سوالات نہیں کیے۔ محض اتنا کہا۔ یار تم نے تو ولایت میں کسی میم صاحب سے بیاہ رہا لیا ہوگا۔ میں نے پھر ہوں ہاں کر دی۔

”کتنے لڑکے ہیں؟“

”ایک“ یاد آیا دودھ والے اولاد کے لیے محض لڑکے استعمال کرتے ہیں۔ لڑکیاں قابل ذکر نہیں۔ مختصر آجواب دیا۔ ”ایک لڑکا ہے۔ لندن میں اخبار نویس ہے۔“

کنور نہایت مسرور و مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ تعلقہ داری کے خاتے کا اس پر ذرا جو اثر ہوا ہو — لہجے کے بعد کہنے لگا۔ چلو ذرا اپنا کالج گھوم آؤں۔ مارٹن۔

تیسرے پہر کو ہم لوگ اس سنٹی منٹل جرنی پر نکلے۔ ہوٹل کے پھانگ سے برآمد ہو کر سامنے اشارہ کرتے ہوئے کنور نے کہا ”واجد علی شاہ قبصر باغ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ بنانا چاہتے تھے اب یہ بدمذاتی کا آٹھواں عجوبہ ہے۔“

”اس معاملے میں تم عنبرین بیگ کو اپنا ہم خیال پاؤ گے؟“

”ماتنا والی ڈاکٹر صاحب ہ قطعی —“ وہ سکندر باغ کی طرف مڑ گیا۔ وہاں اسے جانِ عالم کی جینیٹی نواب سکندر محل کا سمر باؤس یاد آیا۔ ایک آہ بھری: ”یہاں بھی تو گھسان کارن پڑا تھا۔“

”وہ نواب بھی پڑ رہا ہے!“ نئی کورڈونی سے آراستہ بنارسی باغ میں شہریوں کے جم غفیر دیکھ کر میں نے جواب دیا۔ گویا مغرب سے آئے ہوئے ایک یو۔ این ایکسپریٹ کی نظر سے جہان سویم کو دیکھ رہا ہوں۔ بہت جلد اپنے نفیس وحسین جہان اول واپس چلا جاؤں گا۔ دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان بھیانک مسایل سے بچ کر کیا بروقت یہاں سے نکل بھاگا تھا۔

بنارسی باغ سے روانہ ہو کر سہم لوگ نواب سعادت علیخاں کی HUNTING LODGE پہنچے — وہ شکار گاہ ٹوکب کی غائب ہوئی۔ نواب قدسیہ محل کے ٹوٹے پھوٹے ولایتی کاسل کے نزدیک فوجی افسروں کے بنگلے دکھلائی پڑے۔ اچانک یاد آیا۔ اسی دلکش باغ کے اندر ۱۹۴۳ء میں، ادریس لوئیس لاسیڈ لکھنؤ کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی دعوت پر بڑے ابا مرحوم فوجی دستوں سمیت جلسے میں تشریف لے گئے تھے۔ اسٹیج پر نورما ڈریک کو بطور ”نرملادیوی“ ناچتے دیکھ کر ان پر یہ بیتناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ لال باغ کی ایک ”لال بی بی“ ہیں!

دلکش کے احاطے کے باہر نئے سرکاری اپارٹمنٹ بلاکس کے آگے سے گزرتے ہوئے دور سبز وادی میں اچانک لامارٹینز کا اونچا مینار نظر آیا کیونکہ اپنی مرٹینز موٹری۔ چھاؤنی کی طرف واپس آئے۔ ایک نگر ٹرپر HODSON'S HORSE کے دونوں جوان افسروں کی مرمری قبروں نے متوجہ کیا۔ یہ نوجوان غدر ۱۸۵۶ء میں مارے گئے تھے۔ ارے کیا ہم تو اپنے اپنے غدر میں اندر دنی طور پر نہیں مارے گئے؟

قبروں کے نزدیک ایک لپاٹا مقبرہ استادہ تھا۔ کس کا ہے؟ — قریب کی ایک کوٹھی کے باغیچے میں کسی فوجی افسر کی ہوی، ہاؤس کوٹ میں ملبوس، مالی سے پودے گوارا ہی تھی۔ اس سے پوچھا۔ کہنے لگی۔ کسی سیکم کی TOMB ہے۔

گوری بی بی معاکسی پُرانی گزل فرینڈ کی طرح یاد آگئیں۔ سٹیڈی نے کارڈ اٹھارتے ہوئے کہا: ”کیا یورپین اقوام واقعی ہم سے بہتر ہیں؟ اس عیسائی کالج کا ٹرسٹ جنرل مارٹن کی اس مسلمان دارت کے مقبرے کی کیسی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اسی شہر کے دوسرے مقابر کی شکستہ حالی دیکھو۔ ٹرسٹ انکے بھی موجود ہیں۔“

”نکھنوں میں بیگمات یا مقابر میں مدفون ہیں یا برقعوں میں ملفوف۔“ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

کنو رلیکھت ذرا جوش سے بولا۔ ”اور یہ جو سینکڑوں بے پردہ مسلم لڑکیاں کالجوں میں پڑھ رہی ہیں تم کو دکھلائی نہیں دیں؟ تم لوگ دراصل چند مفروضات لیکر واپس آتے ہو اور انکو بدنام نہیں چاہتے۔ ہاکی چیمپین، بیڈمنٹن کی انڈیا نمبر ون سوکینگ کی انڈیا نمبر ون سب تو مسلم لڑکیاں بن چکی ہیں۔ ہانی سوسائٹی بھی پہلے کی طرح بیگمات سے جگمگا رہی ہے۔ کیا تم ان سے کسی کلب یا پارٹی وغیرہ میں نہیں ملے؟“

”یار۔ یہاں کی نئی ہانی سوسائٹی کی دو ممتاز خواتین سے سابقہ پڑا۔ اب مزید سے ملنے کی تمنا نہیں۔“

کہنے لگا: ”دلن بھائی۔ تم بڑے CYNICAL ہو گئے ہو۔ کیا معاملہ ہے؟“

مدتوں بعد کسی نے دلن کہہ کر پکارا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہی آنسوؤں میں جھلملاتی تنگ غازی الدین حیدر کی نہر سامنے نمودار ہوئی جو گورنمنٹ ہاؤس کے پیچھے سے نکل کر سبزہ زاروں سے گذرتی عالم باغ کی سمت رواں تھی۔ جنرل مارٹن کا پاؤڈر میگزین۔ سعادت علیجاں کی حیات بخش۔ یو۔ پی کے لاٹ صاحب کی کوٹھی۔ اب اتر پردیش کا راج بھون۔! لاریب اس آجکو کا بہت پانی اب تک بہہ چکا ہے۔

صوفیا، پانی بہنے کی آواز اپنے اندر سن لیتے ہیں۔

چاروں طرف دلکش کے پرسکون سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ محمد باغ اس برصغیر کی حسین ترین اور انگریزوں کی چھائی ہوئی قدیم ترین چھاؤنیوں میں سے ایک ہے۔ شکر ہے

اس نئی تعمیراتی بیہودگی کا شکار نہیں ہوا۔ ان حسین راستوں پر سے گذرتے ہوئے میرا ذہن سامنے بہتی بادشاہی نہر کی طرح بہتا ہوا دوڑ نکل گیا — اگر میں دو ماہ قبل زکا رخا نام کو بلیک میل کرنے کے ارادے سے یہاں نہ آتا — سینڈی یعنی سنڈریٹوزرائین سنگھ، اس ہمدم دیرینہ سے ملاقات کیونکر ہوتی۔

مال روڈ پر واپس آ کر دوبارہ گونمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گذرے تو کہنے لگا — ”نواب آصف الدولہ کرنل مارٹن کو روہیلوں سے لڑنے کے لئے بھیجتے ہیں، آصف الدولہ کی فائنڈری میں یہ یورورپین افسر ایک خوفناک توپ ڈھالتا ہے اسے انگریز ٹیپو کے خلاف میدان جنگ میں لیجاتے ہیں۔ افسوس!“

”جنگ ایران و عراق میں بھی ناک تو نیریزی بمباری سے متعدد شہر تباہ —“ مرے ڈیزر کے ریڈیو پر خبریں آرہی تھیں۔ کنور نے سو میچ بند کیا۔

”یارت مسلمانوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔ کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیا!“ پھر خود ہی فوراً موضوع تبدیل کیا — ”یہ حیات بخش کوٹھی پہلے برٹش گورنروں کے لئے حیات بخش ثابت ہوئی تھی اب سوڈیشی راجہ پالوں کے لئے —! اس نے قہقہہ لگایا۔“

سنہری روشنی میں خاموش نوشکو اور راستوں پر سے گذرتے رہے۔ غازی الدین جیڈر کنال نے عالم باغ کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔

عالم آراء بیگم کیسا انکا فعل بنوایا تھا جانے عالم نے کہ دریچہ ایک نہیں اور ہوادار۔
”وہ کیسے لوگ تھے بھی؟“ میں نے باواز بلند کہا۔

”کالج میگزین میں تم خاص مضمون لگاری کیا کرتے تھے۔ انگلستان واپس جا کر ایک آرٹیکل لکھنا — CAMELOT REVISITED“

”اب وہ کہاں ہے۔“

”کیم لوٹ کی خصوصیت یہی تھی کہ چند روزہ تھا“

جنرل کلاڈ مارٹین کا اطالوی محل CONSTANTIA پھانگ پر وہ مانوس تختی

LA MARTINIER COLLEGE 1840

کنور مصنوعی پھیل کے فلک بوس میدان کو نکلنے لگا یا دسے وہ ایک بوڑھا انگریز ہسٹری کا ستادم سے کہتا تھا۔ آپ لوگ BARONS OF OUDE کی اولاد ہیں آئیے رکھوں نے بی گم حضرات ما حال کا ساتھ دیا تھا مگر ہارنے کے بعد سجداری سے کام لیکر پرتش کر اؤن ے وفادار بن گئے تھے۔ اب آپ لوگ بھی وفادار رہیے۔

”یہ لیکچر کیوں دیا تھا اس نے مجھے بالکل یاد نہیں۔“

”ہم پہاڑ سے لوٹ کر آئے تھے اور وہ جو چٹان تھی نائینی تال میں جسکے لیے مشہور تھا کہ جس رسات میں یہ ٹوٹ کر پھیل میں گری اس سال راج کا خاتمہ ہو جائیگا۔ کلاس میں اسکا ہتہ سنا رہے تھے۔“ وہ ہنس پڑا۔

کالج کے گولف کورس اور زو کا چکر لگایا۔ کارٹواں اور ہوڈ سن ہاؤس کے سپورٹس یاد کیے اور وہ ہاتھی جو بنارسى باغ سے چرایا تھا۔

مادر در سگاہ! ————— کنور بولا: ”جب ہم یہاں کھیلا کوڈا کرتے تھے ہمیں طعی احساس نہ تھا کہ فرانس کے ایک جولاہے کا بیٹا اپنی ساری دولت یورپین لڑکوں کی تعلیم کے لیے کیوں چھوڑ گیا۔ وہ اس نئے یورپ کا نمائندہ تھا۔ مہم جو، مؤجد، باکمال انجینئر۔“

”یہ دولت تو اس نے یہیں سمیٹی تھی۔ میں نے یاد دلایا: ”مارٹین کوٹھی بھی اس نے اصف الدولہ کو چوٹا لگانے کے لیے بنائی تھی۔“

کنور نے سر بلایا: ”ایک روز اصف الدولہ سے کہنے لگا آپکے لیے ایک کروڑ کی مالیت لی کوئی چیز ایجنک نہیں بنائی اب ایسی عجب بہ روزگار عمارت تعمیر کرونگا جس میں ہر طرف سے رتے موسموں کا نظارہ کیا جاسکے۔ بجلی، بارش، طوفان، سیلاب، چاروں کھونٹ کی ہوا میں، سردی، گرمی۔“ چلو دیکھ آویں وہ موسموں کی گردش کس طرح جھیلتا ہے۔ چاروں کھونٹ کی ہوا میں اسکے اوپر سے کس طور سے گذر رہی ہیں۔“

— سر جھکائے پایپ پیتا ایک روش پر ہویا۔ اسکے ساتھ ساتھ قدم رکھتے ہوئے

مجھے خیال آیا کیا ہم سب چلتی پھرتی مارٹین کو ٹھیاں نہیں کہہواؤں اور بدلتے موسموں طوفانوں کو سہتے چلے جاتے ہیں۔ گجی میں میں شہزادہ سلیمان شکوہ والی ٹیڑھی کو ٹھی بھی تو۔
— اگر انسانوں کی شخصیتوں کو طرز تعمیر سے تشبیہ دی جائے — کلاسیکل — گوتہ —
باروک۔ روکو کو — اپنا کنوڑ مغل راجپوت کا آخری نمونہ ہے۔

ہم دونوں نے مارٹین کو ٹھی کے زنان خانے کا رخ کیا۔ اسکے سامنے ایک فرنگی اکرسی پر لٹیا کتاب پڑھ رہا تھا۔ سینڈی کو پہچان کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھ کر کنوڑ ریش نر این سنگھ!

”یہ بھی میری طرح یہاں کے پُرانے اسٹوڈنٹ ہیں —“ کنوڑ بولا۔ ”راجہ دلشا ہندوستان کی اضطراب انگیز تاریخ کے تین فریق — جو کبھی ایک دوسرے کے ساتھی بنے کبھی دشمن — اس وقت اس سیاہی مائل روٹینٹک طرز تعمیر کی عمارت کے سامنے ایک بدلے ہوئے رنگ آسمان کے نیچے کھڑے تھے۔“

اندر ”زنان خانے“ کے اطالوی اور ہسپانوی نقش و نگار اس طرح چمک رہے تھے۔ رائیل اکیڈمی کے مصور کا بنایا ہوا گوری بی بی کا پورٹریٹ ڈرائنگ روم کے آئینہ ہنوز موجود۔ ایک اونچے سرسبز درخت کے نیچے سرو قد غرارہ پوش حسین و جمیل گوری بی ساتھ ایک کسٹن لڑکا — جنرل کا متنی جیمز ذوالفقار مارٹن —

کانی پیتے ہوئے کنوڑ نے ایک بحث طلب موضوع چھیڑ دیا: ”گوری بی بی اور سیلی جنرل کی حرم تھیں یا لے پالک بیٹیاں؟ مسلمان اور انگریز مورخ تو انہیں حرم ہی بتاتے“
”بالکل غلط“ میزبان نے سیکھے پن سے جواب دیا ”جب او وہ میں تھپڑا ان غارتہ موزلم لڑکیوں کو بیٹیاں بنا لیا تھا۔ انہیں عیسائی نہیں کیا۔ انکے لیے ٹرسٹ چھوڑے“
”میں نے تو کہیں پڑھا ہے کہ سیلی بیگم یہ وہ جنرل مارٹن نے شہزادہ سلیمان شکوہ ایک بیٹے سے عقد کیا۔ سیلی بیگم کا مقبرہ کوئٹہ کنج میں موجود ہے۔“
”غلط۔ اچھا میں آپکے لیے کنجی لے آؤں۔“

میزبان کے جانے کے بعد کنور نے آہستہ سے کہا: ”مطلب یہ کہ وہ اولڈ بیچلر اتنا پاکباز تھا اور برتریورپین بھلا وہ نیٹو لڑکیوں کا حرم کیوں رکھتا“

”مگر وہ تو اس زمانے کے ہندوستان میں یورپیوں کا عام دستور تھا اور فرانیسی آج تک نسل پرست نہیں۔“ میں نے کہا۔ فرنگی کنبی لیکر واپس آیا۔ ہم لوگ تنہا خانے کا زینہ اترے۔ بیٹھیوں پر ”سیف الملک جنرل مارٹن صاحب“ کے نام کی مرمریں تختی کا ایک ٹکڑا دھرا ہوا تھا یہ سیڑھیاں زندوں کی دنیا کو مردوں کے جہان مستور سے ملاتی ہیں میرے جسم میں سنسنی سے دوڑی۔ پھر موت کے خوف نے آن دلوچا۔ یہ عمر کا تقاضہ ہے۔

نیچے اتر کر ہم جنرل کے قائم کیے ہوئے بنک کے وسیع مرمریں والٹ میں داخل ہوئے۔ ”ایشیا کا پہلا بنک اس نے اس ہال میں کھولا تھا“ فرنگی محجر کا دروازہ کھولنے آگے بڑھ گیا۔

”ملٹی نیشنل نہیں قائم کی؟“ سنڈی نے دانتوں میں پائپ دبا کر بڑی مٹھاس سے پوچھا پھر کہا۔ ”دن بھاتی۔ جب اودھ میں تھپڑا ہے اس چالو چکر آدمی کے دیا لو آقا آصف بطور ریلیف بڑا امام باڑہ تیار کرواتے ہیں اور رات کے وقت اسے تعمیر کیا جاتا ہے کہ فاقہ زد شرفاء کو مزدوری کرتے شرم نہ آتے۔ یہ شخص اسی زمانے میں ذخیرہ اندوزوں کے لیے بنک کھولتا ہے۔ یہ آہنی دروازہ دیکھو۔ جب سے اب تک ٹس سے مس نہیں ہوا۔“

”یار اب تم ہندوستانی نسل پرست تاریخ داں بن رہے ہو۔ مارٹن صاحب کا بنک تو بڑا پروگریسو ایسٹپ تھا۔ فیوڈل ازم سے سرمایہ داری کی طرف پہلا قدم۔ ایشیا میں پہلا گیس کا غبارہ بھی اس نے اڑایا۔ اسی مارٹن کو ٹھی کے باغ سے۔ نہ بھولو کہ اس کے محض دو تئو سال بعد آدمی چاند پر پہنچ گیا۔“

”چالو چکر۔“ کنور نے آہستہ سے دہرایا۔ ”پہلے آصف الدولہ کی خاطر یہ محل بنوایا۔ مرتے وقت سوچا نواب وزیر کے جانشین اس پر قبضہ نہ کریں۔ وہ اس میں یورپین بچوں کے لئے اسکول قائم کرنا چاہتا تھا۔ خود کو ہمیں دفن کروا گیا۔ تاکہ عمارت مقبرہ بن جائے۔“

”ہاں سعادت علیجاں مقبرے میں تو آکر رہیں گے نہیں۔“ میں نے کہا۔

ہم بنک کے ہال سے ملحق مرم میں کوٹھری میں گئے عرصہ دراز بعد وہ کتبہ پڑھا

HERE LIES GENERAL CLAUD MARTIN,
BORN IN LYONS
THE FIRST DAY OF JANUARY, 1735,
ARRIVED IN INDIA
AS A COMMON SOLDIER,
DIED AT LUCKNOW
THE THIRTEENTH SEPTEMBER 1800
A MAJOR GENERAL.
PRAY FOR HIS SOUL

ماکین صاحب اٹھارہویں صدی کا شمالی سو بھراٹ فورچون نام کر گیا۔ میں بیسویں صدی
کا ایک حقیر چلتا پرزہ۔ اٹھائی گہرا۔ ہری چگ۔ اودھ کے دریا دل فرمانروا جنرل مارٹن کے
مرتی تھے۔ ماآنیہ کے بے رحم سرغنہ میری پشت پناہی پر ہیں۔ مغرب کے کسی سرد، کہرا کوڈ شہر
میں جب مجھے موت آئیگی تو کیا میرے لوح مزار پر یوں لکھا جائے گا۔

HERE LIES DILSHAD ALI KHAN,
BORN IN DHANPUR, 1919,
ARRIVED IN ENGLAND AS A MODERN
FREEBOOTER
DIED AT _____ A COMMON CROOK
PRAY FOR HIS SOUL.

لرزہ سا طاری ہوا۔ دیکھتے دیکھتے زندگی کی آخری سیٹی بج گئی۔ اب اجل کتنی دور ہے۔

سینڈی دوسری طرف کھڑا تھا اسے میری کیفیت کا اندازہ نہ ہوا۔ ہم لوگ باہر نکلے۔ مشرقی پھیٹک پر رکھی ”لارڈ کارنوالس“ کو چھووا سلطان ٹیپو کی آنکھوں نے اسے دیکھا تھا۔ کانوں نے اسکی گرج سنی تھی۔ شیردل نے اسکے گولوں کا سامنا کیا تھا۔ فتح سری رنگا ٹیپو کی یادگار۔ لکھنؤ واپس لا کر اس توپ کو اسکے خالق کلاڈ مارٹن کے دروازے پر نصب کر دیا گیا تھا۔ اللہ اللہ۔ میں نے اپنی پلکوں پر نمی سی محسوس کی۔ یہ لکھنؤ آکر مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مرتبہ کنور نے مجھے غور سے دیکھا۔ چند لحظے خاموش رہنے کے بعد بولا ”چلو کل ذرا بارہ بجی تک ہو آویں۔ تم دھان پور نہ جاؤ گے۔“

”دھان پور۔۔۔ وہاں جانے کی ہمت ہے نہ رشتہ داروں سے ملنے کی میں کل صبح کے پلین سے دلی جا رہا ہوں۔ بڈنایٹ فلائیٹ سے لندن روانہ براہ ٹوکیو۔“

ڈوبتے سورج کے مقابل میں سرمی آسمان کے نیچے CONSTANTIA ایک سیاہ پہاڑی ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ اور اسکی چھت پر نصب اونچے کلاسیکل مجسمے سیاہ میاں۔ ہم عمارت کی طرف لوٹے۔ سامنے ایک دیوار پر نشانات لگے ہوئے تھے۔ فلاں سنہ میں گومتی کا سیلاب اس نشان تک۔ فلاں سنہ میں اس نشان تک۔ فلاں میں۔۔۔

”نیلے پانی کی طرح بہتی جاتی ہیں کبھی ان میں طغیانی بھی آجاتی ہے۔ تب بڑی نساہی چھتی ہے۔“ میں نے کہا: ”آخری طوفان کب آئے گا۔“

”یارت تم بڑی منفی باتیں کرنے لگے ہو، کنور نے جواب دیا۔“

ہم دونوں ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ لامارٹینیر کی موجودہ نسل سامنے سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ طلباء کی ایک لہر کے بعد دوسری گومتی کے مانند بہتی گئی ہے۔ اس وقت پورڈنگ ہاؤس کے ہندو مسلم سکھ بچے اچھلتے کودتے کھیل کے میدان سے واپس آ رہے تھے۔ ایک

لڑکے نے دور سے آواز دی — رکی — وکی — عمران — سینڈی —
کنور سینڈی مسکرایا: "سول اور ملٹری کے اعلیٰ عہدے ان لڑکوں کے منتظر ہیں۔ انہیں
بخشو کی کیا پہچان؟" میں نے کہا۔
"بخشو کون —؟" کنور نے پوچھا۔

"ہے ایک۔ میرا نیا دوست۔ ہوٹل کے پھانک پر رکنا کھڑی کرتا ہے۔ سابق غلام زادہ۔
ہم تم BARONS OF OUDH کے غلاموں کی اولاد۔"

"یار کیا تم ولایت میں رہ کر LEFTIST ہو گئے ہو —؟" کنور نے دریافت کیا۔
"میں اور لفٹسٹ —؟" میں نے زور کا ہتھیار لگایا۔ دل میں عجیب قسم کی شدید بے چینی
موجزن تھی۔ سورج ڈورندی میں غروب ہو رہا تھا۔
رائیگاں۔ رائیگاں۔

کنور پر بھی اداسی طاری ہو گئی۔ سنبھائی کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔
ایک گورا پیرا سا بچہ سامنے سے بھاگا جا رہا تھا۔ "ادھر آنا بیٹا —" کنور نے اسے
آواز دی "یہ میرے پوتے کا کلاس فیلو ہے۔ خوب گاتا ہے۔ عمران زیدی۔ یہاں آؤ بیٹا۔ یہ
تمہارے گریٹ انکل لندن سے آئے ہیں۔ انکو ذرا کوئی گیت سنا دو جھٹ پٹ۔ شاہاش۔"
بچے نے فوراً انٹرن کھڑے ہو کر انگلش اسٹائل سے منہ اوپر اٹھایا اور گانا شروع
کر دیا۔ عہد نامہ قدیم کا ایک سو سینتیسواں مہین

BY THE RIVERS OF BABYLON

THERE WE SAT DOWN, YEA, WE WEPT.

بھیل کا پانی شفق رنگ ہو گیا۔ عبرانیوں کی قید بابل ڈھانی ہزار سال قبل کی —
بہت دُور کی بات تھی۔ بہت دُور کے سُر — گوئی کا یانی بھی بہت فاصلے سے بہتا ہوا آ رہا
تھا۔ بچے نے بونی ایم کا گیت ختم کیا اور بھاگ گیا۔ ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔

BY THE WATERS OF LUCKNOW

میں نے آہستہ سے کہا —

THERE WE SAT DOWN, YEA, WE WEPT

”ہاں۔ اب تک کی زندگی تو ا کا رت گئی۔ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ نہ تمہارے ہاں۔ نہ ہمارے۔“ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن —“ ادھ جلا سگریٹ دور پھینک کر اس نے دیا۔ ”بقیہ زندگی تو سوارت کی جا سکتی ہے۔“

کلا دما تین نے CONSTANTIA کے نیچے ایک سرنگ بنوائی تھی جو امام باڑہ آصفی دل بھلیاں سے جا ملتی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے، ایک شے دوسری شے، ایک وجود دوسرے وجود سے کن ان دیکھی پراسرار سرنگوں کے ذریعے منسلک ہے؟

شغنی کی روشنی میں کنور پانی کے کنارے کھڑا تھا۔ کالر کے اندر اپنا سبز اسکارف ت کرتے ہوئے دوبارہ بولا: ”چلو کل ذرا بارہ بنکی کا چکر لگا آویں۔“ میں جھنجھلا گیا۔ یہاں زجلد پیرس پہنچ کر اپنی ایک کورٹ سروس کا براچ آفس کھولنا ہے۔ اسکے لئے پٹا خہ ریاں بھرتی کرنی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں چلو بارہ بنکی۔“ یار رہے تم کنویں کے مینڈک، پیرس جانا ہے آپ نے بارہ بنکی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ارے اتنا پیسہ ہے ذرا ولایت کی لراؤ۔“ ہماری ایک کورٹ سروس تم جیسے روماء کے لیے ہی تو قائم کی گئی ہے۔ میں نے یں اضا فذ کیا۔ ہم لوگ پھانک کی طرف واپس آئے۔

میرا دوست کار میں بیٹھتے ہوئے بولا ”کل تبیر سے پہر روانہ ہو جائیں گے۔ بس ٹوٹھ برش اور سلینڈر سوٹ پیک کر لینا۔“

لڑکپن میں ہم دونوں اسلٹرح اچانک اپنی اپنی بنسیاں اور بند و قیں اٹھا کر ں بیٹھتے اور پھیلی اور تیز اور مرغابی کے شکار کے لئے چہنٹ لگ کر آیل اور پختی کے ب کا رخ کرتے۔ یا لکھنؤ سے روانہ ہوتے۔ راستے میں عہد شاہی کی گربلا میں۔ آصفی یرمہا راجہ ٹکیٹ رائے کی تعمیر کردہ مسجدیں اور شاہان اودھ کے کنٹری ہاؤسں چھوڑتے اور جنگلوں کی سمت نکل جاتے۔ میں نے طے کیا۔ ٹھیک ہے۔ لکھنؤ ۸۳۔ اکر لیا۔ اب ذرا اضلاع و قصبات کی ایک جھلک بھی دیکھ لیں۔ پرسیوں ٹوکھو۔

بن ساگر کے باسی

دوسری صبح ہوٹل آکر کنور مجھے اپنی نئی کوٹھی پر علی گنج لے گیا۔ اسکی بیوی اور بہو تیر
مینی تال گئی ہوئی تھیں نرکے علاقے پر تھے۔

تیسرے پہر ہم لوگ روانہ ہوئے۔

ازابلاتھو برن کالج۔ فیض آباد روڈ۔ نیا اور برج۔ کرامت حسین گز کالج — ”یہ
تک چل رہا ہے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کنور کچھ کبیدہ خاطر ہوا۔ ”اور تمہارا کیا خیال
بند ہو گیا ہوتا۔“

لڑکیوں کے غول کے غول کالج کے وسیع کیمپس سے نکل کر آرہے تھے۔ آگے نشاط گز
نیا بازار۔ پھر اندرانگر۔ حد نظر تک نئے رہائشی اپارٹمنٹ بلاک۔ یو کلبس کے ایونیو۔ شہر نوا
چکا۔ ہم ہندوستان ایر ٹوٹیکل فیکٹری کے سامنے سے گزر رہے تھے جب کنور بولا: ”خاصہ طویل
ہے سہنچتے سہنچتے شام ہو جائے گی“

”بارہنگی تو صرف پندرہ میل دور ہے“

”ہم ذرا اور آگے جا رہے ہیں۔“

ہم لوگ باتوں میں اسقدر مصروف تھے میں نے اب تک پوچھا ہی نہ تھا کہ کہاں کا
ہے۔ اب دریافت کیا تو بولا۔ ”ہم جہاں جا رہے ہیں وہ اپنے مہمانوں کو بلدی واپس،
آنے دیتے۔ شاید کل بھی ٹھہرنا پڑے۔“

میں جھنجھلا گیا: ”تم رہے ہندوستانی چیٹرفنات۔ وقت کی پابندی تمہارے لئے کوئی

نہیں۔ علاوہ ازیں میں کسی اجنبی کے ہاں ایک دن سے زیادہ ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔
”تم نقلی انگریز بن چکے ہو۔ لندن میں رہت ہو۔ مگر ہمارے پیر مہانوں کو بڑے اصرار سے
روکتے ہیں“

”پیر— کیا مطلب؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”جہاں تک مجھے یاد ہے تم تو نامی گرامی
پلے بوائے ہو کرتے تھے۔“

”تمہارے اسٹائل سے لگتا ہے کہ تم اب تک پلے بوائے چلے جا رہے ہو۔ مگر ہمارا راستہ
بدل گیا۔ ہم مدھوشالا سے چلے تو مدھوبن میں جانکے۔“

ویسٹ میں کسی گرو یا سوامی کا چیلانینا ایک FAD ہے۔ ہمارے زمانے میں یہاں بے شمار
اہل ہنود مسلمان درویشوں وغیرہ کے معتقد ہو کرتے تھے۔ مگر آجکل بھی ایسا ہو رہا ہے۔ العجب!
ہر سے بھرے چینٹ سے گذرتے آگے بڑھے۔ دونوں طرف بے پناہ سبزہ۔ شادابی۔
جھیلیں۔ آم کے باغات۔ ”مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ انڈین کنٹری سائیڈ اتنی خوبصورت ہے۔“ میں
نے اظہار خیال کیا۔

”دن بجاتی۔ تم تین برس ولایت میں رہ کر بالکل یو۔ کے۔ پی بن گئے۔“
”یو۔ کے۔ پی؟“

”لکھنؤ میں ڈاکٹر منصور کا شغری سے ملنے کا اتفاق ہوا، ماشا زنگ ہوم والے۔“
میں چونک پڑا۔ میں نے اسے بتلایا تھا کہ آجکل سہارنپور کا فرینچر امریکہ ایکسپورٹ کیا جا رہا
ہے۔ میں اسے برطانیہ امپورٹ کرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہوں۔ اور لکھنؤ کا چکن بادلہ
درک وغیرہ۔ نواب بیگم کی تصویر والے قصبے کا لکھنؤ میں عام چرچا تھا لیکن کنور نے اب تک اسکا
تذکرہ بھی نہیں کیا اپنے آپ میں لگن تھا۔ کہنے لگا ”میری بیوی اور بہو میں ماشا ہیلنہ کلب جاتی
رہتی ہیں۔ ڈاکٹر کا شغری کو بھی ہم جانتے ہیں۔ باغ و بہار آدمی ہیں۔ انھوں نے بڑے دلچسپ
مخفف امتزاع کر رکھے ہیں۔ یو۔ کے۔ پی یعنی او کے پتھے۔“

میں نے اطمینان کی سانس لی۔

چند منٹ بعد ہم بارہ بنکی پہنچ گئے۔ ایک بس اسٹاپ پر غرارہ پوش مسلمان عورتیں

دکھلائی پڑیں۔ پھر وہی خیال آیا جب تک غرارہ باقی ہے کلچر باقی رہیگی۔ بارہ بنکی سے نکل کر پھر شاہراہ پر آئے۔ ایک جگہ ایک بس سے اتر کر سیاہ برقعے اوڑھے کالج کی لڑکیاں کتابیں سمجھانے ایک کھیت کی پگڈنڈی پر سولیں۔ اور دو ایک گاؤں کی طرف روانہ ہو گئیں جسکی سفید مسجدوں کے کنارے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ دیر تک ان لڑکیوں کے رنگ برنگے غرارے ان کے برقعوں کے نیچے سے نظر آیا کیے۔ اب مجھے غرارہ کو مپلیکس ہونا جا رہا ہے۔

سات میل بعد دیوہ شریف۔ ہائے دیوہ شریف۔ بچپن میں بڑے آبا مرحوم کے ساتھ عرس کی نمائش میں آیا کرتا تھا۔ ایک ماموں بھی وارثی فقیر ہو گئے تھے۔ کنور بولا۔ ذرا اور چند روز کٹھنر جا تو میلے اور مشاعرے میں شریک ہو لینا۔ کروا چوتھے کا چاند میری بیوی اور بہنیں یہیں آکر دکھتی ہیں۔“

نمائش گاہ کے راجہ اعزاز رسول گیٹ اور بارہ دریوں کے سامنے سے گذرتے ہوئے ایک مستعد گائید کی طرح اطلاع دی: ”اس میدان میں دو دروازے مولیٰ — ادھر نمائش حاجی صاحب کا مرمری مقبرہ رتھنیوں سے لبقہ نور۔ پونم کے چاند ایسا — اور — اور رات کے سمندر میں پچاس ہزار ہندو مسلمان یا تریوں کا جوار بھاٹا۔“

کنور پہ اب شاید کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ میں خاموش رہا۔ سینٹ پال کے DOME کی عادی آنکھوں کو دور سے روٹنے کا گنبد دکھلائی دیا۔ سامنے سے ایک جلوس جا رہا تھا۔ ہار پھول اور چادریں لیے مزید غرارہ پوش بے پردہ عورتیں۔

ہر طرف لوکل کلر کی افراط۔ دیوے شریف سے نکلے۔ اب ذرا اکتا کر کنور سے پوچھا

”تمہارے پیر صاحب کسی جنگل بیابان میں رہتے ہیں؟“

وہ خاموش رہا۔ گویا اپنے پیر کا بلاوجہ سرسری تذکرہ کرنا بے ادبی تھی — شاہراہ چھوڑ

کر ایک کچی سڑک پر کار موڑی۔

”تم کو راجہ صاحب محمود آباد یاد ہیں؟ راجہ امیر احمد خان مرحوم، چند منٹ تک چکولے کھانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

”بالکل یاد ہیں۔ سچی نیک انسان تھے“

”ہاں۔ ایک زمانے میں جب ان پر مذہب اتہاسے زیادہ طاری ہو گیا تھا انہوں نے کیا کہ باری باری ہر بیغیر کے طرز حیات کی پیروی کرینگے۔“

”ہمیشہ جو کی روٹی کھاتے تھے راجہ صاحب۔ سادہ سنت آدمی تھے“

”ہاں۔ انبیاء بھی چرایا کرتے تھے چنانچہ راجہ صاحب نے آسٹریلیا سے بہترین بیٹریں منگوائیں۔ انکو ندی کنارے چھوڑا گیا۔ اب روز صبح راجہ محمود آباد اپنی رولز پر چاکا شریف لے جاتے۔ چوہدار بیٹریوں کو گھیر گھار کر انکی خدمت میں پیش کرتے۔ آپ ایک عصا نبھال کر چیمینٹ تک بیٹریوں کو سہر۔ سہر کرتے پھر کار میں بیٹھ کر قلعے واپس چلے جاتے“

”تو — ۶“

”تم بھی ہی کر رہے ہو۔ اپنی مرے ڈیز پر بیٹھ کر کچے راستوں کے دکھے کھاتے کسی کو ردہ ن طرف رواں ہو جہاں کسی پیر صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی آتما کو فائدہ پہنچانے کی دوشش کرو گے۔“

”بکومت۔“

”آج کل پاکستان میں بھی فیشن چل پڑا ہے۔ بالخصوص دو متمند سگمات ایک ایک پیر صاحب کی معتقد ہیں۔ وہاں کی طرح یہاں بھی تصوف کا تذکرہ نیا انٹلیکچوئل فیشن معلوم ہوتا ہے۔ ایک سے ایک پرانا مارکسٹ صوفیاء کی بات کرتا ہے بسلسلہ انسان دوستی“

”دہنی فیشن بدلتے رہتے ہیں؛ کنور نے اطمینان سے جواب دیا۔“ ایک نامی گرامی بارس وادی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ دنیا خدانے پیدا کی۔ انسان خدانے بنایا۔ بچپن کے نماز روزے کا اثر انسان کی سائیکلی میں باقی رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ“

”واٹ اباؤٹ یو؟ تمہاری سائیکلی کا بھی یہی احوال ہے؛ یا تم تو اگنوٹنگ ہو کرتے تھے“

”ہم محض اپنے مرشد کو مانتے ہیں“

”ہمارے خیال میں تم تنگ گئے ہو۔ بڑھاپے میں کوئی نہ کوئی تنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ تم ٹھیک گئے ہو یا سینڈی۔ پتہ ہے تمہاری اس روحانیت کے چکر میں میرا انجری پتھر ڈھیلا ہوا۔“

اس ناممکن سٹرک پر اور کتنے میل جانا ہے؟“

”چپ چاپ چلے چلو — مگر تم ظاہری مذہب پرستی اور سچی دینداری میں آج تک تمیز نہیں کر پاتے؟ ساری دنیا کا تجربہ تو رکھتے ہو؟“

میں نے کہا: ”یہ سب بڑی اضافی اصطلاحات ہیں۔ سچی دینداری وغیرہ“

”GENUINELY RELIGIOUS“ لوگ ہی MYSTICISM کی طرف چلے جاتے

ہیں۔ کنور نے جواب دیا۔

مجھے طیش آگیا: ”ارے یار۔ صوفی شاعروں کی سرزمین میں آجکل کیا دیوان حافظ سے

فال نکالی جاتی ہے کہ آج کتنے دانشوروں کو پھانسی دی جائے کتنی حاملہ عورتوں کو گولی ماری

جائے؟ وہ لوگ بھی تو خود کو سچے دیندار سمجھتے ہیں جو یہ سب کر رہے ہیں وہاں“

”کامیاب بزنس میں کے علاوہ تم ایک باشعور سیاسی مبصر بھی بن چکے ہو!“

”جس لائن میں ہم ہیں اس میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے ضروری ہیں“

”کون لائن —؟ اچھا وہ ایکسپورٹ امپورٹ؟“ کنور نے بھولپن سے پوچھا پھر بولا۔

”ہاں۔ ہم تم سے متفق ہیں۔ مذہب ہمارے ہاں تو BIG BUSINESS بھی بن چکا ہے۔

بہت سے نینا لوگ ایک دوسرے کے خلاف لگیے اور سون کر داتے ہیں جیوتنشی اور روانی سیاسی

مشیر بنے ہوئے ہیں۔ عجیب سٹریٹونگ مچی ہے۔ لہذا — جو چند ایک سچے فقرا اور یوگی موجود

ہیں انکی طرف سے بھی لوگ بظن“

”تصوف تو دودھائی سو سال سے آلودہ ہو چکا ہے اسی کرپشن اور توہم پرستی کے خلاف

ہمارے ہاں شاہ ولی اللہؒ نے —“

”معلوم ہے“

”کم از کم ایک بات تو ہے۔ اپنے مرشد کے اثر سے تم نہایت لائق فایق ہو گئے!“

”شکریہ۔ شکریہ!“ کنور نے ہنسکر کہا اور کار کو ایک گڑھے کے کنارے سے نکالنے

میں منہمک ہو گیا۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد پھر بولا — ”تم کو معلوم ہے کمبیرج یونیورسٹی

کے پروفیسر ڈیراک نے کچھ عرصہ قبل ایک مضمون لکھا کہ نظریاتی فزکس میں جو کچھ ہو سکنے کی چیزیں

تھیں وہ تو اب تک ہو چکیں جو پر اہم باقی ہیں وہ عرصہ دراز تک حل نہیں ہو سکتے۔
 ”فرانس میں —“ اس نے کار کو پھر ایک جگہ لوے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”فرانس میں بہت سی ریاضی داں ایسے ہیں جو اپنے کام کے ذریعے مٹھیمیکس میں زبردست انقلاب
 لائے۔ اپنی PRIME پر پہنچ کر وہ دفعتاً MYSTICISM کی طرف چلے گئے۔ انتہائی
 اٹلکچوئیل سرگرمیوں کے بعد انسان کہیں اور — آگے دیکھنے لگتا ہے TRANSCENDENTAL
 POWERS کی طرف۔“

”کیا دانشوروں کا دماغ خراب نہیں ہو سکتا؟ میں نے کہا: ”بڑے بڑے سائنسداں
 ایک وقت آتا ہے کہ SENILE بھی ہو جاتے ہیں۔“
 ”فرانس کے ان جوان سال MATHMETICIANS کی بات کر رہا ہوں یا جو اپنے
 PRIME میں کیتھولک تصوف کی طرف چلے گئے۔“

”انکی سائنسی میں جو انکے رومن کیتھولک ورثے کا اثر تھا وہ عود کر آیا —“ میں نے جواب دیا۔
 کنورچپ ہو گیا۔ میں باہر دیکھنے لگا۔ دونوں طرف دھان کے کھیت۔ طراوٹ۔ آم کے
 باغ۔ جھیلیں۔ درمیان سے گذرتی ٹکسنہ کچی بل کھاتی سڑک — چار سٹوہریالی پراپنا
 جادہ حیات بھی تو اسی طرح اُڈ بڑکھا بڑ ہے۔ ٹیڑھا میڑھا میرا باطنی لینڈ اسکیپ۔
 کنور جانے کیا سوچ رہا تھا، کچھ دیر بعد بولا: ”دلن بھائی۔ ہر درخت، ہر ندی، ہر پھول
 پتہ دھرتی کا ایک اسٹیٹمنٹ ہے۔“

بانس کے ایک جھنڈ میں چھپرے تلے غرارہ پوش لڑکیاں سہاگ گارہی تھیں۔ جی بیٹھ گیا۔
 کنور سے کہا ذرا گرنا۔ کان لگا کر سنا۔ ایسا لگایا آوازیں دھان پور سے آرہی ہیں۔ پنڈت جو
 آدیں راجہ راس گنانے — پنڈت کانگ میرے ابا کو دیکھو۔ سہاگ مانگن گئی حضرت
 بی بی کے انگنا — حضرت بی بی کے انگنا۔

کنور نے کار آگے بڑھائی راستے کے کنارے چند مضبوط اونچے درخت جڑ سے
 اکھڑے پڑے تھے: ”پچھلی آندھی میں بڑی تباہی آئی۔ اس سال بہا کا بھی خطرہ ہے۔
 یو۔ پی ادبہار میں بہت گڑ بڑ جھالا چل رہا ہے دلن بھائی۔ کرپشن اتنا ہے کہ ٹھیکیدار کمزور بندہ

باندھتے ہیں جو ہر برسات میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمالیہ پر درخت بے تماشا کاٹے جا رہے ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کی مٹی گر گر کر ندیوں کو اٹھلا کیے دے رہی ہے۔ سیلابوں کا زور بڑھ گیا۔ ”یا تم تو خوش نصیب ہو کہ اپنی جگہ کھڑے ہو جڑوں سمیت“ میں نے کہا: ”تمہیں اپنے آپ کو انگلیٹڈ وغیرہ ٹرانس پلانٹ کرنے کا خیال نہ آیا“

”ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی بہت بڑھیا موقعہ ملتا تو چلے جاتے“

”مزید کچھ جھونپڑے“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”راستے میں اتنی سی فیکٹریاں ملیں اور ساتھ ساتھ ایسے پیمانہ گاؤں“

”ابھی پیمانہ گاؤں سے نکل کر لڑکیاں لڑکے الیکٹرونک انجینیر بن رہے ہیں۔“
کنور بڑا قوم پرست آدمی ہے۔

پھر زور سے دھکا لگا۔ اس جگہ راستہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا: ”بڑی اٹکل پچھڑی ہے یا۔ ایسی بڑھیا شاہراہیں اور ایسے کچے راستے“

”ترقی ہو تو رہی ہے۔ اٹکل پچھڑی سہی۔ میرا ایک سالانیہ جہزی کے ایک حسین گاؤں میں سینٹل ہو گیا ہے ایک بار آیا تو اپنے شاندار مکان کی تصویریں دکھلا رہا تھا۔ بات بات پر میرے ویلج میں، یہ اور میرے ویلج میں وہ۔ میں نے کہا تم ان کچے جھونپڑوں والے غلط گاؤں کو دستر و ضرور کر سکتے ہو انکے چھڑوں اور کھیتوں کی وجہ سے جھینپ بھی سکتے ہو مگر کیا یہ امسکیر قریہ واقعی تمہارا گاؤں ہے؟ تمہاری اولاد کا شاید ہو جائے۔ دلن بھائی کیا وہاں رہتے ہو تے تمہیں بھی اپنے ایشیائی اور یجن سے شرم آتی ہے؟ اس نے مسکرا کر ذرا غو سے مجھے دیکھا: ”قلح سے تو تم باسانی اینٹیلین سمجھے جاسکتے ہو۔“

میں خاموش رہا۔

”نام بھی بدل سکتے ہو۔ DELI SHAW ELI KAHN — وہ مذاق کر رہا“

لیکن مجھے اپنے کالر کے سچھے گرمی محسوس ہوتی۔

کہنے لگا: ”تم درختوں کی بات کر رہے تھے۔ ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہ گھرانہ ساڑ

پانچ سو سال سے اسی دنیاؤسی گاؤں میں رہ رہا ہے۔ وہی درگاہ۔ وہی کچے مکان۔ وہ

کھیت کھلیاں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے لیکر آج پرانے منسٹر انڈراکانڈھی کے دور تک۔ - افق پر ایک گھنا WOODLAND دیکھتے ہو؟ اسمیں محبت کے جنگل کا تیسر رہتا ہے۔“
میں نے اس لڑکی کی جگہ کی داد دی۔

دھان کے لہریں مارتے ہرے سمندر کے کنارے ایک مسجد نظر آتی۔ نیلے آسمان میں ایک چمکیلا سفید کٹ آؤٹ۔ سیاہی مائل بسز و درختوں کا جزیرہ جو ہرے سمندر سے گھرا ہوا تھا۔
”بن ساگر کے بن باسی“

”کون چیز؟“

”ہمارے شیخ کے جدا جدا بہت بڑے بزرگ تھے۔ سنٹرل ایشیا سے آئے تھے۔ ماہے دیں میں گھومتے پھرتے مالوہ پہنچے۔ وہاں کا سور یہ دنشی راہہ انکا مرید ہو گیا۔ مالوہ سے چلنے لگے تو بہت دکھی ہوا کہنے لگا آپ کے جانے سے میرا جل ساگر بے رنگ ہو جائے گا۔ اپنا بالک یہیں چھوڑ دیجیے۔۔۔ جل ساگر سا رنگ ہو جائے“
”ساگر تو ہوتا ہی جل کا ہے کھئی۔“ میں نے کہا۔

”فقراے ہنود کی بول چال میں عالم علوی بن ساگر کہلاتا تھا اسکا مشاہدہ کرنے والے بن باکی عالم نقلی جل ساگر۔۔۔ ہم تم سب جل باسی ہیں“
”دیسری انٹر سٹنگ“ میں نے اخلافا کہا۔

”مرشد زادے کو راہہ نے بیٹا بنالیا۔ اسکے مرنے کے بعد راجکمار سا رنگ جو تھے وہ گدی نشین ہوئے۔ شہر سا رنگ پورا انہوں نے ہی تو بسایا تھا ریاست دیو آس میں“
”ای۔ ایم۔ فورسٹر والا دیو آس؟“

”وہی۔ اچھا تو سو رگیہ راہہ کی تو بیٹی تھی۔ وہ مخدوم۔۔۔ آئی مین۔۔۔ راجکمار سا رنگ کی گویا بہن ہوئی نا؟ اسکا بیہ فیروز شاہ تغلق کے بیٹے شہزادہ محمود سے ہوا۔ تو اس رشتے سے شہزادہ راہہ سا رنگ کا بہنوئی بن گیا۔ بادشاہ نے انہیں دئی بلا کر اونچا منصب ملا مقرر کیا۔“ کنور نے گاڑی کی رفتار دھیمی کی۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سندھ سے دئی تشریف لائے۔

یاریہ بڑے FASCINATING بزرگ رہے ہونگے۔ ایک روز فیروز شاہ نے خانقاہ میں آپس
ما حاضر بھیجوا یا۔ ملک سازنگ ساتھ گئے۔ سوچو کیا منظر رہا ہوگا۔ غلاموں کا جلوس سرسرخوان پوش
اٹھائے جلعت پہنے ملک سازنگ آگے آگے گھوڑے پر

”اچھا۔ تو کوئلہ فیروز شاہ سے روانہ ہو کر اس خانقاہ کے پھانک پر پہنچے ہیں۔ مخدوم جہانیاں
نے لکھا ہے سلطان نے انہیں دلی کی چالیں جانقا ہوں کا انچارج مقرر کیا تھا۔ تو جناب ملک
سازنگ اسپ تازی سے اتر کر اندر پہنچے ہیں۔ دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔

”مخدوم درباری امیر سے انکا حال احوال دریافت کرتے ہیں تب ملک سازنگ کو پتہ
چلتا ہے کہ وہ تو مخدوم جہانیاں کے فرسٹ کزن ہیں۔

”خود مخدوم زادے تھے۔ جہانیاں جہاں گشت کے اثر سے سنیاں لے لیا۔ حج کرنے کیلئے
پیدل روانہ ہو گئے۔ وہاں سے لوٹے گھومتے پھرتے دلی سے سینکڑوں میل دور اس بن بھوم
میں آپہنچے۔ گیان دھیان کرنے“
سینڈی تصوف اور یوگ کی اصطلاحات تے لکان استعمال کر رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک گاؤں نظر آیا! سامنے جو جنگل ہے یہی انکا تپ دن تھا۔ وہ دیکھو مسجد
کے نزدیک ہر گنبد دکھلائی پڑ رہا ہے۔ انکا مزار شریف لکھنؤ کے شاہ مینا صاحب انکے خلیفہ تھے۔
”بہت خوب“

”عمرس انکا کل ہی ختم ہوا ہے۔ انکے وصال کے پانچ سو سال بعد اس خاندان میں میاں
کے والد پہلے دلی پیدا ہوئے۔ میاں دوسرے“

گاؤں میں داخل ہو کر کنور نے مرسیڈیز ایک برگڈ کے نیچے روک لی۔

(۳۷)

دریائے نور

میلہ اٹھ چکا تھا۔ دوکانیں بڑھانی جا رہی تھیں کچی سڑک پر چرخ چوں کرتا ایک چھکڑا
ن کر رکا۔ گوگلز لگاتے سفید ساری میں ملبوس ایک گوری جی خاتون اس پر سے اتریں۔ کنور کو
ہجان کر نمسکار کیا۔ درگاہ کی سمت چلی گئیں۔ پھانک پر ایک صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے
نور کو آواز دی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے دوڑا گیا۔ میں مرتے ڈیز سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
نام کا اندھیرا چھپا چکا تھا۔ مکانوں میں چراغ جل رہے تھے۔ تین برس مغرب کی چکا چوند میں
زار نے کے بعد میں وطن کے ایک نیم تاریک خالقہی گاؤں میں موجود تھا۔ اپنے دوست کی
توں پر غور کیا۔ شرک۔ بدعت۔ توہمات۔ ری ایکشن اور غیر سائنسی ذہنیت کو فروغ دینے
بے یہ پیر فقیر، خواص و عوام کے لیے اتنی بڑی انیم تھے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ اس ادہام
رست ملک میں یہ آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔ گھڑی دیکھی۔ کنور کے بچے نے اس کو روہ میں
اڈالا۔ یہاں ساری شام کس طرح کٹے گی۔ اور رات مجھ بھی ضرور ہونگے۔ اس وقت طیارے
کے انتظار میں آرام سے پالم کی لاؤنج میں بیٹھا شیوا اس ریگال سے شغل کر رہا ہوتا۔

سامنے دوپٹی ٹوپوں اور تہہ پوش مسلمان کسانوں اور دھوتی پوش ہندو کسانوں کا جھوم
ڑھتا جا رہا تھا۔ ایک شامیانے کے نیچے کرسیاں اور کھاٹ بچھے تھے۔ وہاں بھی لوگ جمع
تھے۔ چند قدم پر سرکنڈوں سے گھرا تالاب۔ درگاہ کے نزدیک ایک وسیع کچا مکان۔
پھانک پر ایک سرخ پوش فقیر نے نعرہ لگایا — حق — حق — حق —

ایس وقت بند دروازوں اور سبز پردوں والی ایک جیپ تیزی سے آن کر مکان کے صد
روازے پر رکی۔ بڑھیا گوگلز لگاتے ایک خوشرو نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا۔ دوسرے لمحے سفید
ون اور آبی رنگ کی جرسی میں ملبوس گھنگریالے بالوں والا تھیلیٹک قسم کا وہ کشیدہ قامت

شخص دروازہ کھول کر جیپ سے اترے۔ ہمارے کنورسینڈی کی طرح کا ایک اوفیشن ایبل مین زادا جو اپنے پیر سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔

لیکن جوں ہی وہ گاڑی سے نمودار ہوا بھیڑاسکی سمت لپکی۔ اس نے مسکرا کر سب کو ایشیرواد دی اور شاہانہ وقار کے ساتھ مکان کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔

اب میں چکرایا ممکن ہے یہ پیر صاحب کا بھانجا بھتیجا ہو جو MOD ہو گیا ہے اور پیر صاحب کے معتقدین اسکے بھی دست بوسی قذوبوسی کرتے ہیں۔

گلیمرس نوجوان ڈیوڑھی کی کچی سیڑھیوں پر پہنچا ہی تھا کہ کنور بھاگتا ہوا آیا اور جھک کر اسکے پیروں پر سر رکھ دیا۔ نوجوان نے شفقت سے مسکرا کر کنور کے سر پر ہاتھ رکھا۔

میں حیران پریشان کار کے پاس کھڑا تھا۔ کنور نے مجھے آواز دی۔ میں وہیں ٹھٹھکا رہا۔ نوجوان اندر چلا گیا۔

چھکڑا کھڑا کھڑا آنا ہوا برگڈ کی چھاؤں میں پہنچا۔ اس پر سے اتر کر برساتی پوش خاتون کچھ دیر قبل درگاہ میں گئی تھیں۔ گاڑی بان مریل گھوڑے کو چارہ کھلانے میں مشغول ہوا میں وہاں کھڑا کھڑا ڈرا عجیب سامحوس کر رہا تھا۔ مجھ جیسا دنیا دار آدمی۔ کنور صاحب کے مرشد سے کیا بات کرونگا۔ یہ میرا دائرہ عمل ہی نہیں۔ انکا جو یہ MOD بھانجا بھتیجا آیا ہے اس سے البتہ دوستی ہو سکتی ہے۔

میں نے گاڑی بان کو ایک سگریٹ دیا۔ اس نے بتایا کہ قبصر باغ بس ڈپو سے جو بس خاص طور پر یہاں آنے کے لئے چلائی جاتی ہے وہ شام کو یہاں پہنچ کر دوسری صبح سویرے نکھنوا پس چلی جاتی ہے۔ اسوجہ سے بہت سے لوگ دوسری بسوں پر قبضے تک آکر کھڑا کرانے پر لیتے ہیں اور سات کلومیٹر طویل کچی سڑک پر بچکولے کھاتے یہاں پہنچتے ہیں کیونکہ لوگ میاں کو بے انتہا چاہتے ہیں۔ دور دور سے آتے ہیں۔ میاں کھد مت کھلک کے لیے زیادہ تر دور سے پر رہتے ہیں انکے انتجار میں یہاں ہفتوں مہینوں پڑے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ بندو۔ مسلمان۔ سیکھ۔ سیکھیں اور رانیاں۔ بوڑھے۔ جوان۔ امیر۔ گریب۔

گاڑی بان بڑا دلچسپ آدمی نکلا۔ میں نے پوچھا کب سے یہ کھڑکھڑا چلا رہے ہو۔
 ”صاحب۔ تین چار سال سے۔“
 ”پہلے کیا کرتے تھے؟“

ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ ”تجور۔ بُرا کام کرتا رہے۔ پتھرین کے پیچھے طبلہ ہار موسیٰم بجاوت
 ہے؛ اس نے کسی گاؤں کا نام لیا۔ ”ہواں اب بھی چالینٹ ڈیرے ہیں۔ گاتی بجاتی گاؤں
 ایل کھوتی ہیں۔“

میں نصف صدی قبل کے اودھ میں پہنچ گیا۔ وقت یہاں جیٹ کے بجائے کھڑکھڑے
 موارا اپنا سفر طے کر رہا ہے۔

”صاحب۔ آپکو میاں یاد فرما رہے ہیں۔ ایک آدمی نے آکر کہا۔ بادل ناخواستہ پر چھا
 لے آستانے کی سمت روانہ ہوا۔ سورج کی آخری کرنوں میں جھیل سنہری ہو گئی۔ سارنگ۔
 تنک کی روشنی کا تالاب۔“

کچھ مکان کے بیرونی طویل کمرے سے گذر کر خادم کے ساتھ اندر پہنچا۔ کچے فرش کے
 دصاف ستھرے آئنگن میں چاروں طرف خوش رنگ پھولوں کے گلے۔ ایک کونے میں سینڈ
 پ۔ سامنے کچا سدرہ۔ خدام اور اراؤتمندوں کا ہجوم۔ دالان کی سیڑھیوں پر درجنوں مسلمان
 رہنڈ لوڑکیاں سر ڈھانپے ہوڈ بانہ بیٹھی تھیں صحن میں کرسیاں اور کیمپ کوٹ۔ وسط میں
 بکیمپ کوٹ پر وہی مہنس مکھ نوجوان گاؤتیکے کے سہارے نیم دراز بیچوان کے کش لگا ہاتھا۔
 یہ صاحب خان ابھی حجرے میں تھے یا مسجد سے نلوٹے تھے۔ کنور نے میرا تعارف کرایا۔
 مرکار۔ یہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ راجہ دلشاد علی خان۔ اب مدتوں سے دلایت
 رہت ہیں۔“

نوجوان نے شفقت سے مسکرا کر ”السلام علیکم“ کہا میں نے برطانوی انداز میں ”ہاؤ
 یوڈو“ ایک پریشان صورت غریب عورت بچہ گود میں لیے آکر نوجوان سے بات کرنے لگی۔
 نے چپکے سے کنور سے پوچھا۔ ”تمہارے پیر صاحب کہاں ہیں؟“
 ”ارے یہی تو ہیں۔“ کنور نے جواب دیا۔

میں بھونچکا۔ آنکھیں پھاڑ کر گلیمس نوجوان کو دیکھا۔

میاں میرے استعجاب سے بہت محفوظ نظر آتے۔ جنبیوں کے اس رد عمل کے عا
معلوم ہوتے تھے مجھے AT EASE کرنے کے لئے لندن کے متعلق باتیں کرنے لگے۔
مسکرا کر مجھ پر نظر ڈالی۔

اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گوڈریمپلز محوس ہو امیر سے ماضی اور حال
رتی رتی بات اس روشن ضمیر انسان پر عیاں ہے۔ اس وقت وہ کھڑکھڑے والی خاتون
زنانہ مکان سے برآمد ہوئیں۔ نمسکار اور قدمبوسی کے بعد ہاتھ جوڑ کر پائنتی کھڑکی ہو گئیں
کے اشارے پر ایک کرسی پر ٹکیں۔ بہت نروس معلوم ہوتی تھیں۔ میاں بے پناہ سنس اف
کے مالک نکلے کہنے لگے ”ہم آپکے پیچھے پیچھے یہاں پہنچے۔ آپ تو اس طرح کھڑکھڑے پر
تھیں برساتی اور ہے گوگلز لگاتے جیسے فلم کی شوٹنگ کے لئے جا رہی ہوں غضب کے پورے
میں کنور کے ساتھ ذرا فاصلے پر جا بیٹھا۔ ”میاں اتنی کم عمری میں اتنے بڑے ولی کیے
ہو گئے؟“ میں نے طنزاً دریافت کیا۔

”پیدائشی“ ایک سرخ داڑھی والے بوڑھے پٹھان نے جواب دیا ”پانچ سال کی
میں دستار بندی کی گئی تھی“

”میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی صاحب وقت تھے۔ میاں اس دور کے قطب ہیں۔
”بلکہ قطب الاقطاب“ شلو ارمیٹس میں ملبوس ایک ڈبلی لڑکی گفتگو میں شامل ہوئی گونور
اسکا تعارف کرایا۔ وہ عربی میں ایم اے تھی اور شمالی افریقہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھا چکی تھی
”نہایت MOD قطب ہیں“ میں نے آہستہ سے کہا۔

دفعاً لڑکی نے مجھے مخاطب کیا ”راجہ صاحب۔ آپ حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی
کے اسم گرامی سے واقف ہیں؟“

میں نے ذرا مبہم سا سر ہلایا۔ سوچ رہا تھا کہ واقعی بڑے پھنسے۔ لڑکی کہنے لگی ”
سے نواب عبدالباسط خواں نے قطب وقت سے ملنے کی تمنا ظاہر کی۔ حضرت مولانا
فرمایا تم نے شاہ مینا صاحب کی درگاہ میں کل کسی سے جو تاملوایا تھا؟ انہوں نے جواب

ہاں میں نے انکو کافی سخت سُست بھی کہا تھا۔ مولانا نے فرمایا۔ اچھا خیر۔ نواب بولے حضرت طرح قطب سے ملنے سے کیا فائدہ۔ ہم چاہتے ہیں ملیں اور پہچانیں۔

”ایک روز نواب صاحب معالی خاں کی سرائے جا رہے تھے۔ راہ میں گول دروازے ایک بانکے ملے۔ انہوں نے کہا السلام علیکم۔ انہوں نے جواب دیا۔ وعلیکم السلام۔ اور آگے ل دیے۔ جب مولانا عبدالرزاق صاحب سے ملے۔ انہوں نے فرمایا اکل تم سے قطب ملے فھے اور سلام بھی کیا تھا۔

”اسکے بعد جناب عالی ایک بھشتی کی وضع میں قطب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے بچے کو پہنچوایا۔ نواب نے سلطنت اور دھک کی واپسی کی خواہش کی۔ انہوں نے جواب دیا مقدرات کسی کو دخل نہیں ہم تو مقدرات کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ عرض کرنے والے دوسرے منرات ہیں۔ تمہارے سپہاگر چاہیں تو ہو سکتا ہے۔“

”ناجانے کس بھیس میں نارائیں مل جائیں، کنور نے کہا۔

”ایک قصہ تو ہمارے دادا ابانا تے تھے،“ عربی داں لڑکی نے بات جاری رکھی۔

انکے ایک دوست تھے بہرائچ میں۔ احمد اللہ شاہ۔ انکے ہاں ڈنر سپر ایک انگریز آیا تھا وہ انہوں نے بعد میں بتایا کہ فلاں جگہ کا قطب ہے۔“

”CURIUSER AND CURIUSER“ — میں نے ایس آن ڈنڈر لینڈ

طرح کہا۔ سرخ ریش مولوی صاحب رسان سے بولے ”ان معاملات کا مذاق نہیں لانا چاہیے۔ جن باتوں کو آپ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے انکے بارے میں خاموشی بہتر ہے۔“

سرخ پوش فقیر نے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر حق — حق — حق — کا نعرہ لگایا۔ صحن چکر کاٹا اور میاں کو ڈنڈوت کر کے باہر نکل گیا۔

”یہ شخص“ — کنور نے کہا ”نرائی کے علاقے کے ایک بڑے مندر کا پجاری تھا۔ فقیری لیکر لے آئے۔“

میاں اٹھ کر حجرے کی سمت گئے۔ کچھ دیر بعد ننگی کزن اور دوپٹی ٹوپی پہنے واپس آکر پلنگ پر بیچوچان کی منہ سے لگائی۔

ہم لوگ پھر انکے قریب جا بیٹھے۔ میں نے ایک عجیب بات نوٹس کی مسلسل حقہ پیتے رہتے تھے مگر دھواں غائب۔ سُن رکھا تھا کہ صوفیاء اور یوگی ایسی چیزوں پر قابو پا لیتے ہیں جو اتنا سوچا ہی تھا کہ میاں نے سچوان کا دھواں اڑانا شروع کر دیا۔
 دالان میں خاصہ چٹا گیا۔ خورتوں کا گردہ کھانے کے لیے زنا نخانے کی سمت روانہ ہو بیس پچیس لوگ میاں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے ”باقی دوسری شفٹ میں کھائیں گے،“ کہنے سینڈ پیپ پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا ”سال کے بارہ مہینے صبح شام دعوتی کھانے کی یہ فریاد بھی کراہت ہے۔ لوگ بسوں میں بھر کر آدھی رات کو یہاں پہنچتے ہیں انکے لئے دینیوں کھانا تو میں خاموش رہا۔

”سرکار کی ہمیشہ سیرگان اور برادر خورد بھی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔“

اندر دالان میں میاں سجد اخلاق سے پلیٹوں میں کھانا نکال نکال کر سب کو پیش کرتے تھے ”میاں اسوہ حسنہ کی مثالیں پیش کرنے پر مامور ہیں۔“ عربی داں لوکی نے کہا۔

”خلق اللہ کو اپنے دسترخوان پر کھانا کھلانا صوفیائے اکرام کی روایت ہے۔“
 — اس دسترخوان پر کنوڑ نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا ”میاں کے مخالفین بھی موجود تھے

میں میاں انکو بھی اسی محبت سے کھلاتے ہیں“

”مخالفین کون ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”بہت ہیں۔ کہتے ہیں۔ میاں داڑھی کیوں منڈاتے ہیں انگریزی لباس کیوں پہنتے ہیں باغ میں دس پنڈرہ گتے کیوں پال رکھے ہیں کبھی کبھی جماعتیں گاؤں کی مسجدوں میں آدھی رات کو گرتی ہیں۔ وہ انکو بدعتی کہتے ہیں،“ سرخ ریش نے جواب دیا ”میاں ملا متی فقرا کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوگ جتنی انکی غیبت اور ملامت کرتے ہیں انکے مدارج بڑھتے جاتے ہیں“

دسترخوان پر بھانٹ بھانٹ کے اشخاص موجود تھے۔ چند صوفی ٹائیپ بوڑھے، دو برہمن کئی لہو جوان ہیں نے پوچھا میاں اپنے مخالفین کی سرزنش نہیں کرتے۔
 ”ظرفیت میں انتقام نہیں ہے“ مولوی صاحب نے جواب دیا۔

” بے شمار ہندو شیوجی یا کرشن کا اوتار مان کر میاں کی پرستش کرتا ہے۔ کنور نے ”گو انہوں نے آج تک اپنے متعلق کسی قسم کا دعویٰ نہیں کیا — دوست کے بھید ظاہر نہیں کرتے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بتلانا مشکل ہے، کنور پر پھر کیفیت طاری ہوئی۔“

ذرا تامل سے جواب دیا ”بس یوں سمجھ لو کہ میاں میں ہمیں بنگلوان کا سروپ نظر آتا ہے۔ رنہ ہم جیسے چالو چکر آدمی اور ایسی بھکتی ہے“

”نرالی شان۔ جمالی شان۔“ سرخ ریش نے کہا۔

”میاں ہر انسان کو فرداً فرداً اس کے ظرف کے مطابق مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں۔ MYSTICISM کا ایک نکتہ ہے، کنور بولا۔“

”CHARISMATIC تو ہیں، میں نے اظہار خیال کیا۔“

”CHARISMA تو بعض سیاسی لیڈروں اور فلم اداکاروں میں بھی ہوتا ہے۔ یہ جمالِ بلایت ہے،“ عربی باجی نے خوش سے کہا۔

اب گاؤں کے لوگ بھی آگئے تھے صحن کھینچ کھینچ بھر گیا۔

”خواجہ غریب نواز نے فرمایا ہے،“ عربی باجی نے مجھے مخاطب کیا، ”ولی کی پہچان یہ ہے کہ اسکی پیشانی پر نور چمکتا ہے اور چہرے پر رعب داب۔ لقائے الہی کو دیکھنے والوں کا چہرہ منور ہوتا ہے۔“

”آپ کا کیا مشغلہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم خواجگانِ چشت کے اودھی سلسلے پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ میں نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔“

”رت جگا یہاں کا معمول ہے۔ آپ کو نیند آرہی ہے؟“

”جی نہیں۔ جی نہیں۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا۔

طعام کے بعد ہم لوگ صحن میں واپس آگئے۔ کنور نے ایک سانولی پستہ قد خانوں کو تپاک سے آداب عرض کیا۔ ایک کرسی سرکاتے ہوئے بیانتہ خانوں کے منہ سے نکلا ”بی تے شن — اہلیز! میں چونکا۔“ تم عربی باجی سے ملے۔ یہ ہماری جرمن آیا ہیں۔ زیادہ تر ویسٹ جرمنی میں رہتی ہیں۔ انکا بھی تمہاری طرح یورپ میں کاروبار ہے، کنور نے کہا۔

”ماشا اللہ!“ میں نے جلدی سے کھڑکھڑے والی بی بی کو کرسی پیش کی۔ انہیں یہاں دیدی پکارا جا رہا تھا۔ گفتگو سے اخذ کیا کہ دھواٹھکرائین، میں سو تیلے دیور جیٹھ نے پچاس لاکھ کی جائیداد ہٹ پ کر لی۔ میں سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ بے چاری بے انتہا عاجز اور پریشان معلوم ہوتی تھیں۔ باری باری ہم سب کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت مجھے خیال آیا اگر میری گونا گوں جلسا زلیوں کا کوئی شکار دیا مغرب سے یہاں آن پہنچے تو کیا ہو —! مگر یہ امر محال تھا۔ بیجے ابھی سے مجھے واہموں نے آن گھیرا!

پتہ چلا دیدی خورشید منزل یعنی لامارٹینگر گز اسکول کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک مشترکہ موضوع سخن ہاتھ لگا۔ طریقت اور معرفت وغیرہ کی گفتگو سے بور ہو چکا تھا۔

کنور نے پوچھا ”آپ نے میاں کے درشن آج ہی کیے ہیں؟“

”جی نہیں۔ دس بارہ دن ہوتے۔ لکھنؤ میں پہلی بار اپنا دکھڑا دیا تو بولے درگاہ پر آجائے گا۔ یہاں آکر دیکھا یہ تو بڑا چیتر سا آشرم ہے! لیکن ہم جب چل رہے تھے تو ایک لیڈی جانے کیا کیا کہنے لگیں، ”جرمن باجی بولیں؟“ دیدی، آپکو ایک بات بتائیں، میاں کے مخالفین کی بڑائی کبھی نہ کیجئے گا۔ میاں لوگوں کی احمقانہ حرکتوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ان میں اتنی ہی سمجھ ہے۔ اتنی ہی سکت ہے۔ ہر ایک تمہاری طرح دانشمند تو نہیں ہو سکتا۔ ایک روز لکھنؤ میں چند لوگوں پر اعتراض کر رہی تھی اچانک گلا بیٹھ گیا۔ حلق سے آواز ہی نہ نکلے۔ دہشت زدہ ہو کر بھاگی بھاگی یہاں پہنچی۔ میاں سے معافی مانگی۔ آواز کھل گئی۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا تھا خلق خدا کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا تصوف ہے۔“

عربی باجی ”کی طرح یہ ”جرمن آیا“ بھی نہایت بقراط نکلیں۔

میاں صحن میں آکر پلنگ پر نیم دراز ہوتے۔ ایک قوال نے بغیر ساز کے فارسی کلام سنانا

شروع کیا۔ اس کے پیچھے دوسری کرسی پر بیٹھا اسکا مسکین ساسا تھی تال دیتا جاتا تھا۔

”کفرش ہمہ ایماں شد — تا وعدہ جنین وعدہ —“

سینڈی آنکھیں بند کر کے جھوماکیا۔

”ہم خانہ و مہماں شد — تا وعدہ جنین وعدہ

از بسکہ در آمیزی

تبریز خراساں شد — تا وعدہ جنین وعدہ —“

”تبریز خراساں شد — سبحان اللہ — سبحان اللہ —“ میاں نے داد دی۔

مرئی قوال عرس کے لئے شاہجہاں پور سے آیا تھا۔ صبح چھ بجے کی بس سے واپس

جانے والا تھا۔ اب صبح کا دونج رہا تھا۔ میں ہاتھ روم سے واپس آیا تو ایک بچے کی سڑبلی

باٹ دار آواز سنی۔ وہ میاں کے پاس کھڑا غزل گارہا تھا۔ ٹھکرائین دیدی نزدیک کی کرسی پر

بیٹھی تھیں۔ میاں نے ان سے کہا ”یہ مچھلی کا بچہ ہے۔“

”مچھلی کا بچہ —؟“ انہوں نے دہرایا۔

قوال بچے نے ٹھمری شروع کی۔

جھومت آویں تند کے لالہ گلین میں۔ نین کجرا پاگ بستنی

گلے موتین کا ہار رے۔ مکھ پرانکے نور براجت

چتوت ہیں چنچل چال رے۔

سرخوش فقیر دوبارہ نمودار ہوا۔ ڈیوڑھی کے پاس کھڑے ہو کر ناچنے لگا۔ بھڑغایاب

ہو گیا۔ دو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ایک برسہن ایک ٹھکرائین میاں کو نیکھا جھلنے میں مشغول تھیں۔

یہ دونوں میاں کو کرسن اوتار سمجھتی تھیں اور انکی آرتی اتارے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔

دونوں کے شوہر دیوار کے پاس دست بستہ کھڑے تھے۔ یہ دونوں جوڑے دور دراز کے شہروں

سے آئے تھے۔

”میاں بعد نماز فجر حجرے میں تشریف لے جائیں گے۔“ عربی باجی نے کہا۔

ہم بہت کنفیوزڈ ہیں۔ پچھلے تین دن اور تین راتوں میں اپنی روح کے کھڑکھڑے پرسوار ایک انوکھی اجنبی دنیا میں نکل آئے۔ یہ جملہ بوگس معلوم ہوتا ہے۔ میں کنور کی گفتگو کو بھی سمجھ رہا تھا۔ برین واش سا ہو رہا ہوں۔ کیا چکڑ ہے۔ ابھی دالان کی جاگم پیر لٹا ہوا کنور کہہ رہا تھا۔ دلن بھائی بڑی سہانی بھور ہے چلو ذرا میاں کے کھیتوں تلک گھوم آویں۔ تو میں نے ایک عجیب و غریب سجدہ آؤٹ آف کر مکیڑ جو اب اسے دیا۔ میں نے کہا نہیں صاحب۔ ہم تو نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ باجماعت۔

ہم نے نماز عرصے سے پڑھی ہی نہیں۔ آخری بار جو جماعت کے ساتھ ادا کی تھی وہ بڑے ابا مرحوم کی نماز جنازہ تھی۔ اس وقت ایک مولوی صاحب نے بتلایا تھا کہ اس نماز میں مرحوم امامت کرتا ہے کہ جماعت کے آگے ہوتا ہے مردوں کی۔ یہی واحد نماز ہے جس میں عورت بھی امامت کرتی ہے یعنی اسکا جنازہ امام ہوتا ہے عیش باغ کے جن خاص میں گلشن اف دست کے نیچے کھڑے مولوی صاحب جب یہ سب کہہ رہے تھے بڑا ڈر سا لگا تھا۔ ہمیں یاد ہے بارش کی پھوار پڑنے لگی تھی اور سر سبز قبرستان میں دو در و سفید گھوڑے دوڑتے جا رہے تھے۔

تو کیا آج ہم اپنا جنازہ اپنے سامنے رکھ کر نماز پڑھیں گے؟ فجر کی دو دو سیر ڈوئی آسمان پر پھیلتی جا رہی ہے عرش نافرش ٹوڑکا دریا سا بہ رہا ہے ہم نے نوٹس کیا ہے کہ اب ہم بھی کنور کی طرح معرفتی جیلے استعمال کر رہے ہیں۔

نکتہ: برسہا برس کھڑی بولی والوں سے میل جول کی وجہ سے پڑھی بولی کے ہم کئے بجائے میں کہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اب رفتہ رفتہ ہم بھی واپس آ رہا ہے۔ ولیمکیم ہوم دلن اولڈ چیپ۔

روم و تبکیریز

و سے ٹکن کا ایک پکچر پوسٹ کارڈ نوٹرز نے لکھنؤ ہمارے ہوٹل کے پتے پر بھیجا تھا۔ وہ پری بیگم کے ساتھ سنی ٹون منانے روم گیا ہوا ہے۔ جب وہ لندن میں پیدا ہوا تو رمانے ہمیں امریکہ اطلاع بھیجی تھی۔ لکھا تھا جرج میں بتیسرہ دلو اتے ہوئے اپنے باپ جارج نوٹرز ڈریک کے نام پر اسکا نام نوٹرز رکھا ہے۔ کیونکہ ہماری شادی نہیں ہوئی لہذا وہ اپنے نانا کا SURNAME ڈریک اختیار کرے گا۔

پڑھ کر ہم دہل سے گئے تھے۔ سوچا تھا ہمارے بھولے، نیک نفس، دین اسلام، خاندانی آن اپر جان دینے والے راجہ جو آد علیخان جب اس روز ۱۳۴۶ء کے کرسٹس ویک میں اپنی غلط فہمی کی بدولت نور ماڈریک کے بنگلے پر جا پہنچے تھے اور اس اینگلو انڈین رقاصہ کے بدخواہ باپ نے انہیں خوش آمدید کہا تھا، محکمہ قضا و قدر کے منجروں نے قہقہہ لگایا ہوگا۔ ٹھا کر صاحب جلد وہ وقت آنے والا ہے جب آپکا پوتا اس ہان کاسٹ دلال کا نواسا ہوگا۔ اور اس آپکے پوتے کا نام اسکے یہودہ نانا کے نام پر رکھا جائیگا۔

عبرت کا یہ نازیبا نہ ہمارے لئے کافی تھا۔ بہت پیچ و تاب کھایا مگر کچھ کرنے سکتے تھے۔ ہم جس قسم کی لاقانونی زندگی گزار رہے تھے نور ماہم سے بیاہ کر کے خطرہ مول نہ لینا چاہتی تھی نہ اپنی آزادی کھونے پر آمادہ تھی۔

بہر حال اسکے دادا کنور بہزاد علیخان مرحوم برادر خور در راجہ جو آد علیخان مرحوم کے اہم گرامی پرنو چشم کا نام ہم نے اپنی طرف سے بہزاد علی رکھ لیا۔ اور سوچے دل میں اسے اسی نام سے یاد کریں گے۔ اس غریب کا نہ حقیقہ ہوا۔ نہ میر اسٹین گامیں نہ ڈومیناں ناچیں۔ نیویارک کی ایک بار میں اشک بہاتے، شراب پیتے، آنسوؤں سے میز کی سطح پر لکھا راجہ بہزاد علیخان آف دھان پور۔

نورمن کو اپنے اس دوسرے ”انڈر گراؤنڈ“ نام کی معنویت کا علم نہیں۔ دادا کون تھے۔
یا بہزاد کون تھا۔ علی کون تھے۔

ایک روز یہاں میاں کے ہاں کوئی شخص ایک مصرع بار بار پڑھ کر سر دھن رہا تھا ع
اک کر بلا میں اک مراساتی نجف میں ہے۔

مکہ مدینہ نجف کر بلا سب سے بے نیاز کنور بہزاد علی خاں مرحوم کا پوتا توروم نکل گیا۔
مگر ہمیں اسکا اتنا علم کیوں؟ ان راہوں کا انتخاب ہمارا اپنا نہ تھا؟ کل سینڈی کہہ رہا تھا
کہ ازل میں ساری روحیں، ایک تھیں۔ بعد میں الگ الگ ہو گئیں۔ تو کیا میری اور سندیشورز آئین نگہ
اور پوپ آف روم کی روح ایک ہے؟

نہیں صاحب۔ یہ باریکیاں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر میاں کی شخصیت ایسی مقناطیسی
ہے کہ یہاں سے جانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ جب آئے تھے تو پکا ارادہ تھا کہ رات گزار کر صبح ہووے
لکھنؤ چلے جاتیں گے۔ اتنے اصرار اور اخلاق سے میاں نے روکا کہ کچھ کہتے نہ بنا۔ لکھنؤ آدمی بھیج کر
ہمارا سوٹ کیس بھی ہوٹل سے منگوایا۔

کنفیوژن دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لکھا جائے۔ کاش ہم ایک ٹھگ کے بجائے
ادیب ہوتے۔ لیکن اسکی کیا گارنٹی ہے کہ ادیب بن کر بھی ہمارا کروک پن نہ جاتا۔ اسوقت روپیے پیسے
کا گھپلا کرتے ہیں تب اردو زبان و ادب کے معاملات میں گول مال کرتے۔

میاں نے ایک بار بھی ہم سے کوئی ذاتی سوال نہیں کیا۔ نہ انشازہ کسی قسم کی سرزنش۔ وہ
لوگوں کو کسی بات کی ممانعت نہیں کرتے۔ یہ کرو وہ نہ کرو۔ البتہ ایک رات جب صحن
میں محفل شعر و سخن پڑھتی تھی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے اور چپکے سے کہا
بڑے بھولے بھالے بڑے سیدھے سادے
ریاض آپکو کچھ ہمیں جانتے ہیں!

ان کو بے شمار اردو فارسی اشعار یاد ہیں۔ اور رامائین کی چو پائیاں اور کبیر کے دوہے۔

ایک سپہر حجرے میں فرسٹ پریٹیے روٹی کے اشعار سنا رہے تھے ہم نے پوچھا آپ نے فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کہنے لگے: ”ارے ہم نے اردوئے کون سی پڑھی ہے جو فارسی پڑھتے“
یقین نہ آیا۔ بعد میں عربی باجی سے پوچھا وہ بولیں: ”راجہ صاحب اسے علم لدنی کہتے ہیں“

ایک دیہاتی مسلمان حجرے میں داخل ہوا۔ میاں کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی داستان الم بیان کرنے لگا۔ سر جھکائے سنا کیے پھر آہستہ سے بولے۔ دیکھو۔ بندر کے سچے کی طرح جو اپنی ماں کو کپڑے رہتا ہے اپنے رب کو کپڑے رہو۔ بلی کا بچہ دیکھا ہے نا کس طرح اپنے آپ کو اپنی ماں کے سپرد کرتا ہے؟ وہ اسے اپنے دانتوں میں دبوچے پھرتی ہے پھر اٹھن سے منہ لگاتا ہے اسے فوراً ماں کا دودھ مل جاتا ہے۔ میاں اس دیہاتی سے اسی کی ایجبری میں بات کر رہے تھے بہر حال زبردست ماہر نفسیات ہیں۔ یہ صوفیاء صدیوں سے عوام کیلئے سائیکسٹرس کا فریضہ تو انجام دیتے ہی رہے ہیں۔ باقی روڈ خائیت وغیرہ اپنے پلے نہیں پڑتی۔
حجرے میں مجمع لگ چکا تھا۔ ایک شخص نے عرض کیا ”میاں ہم نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں دنیا بھر سے کی باتیں دماغ میں آتی ہیں“

”ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے“ ایک بیگم صاحبہ نے کہا۔
”جب آپ پرتیز روشنی پڑھی ہو تو آپکے دماغ کے اندر جو سامان بھرا ہوا ہے روشنی کی رڈیں وہی تو دکھلائی دے گا“ میاں نے جواب دیا۔

”میاں یہ تعویز بن گیا ہے“ بیگم صاحبہ نے کہا۔
”اس پر بارہ اماموں کی نیاز دلو کہ یہن لیجئے“ میاں نے فرمایا۔
دو میاں بی بی دروازے میں نمودار ہوتے۔ میاں اخبار پڑھنے میں مصروف ہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر آرتی اتاری۔ مٹھائی کا ڈبہ پیش کیا۔ اسکو ہاتھ لگا کر پھر اخبار میں مہنک۔
مسز تیواری نے حاضرین میں گویا پرشاد تقسیم کیا۔

ہم اخلقا برنی کا ایک ٹکڑا لیکر ہاتھ میں تھامے رہے۔ وہ دونوں پالاگن کر کے باہر گئے۔ ایک نوجوان آیا۔ میاں اس سے ٹسٹ میج کے تازہ اسکو پر تبادله خیالات کرنے لگے مولانا تاتاری

داخل ہوتے۔ یہاں ہمیں ترائی کے مملتان بہت ملے۔ ہمالیہ کے دامن میں دینی عربی ماہرین کی کثرت ہے۔ چکنی باریک داڑھی والے مولانا بھی شکلاً منکول معلوم ہوتے تھے۔ میاں انکو بہت چھپڑتے۔ ہمیں مخاطب کیا: ”دیکھئے پھلے ساڑھے تین ہزار سال سے ایسے خود خال کا کوئی انسان پیدا نہیں ہوا۔“

مولانا دئی سے شایع ہونے والے دینی رسایل اور اردو بلیٹز اور دوسرے اردو ہفتہ وار اخبارات کے مضامین میاں کو سناتے۔ اور جاسوسی ناول۔ وہ دراصل ایک قسم کی بیک گراؤنڈ میوزک ہیں۔ میاں لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ خود اخبار پڑھنے میں مصروف ہیں یا مولانا کو ننگ کرنے کے لئے خود اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سناتے جا رہے ہیں یا آنکھیں بند کیے خود گی کے عالم میں ہیں۔ اور مولانا ہیں کہ محمود غزنوی کے معرکوں کی داستان بے تکان پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ادھر انہوں نے کوئی لفظ غلط پڑھا میاں نے ٹوکا۔ اور لغت منگوائی۔ مولانا اپنی بات پر مصر۔ دونوں میں سجد دلچسپ ٹکرا رہتی۔ کور نے ہم سے کہا: ”وہ بنیادی طور پر غالباً بہت تنہا ہیں۔ جس ناقابل تشریح بلندی پر وہ موجود ہیں وہاں عام انسان کا گذر نہیں۔“

”عاشق حسینؑ ہیں۔ محرم میں تعزیر داری کرتے ہیں۔ ایک روز حضرت علیؑ کے متعلق فرما رہے تھے ارے ہمیں جو کچھ سامان ملتا ہے شاہ ولایت ہی سے تو ملتا ہے۔ سامان‘ میاں کا مخصوص لفظ ہے۔ انکی مراد انکی اپنی ولایت سے تھی۔“

یہ کچا مکان جتنا MODEST ہے درگاہ اتنی ہی وسیع اور شاندار۔ پختہ فرش۔ چاروں طرف برآمدے۔ وسط میں مخدوم کا روضہ۔ ایک طرف میاں کے والد کا مزار۔ سر سے پرتو بھوت مسجد۔ ایک طرف شاہ مینا صاحب کا چلہ۔ روضے کے دیوار میں ایک پتھر نصب تھا اس پر ہاتھ کا گہرا نشان۔

یہ مولائے کابینات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا نشان ہے۔ ”سیاہ رنگ کی BERET پہنے ہوئے میاں کے شو فر نے نہایت وثوق سے اطلاع دی“ واقعہ یہ ہے کہ جب اسی جگہ پر حضرت مخدوم کا دصال ہوا انکے صاحبزادے گھر یہ موجود نہ تھے۔ انکے

مرد شاہ مینا صاحب تنہا تھے۔ بہت پریشان ہوئے کہ اکیلے کس طرح تجہیز و تکفین کریں۔ کیا دیکھتے ہیں ایک نقاب پوش بزرگ سبز عمامے سبز عبا میں ملبوس گھوڑے پر سوار جنگل میں سے نمودار ہوئے وہ مشکلات علیٰ شیر خدا تھے۔ حضرت مخدومؒ کی تجہیز و تدفین میں شاہ مینا صاحب کی مدد کی اور واپس تشریف لے گئے۔“

میں خاموش رہا۔ کنور سرپر و مال باندھ ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے روضے کی دلہیز پر کھڑا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کوڈرینگل کے برآمدوں میں کینے مقیم تھے۔ مجاور اور بھکاری مفقود۔ رات ہو چکی تھی۔ درگاہ کے باہر درختوں میں بھگی ہوئی ہوا سرسرا نے گی۔ عربی باجی نے کہا — ”عین اسی جگہ ان اولیاء کے کچے تھونپٹر سے موجود تھے۔ صدیاں ہمارے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گذر رہی ہیں۔“

”حق — حق — حق —“ سرچوش برہمن بجماری نے احاطے میں نعرہ بلند کیا۔

”میاں جس کچے مکان میں رہتے ہیں وہ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ہر سال برسات میں اسکا کچھ حصہ گر جاتا ہے اسے پھر لیب پوت کر ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔ صدیاں بھی تو خام سینٹیں ہیں ڈھے جاتی ہیں تو مٹی سے نئی گھڑلی جاتی ہیں۔“ عربی باجی نے کہا۔
مجھے نیویارک کی اسکانی لائین یاد آئی اور شکاگو کا پلے بو اسے کلب۔ زمین حق کیوں نہ ہوئی۔

”چرچ کی رسومات کو MYSTERIES کہا جاتا ہے۔“ کنور بولا۔ درگاہ سے باہر اگر ہم لوگ دھان کے کھیت میں سے گذر رہے تھے۔ میاں بڑی بھیل کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ غروب آفتاب کی سرخی پانی پر منعکس تھی دوسرے کنارے پر گھٹا جنگل سرسرا رہا تھا۔
”ہولی کمیونین۔“ کنور نے بھیل اور آسمان کے گھلے ملے اغوانی رنگ کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔
”یہی تو ہمارا بندنا بن ہے۔ وہ ہمارے بن راج کھڑے ہیں۔ پانی کے کنارے۔ تنہا کہنیا کی مڑلی اور سپرد مٹی کی نے سب ہم سن لیتے ہیں۔ جیرس نے بھی نو کہا تھا اے روجو میرے ساتھ ناچو میں تمہارے لیے بانسری بجاؤں گا۔“ حضرت علیؑ نے ناقوس کی آواز سن کر فرمایا تم

سمجھتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔؟ سبحان اللہ حقا حقا ان المولیٰ قدسینا۔“

ہم کنور کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ اپنا پرانا لوفرنینڈی تو نہیں تھا۔ جانے کون تھا۔

”وٹن بھائی۔ روم میں ہم نے ہزاروں ہزار یورپین اور امریکن زائرین کو دیکھا ہے جو عیسائی اولیاء کے تبرکات کو چومنے کے لئے جوق درجوق گرجاؤں میں جاتے ہیں۔ تم انکو نہ جاہل کہتے ہو نہ تو ہم پرست جینز و بیٹ فادرز سے زیادہ پڑھا لکھا کون ہوگا؟“

”سائیکولوجی آن ریلیجن ایک کتاب ہے۔ ہم تم کو پڑھنے کے لئے بھیجیں گے لندن سے۔“

”وہ بھی ہم نے پڑھ رکھی ہے۔ مدھوبن میں پہنچنے سے پہلے؛“

کھیت کی منڈیر پھلانگ کر ہم دوسری روٹ پر آگئے جو آم کے باغ میں سے گذرتی درگاہ کی سمت جاتی تھی۔ سیاہ درختوں میں سے جھلکتا جھیل کا پانی چتائی کی واٹش معلوم ہو رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے میاں کا یا تو منڈھا بندھا ہوا تھا۔

سایبان میں چرمی کاٹنے کی مشین رکھی تھی۔ ایک سفید ریش بنچ پر بیٹھے تھے۔

دور گاؤں کے ایک مکان میں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ عبداللہ کے آنگٹوا میں جوڑیں ناچیں چھاہم۔ جوڑیں ناچیں۔ جھیل پر بہتی پڑوانی نے عورتوں کا گیت لہروں کی طرح پھیلا دیا۔

”LIVING WATERS“ بائبل میں اسی کو کہا گیا ہے۔ ”کنور تیز چلتا ساحل

پر پہنچا۔ میاں سے کچھ فاصلے پر موڈ بانہ جا کھڑا ہوا۔



(۳۹)

جنگل میں جگنو

— نورما کو خط لکھنے کے لیے بریف کیس کھول کر قلم اور پیڈ نکالا۔ وہ حیران ہوگی اب
سیکوں نہ پہنچا۔ اس تاخیر سے پیرس والے معاملے میں جو نقصان ہوگا سو الگ کنور کو اپنی
رف آتے دیکھ کر پیڈ ایک طرف رکھ دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”رانی صاحب کو اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی؟“ اس نے ڈانٹا۔ ”ہر بی بی کا قاعدہ
ہے اپنے شوہر کے پرانے دوستوں سے جلتی ہے۔ رانی صاحب بھی سوچیں گی۔“

— الجھ کر بات کاٹی۔ ”ہنیں یا۔۔۔ خط تو ہم لکھ چکے ہیں۔ پھر جھوٹ بولا۔ میاں کے
مدت میں لوگ با وضو حاضر ہوتے ہیں ہم کم از کم اپنی دروغ گوئی ہی سے باز آئیں۔
ہم لوگ شامیانے کے نیچے بیٹھے تھے۔ کنور نے اچانک ہمیں مخاطب کیا۔“ لکھو۔

”لمھو۔ آں خطا۔“

”۔ آں خطا۔“

”سہ گونہ خط نوشتی۔ کیے ادخواندی، لا غیر! کیے راہم ادخواندی، ہم غیر،

کیے نہ ادخواندی، نہ غیر او۔ آں خط سوم نم۔ اب دیدانت کا ایک نکتہ۔“

اسی وقت شامیانے میں چند ڈکیت نما صاحبان اطمینان سے آہر ایک کھاٹ پر ڈٹ
گئے میں نے کنور کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میاں کے ہاں محض تمہارے ایسے انٹلیکچوئل ہی نہیں آتے۔“

مجھ جیسا انٹلیکچوئل! ارے سنڈیشن نرائین سنگھ کو کیا معلوم ایک انٹرنیشنل ڈکیت سے
بات کر رہا ہے۔

”شروع شروع میں، کنور کہتا رہا، ”میاں کے ساتھ چندنا معقول سے آدمیوں کو دیکھ کر

ہم نے پوچھا تھا آپ کیسے بے تکے لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں فرمایا ٹوٹی پھوٹی موٹر میں تو کارخانے میں مرمت کے لئے آتی ہیں۔ میاں جہاں جاتے ہیں بھانت بھانت کے انہاں کا ہجوم انکے ہمراہ ہوتا ہے۔ گویا شیوجی کی بارات۔ پھر کہا تو انہوں نے محض جواب یہ دیا اور جو ان دیکھے لوگ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں تم کو نظر آجائیں تو تمہارا کلیجہ شق ہو جائے مولوی صاحب ٹھکرائیں دیدی، عربی اور جرمن باجیاں اور ایک نووارد خاتون آ رہیں۔ میاں کے الوکھے فضائل کا تذکرہ چھڑا۔ وہ خاتون بولیں: "جب مجھے لوگوں نے بتایا کہ وہ میاں کو بیک وقت کئی مسجدوں میں نماز پڑھتے دیکھ چکے ہیں تو میں۔ زور کا قہقہہ لگایا۔ پہلی بار آئی سرکار بس اسٹاپ تک چھوڑنے قصبے تشریف لے گئے کوئی میلہ چل رہا تھا۔ بھڑکی وجہ سے جیپ بس اسٹاپ سے بہت دور روکی۔ میں اتر کر بمشہ ہجوم سے نکلتی بس میں پہنچی وہ کچھ کھینچ بھری ہوئی۔ دھکا پیل میں بچھڑ گئی۔ پلٹ کر دیکھ سرکار دراپنی جیپ میں موجود تھے۔ کیا دیکھتی ہوں بس کے اندر کھڑے مسکراتے ہیں۔ مجھے جگہ دلوائی اور خدا حافظ کہہ کر اتر گئے۔"

"اولیاء"۔ عربی حاجی بولیں۔ "زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ رات کو چہار ڈیوٹی لگاتی جاتی ہے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اکثر صبح گیا رہ بارہ بجے تک حجرے کے دروازے نہیں کھلتے۔ اس وقت وہ نجانے کہاں کہاں "ASTRAL TRAVELS" میرا پاکستانی بھانجا۔ "نووارد خاتون نے کہنا شروع کیا "امریکہ میں تھا۔ کے حادثے میں بُری طرح زخمی ہوا ہسپتال لے جایا گیا وہاں سے ٹرنک کال آئی بچنے امید کم تھی۔ میں نے ہڑ بڑا کر میاں کو بتلایا۔ وہ لکھنؤ پہنچے۔ ایک ہسپتال میں جا کر ایک پلٹ پر لیٹ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کر رہے ہیں۔ چند روز بعد امریکہ سے اطلاع آئی کہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور پاکستان آ رہا ہے۔ آپا جان یہاں آئی ہوئی تھیں۔ فوراً واپس جب وہ روانہ ہو رہی تھیں میاں نے ان سے فرمایا خواجہ فرید گنج شکر کے روضے پر جا ہمارا سلام کہے گا۔ ہم مطمئن ہو گئے کہ میاں نے اس بچے کو خواجہ فرید کے سپرد کر دیا مولوی صاحب بولے: "راجہ صاحب ان لوگوں کا اپنا ایڈمنسٹریشن ہے۔ رات کو"

کی کانفرنس ہوتی ہیں۔ وہاں سب معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں سب سے بڑی کانفرنس اجیر شریف میں سلطان الہند کے آستانے پر ہوتی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بڑی مدینہ شریف میں۔ دربار نبوی سے احکام جاری ہوتے ہیں۔

”ایک بار کنور نے کہا: ”میاں نے ہم سے محض یہ فرمایا تھا کہ ساری دنیا میں ساڑھے تین سو قطب موجود ہیں۔ وہ سارا نظام چلا رہے ہیں۔“

ہمیں وہ پہلے روز کانگریز قطب والا قصہ یاد آیا۔ پوچھا: ”چینی قطب بھی ہوتے ہونگے امریکن اور فرینچ بھی لیکن سوویٹ یونین میں شاید کوئی قطب موجود نہیں۔ اچھا یہ بتائیے ان قطب نے ہائیڈروجن بم وغیرہ کیوں بننے دیے؟“

”دنیا دالاکفات ہے۔“ سرخ ریش نے جواب دیا۔

”میاں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ قطب بھی موجود ہیں۔ خاتون قطب۔ اور رجال الغیب میں عورتیں بھی شامل ہیں۔“ عربی باجی نے کہا: ”لیکن کچھ ملاحورتوں کو ناقص العقول۔۔۔“

”چار نوش کیجئے۔۔۔ میں نے عرض کی۔

”ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ بعض اولیاء عالم طیر رکھتے تھے۔“

”آپنی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں بھی سب پر یوں کی کہانیاں لکھ رہی ہیں؟“ میں نے با استعجاب دریافت کیا: ”یہ سائنس اور تفعل کا زمانہ ہے۔ چارنوگمال سے مغرب پر یوں کی کہانیاں مسترد کر چکا ہے۔ ہمارے ہاں سرسید احمد خان وغیرہ نے زندگیاں اکی جلد جہد میں صرف کر دیں کہ ہم اپنے توہمات سے خود کو آزاد کریں۔ آپ لوگ ہم دیکھتے ہیں کہ از سر نو اپنے ذہنوں پر میڈیول تصورات طاری کر رہے ہیں کیا واقعی یہ ایک عالمگیر سازش ہے کہ تھرڈ ورلڈ کو پھر مذہب پرستی اور ادھام کے جال میں گرفتار کر دیا جاوے۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں میاں کی گوناگوں کرامات کی حکایتیں سن رہے ہیں۔“

چند لمحوں بعد ایک خادم ڈیورٹھی سے نمودار ہوا: ”راجہ صاحب۔ کنور صاحب۔ میاں آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔“

”یہ بہت معمولی بات ہے۔ تم میاں کے متعلق جن ٹیک و شبہات کا اظہار کرو گے میاں کسی فاصلے پر ہوں انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔“ سینڈی نے قہقہہ لگایا۔

”اسے TELEPATHY کہتے ہیں جس چیز کو تم میاں کی روحانی طاقت گردانتے ہو محض

E. S. P. ہے۔ دراصل سائینس نے ابھی تک انسانی ذہن کی بہت سی

قوتوں کو ڈسکور نہیں کیا ہے۔ اگلے سو پچاس سال میں ساری حقیقت کھل جائیگی۔ وہ کیا ہے بایوانرجی۔“

”بایوانرجی! — کنور نے دہرایا: ”یہ اصطلاح روسیوں نے ایسے اختراع کی ہے کیونکہ وہ روح کے منکر ہیں۔ اور کسی حالت میں اسکے وجود کا اقرار نہیں کر سکتے۔“

”روحانیت اور مادیت کے متعلق یہ بڑے مبتدیانہ مباحثے ہیں۔ میں نے انکا جواب دہ

ڈیوڑھی، صحن اور دالان عبور کر کے میاں کے مہرے میں پہنچے۔ مسکرا کر بولے: ”آئیے

آئیے۔ تشریف رکھیے۔“ چاء بنا کر پیش کی۔ حجرے میں اسوقت ہم لوگوں کے علاوہ اور کوئی موجود

نہ تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں معانہ لگے۔ ”یہ سائینس اور تعقل

کا زمانہ ہے۔ نہ کہ ادھام پرستی کا۔“

ہم ہڑبڑا گئے۔ میاں ہمارے الفاظ دہرا رہے تھے اسکے بعد انہوں نے گویا ایک

بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑا۔ کہنے لگے۔ صوفی کو پہلے غوطے میں کرامات حاصل ہوتی ہیں۔ اسکے

بعد ایک ہزار مقامات ایسے ہیں کہ اگر صوفی کرامات کی طرف نظر کرتا ہے تو وہ ایک ہزار مقامات

اس پر منکشف نہیں ہو پاتے۔ جناب حائل ہو جاتا ہے۔ راہ صاحب اور چاء۔؟ لیجئے یہ

سموسے نوش کیجئے۔“ انہوں نے مجھ پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی اور کہا ”عبادت بغیر توبہ کے

تشنہ ہے۔ عاصی اپنے عصیاں سے۔ زاہد اپنے زہد سے۔ خدا کا دست اپنے مقامات و کرامات

سے توبہ کرتا ہے۔ توبہ زلیت تا مرون ہے۔“

”میاں صوفی اپنے مقامات سے بھی توبہ کرتا ہے؟“ جرمن باجی نے سوال کیا۔

”ادھر جرمن باجی! آج تو آپ نے بڑا اسمارٹ لباس پہنا ہے۔ بالکل بوائے اسکاؤٹ

جی ہاں۔ مقامات صوفی کے لئے حجاب بن جاتے ہیں۔ تو برہ کے بعد وہ صفات کے بجائے ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نبی کے لیے معجزے کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کے لیے کرامت کا انفعال لازم ہے۔ کیونکہ جب ولی کرامت کا اظہار کرتا ہے اتنی دیر کے لیے اسکی توجہ خدا سے ہٹ جاتی ہے۔ اس دوران میں وہ تو مقامات نیچے اترتا ہے۔ اسی لیے وہ کرامت کا اظہار بدرجہ مجبوری کرتا ہے۔“

صحن میں کوئی شخص روتا چلا آتا داخل ہوا۔ میاں نے کہا۔ ”ہم ابھی آتے ہیں۔“ انکے باہر جانے کے بعد کنور نے کہا: ”شاید کوئی پاگل لایا گیا ہے۔ دکن بھائی۔ جو کام میاں کرتے ہیں وہ فیض ہے کرامت نہیں ہے۔ سمندر میں جاؤ تو موتی ملیں گے۔ وہ سمندر کی خاصیت ہے۔ اسی طرح میاں کے فیوض جگنو از نور روشنی کر کے اڑتا ہے۔ میاں کے فیوض برکات عوام انکو کرامت سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ جب باہر نکلتا ہے اسکی خوشبو آپ سے آپ پھیل جاتی ہے۔ کرامت وہ ہے جس کے لیے CONCENTRATE کیا جائے۔ فیض خدا کے دوستوں کا وصف ہے۔ دوسروں کو خود بخود پہنچتا ہے۔“

خاقانی روایت کا ما بعد الطبعانی تسلسل۔

شام میاں حسب معمول مکان کے کچے آنگن کے اندر پلنگ پر بیٹھے سچوان نوش کرتے تھے۔ پیچھے ایک مرید کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ ہمیں بار بار اس اس خیال نے تنایا کہ گو ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں مگر یہ منظر مانوس سا ہے۔ کچھ دیر سوچا۔ ایک دم یاد آگیا۔ اٹھا ہر دس صدی کا نگڑہ فلم کی ایک تصویر۔ مینا ٹوری۔ بالکل ہی سین۔ برآمدے کے سامنے آنگن میں بچھا پلنگ۔ اس پر چھڑوانی۔ ادھی اٹھی ہوتی۔ گاؤ تکیہ۔ مہتابی چہرے والا ایک نوجو صوفی۔ ذرا بھاری جسم۔ سر پر گول ٹوپی۔ سفید لباس۔ آلتی پالتی مارے بیٹھا۔ حقہ کی نئے ہاتھ میں۔ ذرا سنجیدہ۔ بالکل میاں والا انداز۔ وہی شکل اور جثہ اور لباس۔ مہری کے پیچھے مورچیل سنبھالے ایک سیاہ فام خادم۔ حیرت انگیز۔

تصویر کی تفصیل اسوجہ سے یاد ہے کہ ہم نے اسے ڈبلن کے ایک میوزیم سے اڑالیا تھا۔

جھٹ پٹے وقت کنور کے ساتھ جھیل کے کنارے ٹہلنے چلے گئے۔ ایک کنج میں ٹھٹھکے، مکمل خاموشی ہو سکتا۔ افق پر طلوع ماہ کی روشنی پھیل رہی تھی۔ چنبیلی کی بھاڑی میں جنبش ہوئی، ”LITTLE PEOPLE“ میرے منہ سے نکلا۔

”جہاں پھول ہیں وہاں پریاں بھی ضرور ہوں گی“ کنور نے ساگی سے کہا۔
ہم لوگ دوپچے تھے جو صحن چمن میں کھیلنے اور تیلیوں کے پیچھے دوڑنے نکل آئے تھے۔
فطرت کے قریب پہنچ کر انسان اپنی بڑی فراموش کر دیتا ہے۔ میں نے مکیخت اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

”ٹہل پیل۔۔۔“ کنور نے دہرایا وہ بھی اپنی زسری میں پہنچا ہوا تھا۔ ایک آئرش گورنر نے اسکی پرورش کی تھی۔ ”کہتے ہیں یہ ننھے ننھے لوگ مرغزاروں میں جمع ہو کر چاند کے نیچے بانسریاں بجاتے اور گاتے ہیں۔ NATURE SPIRITS — انکی آوازیں ہمارے کانوں میں نہیں پہنچتیں۔ MYSTIC — انکو سن لیتے ہیں۔“

”شاعر تو ہر ربا برس سے ہی سب الاپ رہا ہے۔ تم نے اسے LITERAL سمجھ لیا!“
”حقیقت کو شاعری تو تم گردانتے ہو۔ مس سلیون بتاتی تھیں انکی کاؤنٹی کورک کے کسانوں کو چاندنی راتوں میں مشروم پر بیٹھے ELVES نظر آجاتے تھے!“
”آئرلینڈ غریب اگر پیکچرل ملک ہے۔ لہذا تخیل پرست۔ انڈسٹریل ریوولوشن سے قبل۔“
میں نے جواب دیا: ”جہاں غریب کے سارے مرغزار پر یوں سے آباد تھے۔ دماغی الجھنوں سے آزاد سادہ لوح کسانوں کو فطرت سے ہمکنار رہتے ہوئے پریاں تو آپ ہی نظر آویں گی۔“
معبصومیت معصومیت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دیکھو بچے اور جانور ایک دوسرے کو کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہارے بھارت درش میں جہالت اور غربت کی فراوانی ہے چنانچہ اتنا ہی تخیل بے مہار چھٹا ہوا ہے ہر درخت پر تو تمہارے کے ہاں کوئی نہ کوئی دیوتا براجمان ہیں!“
کنور نے تہقہہ لگایا۔ جامنوں پر اترنے والوں کی چہکار پشپ تاؤں پر تسلیاں گھاس پہ بے بہوٹیاں سب سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے سارس لہروں پر راج ہیں ہرے درختوں کے نیچے گلہریاں۔

”مائی گوڈ۔“ میں نے بیساختہ کہا: ”یہ کنج تو بالکل AS YOU LIKE IT کا سیٹ
علوم ہوتا ہے۔ یاد ہے۔ ہم نے مارٹ میں جس سال اسٹیج کیا تھا اور اس کا گیت میں نے
ہی گایا تھا۔“

میں نے گنگنا نا شروع کیا UNDER THE GREENWOOD TREE
کنور نے آواز ملائی WHO LOVES TO LIE WITH ME
دونوں نے ایک ساتھ ملکر اٹھایا AND TURN HIS MERRY THROAT
UNTU THE SWEET BIRD'S NOTE
COME HITHER, COME HITHER, COME HITHER.
HERE SHALL HE SEE NO ENEMY,
BUT WINTER AND ROUGH WEATHER

دفعہ میں نے نوٹس کیا کہ جطرح اس روز شام لا مارٹینیر میں عمران زیدی نے منہ اٹھا
رانگلش اسکول بوائے انداز میں گایا تھا ہم دونوں بھی اسپطرح انٹرن کھڑے الاپ رہے تھے
یہاں کی پل میں نصف صدی قبل کے لا مارٹینیر کے دو کسٹما بعلم بن چکے تھے۔ مائی جھونپڑے
سے نکل آیا تھا تعجب سے منہ کھولے ہمیں نگ رہا تھا۔ میاں کی خدمت میں بھانت بھانت کے
منی آتے ہیں مگر یہ ادھیڑ عمر کے دو ٹھو صاحب لوگ تو ایک اندھیرے کنج میں انٹرن کھڑے
مگر زیدی گانا گا رہے ہیں!

میں نے چپا کی ایک ٹہنی سامنے سے ہٹائی۔
چونک کر چاروں طرف دیکھا— کنور ایک ٹوکیلے کانوں والے آئرش پریرا دہی طرح
بتسم اور شاداں۔

”شاہراہ خود آگا ہی!“ اس نے کہا۔
”خود آگہی یا خواب گری؟“ میں نے دریافت کیا۔
پتوں میں بھی ایک چڑیا چھپائی۔

میاں پکڑندی پر مل گئے کہنے لگے چلیے کل آپ لوگوں کو ذرا باہر گھملا دیں۔

آج جب ہم میل ادریل کے جھرمٹوں کے درمیان سے گذرتی شاہراہ پر پہنچے شام ہو چکی تھی۔ میاں فراتے سے ڈرا ہو کر نے میں مصروف حسب معمول زیر لب وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی زد میں آ کر سفید رنگ میل چمک اٹھتے۔ گھاگھا گھاٹ — فیض آباد — ایودھیا —

”ایودھیا سے نکل کر —“ دیدی بولیں ”بھگوان رام مہارانی سیتا اور لچھمن جی انہی بارہ بنوں میں تو گھوما کیے۔“ وہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھیں۔
”بڑھی سیتا۔ من را دن۔ گیان رام“ پیچھے سے کنور نے گویا کنسٹری کی۔ پھر بولا: ”دن بھائی۔ حضرت عبدالرزاق کھانا تمہیں کیا یاد ہوگا۔“

”وہی جنکا قصہ اس روز عربی باجی نے سنا یا تھا؟“

”جی نہیں۔ وہ تو حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی تھے۔ یہ سید عبدالرزاق بانسوی بڑبڑیا صدی۔ ملاً انظام الدین فرنگی محلی کے پیر و مرشد“ عربی باجی نے جواب دیا۔ وہ اور جرمن باجی جیب کے پھلی نشستوں پر فروکش تھیں: ”اے سب زدہ لوگ انکے روضے پر جاتے ہیں۔ شفا یاب ہونے۔ بانہ شریف — حضرت کلیانی ندی کے کنارے برگد تلے عبادت فرماتے تھے۔ ایک رات ہوکا عام پایادہ لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ جنگلوں میں پہنچ کر راستہ بھول گئے — دو لوجوان ملے۔ تیر کمان لیے۔ ایک گورا ایک سانولا۔

”وہ انہوں نے کہا آج رات ہمارے مہمان رہیے۔ حضرت کو کٹی میں لے گئے۔ موہن بھوگ کرایا۔ کٹی میں دو شیر موجود تھے۔ لڑکے بولے آپکی حفاظت کے لئے منگوائے ہیں۔ حضرت نے رات وہیں گذاری۔

”حضرت عبدالرزاق بانسوی کے ہاں کرشن مراری کی ایبجری بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس خطے کے دوسرے صوفیوں کے ہاں بھی۔ یہ بزرگ اودھی میں شعر کہتے تھے

اور کرشن اور رادھا اور گویوں اور برج بایسوں کی تلمیحات کو تصوف کی علامتوں اور استعاروں کے طور پر استعمال کرتے تھے؛ میں عربی باجی کے بجز پرستی نہیں رہا۔
جگنوؤں کی بارات اڑتی ہوئی سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔

”ایک اور حکایت ہے؛ کنور کی آواز آئی۔“ حضرت کے ایک مرید بانسہ شریف جا رہے تھے۔ رات پڑے ایک چوپال میں رُکے۔ وہاں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ وہیں پر ایک سانولا خوبصورت نوجوان موجود تھا۔ اس نے کہا آپ جہاں جا رہے ہیں انکو ہمارا سلام کہیے گا۔ مرید جب بانسہ شریف پہنچے حضرت کو سلام نہیں پہنچایا۔ انہوں نے فرمایا ایک سانولے خوش جمال نوجوان نہیں راہ میں ملے تھے؛ انہوں نے ہمیں سلام کہلوا یا تھا۔ وہ کرشن جی تھے۔“

عقائد کی دنیا عجیب و غریب ہے۔ راجندر جی اور کرشن جی مغلیہ اووہ میں! بی بی مریم پرنگال میں اسلامی عہد کے فاطمہ نامی شہر کے چند گڈ ریزہ بچوں کو دکھلائی دیں۔ اب ساری دنیا کے کیتھولک OUR LADY OF FATIMA کے نام سے انکے بت کی پرستش میں جٹے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے مدینۃ الفاطمہ اور مدینۃ الزہرا جیسے شہروں والے اسپین کو مسلمانوں نے کیوں کھلویا۔ کوئی معجزہ ہو جاتا۔

میاں نے ذلیفہ پڑھتے پڑھتے مجھ پر نظر ڈالی۔

میں سو جا کیا۔ اس برصغیر میں کہیں قدم رسول پایا جاتا ہے۔ کہیں حضرت علی کا پنجہ کسی مقام پر امام حسین اور حضرت عباس گھوڑے پر سوار نمودار ہوئے۔ چودھویں صدی بارہنگی کے اس جنگل میں حضرت علی تشریف لے آئے۔ حضرت مخدوم کی تجہیز و تکفین میں مدد کے لئے۔ معامیاں نے میری طرف جھک کر کہا ”ہوں“ اور خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے۔

میٹا فرکس کو فرکس سے ابھانا نہیں چاہیے۔

بد و سرائے سے کئی میل آگے نکل کر ایک سنسان مقام پر فروزاں درگاہ کے سامنے

چپ روکی: "ملا مت شاہ کا مزار، دروازہ کھول کر اترتے ہوئے ہم سے کہا: "ملا متی بزرگ۔"
گھپ اندھیری رات۔ ان گنت جگنو۔ قبریں۔ چاروں طرف گھنا جنگل۔ مورچا آ رہے تھے
چیتیر میں ملبوس مرشد نے سگریٹ سلگایا۔ اور لوگوں سے باتیں کرتے پھاٹک
میں چلے گئے۔ کنور نے کہا: "لگتا ہے کوئی یورومین ٹورسٹ ادھر سیر کرنے آ نکلا ہے۔"
میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی ملا متی تھے۔ برس پہنکر شہسواری کرتے تھے۔ وہ بھی نہایت چہرہ
اور میاں کی طرح پروگریسو۔"
ہم لوگ نئے مسافر خانے کی منڈیر پر جا بیٹھے۔ دونوں باجیاں لگاتار بولا کیں:

"سید احمد بخشی"

"انکے جد تھے۔ کہاں بخش۔ ایران۔ کہاں بارہ بنکی کا یہ جنگل۔ حیرتناک معاملات
حضرت عبدالرزاق بانسوی، ملا مت شاہ اور سنت جگ جیون داس۔ یہ تین دوست تھے۔
تین چار فقراء اور ایک جوگی کسی درخت کے نیچے اسوقت بھی اکڑوں بیٹھے ہیں۔
فیتوں سے گھٹنے باندھے۔ ہاتھ میں دو تارہ۔"

"کہاں؟"

"مغل تصویروں میں۔"

"نورمن ڈریک۔ انگریزوں کے قبرستانوں ہی کی خاک چھانتا پھر روز ایک
آرٹیکل اسکا کسی نہ کسی کھوسٹ فرنگی کی قبر کے بارے میں اخبار میں موجود۔"
"انگریز قوم ہندوستان کو کی طرح بھول نہیں سکی ہے۔"

"تعلق شہزادہ مخدوم سارنگ کو جنگل جنگل ڈھونڈا کیا اس جگہ پہنچا جہاں پتھور۔"
"معلوم ہے۔ ایک بزرگ ملے انہوں نے فرمایا اس جگہ کو بسا دو توشیح کا اتہ پتہ
بتا دیں اس نے پانچ گھر آباد کروائے۔"

"محلہ پنج گھر۔" ایں نے بے اختیار پلٹ کر سوال کیا: "کیا اب بھی آباد ہے؟"
"بالکل۔"

”وہیں ہمارے ایک ماموں رہتے تھے۔“ میں نے یاد کیا۔

جگنو بے نیازی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ ”یہاں بھی عرس ہوتا ہوگا“ میں نے کہا۔
 ”زبردست“ کنور نے جواب دیا۔ ”سنت جگ جیون داس کی سماجی پر بڑا بھاری میلہ
 تا ہے۔ کوٹوا دھام میں۔“

”عُرسوں اور میلوں کے علاوہ سیاسی اور معاشی تحلیقی کیا ہیں۔“ میں نے چڑ کر پوچھا
 وہ عربی باجی سے مخاطب ہو چکا تھا میں نے چاڑوں طرف دیکھا۔ اس تاریک جنگل میں
 اجنبی جگ پر۔۔۔ اجنبی تو نہیں۔ صدیوں سے یہاں موجود رہا ہوں۔ خلیجوں کے زمانے
 سے آباد علمائے ظاہر و باطن کی اس سر زمین نے مجھ جیسے ناکارہ لوگ بھی پیدا کیے۔

آزادی سے پہلے اس صوبے کی زمین کا پانچواں حصہ مسلمان زمینداروں کی ملکیت
 تھا۔ گو آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۳۱ فیصدی تھا۔ محض اودھ میں ۶۷ مسلمان تعلقدار
 تھے۔ میں یہاں سے کیوں بھاگا۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد اپنی بدلی ہوئی کمتر حیثیت
 منظور نہ تھی میں نے کیا غلط کیا۔ ہر شخص اپنی بہتری چاہتا ہے۔ برطانوی تسلط کے بعد مسلم شرافت
 خوار و خجل ہوا تھا۔ انکے پاس جدید تعلیم نہ تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم تو بہت بہتر رہے کہ سرسید
 انگریزی پڑھا گئے تھے۔ لیکن آج پھر وہی حالت ہے۔ اردو اخبارات میں ہندوستان کے
 سینکڑوں مسلم کالجوں اور بائی اسکولوں کے کمزور نتائج پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے۔ مسلم کاریگر
 اور تاجر اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے بجائے انہیں کاروبار میں لگا رہے ہیں۔ ہندی مسلمان
 بلحاظ تعلیم ایک بار پھر بقیہ آبادی سے دس گنا پیچھے رہ گیا ہے۔

میں جو عرصہ دراز سے مغرب کو اپنا وطن بنا چکا ہوں ان معاملات پر استغراب مضطرب
 ہوں؛ میں نے تبدیل شدہ حالات کا مقابلہ کیوں نہ کیا؛ میں تو دھانپور ہن کے غریب
 مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر بھاگا گیا تھا۔ جناح اب مجھے ان سب سے اظہار ہمدردی کا
 کیا حق پہنچتا ہے؛ میں اور ان بہادر باہمت لوگوں کے لیے سرپرستانہ ترحم کا رویہ رکھوں؟

سراٹھا کر عربی باجی کو دیکھا جو کسی دور افتادہ پوربی ضلع میں اپنی موروثی بائناہہ اراضی پر نوڈ کاشت کر رہی تھیں۔ جرمن باجی قابین بانی کی کاروباری ہیں۔ انکے قبضے میں دنیا کے ہر بڑے بینک کی شاخ کھل چکی ہے۔ ایک بیگم صاحبہ مشرق کی ہیلینا میں اٹلیاں کھلا رہی ہیں۔ حوصلہ مند اور کامیاب لوگوں کی اب یہاں کمی نہیں ۱۹۵۰'۵ میں ہم سب کتنے نسبت ہمت ہو گئے تھے۔ جیہی توں یہاں سے روز چکر ہوا۔ غدار کے بعد تو کتنے مغل شہزادے بیراگ لے کر جنگوں میں جا بسے تھے۔ بائیوں سے انگریزوں نے جھاڑ دیتے تک دلوایتیں۔ ہر طرح سے تحقیق کی۔

تاریخ کا جو اربھا ثابت و سالم اشیاء کو کھلے سمندر میں پہنچا دیتا ہے۔ خستہ اور بیکار چیزیں ساحل کی ریت میں معدوم ہونے کے لیے پڑی رہ جاتی ہیں۔ اتہاس کی تلھٹ۔ ایک روز نگار خانم اصرار سے گلبن کے کرتے خریدنے چوک لے گئیں تھیں۔ بہت کہا دلایت کے موسم کے لیے یہ کرتے بالکل بیکار ہیں۔ ہرگز نہ بائیں۔ واپسی میں پرانے شہر کی سیر کرانی۔ فرنگی محل لے گئیں۔ وہاں تنگ و تاریک گلیوں میں بے شمار مرد اور عورتیں کھڈوں پر بیٹھے نظر آئے مرد کرتے سی رہے تھے جو عورتیں پھولوں کے ہار گوندھ کر بیچتی تھیں۔ یہ لوگ ان مغلوں کی اولاد تھے جنہوں نے ۱۸۵۶ء میں جان بچانے کیلئے گاڈوں میں پناہ لی تھی۔ ہنگامہ فرد ہونے کے بعد انکی عورتیں فرنگی محل پہنچیں۔ بولولوں کے ہاں نوکری کرنے۔ تاکہ انکی عزت برقرار رہے۔ پارچے والی گلی سے نکل کر مرزا قدرت اللہ بیگ عرف کدسی کے چاچا خانے سے سگریٹ خریدی اور فرامیسی جھلک والے ان خستہ مکانات پر نظر دوڑائی۔ کہ سا مد و جز اپنے پیچھے ساحل پر یہ نشانات چھوڑ گیا۔

لیکن کنور نے کچھ دیر قبل کسی بات پر مجھ سے کہا تھا دلن بھائی تمہارا پروہم یہ ہے کہ تم محض تاریکی پر نگاہ جمائے ہو۔ اندھکار میں چمکتے جگنوؤں کو نہیں دیکھتے۔ میاں جیب کی طرف جا چکے تھے ہم منڈیر سے اٹھے۔ بن تاؤں میں پریوں کے جلسہ گھر جگمگایا کیے۔

قطب ستارہ

بھا دوں کی کالی رات میں تار سے بھی بڑی تیزی سے چمکتے ہیں۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ روشن کن کھجور سے کی ایسی ٹرین دور غائب ہوتی نظر آئی۔ ملاحت شاہ کی درگاہ سے روانہ ہو کر جنگل کی معطر فضا میں پاکیزہ ہوا کے جھونکے کے مانند گزرتے ہوئے میاں نے تیس میل کا فاصلہ طے کیا اور ایک گچی سڑک پر ٹرک گئے۔ حد نظر تلک ویرانہ اور تاریکی۔ رفقاتے سالار مسعود غازی کی ان گنت قبریں۔ ہم لوگ جیب سے اترے۔

”اس گنج شہیداں میں“ سرخ ریش مولانا نے کہا ایسے ایسے مرقد میں بو کھلے پڑے ہیں۔ اور انکے اندر سات سات فٹ لمبے غازیوں کے جد مبارک صحیح و سالم رکھے نظر آتے ہیں۔ لوگ ڈر کے مارے دن میں بھی اس طرف سے نہیں گزرتے۔ میاں آدھی رات کو چلے آتے ہیں۔ وہ مزے سے آگے آگے جا رہے تھے۔ دیدی اور دونوں باجیاں سر ڈھانپے ہم لوگوں کے ہمراہ قبروں کے درمیان سے گزریں۔ — پر سات کی رات۔ ایک ہزار سالہ پرانی قبروں سے پُر ویرانہ۔ سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن یہی ہٹ۔ اونچی اونچی گھاس۔ خاردار پودے۔ ناگ پھنی کی جھاڑیاں۔ گڑھے ٹیلے۔ ”تعجب ہے یہ بیبیاں اس بیخونی سے چسلی جا رہی ہیں گویا سکندر باغ میں ٹہلتی ہوں، ہم نے اظہار خیال کیا۔

”میاں ساتھ ہوں تو کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔“ مولوی صاحب نے کہا۔
چلتے چلتے کسی قبر کے پاس رک کر میاں ”السلام علیکم“ کہتے گویا وہ شخص سامنے ہو جاتا ہے اور اس سے مخاطب ہیں۔

چند مقابر کے نزدیک پہنچے۔ گلریز درختوں کی پیچھا رہاؤں کے نیچے سے گزرتے ایک گھیر کے دروازے پر گئے۔ اندر جھانک کر آہستہ سے آواز دی ”السلام علیکم“ آگے بڑھے۔

ایک ہزار سال قبل سالار مسعود غازی نے اس مقام پر کوئی جنگ لڑی تھی۔ یہ قدیم گورستان کبتوں سے پرگانہ تھا۔ لیکن میاں تھے کہ یہ ایک کسی گمنام قبر پر ٹھٹھک کر اسلام علیا کہتے اور آگے بڑھ جاتے ٹیلے پھلانگتا میں ان ادھ کھلے مزاروں کی طرف نکل گیا جنکے لیے کہا جاتا ہے کہ ان میں رکھے دیو قامت غازیوں کے جنازے اب بھی دکھلائی دے جاتے ہیں۔ سرخ ریش نے دور سے پکارا۔ راجہ صاحب۔ ادھر نہ جاتیے۔

شکستہ نیچی دیوار بل کھاتی دوڑ تک چلی گئی تھی۔ گویا مختصر سی دیوار چھین جو ظاہری دز کو اس پر اسرار کائنات سے علیحدہ کرتی تھی۔ دور افق پر چنڈر و شنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔
 ”وہ دیکھتے۔ میاں نے مجھے مخاطب کیا۔“ وہ جو ر و شنیاں نظر آ رہی ہیں وہ قصبہ کنتور ہے۔ اسے ارجن کی ماں مہارانی کنتی نے بسایا تھا۔ بہت قدیم ہے۔“

یہاں ہر چیز قدیم ہے۔ نئی کون سی ہے۔ ہم نے سوچا۔ کیا خود میاں بہت قدیم نہیں ہیں۔ نجانے یہ کیا معاملات ہیں۔
 ”مہا بھارت والی مہارانی کنتی۔ پانچوں پانڈؤں کی ماں، کنور مجھے ایجوکیٹ کرنے پر کمر بستہ تھا۔“ وہ لوگ اپنی جلا وطنی کے زمانے میں یہاں آن کر رہے تھے۔
 ”کنتور“ عربی باجی بولیں ”سالار مسعود نے فتح کیا۔ ۳۰۰ء میں صدیوں سے یہ علماء اور مجتہدین کا مرکز رہا ہے۔ علامہ کنتوری کا نام یاد ہے آپکو۔“
 ”جی نہیں“

مولانا جسٹس کرامت حسین بھی کنتور کے خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے۔
 ”اچھا وہ کرامت حسین گریز کالج۔“ ہم نے ذرا بے دھیانی سے کہا۔
 ”اور آیت اللہ خمینی بھی۔“ سرخ ریش بولے۔ ”انکے اجداد کو شاہان اودھ نے ایران سے بلا کر یہاں آباد کیا تھا۔ عذر کے بعد وہ لوگ ایران واپس گئے۔“
 ”آیت اللہ خمینی نے اس بات کی تردید کر دی ہے۔“ ایک اور صاحب نے جواب دیا۔

جرمن باجی گورستان کی دیوار پر بیٹھی آسمان کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ "بعض تارے اتنے روشن۔ باقی مدھم۔ اور پھر اندھیرا۔ نور اور تاریکی کا یہ کیسا سلسلہ ہے۔ لامتناہی۔"

انہوں نے حیرت سے کہا۔ ہم دیدی کی طرف مڑے۔ وہ بولیں۔

"تارے دیکھت ہیں چاچا۔ وہ دیکھیے۔ وہ رہا پست رشی منڈل۔"

ریدی کو تو رشی ہی نظر آئینگے۔ لیکن مجھے اور آن دھتی اور روشی کا خیال آیا۔ دیدی کہ وہاں پورے کے ایک پڑوسی راجہ کی بیٹی نکلیں۔ میکے کے رشتے سے ہمیں چاچا پکارنے لگی تھیں۔ افسوس کہ ہم پہلے بوائے کے بجائے چاچا بن گئے۔

"وہ رہا دھرتارا۔" دیدی نے اطلاع دی۔

"قطب ستارہ۔" عربی باجی بولیں۔ "اُدھر۔"

"گورستانوں کے سلسلے بھی نو رستان کی طرح لامتناہی ہیں۔ جیپ کی سمت واپس

جاتے ہوئے جرمن باجی نے اظہار خیال کیا۔ "تارا منڈل کے مانند انت۔"

ہانی دے سنان پڑی تھی جیپ اڑی جا رہی تھی۔ اچانک ایک جسم سیاہ پرند سا منے آن کر ادھ کھلے شیشے سے ٹکرانے ہی کو تھکا کہ میاں نے بریک لگائی۔ پرند پل بھر کے لیے ہوہاں معلق رہ کر انجن پر پٹ سے گر اور زخمی ہو کر اڑ گیا۔

"یو۔ کے۔ پی۔! میاں نے مسکر کر مجھ سے فرمایا۔

دیدی متوحش نظر آئیں۔ دریافت کیا۔ "میرے لیے بھیجا گیا تھا؟"

"واپس گیا۔" میاں نے تنگ تنگی سے جواب دیا۔

رات بھیگ چلی تھی مگر آستانے پر حسب معمول بے انتہا چہل پہل۔ گیس کی روشنیاں۔ مہانوں کی آمد و رفت۔ میاں مکان کے اندر تشریف لے گئے۔ طعام شب کے بعد تینوں خواتین اور سرخ ریش کے ساتھ ہم باہر شامیانی میں جا بیٹھے

"اُو کا چھٹا بری چیز ہے۔" دیدی بار بار کہہ رہی تھیں۔ "میاں نے پچالیا۔ میاں نے"

”اُلوکا جھٹیا کیا شے ہے؟ ہمیں سنسی آگئی۔“

”چاچا۔ ہمارے دشمنوں کو معلوم ہو گیا کہ ہمارے خلاف انہوں نے جو مشترک کام کروائے تھے انکا یہاں اتار کیا جا رہا ہے۔ اسی مارے آج انہوں نے اس سے اُلو بھیجا۔ چاچا۔ اماوس کی گھور کالی راتوں میں ندی کنارے عمل کروا کے ہماری جھٹھانی ہمارے خلاف پرتیوں کی چوکیاں بھجواتی رہی ہیں۔ ایک عامل صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہمارے اوپر چوڑے تختیوں کا اثر ہے۔ چودہ بُری آتماؤں کا۔ اٹھارہ سال تک ہمیں بیماریوں نے گھیرے رکھا۔ رام رے۔ کیا دھجا تھی ہماری اتنے دنوں میں ہیرا پھیری کر کے ہمارے چٹھ جھٹھانی نے ہماری پچاس لاکھ کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ ہمارا یہ حال کہ سونے کو ہاتھ لگاویں تو مٹی بن جائے۔ کوئی سادھو عامل کھاؤ پیرایسا نہیں جسے ٹرائی نہ کیا ہو۔ چاچا ایک بڑے میاں ایسے ہمارے پاس آئے اتار کرنے جنکے پاس ایک کتاب تھی۔ شبد تو اسمیں عربی فارسی جیسے تھے مگر سب اُلٹے لکھے ہوتے۔ سب ملا کر تین لاکھ روپیہ ان لوگوں پر ربا دیا۔ ہم ہمیشیت انکے ”میکے والے“ ہمدردی سے سُننا کیے۔ وہ ہماری ”بٹیا“ تھیں۔

”پھلے مہینے الہ آباد اپنے پیرسٹر سے ملنے گئے تھے۔ وہاں کسی نے میاں کا ذکر کیا ہم نے دھیان نہ دیا طے کر لیا تھا اب کسی کے پھیر میں نہ پڑیں گے۔ بلکہ نوڈمنزل جا کر اپنے دماغ کا علاج کروائیں گے۔ شاید مصیبتوں نے ہم ہی کو وہی بنا دیا ہے۔“

”لیکن جب ان صاحب نے بہت سارے قہصے ہم جیسے دکھیا روں پر میاں کی کربا کے سُناتے تو ہم ان کی شرمن میں پہنچے لکھتو۔ ان کو اپنا ماجرا سنانا شروع کیا۔ بیس سال لمبی کہانی تھی۔ مگر میاں نے دس منٹ بعد ہی بڑی مدھرتنا سے کہا: ”اب کچھ نہیں ہوگا!“

جب ہم اس روز یہاں آئے تو میاں نے ان دونوں میں سے ایک سجن کو بلوایا وہی جو میاں کے انسٹرکشن پر لوگوں کو تعویذ وغیرہ دیتے ہیں۔ چینی کی بلیڈوں پر زعفران سے نقش لکھ کر دیتے ہیں پینے کے لیے۔ میاں نے ان سے خالی اتنا کہا — دیدی کے اوپر سے چار ہانڈیاں اتار دو۔“

”پیرسوں سے آج سویرے تلک تین ہانڈیاں اتاری جا چکی ہیں کل سویرے چوتھی

ہانڈی اتاری جاوے گی تو دیکھتے آج ہی بیروں نے اٹو بھجوا دیا۔۔۔“

ذیدی کی ہانڈیوں نے والد سدھیں چکرا دیا۔ پوچھا: بوہی جن میں کھانا پکتا ہے؟“

بولیں: ”جی ہاں چا چا مٹی کی کوری خالی ہانڈیاں۔ ایک کے اوپر خادم نے ہمارا اور ہماری ماں کا نام پوچھ کر لکھے اردو میں۔ اور عربی میں کچھ اور لکھا۔ پھر اسے ڈھکن سے بند کر کے آٹے کا کڑا لگا دیا۔ پھر چالیس بار ہمارے اوپر سے اتارا۔ اب جو ہم نے دیکھا چاچا تو اٹا خون سے لال خادم کہنے لگے ہانڈی بہت بھاری ہو گئی ہے۔ پر ماتا کی شان ہے۔ کتنی بڑی بلاؤں نے ہمارے اندر گھر کر رکھا تھا۔ اٹھارہ بیس برس سے۔ وہ صاحب ہانڈی لیکر باہر چلے تو ہم نے پوچھا کہاں جاتے ہیں بولے اب اسکو من بھر کڑی کے الاؤ پر رکھ دیا جائے گا دن بھر کھد بکتی رہے گی ساری بلائیں اندر ہی اندر بھسم ہو جاویں گی۔“

”آج سویرے دوسرے ہانڈی اتاری گئی تو دیکھتے دشمنوں نے اٹو بھجوا دیا۔ اسے میاں نے فوراً واپس لوٹا دیا ادھڑا کر کے۔ آپکے سامنے کی بات ہے۔ اب ہمیں کوئی چنتا نہیں۔“

ہم کرسی سے سڑک کر سامنے تالاب کو دیکھا کیسے۔ ہم میاں کی پاکیزگی، منفرد شخصیت اور سنِ اخلاق کے گردیدہ ہو چکے تھے مگر یہ جادو ٹونے کا آثار، جنات اور بیدار وح کے قصے۔

THIS WAS A BIT TOO MUCH

”اس تال کے کنارے۔۔۔“ کنور نے کہنا شروع کیا ”بے شمار ہانڈیاں دفن ہیں۔ میاں کے والد علیہ الرحمہ کے پاس بھی اسی طرح پریشان حال لوگ آتے تھے۔ بانسہ شریف اور کچھوچھ شریف سے آسب زدہ لوگ پاگل دیوانے یہاں لائے جاتے ہیں وہ میاں کی توجہ سے اچھے ہو جاتے ہیں۔“

”کچھوچھ شریف میں ابھی ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔“ عربی حاجی شگفتگی سے بولیں ”وہ ایک مامور ماہر اسلامیات ہیں نا۔ ڈاکٹر شبل۔ وہ کچھوچھ شریف شریف لے گئی تھیں۔ شاید وہ بھی راجہ صاحب آپکی طرح کی SCEPTIC ہیں۔ مغربی دانشور۔ وہاں پر حسب معمول آسب زدہ لوگوں کی بھیر تھی۔ انہوں نے غالباً جنات وغیرہ کے متعلق عدم یقین کا اظہار کیا۔ اسکے بعد

ہوں نے آسیب زدہ سچوم کی تصویریں کھینچیں۔ ڈیویپ کرنے کو دیا تو سارا رول بلیٹک
”کیمرے میں کوئی خرابی رہی ہوگی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ارے تصویر پر یاد آیا، جرمن باجی بولیں! میں نے ٹینگن یونیورسٹی کے میوزیم۔
ایک مغل سیننگ دیکھی تھی۔ ستلہء کی بنی ہوئی۔ کہ حضرت سلیمانؑ جو ہیں وہ مغل بادشاہوں
لباس پہنے تخت پر بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف پریمیاں۔ جنات اور قسم قسم کے جانور۔ ایک تو
مولیٰ مٹی پر مٹی کے سامنے گھڑی ہے۔“

”دیواروں کے شکلوں سے بڑے سٹوئیٹ لگ رہے تھے۔ اس مغل مصور کا تخیل زور دار
ہوگا۔ بڑی WIERD عجیب الخلقیت صورتیں بنائی تھیں۔ داڑھیاں۔ جانوروں کے اڈے
بڑے بڑے کان۔ پیر۔ ایک صاحب کے سر پر ایک سیننگ۔ سب ایک سے ایک کیوٹ۔“
”اسوقت آپ کو ایک نہایت کیوٹ اور سٹوئیٹ جن نظر آجائے تو کیا ہو چاہیں گے؟“
ہو کر پوچھا۔

”میاں کی موجودگی میں ہیں کون ڈرا سکتا ہے! جرمن باجی نے اطمینان سے جواب دیا“

ایک ساؤتھ امریکن مصنف نے اپنی کتاب میں

OTHER IMAGINARY BEINGS شاید اسکا عنوان ہے۔ اس نے دنیا

کے کم فہم لوگوں اور جنگلی قبائل اور قدیم تہذیبوں میں رچے ہوئے نسلی واہموں کی عکاسی
اور نفسیاتی وجوہات کا تجزیہ کیا تھا۔ لیکن یہ خواتین و حضرات نہ قبائلی تھے نہ کم عقل۔ تعجب
سُرخ ریش کہنے لگے۔ ”راجہ صاحب۔ آپ یقین نہیں کر سکتے۔ آپ لوگوں کے س

مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان ہیں تو فرشتوں کے وجود کو مان لیں گے کہ وحی حضرت جبریل علیہ
سہمی لیکر آئے تھے۔ مگر اجنبہ کو واسمہ سمجھیں گے۔ قرآن حکیم میں انکے متواتر تذکرے کے

”صبح عاشور زعفر جن امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی
حکم دیجئے تو میں پل کی پل میں اپنے لشکر کو بلا کر فوج یزید تہیں نہیں کر دوں۔ مولانا نے
نہیں تم واپس جاؤ۔ مجھے ایسا فریضہ پورا کرنا ہے۔“

”مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کا ایک اور واقعہ آپ کو سنا دیں؟“ عربی حاجی نے دریافت کیا۔
 ”انکے مدرسہ نظامیہ میں ایک جن بصورت انسان پڑھنے آیا کرتا تھا۔ مولانا نے ایک روز اس سے دریافت کیا اس وقت قوم اجنبہ میں سے کوئی صحابہ بھی حیات میں ہے اس نے کہا میرے ایک چچا ہیں۔ حضور کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ترک دنیا کر کے ایک صحرا میں مقیم ہیں۔ مولانا پتہ نشان معلوم کر کے اس صحرا میں گئے اور اس سے ملے۔ اس نے بتایا کہ حضور کی خدمت میں رہ چکا ہوں حضور کے ہمراہ اکثر عزوات میں بھی شریک ہوا۔“
 ”مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں تو جنوں کے بچے اکثر پڑھتے آتے تھے“ سرخ ریش نے صا د کیا ”بیٹا یہ تو ہماری یاد کی بات ہے حضرت مولانا عبدالباری مرحوم کے مکان کے تھانے میں جن رہتے تھے۔ انکے بچے مدرسے میں پڑھتے تھے۔ پھر جانے کیا بات ہوئی مولانا نے ان سے درخواست کی کہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ وہ مان گئے رات کو کسی نے دیکھا کہ بے چارے سردوں پر کھانے کے طباق رکھے ہوئے تہ خانے سے نکلے صحن میں سے گذرتے ڈیوڑھی سے باہر چلے گئے۔“

دفعاً سب خاموش ہو گئے۔ برگدوں کے ادھر کسی گھر میں رت جگمانا جا رہا تھا۔
 ولادت رسول کے اسی گیت کی آواز بلند ہوئی۔ عبداللہ کے آنگنوا میں ٹوریں ناچیں چھماچھم
 "HARK THE HERALD ANGLES SING!" کنور نے آہستہ سے کہا۔ "سارا ویسٹ
 کرسمس سینئر میں الاپتا ہے تو سوچتے ہو فرنگی بھی فرشتوں کو مانتا ہے تو چلو فرشتوں پر یقین رکھنے سے تم کو جاہل اور توہم پرست نہیں سمجھا جائیگا۔ لیکن جن بھوت — خرافات! —
 "یار" میں نے زچ ہو کر جواب دیا "یہ جو اتنے روکٹ خلا میں چھوڑے جا رہے ہیں انہیں تو راہ میں کوئی آسمانی مخلوقات نہیں ملیں۔ سو ویٹ یونین میں جنات کیوں نہیں پاتے جاتے؟ جن کو مانوں تو بھوت پریت چڑیل مسان سب کو مانتا چلا جاؤں۔"
 "نہ مانو کو کون کہتا ہے کہ مانو۔ اتنے دنوں میں تم نے نوٹس کیا ہو گا کہ میاں کبھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ — میاں کے ساتھ جو انکے

یہ بتناش اور خوش اخلاق خدام تم مستعد دیکھتے ہو انکے علاوہ چند جنات بھی ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ جنات متیعہ محض ایک بار انہوں نے وہ بات کہی تھی کہ اگر وہ ان دیکھے لوگ تم کو نظر آجائیں جو ہمارے ہمراہ رہتے ہیں تو ہمیت سے تمہارا اکلیمہ بنی ہو جاوے۔

”اور ایک اور مرتبہ کا واقعہ ہمیں کسی نے بتایا تھا۔ عربی باجی نے کہا: ”میاں کہیں تشریف لارہے تھے۔ انکے خیر مقدم کے لیے کچھ لوگ ایک کار لیکر کسی جگہ پہنچے۔ باقی لوگ دوسرے راستے سے آئے۔ دیر سوچکی تھی۔ جب وہ لوگ اس خالی کار کے پاس گئے جہ لے کر میاں کے پاس جانا تھا انہیں دو سفید پوش پچھلی سیٹ پر بیٹھے نظر آئے۔ یہ صاحبان قریب پہنچے تو وہ دونوں دروازہ کھول کر اترے اور فوراً غائب ہو گئے۔ جب انکے میسرابا میاں کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا آپ نے دیر لگا کر ڈیوٹی کے لوگوں کو پریشان کیا“

میں چپ چاپ بیٹھا دال موٹھ کھا رہا مگر مولوی صاحب جھٹکیا کیا شے ہے؟“

سرخ ریش نے مجھے لبور دیکھا: ”راجہ صاحب جن چیزوں سے آپ واقف نہیں؟“

یہ مطلب نہیں کہ انکا وجود ہی نہیں؟“

”آپ نیوکلیر فرکس سے واقف ہیں؟“ عربی باجی بولیں۔

”افوہ بھائی عربی باجی آپ ذرا چپکی رہیے جی مولوی صاحب۔“

”راجہ صاحب۔ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجتہ کو آگ سے پیدا کیا۔ اور احکامات نازا کیے کہ بندوں کو گزند نہ پہنچانا۔ وہ اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ ہر جگہ بے چارے نیک جنات بعض اوقات اپنی غفلت اور اپنے حجم کی وجہ سے انسان کو نادانہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ آگ کی خاصیت جلانا ہے۔ آپ اسکی زد میں آئیے جھلس کر رہ جائیں گے۔ رہیں بدارواح“

”اور الوکا جھٹکیا۔۔۔؟“

”سفلی عمل والے آلودہ کرتے ہیں۔ انکو یہاں سزا مل جاتی ہے۔“

”اس جگہ پر محض نیک جنات رہتے ہیں کل بڑا لطف آیا۔“ جرمین باجی بولیں ”میا

کے ایک خادم درجو بیل کا جنگل ہے نارات کے وقت وہاں چلے گئے تھے۔ وہاں جنوں نے انکی خوب ٹھکاتی کر دی۔ نمودار ہو کر بو بے یہاں ہماری مسجد ہے تم کیا کر رہے ہو۔ اس نے بحث کی مسجد تو وہ سامنے درگاہ میں موجود ہے۔ دوسری مسجد کہاں ہے دکھلاؤ۔ وہ بو بے ہم میاں سے ڈرتے ہیں ورنہ تم کو ٹھیک کر دیتے۔“

پاکستان میں بھی ضعیف الاعتقاد لوگوں کی کمی نہیں۔ کراچی میں ہمارے ایک دوست کی بیوی نے ایک بار بتایا تھا کہ انکا بیٹا کسی بد دعا کے اثر سے ناگہانی مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ ایک لائٹنٹل ایر لائینز کے ایک سینیئر پاکستانی پائلٹ بھی انہوں نے کہا پوشیدہ بزرگ ہیں۔ انہوں نے ایک چھڑی پڑھ کر لڑکے کو دی۔ چند روز میں ادھر بد دعا کا اثر زایل ہوا ادھر وہ چھڑی غائب!

میں ان معقول سنجیدہ انسانوں کی سمجھ بوجھ پر متحیر بیٹھا رہا۔ سامنے تالاب میں تارے منعکس تھے سپت رشی۔ دھرتارا۔ ساری آکاش گنگا۔
صدر دروازے پر گیس کی لائٹنیں جنگل میں بھیگی ہوئی ہوا میں سنسنایا کیں۔ اندھن سے بنشاش تہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ چلو ان رچلیں۔ میں نے کنور سے کہا۔

ڈیوڑھی میں پہنچے تو حاضرین کے تہقہوں کے درمیان ایک باریک غیر انسانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ باریک ہنسنی، خنسنی، خنسنی سی ہنسی۔ ایسی UNCANNY, NASAL آواز آج تک نہ سنی تھی۔ پھر ایک کرک دار مردانہ آواز صحن میں پہنچے تو دیکھا میاں حسب معمول پلنگ پر نیم درواز فلپان نوشی میں مصروف۔ ایک خوش پوش چھری سی لڑکی پیشانی پر سرخ بندی۔ پائنتی زمین پر بیٹھی وہ غیر انسانی ہنسی سن رہی ہے۔ موٹی موٹی ساری پیسے ایک مسلمان دیہاتن میاں کے سرھانے کھڑی نہایت گرجدار مردانہ آوازیں بنکار رہی تھی۔

ادھر وہ شہری ہندو لڑکی ناک میں بولتی اور بھیانک ہنسی سن رہی ادھر وہ مسلمان دیہاتن زور زور سے تقریر کرنے میں مصروف۔ ”ہم بچ رگ ہیں۔ ہم کامت سناؤ۔ ہم معمولی جن بھوت

نہیں ہیں۔ بیچ رُگ ہیں۔ پھر اس نے لمبا قصہ کسی عورت سے اپنے جھگڑے کا شروع کر دیا۔ حاضرین محفل کے لیے یہ یہاں کے روزمرہ کے واقعات تھے۔ وہ محفوظ میں منحصر۔

”یہ دونوں دو مخالف سمتوں سے ابھی ابھی یہاں پہنچی ہیں۔ ایک پورب سے آئی ہے ایک کچھم سے۔“ ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔

دیہاتن بڑی مزیدار تقریر کر رہی تھی۔ مجمع بار بار تھقبے لگا رہا تھا۔ میاں بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نیلی ساری والی لڑکی پھر زور سے جھناک رہی۔

”یہ بے چاری کالج میں پڑھتی تھی کوئی چڑیل اس پر مسلط ہو گئی۔ ابھی ابھی شام کی بس سے اسکا بھائی اسے یہاں لایا ہے۔ فیض آباد سے کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔“ ایک خادم نے میاں کا حقہ تازہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کچھ دیر بعد ”چڑیل“ والی لڑکی رخصت ہوئی۔

وہ دیہاتن اسید طرح بھاشن دیتی رہی۔ پھر اس نے سید کرار اسلام علیکم کہہ کر میاں سے مصافحہ کیا اور باہر گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی۔ اب وہ بالکل نارمل تھی۔

”جن باہر ڈیوڑھی میں کھڑا رہ گیا ہے۔ میاں نے حصار کر دیا۔ کنور چیکے سے بولا۔“

دو فتادہ پھر مردانی آواز میں بنکارنے لگی اور اسید طرح گرجتی ہوئی جا کر ڈیوڑھی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

گاؤ ٹکیوں کے سہارے نیم دراز میاں بڑی بناشت کے ساتھ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں سے آہستہ آہستہ گویا کسی کو جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ اور شرعاً تسم لگا ہوں سے مجھے دیکھا۔ باہر سے عورت کی نارمل آواز آئی۔ چند لمحوں بعد میاں نے پھر اشارہ کیا۔ مکان کے باہر سے عورت نے دوبارہ دہاڑنا شروع کیا۔ اسید طرح جینتی چلائی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

”یہ بھی صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔“ کنور نے کہا۔



(۴۱)

مَدھُون

ہمالیہ کے دامن میں سدا بہار جنگلات ہمارے ساتھ ساتھ تھرواں تھے۔ پیرشکوہ درختوں کے کیتھڈرل! ہوائیں آرگن بجاتی ہیں۔ پرند کوایر گار ہے ہیں! اسارا ہندوستان — ”کنور نے گونجتی ہوئی سی آوازیں کہا ”کیا ایک اوپن ایرویسٹ ٹر ایبے نہیں؟ ڈھ اولڈ وک کی اسٹیج پر طامس بیکٹ کارول ادا کرنے والے سر ڈونلڈ وولفٹ نا طرح بول رہا تھا ”زائرین کے جلوس بیکٹ کی قبر پر جاتے تھے تو انگلش ٹریچر نے اسے زندہ جاوید کر دیا۔ محض ٹھیٹر اور کتابوں میں — ہم اپنے فوک ہیسروٹوسموں کی پشپالا وروک کیتوں سے سے بے بریٹ کرتے ہیں۔ یہ سارا ایریا سالار مسعود کنڑی ہے۔ جیٹھ مہینہ باٹے میاں کی شادی، پلنگ پڑھیاں جھنڈے اٹھائے ہندو مسلم پاپیادہ زائرین کے نافلے —“

اس نے کاری زقار دھیمی کی۔ ایک قدیم درگاہ کی بنسواری میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ایک سیاہ پوش بوڑھا بانسری تراشنے میں منہمک تھا۔
طویل گلہ ٹن ٹن کرتا سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ گوری رنگت کے گڈریے نے مسکرا کر ہمیں دیکھا۔ گاڑی روکنی پڑی۔ بھینسوں کی آہستہ خرامی اور ایشیائی زندگی کی زقار مجھے ایک سی معلوم ہوئی۔ ”گڈ لنگ چپ کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔
”مسلمان گڈی سنتے ہیں انکے اجداد گاچی میاں کے لشکر کو دودھ پیلانی کرتے تھے۔ سالادیم دی کو نکر رسالار مسعود کا تقریباً کن کم پریری تھا جنوبی انگلینڈ کے ملکین یہ تو کہتے نہ ہونگے کہ انکے فورفادر نورمن فوج کے لیے —“

”یاریہ سب یاد رکھنے کے بجائے انہیں اور بہت سے کام بھی ہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان

میں کاسٹ سٹم نہیں ہے۔ بنا رس کے ملاح کہتے ہیں انکے پرکھوں نے راجندر جی کو بن باس کے لیے کاشی کے اسی گھاٹ سے گنگا پار کرائی تھی۔“
 ”عین ممکن ہے“

”سوڈوٹ — تمہارا پرولم یہ ہو گیا ہے کہ تم کو منٹھرا کی ہر گوان میں ایک گوی نظر آتی ہے۔ یہ مہٹری کا OVERKILL ہے سینڈی“

پراٹم منٹھرا صاحبہ جب کسی بیرونی سفر پر روانہ ہوتی ہیں اودھ کے ایک سابق تعلقے کے ایک صاحب کے پاس ٹرنک کال آتا ہے وہ فوراً ڈہلی پہنچتے ہیں ساتھ ریاستی لباس میں نانی — چاندی کی تھالی میں امام ضامن رکھے۔ وہ میڈم کے بازو پر باندھا جاتا ہے۔ آتے دن وہ مندروں میں جاتی رہتی ہیں۔ باپ اتنے سائینٹفک ذہن کے لادین آدمی تھے۔ اپنا اپنا مزاج ہے۔ خواتین بہر حال زیادہ مذہبی ہوتی ہیں۔ سوشلسٹ سماج کی عورتوں کو تو عرصے سے اس جذباتی سہارے کی حاجت نہیں رہی — تیسری دنیا میں مذہب پرستی ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن جن چیزوں کو میں تو تم کہتا ہوں کنورا سے خوش عقیدگی بتائے گا۔ الفاظ اور تصورات کا کمیونی کیشن بریک ڈاؤن۔

”گھوڑا شہید کا چلہ — ایک کافی آلود گنبد کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے اناؤنس کیا۔ امرتوں میں کوئل کوک رہی تھی۔“
 ”ان باغوں میں چھپے کسی پراچین آشرم یا درگاہ کی جھلک دیکھ کر عجب سامحوس ہوتا ہے۔ اس فیلنگ کو میں پن پوائنٹ نہیں کر سکتا“
 ”تم ایک رد مینٹک آدمی ہو سینڈی“

”کسی موڈرن ہندی پوٹریٹ کی یہ ایک لائین پھلے دنوں مجھے اچھی لگی — ایک سمجھدار پتہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے، — سنو۔ دلتن بھائی تمہارا کبھی یہ جی نہ چاہا کہ کسی ہرے بھرے ووڈ لینڈ میں بہتے دریا کے کنارے جا بسو؟ شاردہ۔ موہن ندی۔ گوتمی۔ سرجو۔ بس ایک ندی اور ایک عمیق جنگل۔ تمہارا کبھی جی نہ چاہا —؟“

”نہ جوگیم کہ جوگم بہ برگ کو کنا رہا۔“

”ہا ہا۔“

اب ہم ایک پل پر سے گذر رہے تھے۔

”میاں کی خانقاہ اب زیادہ دور نہیں، کنوڑے کہا۔“

خانقاہ! ایک وقت یونان میں راہب کا بھیس بدل کر فدوی ایک نادر و بیش بہا باز نطنبی آئیکین پر ہاتھ صاف کرنے کی غرض سے ایک گریک اور تھوڈ کس ری ٹریٹ میں گیا تو کیا پراسرار جگہ پائی تھی۔ نیم تاریک راہداریاں۔ سرد اندھیرے زینے۔ سلاخوں دار روزن۔ اونچی شمعیں عود و دلوبان کے مرغولے۔ لباس تیرہ سرسراتے گھنی طویل ڈارھیوں والے راہب۔ باہر زیتون کے پیڑوں پر دمکتا تہا چاند۔ اور قرون وسطیٰ کے اسلامی رباط۔ تعلق اور لودھی قسم کی نیچی محرابیں۔ ٹھوس عمارت۔ عود و دلوبان سے معطر۔ نقش چغتائی کے ایسے لبادے پہنے۔ غلامی آنکھوں اور باریک ستواں ناکوں والے درویش۔ آہو چشم کد و بدست گداگر۔

ناچیز اپنے دائرہ مٹی جیسے زور و تخیل سے عاجز ہے۔ گو اسی کی بدولت اپنے ناگفتہ بہ ارادوں کی پلاننگ میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اس وقت میاں کی خانقاہ کے پراسرار ماحول اور رہ و رسم خانقہ کی تصور کیا سینڈی پھر بولا: ”ہم تو ہفتوں وہاں جا کر رہتے ہیں۔“

”چھوڑ رباط کہن کو صوفی۔“

”ٹنگ ٹکو تم بھی۔“

”ٹنگ ٹکو کا نہ کٹائیں۔“

”ٹالو۔“

”ٹریڈ میں ٹوٹا ٹاٹا بھی نہیں پسند کرتا۔“

”ٹائیں ٹائیں مت کراے بیوقوف طوطے۔“

”ہمیں طوطا مقرر کیا ہے؟ ہم ایک مصروف تاجر ہیں۔“

”ٹھا کر صاحب اف ٹوٹنہم کورٹ روڈ۔ یو۔ کے۔ پی۔“

”میں نے ہتھیار لگا۔“ اسکول میں ہم لوگ پہروں اس قسم کی ٹون سنس۔“

”سبس تو آپکے اندر اب بھی بہت زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔“

کسی گاؤں کی ٹمنٹائی ہزریا۔ دوکانوں میں بیٹھے لوگ گویا میڈیوں تصویریں۔

بندراد اسکول جو سالار مسعود غازی کا ہم عصر تھا۔ اسکا ایک نادرا لہم ہم نے ایک باری ڈنمارک کے ایک میوزیم سے پار کیا تھا۔ ترانی کے اس بازار میں بالکل اسی طرح کے بارش دوکاندار ترازو سامنے رکھے، برقعہ پوش عورتیں۔ گول ٹوپیاں اوڑھے بچے۔

یہ سندریش نرائن سنگھ ابھی مابعد الطبیعیاتی تسلسل کی کیا بات کر رہا تھا۔

اور حلوائی کی دوکان کے نیچے بیٹھا ایک پرامیدگتا۔ ایک پرامید۔

امید کرتا ہوں کہ نورما کی وہ ٹوکھو سان فرانسسکو والی اسکیم نہایت بار آور رہے گی۔

ہمارا پلان یہ ہے اور کیا سو مند پلان ہے کہ سیاحوں میں ایسی ہستیاں جو نہ میوں میں

ہیں نہ شیوں میں۔ انکی میزبانی کی خاطر پیرس ٹوکھو لاس اینجلس سے ایسی ہستیاں جو نہ

معاڈر سالگا۔ فاسد ویلج اور ادوں کے غول بیابانی میں کہ اپنی لائٹن چمکائے جا رہے ہیں۔

چوروں کی طرح سینڈی کی طرف دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جمال ہمیش نے اسے بھی پوتر،

شدھ کر رکھا ہے۔ میاں بہت آگے آگے جا رہے تھے۔ انکی ایمبیڈر کی سرخ روشنی تاریکی میں

تقدیل رہبانی کے مانند جھلملاتی۔

ایک شہر ہماری سمت بڑھا۔ پیچھے ہٹا۔ افق پر روشنیاں نمودار ہوئیں۔ جنگل میں منگل

جو میرے بن مالی نے لگایا ہے۔ ”سندریش نرائن سنگھ خدا سے خوش رکھے، اپنے ممدوح کو

کبھی بن مالی کہتا ہے کبھی بن راج، اور تہواری کہ یہ سری کرشن کے القاب ہیں۔ یوسف تانی

پکارتا ہے کبھی شہر یار ملک عرفان۔ میں دشا دعلی کنٹا ہر میوں میں سے ہوں میں نے اپنے اس

قدیمی یار کو پھر ڈاؤن تو اترتھ واپس لانا چاہا۔ ”ان جنگلوں اور ندیوں میں ہم نے کتنے شہر مارے

کتنے ماہ شیراب و ایبلڈ لائف کے لیے ساری دنیا میں پناہ گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ انسانوں

کا شکار بلا لائنس۔“

”ہاں۔ مچان بھی ایسے باندھے گئے ہیں کہ نشانہ خطا نہ ہو۔ اور کنکر سیٹ کے مہانوں کے

اندر کین گا ہیں۔“

”کیم ریزرور یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”میاں کے ساتھ موقع ملے تو ضرور جانا۔ میرے دینو گوپال اس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ ہرن فلائیں بھرتے آکر ان انکے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انکو تنکا کرتے ہیں۔ رمضان شریف میں اگر وہ خانقاہ میں موجود ہوں انکے ساتھ افطار کے لیے آدم جانے کہاں کہاں سے امنڈ آتا ہے، مدھوبن — شہد کا جنگل! کبھی مدھیہ پردیش میں حسین ٹیکری گئے ہو۔؟ امام حسین کی زیارت گاہ۔؟ نہیں۔؟ اسکے گرد جو فورسٹ ہے اکثر صبح صبح اسکے پتوں پر شکر جی ملتی ہے۔“

”چلو شکر کا مسئلہ تو یوں حل ہوا۔“

”ہاتھ ننگن کو — جا کر دیکھ آؤ۔ تمہیں محل دینے کے لیے ٹیکری کے منتظمین راتوں رات — لاکھوں پتیوں پر چینی تو چھڑکنے سے رہے۔ دن بھینا ہو۔“ وہ خالص اودھی انداز میں بولا۔ تم لوگوں کا پرولیم یہ ہے کہ خرد کی عاجزی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔ درنہ — پچھم کے لال بھکڑوں نے جو گیان بھون تین سو سال میں تمہارے لیے تیار کیا ہے وہ پل بھریں۔“

ایک نیلگوں پھانک سامنے آیا۔ اندر جا کر سایہ دار راستے پر سے گذرتے ہوئے وہ کہنے لگا ”یہ سامنے جو عمارت دیکھتے ہو۔ اسکی تعمیر کا تمہاری عقلی توجیہ سے کوئی علاقہ نہیں یہ دیرانہ تھا۔ ایک کہنہ تلے کے آثار دار بالے میاں کے ایک ساتھی کا مرقد۔“

دس بارہ برس قبل کا ماجرا ہے میاں اچانک یہاں وارد ہوئے اس بلڈنگ کا نقشہ بنایا۔ لہ رٹریٹ آف دی آرٹس ایزاے نیک سینٹ۔ جیز جو اس نہ لکھ پاتے۔ البتہ گرم گریں۔“

گاڑی باغ کے صدر دروازے پر روکی۔ مرشد بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ سامنے ایک خوبصورت گلانی بنگلہ اور اسکا گلشن برقی قمقموں سے فردزاں تھا۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے۔ ہر برگ گل چوں شب چراغے۔ اس کو شک بعل اور چین کی چہل پہل دیکھتے آگے بڑھے۔

نصف شب سے زائید گذر چکی تھی۔ اشجار میں پوشیدہ تیز روشنیوں کی زد میں ایک یگ صاحبہ وسطی روش پر ٹہلتی نظر آئیں۔ میاں پھانک پر گردہ مشافاں میں گھر سے کھڑے تھے۔

قریب آئیں بعد خاکبوسی یوں گویا ہوتیں۔ ”میاں کل رات ہم پچھلے برآمدے میں تہجد پڑھ کر اٹھے ہی تھے کہ ایک بیدلانے سفید پوش دکھلائی پڑے۔ گور سے چٹے نہایت خوبصورت اور نمسن۔ پورے ہنس منٹ تک نظر آیا کیے۔“

”وہ سب نوجوان لڑکے تھے۔ مختلف ملکوں سے آئے تھے۔“ مرشد نے اطمینان سے فرمایا اور بنگلے کی سمت روانہ ہو گئے۔

”مگر اتنے لائے؟“ محترمہ نے دہرایا۔

”آج کے کینیڈین بھی تو بے تحاشا لمبے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ دور دور سے آئے تھے۔“

— ایک صاحب چاء کی کیتی اٹھاتے پاس سے گذر رہے تھے۔ ٹھٹھک کر گفتگو میں شامل ہو گئے۔

”قفقاز۔ اور اسکا نام لیجئے مازندران۔ جرجس۔ سرخس۔“

مجھ دلشاد علی نے پھر آنکھیں ملیں اور کانوں پر ہاتھ پھیرا۔ رات کے دو بجے اس بقول جانفرا گلزار میں جمع یہ افراد کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ ہا سپید پوست بالاقدر عمر۔

— پراسرار بندے۔ ہا ان میں سے چند کے ادھ کھلے طویل مزار تو ہم کشتور کے نزدیک

بھی آدھی رات کے وقت دیکھ کر آرہے ہیں۔ یہ سالار مسعود کنڑی ہے۔ اس ماحول کا اثر ان بی بی کے دماغ پر ہو رہا ہے۔ قطع سے یونیورسٹی لیکچر معلوم ہوتیں (کیمسٹری کی ریڈر نکلیں) ہمارے ویسٹ میں کیتھولک راہب خانے LAY اہل دانش کے لیے عارضی ری ٹریٹ کا کام دیتے ہیں۔ میاں کی اس انوکھی سی ”ری ٹریٹ“ میں مقیم ان صاحبہ کو غالباً اپنے ذاتی مسائل کے بوجھ تلے پہلو سوسائٹیشن دکھلائی دے رہے ہیں۔ موصوفی صہل منزل نور منزل ہے۔ لال باغ، لکھنؤ میں کرسچین مشنریوں کا مشہور شفا خانہ جس کے غیر ملکی ڈاکٹر مند توں سے میڈیکل سائینس کی جدید ترین دریا فتوں کی روشنی میں ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کا علاج کر رہے ہیں۔

نور منزل پر عنبریں بیگ یا دآئیں۔ کہ گذشتہ ماہ میاں کے ہمراہ چند روز کے لیے بندہ لکھنؤ گیا تو اہل پری محل اور ڈاکٹر منہور کا شغری سے نہ ملا لیکن سینڈی کی کوٹھی پر کتورانی صاحبہ سے معلوم ہوا ڈاکٹر بیگ بے چاری کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور وہ نور منزل میں زیر علاج ہیں۔ غالباً ڈاکٹر کا شغری کے چکر میں۔ افسوس۔

رباط گلگوں کی جانب بڑھے سبک مخروطی ستونوں والے طویل برآمدے میں کرسیاں اور مونڈھے پڑے ہوتے تھے۔ خلقت کی آمد و رفت آدھی رات کو بھری دوپہر کی ایسی گہما گہمی۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ عارف کامل کے آگے رات دن یکساں ہیں۔ عربی باجی نے کہا تھا۔ گداؤ لد عربی باجی۔ وہ تینوں بارہ نکی سے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں تھیں۔

عرین زینطے کر کے کنور کے ساتھ اوپر گئے۔ بڑی نما کمرہ۔ جو تھی تاریخ کا چاند سنہرے غزال کی طرح متحرک بادلوں میں چوڑیاں سی بھرتا معلوم ہوا، بٹلے کے نیشب میں تر و تازہ تیز ہرے شہنم آلود کھیت۔ جس سے جگر لالہ ہیں۔ جب سب سوتے ہیں خدا مریم کیساتھ خنک کشت زاروں میں ٹہلتا ہے۔ ایک یورومین کیتھولک مرٹک کا جملہ۔ انوہ۔ مارے مسٹی سیزم کے حالت خراب۔ سمندریش نرائن اپنے ذہنی اور کلچرل فریم ورک میں بدھو شوڈن کے مدھو سن کی بات کرتا ہے۔ مسلم گڈی گڈبان نورمن کو شاید بیت لحم کے چرواہوں کی یاد دلائیں۔ نیچے کیلے کے جھنڈ میں ایک بوسیدہ کنواں دکھلائی پڑا تین سید قیوم مجڑوں کے آنتار جھیل کے نزدیک ایک غازی کا مزار۔ بالے میاں کا دیں!

واپس اترے۔ مرشد بڑے ہال میں فرش پر بچھے بستر پر جلوہ افروز۔ چاء کا دور۔ عوام کی بھیڑ۔ آدھی رات کو یہ سب شہر سے یہاں کس طرح آئے۔ بسیں بند۔ رکشا میں مفقود۔ پایادہ آئے۔ میاں جب کسی جگہ پہنچتے ہیں جتنا کو آپ سے آپ کس طرح اطلاع ہو جاتی ہے۔

صبح چار بجے کے قریب باہر ایک ریڈیٹنٹ قلندر کا نعرہ حیدری سنائی دیا پھر وہ چلایا "لافتی الاعلیٰ، لاسیف الاذولفقار۔ لافتی"۔ دیو داروں میں کوئی صاحب خوش لمحنی سے مناجات کر رہے تھے۔ باغ سے آواز آئی۔ مر جاسیدی مدنی العربی۔

ناشتے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فاضل ایک نوجوان مولوی صاحب نے مستنوی مولانا روم شروع کی۔ باغ اور میدان کے اس پار کسی مغل بادشاہ کی بنوائی ہوئی تین گنبدوں والی مسجد دھوپ میں چمکی۔ اس سے لمحنی میاں کے قائم کردہ جویریہ بانی اسکول میں پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ کنور کے ساتھ ٹہلتے وہاں پہنچے "بھوگول" کی ایک کلاس میں جھانکا۔ "اس لمحنی کے ایک اسکول میں رتن ناتھ سرشار رارو پڑھاتے تھے۔ بھما سے والد کی

جریشن تک ایسے کا ساتھ بزرگ موجود تھے جو پوجا کرتے وقت کہتے تھے۔ ایک فلوئس
یک بادکش ویک صراحی بشری کرشن اپن میدہم۔ ہمارے پوتے دروائے کو درواجا
اور زمین کو جین کہتے ہیں۔ جمیلہ کو زمیلہ۔“

ہم دونوں پاپ کے کش لگاتے سر جھکائے اسکول گراؤنڈ طے کرتے رہے۔ چند
منٹ بعد کنوڑ جوش سے بولا۔ ”لیکن اردو زندہ رہے گی! مجھے منہ ہی آگئی۔ ایونپور پہنچے۔
ایک فیٹ باغ کے پھاٹک پر آن رکی۔ ایک خوش پوش سُرخ و سپید، خوب د
نوجوان اسمیں سے نکلا۔

”لکھنؤ میں آج صبح سویرے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ہمارا کمرہ اچانک میاں کے
پچوان کی خوشبو سے بھر گیا ہم سمجھ گئے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔ فوراً دوڑے“

تہجد گزار بی بی کے بصری ہیوسٹی نیشن۔ اس غیر مسلم نوجوان کے حتی۔ ہم بھی ان داہلو
میں گرفتار نہ ہو جاویں۔ سوچے اب یہیں سے گھر کی سیدھ بھریں۔ چند گھنٹے کے ارادے
سے کنوڑ سینڈی کے ہمراہ بارہ بنکی پہنچے تھے۔ اتنے دن گذر گئے۔ رجعت تہقہری۔ اس سے
قبل کہ ہم اپنی نانی دادی کے دور میں واپس چلے جائیں ہم کو بھاگ نکلنا چاہیے۔ یہ بہت
بوڑھا تمدن اپنے سینکڑا چائلڈ بڈ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہ کلچر سینا ایل ہو چکی ہے۔ ذہنی
صحت بڑی نعمت ہے جو ہم کو اب تک مغرب میں میسر رہی۔ وہ سرد، بے پرواہ، خود پسند،
مغرور دیا غیر سہی۔ لیکن ایک نہایت منظم، سائنٹیفک حقیقت پسند معاشرہ ہے۔ جیک
اندر ہمارا پرسنل کمپیوٹر ہمارا منتظر ہے۔ بیشک میرا ڈالٹا نورمن چند سال بعد مجھے نورما د
سیلی سمیت کسی بوڑھوں کے گھر میں ڈال آئے گا۔ لیکن وہ بھی کیا فرسٹ کلاس ”ہوم ہوگ
یہاں تو ممکن ہے کسی سڑک کے کنارے ہم ٹپ ہو جائیں اور رابگ پلٹ کر نہ دکھیں۔ نشتہ
خود غرضی بے حسی اور لالچ ان پر ختم ہے مگر اپنی ”روحانیت“ کی ڈھلی بجائے جا رہے ہیں۔
ویسٹ جیسی اعلیٰ ترین کمیونٹی سرد سیز اور سوک سنس اگلے ہاں اگلے سو سال میں بھی نہیں پ
ہوگا شرم آنکو مگر نہیں آتی۔ ارے ان سب کو سیاہ پوش گریک کورس کی طرح اپنے حال زار

ماتم کرنا چاہتے۔ یہ اہل مشرق کس منہ سے مغربی مادیت کو بُرا کہتے ہیں۔ دراصل ہندوستان کے متعلق کنور کی مسلسل لیکچر بازی نے مجھے بھنبھلا دیا تھا۔

جس مخقر سے فرقے سے نو وارد تعلق رکھتا ہے وہ اپنی بے پناہ انگریزیت کے لیے مشہور ہے لیکن اسکا کنبہ عرصے سے شمالی ہند میں آباد ہے لب دلہجہ کے اعتبار سے اس میں اور کنور میں کوئی فرق نہیں۔ اور نفیس اردو پراسکی زبان جاری ہے۔ دوسری شام وہ ہمارے ساتھ پہلو کے لان پر آن بیٹھا۔ کنور اور رنجن وہاں بید کی کرسیوں پر پہلے سے موجود تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ میاں کو کتنے عرصے سے جانتا ہے۔ ”پچھلی جنوری میں ہم لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے کہا میاں تشریف لائے ہیں اور تم کو بلاتے ہیں۔

”کون میاں اور ہمیں کہاں سے جانتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا سروکار۔ ہمارے رشتے دار نامور لوگ ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو ہمیشہ بیک گراڈنڈ میں رکھا۔ ہمیں مذہب اور روحانیت سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ دوست نے پھر کہا بڑی شان اور مرتبے کے بزرگ ہیں اور اپنے طریق میں یگانہ۔ اور وہ تمہیں بلارہے ہیں۔

”ہم کچھ عرصے سے شدید قسم کی نجی پریشانیوں میں مبتلا تھے لیکن انکا حل ڈھونڈنے کے لیے پیروں اور سوامیوں کے پاس دوڑنا ہمارے لائف اسٹائل میں شامل نہیں۔ دوست مصر رہا۔ دوسرے روز حضرت گنج کی ایک دو منزلہ کوٹھی پر لے گیا۔ اوپر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایک بڑی نشست گاہ میں چاء کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ ایک طرف ویڈیو چل رہا تھا۔ تخت پر بیٹھے مہمان خصوصی چند نوجوانوں سے جوڈو کراٹے پر گفتگو کر رہے تھے اور حاضرین کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑے جمال و جلال والی شخصیت رکھتے تھے لیکن اب انہوں نے کرکٹ کا ذکر چھیڑا سا تھی چپکے سے بولا۔ ”انہوں نے اسکول تو اٹھویں کلاس سے چھوڑ دیا تھا کہ یہ کتابیں ہمیں کیا بتائیں گی۔ والی بال اور شہسوار کی کے البتہ جمیں رہے۔“

”تم ہمیں کسی اسپورٹس میں سے ملوانے لائے ہو؟ ہم نے پھر چاروں طرف دیکھا۔

”چند منٹ بعد ان صاحب نے ہم پر نگاہ ڈالی اور بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ آہستگی سے کہا آپکی حاضری تو لگتی رہی مگر ملاقات آج ہوئی۔“

”ہم اور چکرائے۔ یہ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ دوسری باتوں میں لگ گئے اور ہم جیران بیٹھے رہے۔ ہماری حاضری اسکول اور کالج میں تو لگتی تھی اور کہاں لگی۔“

”سوچا کیسے۔ معاً سمجھ میں آیا۔“

”دریائے گنگا کے کنارے جہاں ہم رہتے ہیں سول لائینز کے نزدیک برگد تلے چند مزار ہیں۔ ہم چار ساڑھے چار سال کے رہے ہونگے تب سے ایک انوکھی سیکش ہر جمعرات کو ہمیں وہاں لے جاتی تھی۔ مغرب کے وقت کھیل کو دھچھوڑ کر ہم وہاں پہنچ جاتے۔ وہاں چراغ جلتے۔ لوگ آکر چلے جاتے۔ ہم ایک طرف چپ چاپ کھڑے رہتے۔ مئی ہمیں ڈھونڈنے کے لیے ملازم دوڑا تیں۔ جو ہمیں کبھی تلاش نہ کر پائے۔ کچھ دیر بعد ہم خود ہی گھر پہنچ جاتے۔ بڑے ہو گئے لیکن یہ معمول جاری رہا۔ شہر میں جہاں بھی ہوتے کسی پارٹی یا دعوت یا کسی اہم سے اہم کام کو چھوڑ کر ہم چند منٹ کے لیے وہاں پہنچ جاتے۔ آج تک ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم اس جگہ کیوں جاتے ہیں۔ ہم کو مزاروں اور ان سے وابستہ عقائد کا کچھ علم نہ تھا۔ لیکن اس مرتبہ لکھنؤ آنے سے قبل تک ہم وہاں اسبطرح حاضری دیا کیسے اور ہم نے آج تک کسی سے اپنے اس دطرے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ کیسے جانے اور ہمیں کیوں بلایا اور کیا فرماتے ہیں کہ حاضری برابر لگائی لیکن ملاقات آج۔“

”دل پر سبیت سی طاری ہوئی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ بعد میں میاں نے نہ کبھی وہ بات دہرائی نہ اسکا مطلب بتلایا۔“

”پرسوں رات، رنجن نے کہا ”میاں فرما رہے تھے کہ ملفوظات اولیاء میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض حاشیے کی گفتگو ہے۔ راز کی باتیں بتانے کا کسی کو حکم نہیں۔“

یہ شیشہ پہلی نظر میں وہ آرٹھی قسم لگتا ہے جو اس ملک کی پیکر گیلریوں اور فلم کلبوں میں پائی جاتی ہے۔ اصیلت میں ایک مہذب اور دھی برہمن زادہ — مریدین میں اور شھوڈ کس برہمنوں کی ہم نے بہت دیکھی۔ ”بھیدیم تم کیا سمجھا دین گے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

ڈھال پر بھٹکتے تالاب کا آدھا حصہ آبی درختوں میں پنہاں ہے پر لے کنارے پر
 ستادہ سستی کے سفید مکانات ڈوبتے سورج کی روشنی میں گلانی ہو گئے۔
 گویا گویا یا ایل گر کی کو کا کوئی منظر ہوا چلی۔ باغ میں یوکلپٹس سرسراے۔
 ”گلشن راز۔“ کنور نے سر اٹھا کر کہا۔

”کون چیز۔۔۔؟“ ہم چونکے۔

”ایک ایرانی صوتی کی کتاب۔ اور فیہا ما فیہا۔ یعنی اس میں ہے جو کچھ ہے۔۔۔“
 ملفوظات رومی“

”معاف کرنا ہم جب سے یہاں آئے ہیں بہت کوشش سے یہ محسوس کرنا چاہ رہے ہیں
 یہ قلعہ اسرار و رموز کا گڑھ ہے۔۔۔ لیکن ہمیں کوئی بٹسری نظر نہ آئی۔ ایک بات نے ضرور
 تعجب کیا کہ تمہارے شیخ ہر وقت اسقدر بنشاش اور شگفتہ نظر آتے ہیں“
 ”سچا صوتی مسرور و مطمئن رہتا ہے کہ خوف ورجاسے آزاد ہے“ سینڈی نے عربی باجی
 کی طرح کسے بڑے دلی کو کوٹ کیا۔

”ایک بار ازلتقا مکا تذکرہ کرتے ہوئے جرمن باجی کو مخاطب کیا۔ آپ بھی ذرا پیچھے چلیے۔
 علوم ہوا ڈال پیٹھی ہیں۔ پھر ایک صاحب کے متعلق بولے۔ انکو پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔
 اب بھی ڈال پیہ ہیں۔“

”ایک روز ہم سرکار کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ کہنے لگے سامنے سے جو کار آویگی اسکا
 ہرنوٹ کرنا۔ ہم چکراتے جانے کیا سیرس بات ہے۔ چند منٹ بعد جو گاڑی پاس سے گذری
 نکی نمبر پلیٹ کے آخری عدد ۴۲۰ تھے!“ رجن نے کہا۔
 ہم سب نے تہقہہ لگایا۔

”بیجے رانی صاحب آگئیں“ کنور بولا۔

سب تعظیمًا کھڑے ہو گئے۔ جو معمر خاتون معمولی سوتی ساری اور گرد آلود چپل پہنے خفیف
 ۔ لنگ کے ساتھ تیز نیز چلتی ہماری طرف پہنچیں وہ قطع سے رانی کے بجائے ایک مڈل
 اس بند و گربستن لگ رہی تھیں۔

”اسلام غلیکیم۔ وہ گرہیں۔ ہم اور جیران۔

”نمک رانی صاحب“ رجن نے پر نام کیا۔

”کہاں ہیں ہمارے باپ؟ سورہے ہیں؟ یا کہیں گئے۔ ہمیں انہوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ یہ دیکھو اسٹیشن سے نہ رکشالی نمبس دو کوس چلے پیدل“ وہ بڑبڑاتی ہوئی بنگلے کی طرف چلی گئیں۔

”یہ کہیں کی رانی صاحب تھیں؟ سابق؟“

”بیحد۔ ایک دم بلو بلنڈ۔“

”حطی میں؟“

”قطعی نہیں ماں کے برابر ہیں مگر انکو اپنا باپ کہتی ہیں۔ وہ ہم سب کے باپ تو میر پر اتنے کم عمر انسان کو اس لقب سے پکارنا ذرا فنی لگتا ہے۔ آئیو شو دھا کی طرح ڈانٹتی ہیں مینا بھگتی۔ یو دھا میا والی“ سینڈی نے کہا۔ ”مگر بھرت منی کے نورس اکثر رل مل جاتے ہیں“

”مشاہدہ حق کے بادہ وساغر میں کوک ٹیل“

”آسمانی باپ۔ دوست آقا۔ کھر سچین۔ میٹک۔ اسلامی۔ ایک روز مشد نے ایک قصہ سنایا۔ محمود نے ملازموں کو حکم دیا محل کے سارے قیمتی ظروف توڑ ڈالیں انہوں نے تعبیل کی۔ تب اس نے انکو بوجھا ڈالا۔ بولے۔ جہاں پناہ آپ ہی نے تو کہا تھا۔ ایاز کو ڈانٹا۔ اس نے دست بستہ عرض کی۔ غلام سے تقصیر ہوئی۔ یہ داس بھگتی ہے۔ سدا ما کی اپنے مٹر کرشن کے لیے سکھا بھگتی۔ رادھا اور میرا کی پریم بھگتی۔ دشمنی کے مضبوط بندھن والی بیڑ بھگتی سے آج کی دنیا سب سے زیادہ مانوس ہے۔ راون رام کے ہاتھوں ہلاک ہونا چاہتا تھا۔ سب سے بڑا دجھتس بھگت وہی تھا۔ ہمارے دلن بھائی کی شردھا گج۔“

بھگتی۔

سب ہنسے۔

”ہم اسوقت باسیہ رس میں ہیں۔ چار سو سبزہ نورس۔ نورس زیر بخت۔ اور آپ

موش - کچھ فرمائیے صاحب۔“ میں نے فیٹ والے نو دار کو مخاطب کیا۔
 ”ان مہاپنڈتوں کے درمیان ۶ اور آپ بھی گنوان نکلے“
 ”تھوڑی سی شدید ہے۔ پچھم کے تھوڑے خانوں کی بدولت“
 ”آپ آرٹ ڈیلر ہیں؟“

”جی“ بجکٹ بدلا۔ ”یا رکور۔ تمہارے اس بندابن میں سب رس طے الاشرنگار
 س۔ راس لیلابھی نظر نہ آئی“

”کھٹک یا منی پوری لباس مجاز میں ۶ اور شرنگار رس یہاں لے گا ۶ گھاس تو
 ہیں کھا گئے؟“

”حقیقی راس لیلاکا سبلمزم میں“ رجن گویا ہوا۔ ”نوائے سردی پر رقصاں نسائی
 وجوں کا ٹوٹل سرنڈر۔ کہ چاندنی راتوں میں ہر رقصاں گویا ایک ایک کرشن اپنے
 ساتھ ناچتا نظر آتا تھا۔ من تو شدم“

کنور بولا۔ ”رنگ اور سرادر رس۔ حرکت۔ اور تال۔ اور لے ساری کائنات۔ اور لفظ
 ابتدا میں تھا مگر یہ حرف شیریں۔“

میں نے احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔ ”اتنی آفاقیت کے بجائے محض دھاپنوری رس
 ہاریوں کی! مشگری پریم ایک پوری کتاب تصنیف کر سکتے تھے۔ بھائی ہم کو مکروہات زمانہ
 ۶ فرصت نہ دی ورنہ ہم بھی یہ مابعد الطبیعیاتی ٹوشنگافیاں کرتے۔ نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ یکساں
 ٹک اصطلاحات تلمیحات کے باوجود کرشن اور را دھا اور گویاں اور براہیڈ زاف کرابٹ۔
 راویاں کا وصال اور عرس اور گوری سوئے سچ پر لکھ پہ ڈالے تیس۔ اور یہ کہ مولانا حسرت
 ہانی سری کرشن کو اونچا عارف سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ صوفیا کا محبت کا باغ مدھیہ کال اودھ
 پریم ہارگی صوفیوں کا پریم بن اور مرگاتی اور مدھومالنی۔ دی ورس۔ قوموں
 بالکل اندرونی سائیکل پر زیادہ فرق نہیں پڑا۔ ذرا سا کریدو تو۔ ایک آخری امید
 لڑیو منزم سے تھی وہ ہو گئی فیل۔ ساری دنیا میں“

چند خدام گھاس پہ آن بیٹھے۔ ان میں سے ایک بٹو صاحب۔ نام اور انداز سے نواز دے۔

مارے ریڈیٹنٹ استاد بتایا کرتے تھے فلاں ٹھہرانے کے فلاں خان صاحب نے کون کوئی اگنیاں بس میں لکری تھیں۔ جب ان میں سے کسی کو چھیڑتے وہ ظاہر ہو جاتی۔ یعنی اس کی دآتما اپنا مخصوص روپ دھار لیتی۔

”ہمارے دادا اعش آشیا نی نے علم موسیقی پر نہایت مکمل قسم کی کتاب لکھی تھی۔ شی نوکشتور نے چھاپی۔ ہم تو محض روایات ہی سنا سکتے ہیں۔ واللہ علم بالاصواب کہتے ہیں۔ بعضے راگ راگنیوں کی خاص بندشیں اگر صاحب کمال گائے وہ چند امراض سے شفا دیتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں سے سنا ہے دلی والی دنوازاگ سے علاج کرتی تھیں۔ ہمارے بردا کی شادی میں انکا مجرا ہوا۔ سو سہی ایک نہایت خواب آور راگنی ہے۔ انہیں نے اپنی تو حاضرین جلسہ گہری نیند سو گئے۔“

”تکان اور بوریت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔“ میں نے دبی زبان سے کہا۔
”یہ آپ کی عادت ہے۔ اچھی بھلی بات میں بھس ملا دیتے ہیں۔“ کنور بڑبڑایا۔

”قاعدے کے مطابق علاج کے لیے بغیر طبلے کے گاتی تھیں۔ جھنجھوٹی اور پہاڑی رائے درد سر۔ اختلاج قلب اور صفراوی عارضوں کے لیے سندھی بھیروی میں غمیش لرب فقیر ہو ترک کیا جو ہو سو ہو۔۔۔ پھر سنا ہے خود بھی سیراگ لے لیا۔ سات حج کیے۔ ڈرن بھیے لگیں۔ اتفاقاً آتش زدگی سے بھلس گئی تھیں۔ جب یہ جبرآگ کی طرح پھیلی خاص و علوم نے بسیا ختہ کہا بی دنوازانے دیکھ چھیڑا ہو گا جو شعلہ لپکا۔

”ہمارے استاد مرحوم کا ارشاد تھا دو پہر کو کلیاں میں گائے ع آئی بہا رباغ بس بلبل نفس میں ہے۔ تو غصہ دھما ہو۔ سکون ملے۔“

”یہ تو بہت غصہ دلانے والی بات ہے۔ سکون کیسے ملے گا۔“ میں نے کہا۔

”۔۔۔ استاد سے یہ بھی سنا کہ لکھنؤ کی حیدر جان کے مانند جے پور والی نواب پائی نے بھی ایک بار ملہار سے مینہ برسا دیا تھا۔ راجہ کوڑیا کھولو۔ ان بے چاری کو کسی دن نے پان میں سندور کھلا دیا۔

”راجہ کوڑیا کھو لورس کی بوندیں گریں۔ آئی گھٹا گھٹا گھنگور رس کی بوندیں۔۔۔
کہتے ہیں اگر تیز بارش میں زور زور سے گاتے تو ملہا رک تو قابو میں کرے۔ بجلی کا دھڑکا
کڑک کا خوف دل سے جاتے۔

”ایک روز سماع پر بات ہو رہی تھی۔ میاں نے فرمایا انسان تو اشرف المخلوقات
ہے اونٹ سے بحث کیجئے کہ وہ عربی نغمے پر کیوں مستانہ وارد وڑتا چلا جاتا ہے۔“
بوند باندی شروع ہوئی۔ ہم لوگ برساتی میں جا بیٹھے۔ منجھ صاحب اب ”بھری لگری
موری ڈھر کانی شام“ الاپ رہے تھے۔

ہماری بھری گاگر بھی تو اب ڈھلکنے ہی دالی ہے۔ نجانے کس گھڑی شام کنکری مار رہی
اور ہم اس ساربان سرائے بے بنیاد سے ناس۔ معاموت کے خوف نے پھر آن دبوچا۔

بادل چھٹے۔

شام رنگ آسمان پر دھنک نکلی۔ اندر دھنس۔ بادلوں کے راجہ اندر کی کمان۔
اسکے رنگ باغ کے پھولوں میں اتر آئے۔ طرح طرح کے نایاب پھول پودے۔ میں نے
ہاتھ بڑھا کر ایک تیز سُرُخ گلاب کو چھوا۔
گلاب صوفیاء کے نزدیک حسن ازل کی ایک علامت ہے۔

ہم لوگ اٹھ کر مال میں پہنچے۔ رانی صاحبہ نذکشور کو ڈانٹنے میں مصروف
تھیں۔ ہم دو مہینے سے آنا آنا کر رہے ہیں تم نے راستے میں اتنی اڑچینیں ڈالیں آنے بھی
نہ دیا۔ اب دیکھو تم نے ہمیں لنگڑا بھی کر دیا۔“
ایک ماہر نفسیات کے حمل کے ساتھ مقبسم۔

عربی اور جرمن باجیاں مع اپنے اپنے رشتے داروں کے آن پہنچیں۔

ایک روز صبح صبح دیدی کی آواز آئی ”اسلام علیکم چاچا۔۔۔!“

”اب تو آپ کو بلائیں نہیں ستائیں؟“ سہ پہر کو باغ میں ٹہلتے ہوئے ہم نے مسکرا کر پوچھا۔
”تو بہ اب انکا نام نہ لیجئے۔۔۔ چاچا ہو! یاد ہے دھان پورا اور ہمارے علاقے کے بیچ
میں ایک تھیل پڑتی ہے؟“

”جی ہاں۔ یاد کیوں نہیں؟“
”اسمیں سے کبھی کبھی ایک ٹھو بھیروی نکلا کرتی تھی ادھی رات کو۔ اما دس میں؟“
”چڑیلین بھیروی بھی لاپتی ہیں؟۔۔۔ یا وہ عورت تو تترک سٹھپوں کی
میڈیم بنتی ہے؟“

”چاچا! دیدی نے صبر سے گویا ایک کم فہم بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا: ”جس یوگنی کی
تسیا سپھل نہیں ہوتی وہ مر کر بھیروی بن جاتی ہے۔ بھرشٹ یوگنی؟“
”اوہ۔۔۔ وہ بھیروی۔ والدہ گلو آہیر۔۔۔! یاد آیا ہماری کہا رہیں کچھ بے سرو پاقے
سنا یا کرتی تھیں دیدی سے انکی نوک لور سٹتے باور چنانے کی طرف نکل گئے۔ اندر جھانکا
پھونس کے اس عریض جھونپڑے میں عربی باجی اور چند لڑکیاں نذر کی کھیر تیار کرنے میں
مشغول تھیں عربی باجی نے پرس میں سے میسوری اگر بتیوں کا بنڈل نکالا۔
’بھئی آپ تو اس شعبے میں بہت درک رکھتی ہیں۔ یہ خوشبوؤں کا کیا سلسلہ ہے؟‘
”نادانتہ آپ نے کہا خوب۔ خوشبوؤں کا سلسلہ۔ بات یہ ہے کہ روہیں خوشبو پسند
کرتی ہیں۔“

”کھانا دانا بھی کھاتی ہیں؟“

”حضرت تو اچھے گیسو دراز بندہ نو آوزنے تو ایک جگہ حضرت ابن عباسؓ کو کوٹ کیا ہے کہ
روہیں کھانا بھی کھاتی ہیں اور صوفیا، ایک دوسرے سے ملنے بھی جاتے ہیں۔۔۔“
”نو کڈنگ۔۔۔؟“

”حضرت محمدؐ ذمہ بانیاں جہاں گشت نے تھری فرمایا ہے کہ فیروز شاہ تغلق انکے لئے خوان

لے کر آیا تھا۔ خانقاہ میں۔ ایبوقت شیخ محی الدین العربیؒ — جانتے ہیں نا آپ، وہی اسپین والے۔۔۔ وہ ایبوقت ان پر کال کرنے آگئے۔ مخدوم نے اسوقت ملنے سے معذرت چاہی۔ جب وہ چلے گئے انہوں نے ماحضر تناول فرمایا۔ بہت بے مزہ لگا۔ انہیں بڑا افسوس ہوا۔ کہ ممکن ہے ابن العربیؒ بھوکے رہے ہوں۔ آئے تھے تو کھانا کھا کر جاتے؛ نذر کی سینی اٹھاتے ہوتے کہنے لگیں۔۔۔ ”مگر ہم نے میاں سے کبھی اس مسئلے کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ چلیے آج پوچھیں گے۔۔۔“

بال کے اندر میاں اپنی مسرت پاش آوازیں کوئی حکایت بیان کر رہے تھے۔ ایک سینٹ جنت کے دروازے پر پہنچے۔ وہاں ایک بلی اور ایک چوہا پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مارے سینٹ پنے کے۔۔۔

مارے سینٹ پنے کے۔۔۔! مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ حکایت ادھوری چھوڑ کر میری طرف منوجہ ہوئے۔ دو فورسٹ آفیسر انکے فرشی بستر کے نزدیک دو زانو بیٹھے تھے میاں نے مجھے مخاطب کیا۔۔۔ ”چلیے کل رات آپ کو نیشنل پارک لے چلیں“

وہ ہمیشہ رات کو سفر کرتے ہیں۔ دوسری شب وقت مقررہ پر ہم نے نیاری پکڑی اور گاڑیوں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بہت دیر انتظار کیا۔ دوسرے ”بابہ رکاب“ اصحاب و خواتین مطمئن معلوم ہوتی تھیں ہم جھجھلا کر خانقاہ کی طرف لوٹے۔ باغ کے مصفا راستے پر تہجد گزار بی بی مل گئیں۔ ان سے پوچھا۔

”وہ تو آرام سے لیٹے سوویت دیس میں ایک افسانہ پڑھ رہے ہیں“

فوراً اندر پہنچے۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے انہوں نے ہم سے کہا: ”عجیب گنجلک کہانی ہے۔ یہ۔“

”میاں۔۔۔ وہ گیم رزرو۔“

”کل رات!“

”پر دو گرام تو آپ نے آج کا بنایا تھا۔ کل بھی چلیں گے یا نہیں؟“

کنور دروازے میں کھڑا تھا۔ اشارے سے ہمیں باہر بلایا: ”فقیر سے کبھی اسکا ارادہ نہیں پوچھنا چاہیے۔“
 ”تم لوگ انکے اس قسم کے معمول کے عادی ہو۔ ہمیں بہت کھل رہا ہے۔ بھلا کوئی بات ہے بتائے بغیر پروگرام ملتوی۔“

صبح کوچاہر کے بعد سینڈی کے ساتھ باغ میں ہوا خوری کرتے رہے طبیعت میں چڑچڑاہٹ
 باقی تھی۔ ہم درلڈ ٹریور آدمی۔ سفر حضر کے لئے منٹ منٹ کا حساب رکھنے والے طے کرنا
 تھا کہ وائلڈ لائف کی سیر کے بعد بذریعہ ٹرین دہلی نکل جاویں گے۔ وہاں سے سیدھے ٹکیو۔

محمدی باجی بڑی سادگی سے ایک پوربی سلام ننگناتی باورچھانے کی سمت چلی گئیں۔
 ”اسی عرض ہے روضے پہ تمہرے۔ آئے کے ہم ہو پڑھتے سلام اے پیارے نبی۔“
 محمدی باجی انہیں بیک وائرز کی رہنے والی برسوں سے ان گنت مہمانوں کا کھانا
 صبح شام بڑے آرام سے پکارتی تھیں۔ ساری کاپلو دیہاتی انداز سے آگے ڈالے ہمیشہ منہ منہ۔
 اسے نفس مطمئنہ!

مگر جہان سوم کے تمام غریب و مساکین مذہب کے سہارے اس طرح مطمئن رہتے
 ہیں۔ یہی سارا پرولم ہے۔ لیٹن امریکہ اور میکسیکو کے گرجا اور سنٹس کے شراہین پیمانہ اور نادا
 کینٹھولک آبادی سے پُر۔ سال کے بارہ مہینے مذہب مذہب مذہب۔ بے دین پروٹسٹنٹ
 شمال بلا وجہ ترقی یافتہ اور دولت مند نہیں ہو گیا۔

یکلخت خیال آیا نور ماہماری روپوشی کی عادی ہے مگر اس بار سوچتی ہوگی انجام کار انڈیا
 میں دھرے گئے۔ وہاں ہمارا کاروبار چوٹ ہو رہا ہوگا۔ ہم دین کی طرف مائل ہوئے یو پار
 ذہن سے نکل گیا۔ وہ بے چاری ہمیں لکھنؤ ہوٹل کے پتے پر خط پخط لکھ رہی ہوگی۔ چرچ میں ہماری
 سلامتی کے لیے تمہیں جلائی ہوگی۔ بیشتر اہل دنیا کی طرح پارٹ ٹائم ایمان رکھتی ہے۔ ہم ہول ٹائم
 بننے کے چکر میں پڑ گئے۔ ہم ہو۔

”آئے کے ہم ہو پڑھتے سلام اے پیارے نبی۔“ محمدی باجی باورچھانے کے سامنے

گھاس پڑھی آلوچھلیتی ہونی سُننا یا کیس۔ اے پیار سے نبی۔۔۔ تارے گنگن میں تمہارا نام۔۔۔

تسلیم درضا۔ یہی سرنڈر۔ مگر کا ہے کے لیے؟

ایک ہفتے سے متواتر یہی ہو رہا ہے۔ ہم آدھی رات کو رختِ سفر باندھے کھڑے ہیں اور سویرا ہو جاتا ہے۔

آج رات مرشدِ سفاری کے لیے تیار ملے۔ رنج ہمیں دیکھ کر بس پڑا۔ ”پچھلے تین چار روز سے آپ نے ان سے جرح نہیں کی تھی ناسرنڈر کر دیا۔ شاید اسی لیے“

صبح کا تین بجا تھا۔ صبارِ قارمیاں حسبِ معمول خاموشی سے اوراد میں مشغول۔ ہم پچھلی بیٹ پر۔ باقی ساتھی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن مجھ پر اب سفر سوار ہے۔ گیم ریز رو کے قریب کوئی ریلوے اسٹیشن ضرور ہوگا۔ چھوٹی لائن ہی ہے۔

کیوں نہ۔۔۔ ایکسپریٹ سروس کی ایک شاخ سینر دہلی میں کھولی جاوے۔ پٹا خد لڑکیاں اور طرہ دار چھوکرے سیاچوں کو سفاری پر لایا کریں۔ کینیا سے گرنار۔ پر یار۔ کوربٹ۔ دو دھوا۔

دفعاً میاں نے کار موٹری۔ سب چپ رہے۔ ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ دل نے کہا دلشاد علی۔ تمہارا نام خطا کاروں کے دیوان کے اندر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ تمہارے غول بیابانی نے لائین چمکانی اور تم پھر ادھر لپکے۔

شاید ہم اپنی سفاری پر کچھ کچھ تو چل پڑے ہیں۔

”آج کہیں اور گھوم آئیں۔“ اس روشن ضمیر رواں شناس نے مسکرا کر کہا۔ دوسری

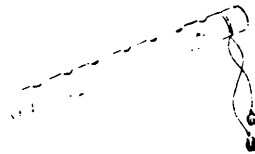
گاڑیوں کا کارواں پیچھے پیچھے لوٹا۔

ان ہی سزاہم جیسے بک گیم ہنڈ کو اپنی سابق شکار گاہ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ اسکے

بجائے، دوراقتادہ دیہات! کسانوں کے جھونپڑوں میں شب باتی۔
ایک رات ایک برہمن گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اگلی سیٹ پر شیخ کے ساتھ برہمن
سامنے دیکھتے جہاں پٹروں کی سوئی صفر کے نشان پر کبھی ہوتی تھی۔ ارادتمندان خوارق
کے عادی ہو چکے ہیں انکا تذکرہ نہیں کرتے۔ ہم بھی اب چپ رہتے ہیں۔
او۔ کے۔ سائیکولوجی اینڈ سوسیولوجی اوف ریٹی جن کے بجائے پیرا سائیکولوجی اور
پیرا سائینس —

سارے برہمن گاؤں میں دیوالی کا سا چراغاں۔ عورتوں کی ٹولیوں نے آرتی اتاری۔
بھجن گائے۔ کنور نے کہا تمہا صاحبِ وقت کی ایک پہچان یہ ہے کہ بلا تفریق ہر مذہب و ملت
کے انسان اسے بے انتہا چاہیں۔

صاحبِ وقت دراصل دو ہیں۔ ایک پورب والا۔ ایک تکچم۔
وہ اپنے آپ کو طرح طرح سے پہنچواتے رہتے ہیں۔ ایک موسم سرما میں سموری ٹوپی
اور پوسٹین پہنتا ہے۔ اور درختاں قرمزی کوکب والے حصار میں اسکا آستانہ ہے۔ دوسرا
ایک بیت الا بیض میں مقیم ہے۔ درجہ قطبیت حاصل کرنے سے قبل تماشاگر تھا۔
ان دونوں کی نوائے سرمدی پر انسانی روحیں مشرقین و مغربین میں رقصاں ہیں
مگر ناز۔ بس ذوق کہ پیش یارمی قسم۔ وہی دونوں روٹی کے نے بھی اپنے پاس رکھتے
ہیں گردھر کی مریا بھی۔ یہی ہے اصل حقیقت۔ ساری حقیقت کا مرکزی نقطہ۔ بھائی سینڈی
میں بھی نبی کی سبلمزم ہی میں بات کر رہا ہوں۔ سمجھنے والے کی موت ہے۔



(۴۲)

کلیانی ندی

ایک نازک پل پر سے گذرے۔ ذرا سی آجڑو۔ سرارٹس واٹر لوکی ”لونیگ کے کنارے“ کا
ایسا پچر ایک منظر۔ (برسوں مصوری کا پروفیشنل مطالعہ کیا تاکہ اصل اور نقل میں امتیاز
کر سکوں اور پھر ان شاہکاروں کو چراؤں۔)

دھانی دوپٹے پر ٹکے رو پہلے لچکے کے مانند چمکتی کلیانی۔ حضرت عبدالرزاق بانروی کی
ندی کہ اسکے کنارے مراقبہ کرنے والوں کو کلیان ملتا تھا۔

کلیان کی شے ہے ہر جگہ جنگل الفاظ کے معانی تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ وہ جگنوؤں
کی طرح چمک کر پھر اندھیرے میں بچھ جاتے ہیں۔

گنگ و جمن اور چناب درادی ان لوگوں کے خون میں بہتی تھیں جنکو اب ڈارٹ اور
موتل اور ٹرنیٹ اور کینیٹ کے کنارے کلیان

حضرت عبدالرزاق بانسوی کی ایک بہنہ زادی سوربون میں تعلیم یافتہ اپنی اولاد
کے ساتھ نیویارک میں رہتی ہیں، گھر آئی ہوئی تھیں۔ دالان میں منتظر۔ اور بہت سے لوگ
سب چشم براہ۔ ایک تہمد پوشش چوگوشیہ ٹوپی والے باریش جواں سال نفر ایک در کے
نیچے مونڈھے پر بیٹھے سبچ پھیر رہے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب، چاء۔“ چھینٹ کی شلوار قمیص میں ملبوس ایک گوری چھری
سی لڑکی نے پاس آکر ان سے دریافت کیا۔ یہ صاحب غالباً ہومیو پیتھیائی۔ یو۔ ایم۔
ایس حکیم بھی تھے۔ اپنا سفری بیگ فرش پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ راستے بھر چھینکیں
آیا کیں۔ ڈاکٹر صاحب نزلے کی دوا عنایت ہو،

”سوری! میں دوسری قسم کا ڈاکٹر ہوں“

”اسلامیات؟ علیگنڈھ؟“

”فنونولوجی۔ سوربون“

چھریری لڑکی چاء کی ٹرے کتھیری انروٹ کی مینر پھر رکھ کر واپس گئی۔ میں لوگوں کو چند سکنڈ میں بھانپ جانے کا ایکسپرٹ ہوں ابھی ابھی دھوکا کھا چکا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں قیاس آرائی ضروری نہ سمجھی۔ اس وضع قطع اور رنگ روپ اور انداز کی پتچیاں یہاں یو۔ پی میں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ شرمیلی، مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ موڈب، سگھڑ، دیندار۔ دیہ لڑکی برابر زیر لب درود شریف پڑھ رہی تھی۔ ذرا زیادہ ہی دیندار تھی، اس قسم کی کرامت حسین یا علیگنڈھ میں پڑھنے والی سیدھی سادی بھارتی مسلم لڑکیوں کی پاکستان کی میرج مارکیٹ میں بہت مانگ ہے۔

ڈاکٹر اف فلاسفی نے نیچ جیب میں ڈالی۔ تقریبی انگشتیوں سے لدی انگلیاں چہرے پر پھیریں۔ میزبان سگیم صاحبہ نے مہری کو پکارا، انکی اولاد کلیانی سے ہڈسن۔ بیہونی جی سوربون کو مع فنونولوجی مسترد کر کے سین سے کلیانی۔ اٹھارویں صدی میں واپس؟

اب انہوں نے جیب سے انگریزی کا قرآن شریف نکالا میرا استعجاب دیکھ کر ہنس پڑے ”آپکو مزید پریشان رکھنا نہیں چاہتا۔ دراصل میں نے جس کلمہ میں جنم لیا اسمیں سنیا س کی پر م پر ابھت قدیم ہے۔ ایک آسٹریلین یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا۔ اچانک جی اچاٹ ہو گیا۔ مذاہب کی اسٹڈی شروع کی اس طرف بہت کشش معلوم ہوئی۔ سوا ڈھڑ آ گیا۔ چند سال مدھیہ پریش کی درگا ہوں میں بتائے۔ حسین ٹیکری پریش ارت ہوئی کہ میاں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ انکا نام نہیں بتلایا گیا، صرف شبیہ نظر آئی۔ کئی بار۔ وہ ذہن سے نکل گئی۔ پھر بھٹکا پھرا۔ ابھی پچھلے مہینے کسی نے انکا نام پتہ بتلایا۔ اثر پریش آیا۔ خانقاہ پر پہنچا معلوم ہوا سفر پر گئے ہیں۔

فلاں تاریخ کو شاید اس قصبے میں پہنچیں، اس کو ٹھی میں آکر اتریں گے۔ آپ لوگوں کی آمد سے کچھ دیر قبل ہی بس کے ذریعے یہاں آیا۔۔۔۔۔ سب ہدایت اللہ کی طرف سے ہے حضور کا سینڈ کر رہے ہیں، فونمونولوجی کے ڈاکٹر نے بڑی سادگی سے بات ختم کی۔ ان حضرت نے دور حاضر کے دماغ کو چھٹی دیدی اور سترھویں اٹھارہویں صدی کے خوابیدہ ذہن کو جگا کر شانتی پا گئے۔ وہ مشرقی ذہن جو سوال کرنا نہیں جانتا تھا۔

رات - وسیع پختہ صحن میں کسی میڈیول کارواں سرائے کی ایسی چہل پہل - دیوار کے نیچے چولہے سلگاتے جا رہے تھے۔ محمدی باجی کی آواز آئی — لُچیا۔۔۔ اے لُچیا بیٹا۔۔۔
”مومن تو۔۔۔ ابھی آئے۔“

دوبارہ دھوکا کھلایا۔ وہ لڑکی ایک چولہے کے پاس بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی۔ سگریٹ کے لئے ماچس لینے کے بہانے قریب جا کھڑا ہوا۔ بیوقوفوں کی طرح سرکھایا — اس نے پوچھا۔ راجہ صاحب خاکینہ پسند کرینگے یا چاند تارا؟ مجھے حیران پریشان دیکھ کر صوفی جی کی طرح وہ بھی مسکرائی۔ ”راجہ صاحب۔ تشریف رکھیے۔ وہ مونڈھالے لیجئے۔ آپکو قلعے پر دیکھ چکے ہیں۔ جس روز آپ لوگ ڈوہوا جا رہے تھے ہم اسی شام لکھنؤ سے پہنچے۔“
”قلعے میں بھی ہم زیادہ تر باور چینیچا نے ہی میں رہتے ہیں۔ آج دوپہر کی بس سے یہاں آئے۔ تاکہ آپ لوگوں کو جو این کریں“

”صاحب ہم بروکن ہوم کی اولاد قطعی نہیں ہیں۔ ہمارے ماں باپ دونوں میلان میں یونیورسٹی پروفیسر ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش۔“
”والدہ یہودی ہیں۔ نہیں ہم مسیحی بھی کبھی نہیں بنے۔ اسکی ہمارے مزاج میں گنپائیش نہیں تھی۔ ہمارے ایک چچا جیزو ویٹ فادر ہیں۔ کسی افریقی مشن میں۔ ہم بھی بہت کچھ کیتھولک تھے۔ ہندوستان سیر کرنے آئے۔ گھومتے پھرتے ترانی پہنچے۔ اور بالکل اتفاقاً قلعے“

”خوب جت بھری!“

”جت ہجی نہیں۔ رفتہ رفتہ۔ اٹلی سے ہر سال آنے لگے۔ مہینوں رہے۔“
 ”اتنی سلیس باجا اورہ اردو۔۔۔“

”آپ سات آٹھ برس اٹلی میں قیام فرمادیں تو اسی روانی سے اٹیلین نہیں بولنے لگیے گا؟“

”آپکی تو شخصیت ہی بدل گئی!“

”میاں کی بہنوں کا اثر ادرانکے ہاں کا پاکیزہ ماحول۔ ہمیں یہ طرز معاشرت پسند ہے ہر لحاظ سے محفوظ سا بھی ہے۔ اور صاحب رہی شخصیت کی تبدیلی۔ تو اگر آپکو اردو میں گفتگو کرتے نہ سنا ہوتا تو اٹلے ہم آپکو اٹیلین سمجھتے!“

میری کھوکھلی ہنسی۔ بیشک دنیا خربوزے کا کھیت ہے مگر مافیا کے سٹیلین نثر ادر افراد کارنگ اتنا واضح؟

”آپ کے دوست سینڈی صاحب دکھلائی نہیں دے رہے۔“

”لکھنؤ گئے۔ کل آجا دیں گے۔ سینورا۔۔۔ سینورینا۔۔۔ ایک بات نے مجھے اور اکثر متعجب کیا۔“

”آپ بہت حیران ہونے والی روح معلوم ہوتے ہیں!“

”سو تو ہے! لیکن حیرانی یہ کہ ویٹ میں گوری جو گین ہزار ہا نظر آرہی ہیں آپکی ایسی

خواتین اکا دکا۔۔۔“

”اسلام کانیکٹیو ایج۔۔۔“ لوجیانے لوجیوں کے لیے پھرتی سے پڑے کاٹنے شروع کیے۔

”اور یہ مذہب جو ڈیوکر سپین ٹریڈیشن کے کافی نزدیک ہے۔ اور کرفل نہیں۔ اور سخت گیر۔۔۔ یونو ووٹ آئی مین۔۔۔“

”علاوہ ازیں۔۔۔ انڈک مذاہب ویسٹرن درلڈ ویو سے استفادہ حاصل پر ہیں اور

بالکل مختلف۔ متضاد عناصر ہمیشہ ایک دوسرے کو اٹریکٹ کرتے ہیں۔ اور انکے فلسفوں میں

لوج بہت ہے۔

” علاوہ ازیں۔ انڈیک مذاہب کے فارن مشن اسقدر کے ویل اور گناہیں ڈھیں انکا لڑ پچراتے سہلے سے شائع ہوتا ہے دنیا کی ہر زبان میں۔ آپ لوگوں کو اپنے آپس کے سیکٹیورین جھگڑوں ہی سے فرصت نہیں۔ شروع شروع میں“ اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا ” مجھے لکھنؤ کے شیعہ سنی تعصب اور بلووں نے سجد بد دل کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اسلام از اے سیک ریلی جن۔“

— سراٹھا کر مجھ پر نظر ڈالی ” آپ لوگ موڈرن ویسٹ کی زبان میں — ویسٹ کی تجسس روح سے کیونٹی کیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ اور باہر بھی۔ کٹر پنہتوں کے ہاتھ میں —“

چولہے کی دوسری طرف پر چھائیوں میں چھپے نواب منجوتھے کے لیے کویلے دہکار ہے تھے۔ فسانہ عجائب کا ایک پراسرار سا کردار۔ ویسٹ کی تجسس روح سے یہ صاحب کیونٹی کیٹ کر سکتے ہیں؛ میں نے سوچا۔ افسوس کہ دارالاسلام کے لوگ باقی دنیا کو بارہین ہی سمجھا کیے ” اتنی تمباکو نوشی پیر کھجیا کر میں نے اظہار خیال کیا۔“ صحت کیلئے مضر ہے — اتنے سگریٹ۔ دن بھر میں چالیس پچاس چلیں —“

” جی ہاں۔ کوئی شخص اتنی چلیں نہیں پی سکتا۔ لیکن حقہ نوشی سرکار کا ایک نوع کا ذکر ہے؛ کوٹلوں پر پنکھا جھلتے جھلتے انہوں نے مجھے مخاطب کیا ” جناب والا ہم بھی سیدھے ہو گئے۔ فرعون بے ساماں بنے گھوما کرتے تھے۔ بددماغ۔ خود پسند۔ جتنا بڑا یہ مکان ہے اتنا بڑا ہمارا ایگو تھا۔ اگر آپ انگلش ایکسپریشن استعمال کرنے کی اجازت دیں۔ ہم جیسے لارڈ آدمی — اب چلیں بھرنا اپنے لیے باعث فخر جانتے ہیں“

” ربانی یوزرے کا ارشاد ہے —

” لارڈ شپ آدمی کو دفن کر دیتی ہے۔ ریلٹی کی خاک بھی مہلک ہے۔ امارت کا مطلب ہے اقتدار سے محبت۔ لیکن جو شخص علم حاصل کرنے میں کوشاں ہو اسے کبھی نہ روکو امیروں اور حکام وقت سے ہمیشہ احتراز کرو۔“ لوجیانے کہا۔

لارڈ آدمی — لارڈ — کچھ یاد آیا۔

”نواب صاحب سنا ہے آپ کا نام موسیو سے بگڑ کر منجھو ہو گیا بقول ڈاکٹر کاشغری“

”ربائی یوزر سے نے ربائی یوحنا بن زکائی سے سنا۔ ربائی یوحنا نے ربائی خلیل
— اس نے —، ”لوچیا گھنوں پر ٹھوڑی ٹکائے دہرا رہی تھی“ نام — الفاظ —
ہورات انکے ایسوسی ایشن — سب رفتہ رفتہ بدل جاتے ہیں —“

ڈاکٹر صاحب اس قسم کی تحقیقات بہت کرتے ہیں۔ لکھنؤ یورپین کلچر کا اثر —
سیو سے منجھو۔ کولینز سے کلن۔ لارڈ سے لڈن —

نواب منجھو صاحب جلم لیکر لگناتے ہوئے روشن دالان کی طرف پیک گئے۔

دایس آگرا ایک گرسی پرفسور دکش ہوئے۔

ادپر تاروں پر نظر ڈالی۔

کرسی کا ہٹھا بجانے لگے۔ جمائی لی۔ ”ملاحظہ کیجئے۔ اصل چپن ڈیل صاحب آج
اسلم آرائش بھنڈی بازار یا کرخندار اسٹائل کہلاتی ہے تو خون کے آنسو روتا ہوں۔“
”نتی ہندو KITSCH بھی یہاں گھوم کر کافی دیکھی“ میں نے جواب دیا۔ ”ملاں ہوا۔“

آنکھ میں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ توالوں کی ایک پارٹی دالان کے ایک گوشے میں
ی پر جا بیٹھی۔ یہ ملت پیرمناں ہے۔ یہ ملت —

”دیکھیے کتھر محنت کش عوام یہاں جمع ہو گئے۔“ نواب منجھو نے کہا۔

”صوفیوں نے ایسیٹلٹمنٹ کا ساتھ کب دیا تھا؟“ لوچیا نے پوچھا۔

”پچھلی بار جو یہاں بھی آئی تھی پورے پورے ضلعے پانی میں ڈوب گئے۔ بڑی بابا“

سامعین داستان گو کے گرد جمع ہو گئے۔ میں وہاں سے اٹھا۔

سارا وقت ایک ہے۔ قرآنی وقت۔ آن واحد۔ خدا کے نزدیک سب ”آج“ ہے۔ زاد سزا جاری ہے روز قیامت بھی ہے۔ اینوالا نہیں۔ موجود ہے۔ پھر برمی سی آئی۔ لوجیا ن تالمودی ربائیوں کے نام لے رہی تھی وہ کہیں گئے نہیں۔ ابن العربی ”مخدوم جہانیاں“ لے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ ایک مرید بتا رہا تھا اکثر جب میاں رات کو اپنے جد کے قبر سے کے اندر تشریف لے جاتے ہیں دوسرے اولیا بھی وہاں آتے ہیں۔ آج کی شک میں ملبوس، ایک دو کلین شیو۔ دماغ چکرا جائے گا۔ زیادہ کرید نہ کرو۔ خاموش

صاحب معاملہ خود پر داز کرتا ہے۔ وہ فصل پہلے کاٹ چکا ہے۔ پھر سے بوتا ہے۔ لقی کی مردوریت سے نہ مردودیت ہے نہ خلق کی مقبولیت سے مقبولیت۔ اور کیا کہا تھا۔

کوٹھی کے پچاس کمروں میں سے بیشتر بند پڑے ہیں۔ نجلی منزل میں لوگ جمع ہیں۔ وپہر کاسٹ ٹائٹا۔ میں ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں جا نکلتا ہوں۔ حاجی وارث علی شاہ کا پورٹریٹ۔ پرانی وضع کے بریکٹوں سے آویزاں ہے۔ شدان پریڈنی خاندانی تھا ویر۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل اؤکسفرڈ میں زیر تعلیم ایک جوانمگ۔ وار پر ایک گروپ نوٹوگراف میں ساتے اور سفید ٹوپ پہنے میمیں اور چھوٹی چھوٹی بچھوں والے انگریز۔ ۱۹۰۷ء موڈل ”ڈبل فنٹن“ موٹر کار کے سامنے استادہ شکاری تصور دہلی دربار ۱۹۱۱ء کی۔

جاپلنگ روڈ لکھنؤ کا ڈرائنگ روم آنکھوں میں گھوم گیا اور دل سچپن ہوا۔ کیوں؟ اہ محواہ۔ مجھے اُس دقیانوسی بوسیدہ کوٹھی سے بہتر مکانات اور اُس پرانے دھرانے سے بہتر اور کہیں زیادہ بیش قیمت ساز و سامان بعد میں میسر آیا۔ امحض پرانی چیزوں چٹے رہنا کس قسم کی مریضانہ نفسیات ہے؟ پھر بھی آنکھیں بھرسی آئیں۔

باہر جانے کے لیے پلٹا تو ایک معمر بی بی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے پوچھا: ”بھیا آپ — دھانپور کی خیر النساء، کیم کے عزیز تو نہیں —؟ چھوٹی ٹھکرائیں صاحب —“

”ہماری والدہ تھیں“

عرصہ دراز بعد کسی نے مجھ سے میری ماں کی بات کی تھی۔ انکا نام لیا تھا۔ یہ اجنبی بی بی مجھے ایک سجدنا دار اور قابل قدر سستی معلوم ہوئیں۔ یہ میری ماں سے واقف تھیں۔

”آپکو تو یاد نہ ہونگی“

”یاد ہیں“

انہوں نے درد مندی سے مسکرا کر سر ہلایا پھر دو چار باتیں کر کے باہر چلی گئیں۔

میری ماں۔ نازک نازک گوری سی۔ بادامی سلک کا غرارہ۔ سفید لیس کی قمیص۔ بایوں میں چنبیلی کے پھول۔ آپ رداں کا دھانی دوپٹہ۔ پچکاٹکا۔ کلیانی ندی۔ رنگین پاپوں والی پلنگر ٹی پڑی تھی ہیں۔ چاندی کی پٹاری کا بڑا سا گنبد نما ڈھکن کھلا رکھا ہے۔

اباکی گرجدار آواز — سنتی ہیں۔ آپکے صاحبزادے پھر پتے کھیلنے پائے گئے۔ اماں اماں آپکے نام کا کیا مطلب ہے؟

حضرت بی بی کا لقب ہے بھیا۔ ارے ہماری بانی کہاں گئی —؟ دیکھیے دیکھیے بالوں میں تو نہیں الجھ گئی۔

نہیں باؤں میں بھی نہیں — ابھی ابھی تو —

یہیجے۔ اماں۔ ہم تو اپنے ہاتھ کی صفائی دکھلا رہے تھے۔

بھیا تم نے کب اتار لی ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔

آنکھیں زرد سے مچھیں۔ پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خالی کمرے سے باہر نکلے۔

تیسرے پہر تک قریبی اضلاع کے مزید کنبے خانوادوں کے افراد۔ یہ ایک عجیب نٹ درک تھا۔ اور پہلے کی طرح آج بھی جوں کا توں موجود۔ فرق محض اتنا تھا کہ انکی برقعہ پوش یا بے پردہ لڑکیاں اکثر پی۔ ایچ۔ ڈی بوجیا انکے ساتھ گھلی ملی نظر آرہی تھی۔

”سدا سہاگن ابھی بتا رہے تھے حضرت اکمل شاہ کہنے لگیں۔“ ”لوچیا کسی سے مخاطب ہوئی۔“

”سینورینا اردو اتنی سلیس بولتی ہے مگر تندرانیٹ میں اب بھی گڑ بڑ جاتی ہے۔“ میں نے ڈاکٹر آف فنونولوجی سے کہا۔

”سدا سہاگن کو آپ ابھی دیکھ لیجئے گا اکمل شاہ صاحب ایک احرام پوش دار ثنی فقیر ہیں۔ بیحد خوش شکل۔ مرید بناتی ہیں۔“

”خاتون پیر۔!“

”جی ہاں۔ لیکن عورتوں کے لیے بیعت لینا جائز نہیں۔ دار ثنی فقراء نے بھی انکو احرام باندھنے کی اجازت نہیں دی تھی ایک نے دی۔ بڑا زبردست کیمپ انکا یہاں لگتا ہے۔“

— موٹروں کی قطاریں۔ اپنے آپ کو شاہ صاحب کہلواتی ہیں۔“

”ویمینز لیب والیوں کو خوش ہونا چاہیے۔“

”کیوں خوش ہونا چاہئے؟“ ”لوچیا نے بحث کی۔“ ”کسی بھی لائین میں اپنی شخصیت منوانے کے لیے مرد کا استعارہ اختیار کرنا ضروری ہے؛ جارج ایلیٹ اور جارج سینڈ سے لیکر آجنگ؟“

پائل کی جھنکار۔ ایک طویل القامت فرد سرخ لہنگا۔ ہری اور ہنی۔ چھم چھم کرتے الاں میں داخل ہوتے۔ درسی پریٹھ گئے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

”یہ وہ نہیں ہیں جو تم شاید سمجھ رہے ہو۔“ سینڈی نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر آف فنونولوجی کو حکیم صاحب سمجھا۔ اطالوی لوچیا کو قصباتی مسلمان بیٹھا۔ اب تیسری بار دھوکا کھانے کو تیار نہیں۔

”یہ ایک قابلِ تعظیم بزرگ ہیں۔ جیمن ٹیکری سے ہر سال یہاں آتے ہیں، سینڈی نے مزید اطلاع دی: ”حضرت موسیٰ سہاگ کا سلسلہ“

”دیکھنے والیوں کو مسرور ہونا چاہئے کہ ایک گروہ نے عورت کا استعارہ اختیار کر لیا۔ کیوں صاحب؟“ میں نے لوجیا کو نا تھانہ انداز سے مخاطب کیا۔ وہ ہنس پڑی۔

ماتھے پر سونے کا ٹیکہ۔ ناک میں بھاری بلاق اور تھکے۔ کلائیوں میں سبز کانچ کی چوڑیاں سونے کے ٹھوس کٹرے۔ گلے میں ٹھسے۔ چمپا کلی۔ چندن ہار۔ سر پر گوٹے لچکے کا دوپٹہ۔ چہرے پر داڑھی۔ درمیانی عمر۔ خوش خلق۔ سدا سہاگن آلتی پالتی مارکر فرش پر بیٹھ گئیں۔“

”شاہ صاحب۔ حافظ پیاری کا کلام سُنائیے،“ سینڈی نے فرمائش کی۔

”اچھا ذرا تلک پہن آؤں۔ ابھی آتی ہوں۔“

اٹھ کر جھم جھم کرتی زینے کی سمت چلی گئیں۔

”تلک لگاتے ہیں یا پہنتے ہیں؟“ میں نے سینڈی سے پوچھا۔

”پیشوا کی ایک قسم۔ جوزیور۔ ناک میں پہنا جاتا ہے اسے چھاپ کہتے ہیں۔“

چھاپ۔۔۔ تلک۔۔۔ چھاپ۔۔۔ تلک۔۔۔ میں نے کچھ یاد کیا۔ ”یار یہ تو امیر خسرو والی وہ مشہور تو آئی ہے۔ چھاپ تلک سب چھپنی موسے نہا لگائے کے۔ یہ سلسلہ جب سے چلا آ رہا ہے؟“

”کہتے ہیں امیر خسرو کے زمانے میں ایک صاحب نے جتنا کہ کنارے آیا۔ بندہ وحید سنی ہوتے دیکھی تو انکو خیال آیا کہ ایک کمزور عورت ارضی خاوند کی خاطر جسم ہوسکتی ہے تو۔۔۔ ایک روایت ہے کہ حضرت موسیٰ سہاگ عورتوں کی مزاروں پر حاضری کے مختار تھے جب تنہا ہوئی بطور پریکچت خود زنا نہ پوشاک پہننے لگے۔“

اس قسم کے معاملات کے لیے یہاں کتنی فرصت لوگوں کے پاس ہے۔

ذہن کہیں اور نکل گیا۔ دلواراجین مندر کوہ آلو کی مرمریں فریسکو۔ اجنتا اور

بارغ کی دیواری تصاویر۔ قدیم اور میڈیول ہندوستان برتھ۔ بیل گاڑیوں میں سوار تاجر۔ گھوڑے کی نعل نما محرابوں کے نیچے سے گذرتے بڑے پنکھے سنبھالے جلوس جھروکوں سے جھانکتی عورتیں۔ رنگین گول ستون۔ پیڑھیاں۔ گج راج۔ ہر چیز جامد۔ بھاری۔ شانت۔ ناک میں موٹے زیور پہنے دکن اور گجراتی مینا توروں کی بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں۔ وسط ہند کی ان ”سدا سہاگن“ کو دیکھ کر مجھے وہ مینا تو رکیوں یاد آ رہے ہیں۔ مصوری اور سنگتراشی کا ”پرفیشنل مطالعہ“، کبھی اس نظریے سے نہ کیا تھا کہ ۱۹۸۲ء کے ہندوستان میں انکے اور بچنل دکھلائی دے جائینگے۔

”یہ بہت بڑی آزمائش ہے“، کنور کہہ رہا تھا ”چالیس سال سے یہ شاہ صاحب سدا سہاگن بنے ہوئے ہیں یہ مسلک اختیار کرنے سے پہلے دو بیویاں رکھتے تھے دونوں کو طلاق دیکر انکی شادیاں کر دیاں۔ بہت بڑی آزمائش ہے۔ تمام عمر خلق خدا کی ہنسی مذاق کا نشانہ بننا۔ ملامت کے تیر سہنا آسان بات نہیں“

”مگر کیوں —؟ آخر کیوں؟ اسکی ضرورت کیا ہے؟“

”انسان اپنے انتخابات میں خود مختار ہے“

”بھئی کیتھولک راہبات، برائید زاف کرائسٹ، کہلاتی ہیں نن بننے کے لیے سفید ویل پہن کر باقاعدہ مع انگلشٹری چرچ میں انکی شادی، جیزس سے کی جاتی ہے۔ وہ خود عورتیں ہیں یا۔ بٹ دس ازویرڈ“

مجھے لگا میں ہیون ساگ یا ابن بطوطہ ہوں اور اسی پرانے ہندوستان کے عجائب و غرائب کے مشاہدے میں مصروف۔

سدا سہاگن زر دتلیک پہن کر واپس آئیں۔ ڈھولک سامنے رکھی گانا شروع کیا۔ ایک قباپوش لڑکے نے آنگن میں کھڑے ہو کر زور کا نعرہ لگایا — حق اللہ۔ حق حق حق۔ پھر اس نے اڑنگ بڑنگ تقریر شروع کر دی۔

”اس لڑکے کو دیکھ کر ہمیں شاہ دولہ کے چوہے یاد آتے ہیں“، میں نے ایک نی مہمان سے کہا۔

”جی ہاں۔ شکلاً۔ لیکن یہ بڑا ذہین لڑکا ہے۔ کہتے ہیں اسے بھیڑیوں نے پالا ہے۔ میاں کے یہاں آیا بول نہیں سکتا تھا اب انٹ سنٹ تقریریں کرتا ہے۔ لوگ اسے ہونی نوئل سمجھتے ہیں“ نواب منجھ نے بتلایا: ”اگر آپ غور کریں تو اسکی بظاہر نون سنس کے اندر ایک بنیادی ربط ضرور ہوتا ہے؟

”واقعی؟ میرا تو خیال ہے وولف بوائے ایک کامیاب موڈرن کرٹیک بن سکتا ہے“ ٹوچیا نے کہا: ”راجہ صاحب اسے اپنے ساتھ امریکہ لے جائیے۔ ہٹ گرو بھی ثابت ہوگا“

”ہم تو پھر کہتے ہیں اکتوبر نومبر تک رک جاؤ۔ دیوے شریف کا عرس کر کے جانا۔ میوزک کانفرنس۔ مشاعرہ۔ روز روز اسطرف کب آتے ہو۔ تیس سال بعد اگلے سے آئے اب مزید تیس سال بعد کی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔“ کنور نے کہا۔

دیوہ شریف کی میوزک کانفرنس کا ذکر چھڑا تو منجھ صاحب نے اپنے ریڈیڈنٹ استاد سے سُنی ہوئی چند حکایات گوش گزار کیں۔ صوفی منس سہگل کو جہوں کے ایک شاہ صاحب کی اشیرداد حاصل تھی۔ اُستاد اللہ دے خاں نرت میں ایک آنکھ سے روتے۔ دوسری سے اظہار مسرت۔ ممتاز علی صرف ایک گھنگرو بجاتے۔ بندو کہ چاندی کے جھولے پر پڑھی رہتیں، باہر مسلح سوار کا پہرہ، سنگیت کی بڑی پنڈتا تھیں۔ ”پنجاب گھرانے کی بانی بھی ایک گئی عورت تھی۔ گورکھی بانی۔ بہار کی ڈھیللا بانی یوریشین تھیں اصل نام میری۔ ڈسٹرکٹ کلب میں انگریز افسروں کے ساتھ ٹینس کھیلتیں۔

جرمن باجی بولیں۔ ”ہماری میراٹین بھی اپنے گویے اور مرثیہ خواں مردرد سے کم گئی نہیں۔ گو وہ کسی میوزک کانفرنس میں نہیں گاسکتیں۔ بیگمات کی محفل ساز بجاتی عورتوں کی مغل راجپوت تصاویر جیسے مناظر ہمارے زنا نجانوں میں اب تک

”گھونگٹ کا ناچ۔۔۔۔۔“ مجھے یاد آیا۔

”جی ہاں۔ اسے دوئی اللہ میں کا ہے کو بازار گئی تھی۔ اور نہستی کے وقت ہمار نوروزی میراٹن اندر بابل چھیڑتی ہے عین اسی لمحے باہر سینس کا پردہ تھامے اُسکا۔“

وہی بابل شروع کرتا ہے۔ صدیوں کی پریکٹس کا پرفیکشن۔ لیکن نوروزی کا پوتا کمینک من گیا ہے خود کو میراثی کہلوانا پسند نہیں کرتا۔

”شادی بیاہ عید بقبر عید موسمی پرندوں کے مانند نمودار ہو کر چڑیوں کا صدقہ اتارنے والی ہندو چڑھیار عورتیں۔ بسنت بچھی پرگیہوں کی تازہ بالیاں سنبھالے ہمیشہ دلبر سجان الاپتی میراثیں۔ نویں محرم کو دہے روتی بجا نہیں۔ اس قصباتی تمدن کو بھی سیاست اولی و شیرن عنقریب ہڑپ کر جائیگا“

”لیکن صاحب ہم خوش ہوئے کہ ہمارے کے ہاں کی ایک میراثن آپکے ہاں مشہور ٹی وی اسٹار بن گئیں۔“ نواب منجوں نے سرحد پار سے آئے مہمان کو مخاطب کیا۔ پھر مجھے ”استاد کبیر کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ حال ہی میں۔ میری پت راکھ لیجئے شیخ سلیم حشتی اور۔۔۔ توڑ پہاڑ خیر اکھاڑا، نواب صاحب دھرد گنگنائے۔۔۔ رت، من رت حیدر کونام۔۔۔ اور ایک گذشتہ مہاراجہ بنارس کا بنایا ہوا دھرد پھیر دیں۔ پیارے ہوالد کے۔۔۔ نواسے نبی کے۔ علی کے جگر بند۔ کاشی کے راجہ کے کاٹھ پھند۔ ایک سابق راجہ صاحب استاد کی سنگت لکھا و ج پر کر رہے تھے۔ تب ہم سوچے کاش ساری دنیا کی حکومتوں کی پالیسی فنکار بنایا کرتے تو یہ خون خرابہ نہ ہوتا!“

میں نے عرض کی ”حضور رنکیلے پیا اور آخر پیا دونوں کی حکومتوں کا انجام آپکو معلوم ہے اور جان عالم نے تو ساری عمر ایکونماز فجر قضا نہیں کی“

ایک اجنبی بڑھیا دلاپتی سوٹ۔ قطع سے اعلیٰ ایکڑ کیٹو۔ دکھ سے بوئے۔ ”توسنگیت اور رام نام میں کوئی شکستی نہیں“ گوئے بارود سے زیادہ؟ میں نے سوال کیا۔ ”عربی باجی کہنے لگیں“ ”آپکو کیا پتہ منجوصاحب کہ اقتدار حاصل کرتے ہی فنکار لوگ کیا کریں گے؟ فلاں بانی اور فلاں کنور نے تو ایک پوری سلطنت اکھیٹڑ بھینکی۔ ہم تو جانتے ہیں کہ زیادہ تر کلاکاروں کے دماغوں میں واٹرٹائیٹ خانے ہیں۔ ایک میں انکا ٹیلٹ۔ باقی خانے عام انسانوں جیسے۔ یا خالی۔ اور راجہ صاحب ہم نے آپکے ویٹ میں

بھی اکثر مصوٰر غنّی پائے۔ اور بول رہے ہمارے ادیب اور شاعر لوگ۔ پہلے بھی حکمرانوں کے
 قہیدے اور ایک دوسرے کے خلاف بچو لکھتے تھے اور آج بھی۔۔۔۔۔“
 ”سب نہیں۔۔۔ سب نہیں“ اہلبی، بُرا مان کر۔ جوش سے۔
 ”تیس برس بعد“ میں نے منجو صاحب کے کہا ”واپس آکر آل انڈیا ریڈیو سنا تو تعجب
 ہوا۔ بے شمار پاکستانیوں کے فرمائشی ریکارڈ روزانہ۔۔۔۔۔ ادھر سارا ہندوستان
 ہم نے دیکھا کہ پاکستانی موسیقاروں پر ٹوٹا۔ اسکے باوجود کیا دونوں طرف ایک دوسرے
 کے لیے شدید بدگمانی اور تلخیاں برقرار نہیں ہنواب صاحب۔ محض فنونِ لطیفہ اور
 ادب قومی روئے اور حالات بدلنے کے لیے کوئی کمیائی اثر نہیں رکھتے“
 لوچیا جگ اٹھائے گویا ”لاڈو ناء مویلے“ کی دُھن پہ رواں سامنے سے گذری۔
 ”سرکار کے لیے تازہ پانی“ میں اٹھ کر صحن کے پچھوڑے کنویں پر پہنچا۔

یہ بڑی پرفضا جگہ تھی۔ شہتوت، انجیر اور فالسے کے پیڑ۔ گلہائے زنگارنگ۔ کسی
 مغربی شاعر نے کہا ہے کہ راگوں جیسے متناسب پھولوں کے اصل نام باغِ جنت میں
 محفوظ ہیں۔ پرند خیالات کے مانند کبھی آسمان کی سمت اُرتے۔ کبھی نیچے آجاتے ایک
 ڈالی سے دوسری۔ یا چکر کاٹتے۔ انجیر کی چھاؤں میں ہرے پتوں کے گویا دل بادل کے
 نیچے ایک راگ دھاری جھینگر کی تانیں سُنائی دیں۔

لوچیا جگ منڈیر پر رکھتے ہوئے بیترس کی تصویر نظر آئی۔ کہنے لگی ”بہن جھینگر
 سینٹ فرانسس کو گیت سُنا کر ابھی لونی ہیں۔ ایک روز انجیر کی شاخ پر بیٹھی الابی
 تھیں سینٹ فرانسس نے کہا شاہاش جھینگر باجی۔ سبحان اللہ۔ پھدک کر اُنکے ہاتھ
 پر آن بیٹھیں اور طبیعت سے گایا۔ انہوں نے کہا اب چپ ہو جاؤ۔ چپکی ہو گئیں۔ اُنکے
 حجرے کے ایک کونے میں جا بیٹھیں۔ آٹھ دن تک متواتر گایا کیں۔ تب سینٹ فرانسس
 نے فرمایا جھینگر باجی تم نے اپنے گیتوں سے ہمیں بہت شاد کیا۔ اب جا سکتی ہو۔ پھدک کر
 غائب“ سینورینا خود اس جھینگر کی طرح آزاد اور سرور معلوم ہوتی تھی۔

”لوچیا بی بی کیا تمہارے سارے مسئلے حل ہو چکے ہیں؟“
 ایک ننھے پولش بچے نے ابھی لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اسکے ماں باپ
 چل بے۔ اسے دُعاؤں کی ایک بہت بھاری کتاب ترکے میں ملی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر
 سنے گوگ میں لے گیا اور پریڈیک پر دھر کے پکارا۔۔۔ خدایا۔ مجھے دعا مانگنا نہیں
 آتا۔ یہ پوری کتاب ہی سمجھے دیے دیتا ہوں۔“
 جگ بھر کے وہ واپس چلی۔

ہر جگہ میاں کا کیمپ ایک نوع کارو حافی ہائیڈ پارک کو زربن جاتا ہے۔ اب
 آنگن میں ایک ٹاٹ پوش کھڑے بھاشن دے رہے تھے۔ دوبارہ دیکھا تو وہی ایک بکڑو
 انکا سوٹ تہہ کیا ہوا کرسی پر رکھا تھا۔
 ”چہ خوش یہ کون مہاشے ہیں؟“
 ”سادھوؤں کی ایک ایسی ٹوٹی سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی دنیاوی پوشاک کے
 نیچے ٹاٹ پہنتی ہے۔“ لوچیا نے جواب دیا۔
 وہ فرما رہے تھے ”حقیقتِ محمدیؐ کیا ہے؟ پر ماتما کی اچھا شکتی۔ شیش آسن؟
 صلوٰۃ معلوس۔ خواجہ فرید شکر گنج چودہ برس تک۔۔۔“
 سینورینا سمیت ان فرار پسند اہل درو کو انکے حال و قال پر چھوڑ کر ہوا خوری
 کے لیے باہر نکلا۔
 پھر سینڈی کی بات یاد آئی۔ تین سال بعد آئے۔ اب اگلے تین برس کی
 گنجائش ہی باقی نہیں۔

”صاحب وقت وقت کو گردش دیتا ہے۔ دن اور رات اور مہینہ اور سال اسکے
 سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں اور اسے حساب دیتے ہیں۔“
 وقت کے حساب کتاب کے آئینہ دار کتنے پرانے مکانات کھلے چند ماہ میں ان

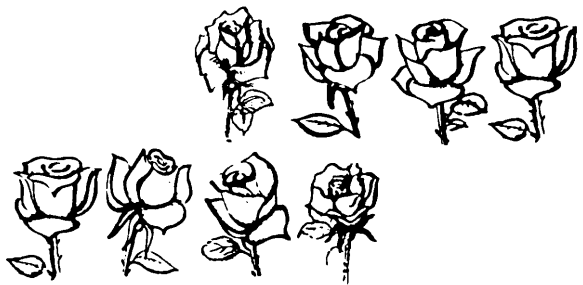
قصبات میں دیکھے۔ کوٹھی سے ملحقہ زاناخانے کے کھنڈر پر نظر دوڑائیں۔
ان پیرن لوگوں نے مسجد کے ایک گوشے میں گھنٹہ گھر تعمیر کروا رکھا تھا۔ گجرجا۔
اور آگے بڑھا۔ بارش کی پھوار پڑی۔ ایک جامن کے بیجے ہو گیا۔ میرے ل کے
اندرتوبن موسم برکھا ہوتی ہے۔ گرم اور سرد ہوا میں جلتی ہیں۔ دل کی ندی میں بارھا آتی
ہے تو پیروں میں کوڑیا لے سانپ پیٹ جاتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ یہ ذرا سی پھوار کیا
چیز ہے۔

شام ہو گئی مطلع صاف ہوا حاجی صاحب کے گنبد کے عقب سے بدر کامل نے جھانکا۔
جھڑ بیری کے نیچے چند قدیم قبریں دکھلائی پڑیں۔ یا ایک مختصر وود ڈکٹ۔ چاندنی رات
میں انگلینڈ کا ایک سنسان، پرانا گورستان۔ ٹیڑھے ترچھے زمین میں دھنسے سنگ مزار۔
ایک کتبے کی عبارت بتایا کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالتا مکان کی جانب لوٹا۔
ڈیوڑھی میں نواب منجو ذرا پریشان اور محفوظ سے کھڑے تھے۔ "میاں فرما رہے
ہیں یہاں سے کیوں نہ دلی ہوتے آویں!"

اچانک وہ تحریر یاد آگئی۔



www.urduchannel.in





(۴۳)

بیلے میں میلہ

روشنیوں اور دھندلکوں اور پرچھائیتوں میں سے چھننے ہندوستان کو اب
فنِ مصوری کے پارکھ کی نگاہ دیکھ رہا ہوں۔

اصل نام مہرولی۔ اب عرصے سے مہرولی ۲ زیر سہٹ جانے سے کیا فرق پڑا۔
ولی تو موجود ہیں؛ نواب منجوں نے کہا۔ تواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا کوپلیکس مجھے
عبدالرحمن چغتائی کے نازک ماورانی نقوش کا موڈل معلوم ہوا۔ ایک کے بعد ایک ادنیٰ
سپید محرابیں اور صحن اور مرمریں غلام گردش اور دروازوں کے اندر دروازوں کا
سلسلہ وار تناظر۔ مرمریں جالیاں۔ اچانک قرمزی گلاب۔ اور زمردیں بلیں سپید
مزارات۔ ایک اونچے گنبد کے نیچے بالکل داستانی ماحول میں بیٹھے چند درویش۔
طلوع آفتاب سے بہت قبل ہم وہاں پہنچے تھے جیسے معاً ایک بے آواز بیکراں
خواب میں داخل ہو گئے ہوں۔

وقت مقررہ پر ایک خر قہ پوش گروہ نے ایک قدیم دروازے کے سامنے کھڑے
ہو کر حمد و نعت پڑھی۔ بعد ازاں انکے قاید نے کوڑ پر دستک دی اور دروازہ کھولا۔
”روز صبح دستک اسیلے دی جاتی ہے کہ خواجہ صاحب اکثر رات کو باہر تشریف رکھتے
ہیں انکو اطلاع ہو جائے کہ اب لوگ روخصے میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ ہماری نظروں
سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔“ دروازے کے اندر جاتے ہوئے منجوا صاحب نے مجھے اطلاع
دی۔ میں نے سر ہلایا۔ اور خاموش رہا۔ یہ سارے اولیائے کرام اگر اس وقت بھی موجود
ہیں کم از کم اسی راجدھانی میں ہونے والی بے انصافیوں اور مظالم کا تدارک
فرمادیں۔ یہ کیا مہرولی ہے۔ ان سرکش باغیانہ خیالات کے ساتھ بندہ اس رخصتہ الصفا

میں داخل ہوا۔ روشوں پر سے گذرتے ہوتے سوچا۔ مسجد۔ روضہ۔ مدرسہ۔ یہ تخلیق جو دارالاسلام کی روحانی، ذہنی، فقہی تہذیب کا مرکز رہی ہے ڈینوب ووالگا سے لیکر برہمپتر اور کاویری تک اسکے تعمیراتی اور مجموعی تاثر کی وحدت یقیناً حیرت انگیز ہے مگر یہ ہمہ گیر تمدن آج تنگ نظر اینٹی انٹلیکچوئیل، اینٹی انکوائری، عیاش، خون ریز و خونخوار کن اندرونی اور بیرونی وجوہات کی بنا پر سمجھا جا رہا ہے؟

مزار شریف کے باہر آدیزاں پنکھا۔ اگلی پھول والوں کی سیر پر نیا لگا یا جائے گا۔ نواب منجوز دیک آئے۔ ”شہزادہ جہانگیر“ انہوں نے لکھنؤ کی آنکھوں سے پنکھا ملاحظہ فرمایا اور انکے لکھنؤی حافظے نے کچھ یاد کیا۔

”شہزادہ جہانگیر“ میں نے دہرایا۔ تاریخ ہند کے سب سے کربناک باب کا ایک ذیلی کردار ”اینٹی برٹش تھے۔ اور کچھ بس نہیں چلتا تھا ریڈیٹ کو لوٹو ہے بے کہہ کر چڑھایا کرتے تھے۔ دارسلطنت سے الہ آباد جلا وطن کیے گئے۔ ماں نے پنکھا چڑھانے کی منت۔“

”لوٹو ہے بے“ میاں نے اس فقرے کی داد دی۔ بہت محظوظ ہوئے۔ ”اجی وہ کیا سلطنت تھی از دلی تا پالم ایر پورٹ۔ اور کیا اس سے جلا وطنی۔ سب نوٹنگ تھی“ منجوز صاحب بولے ”لکھنؤ پہنچے تو کس قدر کی ہڑبونگ چمائی شراب پی کر راہگیروں کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں تلے روندتے چلے جاتے تھے نہ داد نہ فریاد۔ وزیر ہند چیپ کہ صاحب عالم ہیں۔ اور ہمان وہ ایک طوائف کو لے بھاگے“

”ہم لوگ خواجہ صاحب کے مزار کے پاس کھڑے ایک مرحوم شہزادے کی عیب جوئی کر رہے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ ایک ساتھی نے کہا۔ ”ہم سب اپنے اپنے دور کی پیداوار ہیں“

”بیشک اس اعتبار سے شہزادے کو افسور ڈ میں پڑھنا چاہیے تھا۔ اسی دور میں محمد علی فدیو مصر اپنے نوجوانوں کو بغرض تعلیم یورپ بھیج رہا تھا“ میں نے جواب دیا۔

”خواجہ صاحبؒ ہی کا ارشاد ہے قینچی سے کاٹنا نہیں سوتی دھاگے سے جوڑتا ہوں۔ انگریزوں نے پھول والوں کی سیر بند کرادی تھی۔ پنڈت نہرو نے پھر سے شروع کردائی“ ایک خادم نے مطلع کیا۔

”جی ہاں۔ اور نیتاؤں کو قومی اتحاد پر کھوکھلے بھاشن دینے کے لیے ایک اور پلیٹ فارم مل گیا“ منجھو صاحب تلخی سے بولے۔

روضے سے باہر نکلے تو اچانک افق۔ زمین کا کنار اور پھر آسمان۔ گویا ہم کرۂ ارض کے چھوڑ پڑے ہوئے۔ پوچھت رہی تھی ع یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبر تیل۔ احاطے کی دیوار سے ملتی ایک قصر شکستہ کہ بے چارے فتح کے باپ، دین کے چراغ مع فیملی اسمیں قیام کر کے ساون مناتے تھے۔ آہا۔ قطب صاحب۔ شمسی کاتالاب۔ جھرنا۔ اندھیری باغ۔ باگ اندھیری تال کناے۔ جھولا کین نے ڈالوری امریاں۔

تخت و تاج اور تاخت و تاراج میں بھی فرق محض تین حروف کا ہے۔

پچھلے پہر اور طلوع سحر کی اس ناقابل بیان کیفیت، تیسرے پہر کے سلطان جی کی چہل پہل اور جم غفیر کے بعد حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی ایسی خاموش شام جس میں فرشتوں کی پرواز سنائی دے جائے۔

”حضرت کو سکون پسند تھا۔ آج تک وہی عالم“ منجھو صاحب نے کہا۔ میاں آگے آگے جا رہے تھے۔ ”اپنے شاہانہ انداز میں خراں ایسا لگتا ہے گویا اپنے لوگوں سے ملنے جاتے ہوں“ میں نے اظہار خیال کیا۔

”حقیقت تو یہی ہے۔“ منجھو صاحب نے فرمایا۔

ایک پولیس میں حضرت نصیر الدینؒ کا نقشیت تخت۔ ایک تختے سے ترشا۔ کاریگری کا نادر نمونہ۔ اس پر دایاں ہاتھ لگایا۔ پھر اپنی انگلیوں پر نظر ڈالی سات سو

سال اس لکڑی میں پنہاں ہیں۔ جیسے میری ساری ”فنکاری“ میری انگلیوں کی پوروں میں۔

”نور پوروں میں ہوتا ہے۔ اور یہاں۔ پیشانی میں۔“ میاں نے دفعتاً مجھے مخاطب کیا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں وہیں ٹھٹھکا رہا۔ ”جدید سائنسدانوں نے انگلیوں میں پوشیدہ روشنی کی عکاسی بھی کر لی ہے“ سینڈی نے کہا۔ ”گو میاں نے وہ انگریزی رسالے پڑھے ہیں نہ کتابیں“

میں نے کنور کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اس لمحے اس گویا طلسماتی تخت کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اپنے نارمل حالات میں دلی آتا تو اس وقت کسی اعلیٰ درجے کی بار پر موجود ہوتا۔

حضرت چراغ دہلی کی شام۔ سندھیا کال کا اندرونی دھیان۔ بے نام بے آواز رانگی۔

قدسیہ باغ کے نزدیک جاتے قیام پر ایک بیڈ روم میں حسب معمول فرش پر مرشد کا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ ایک رات دیکھا کہ آپ ایک اور بچھونا بچھاتے بیٹھے ہیں۔ لیکن پہلا بستر اسی جگہ موجود۔ ہم اسے پھلانگ کر دوسری جانب جانے لگے فرمایا اسے نہ پھلانگیے گا۔ ادھر سے چلے جاتیے۔

”—؟“ بعد میں منجھ صاحب سے دریافت کیا۔

”معلوم نہیں۔ یہ باتیں خواجہ کی چوکھٹ ہے۔ بزرگان دین رٹرن کال کیلئے اس مکان میں بھی آرہے ہونگے۔ کیا جانے کیا معاملہ ہے۔ کرئید نہ کیجئے“

دوسرے روز ایک مشکک دانشور جو پہلی بار میرے ملے تھے پوچھنے لگے۔

”ڈرائینگ روم میں کل شام کوئی صاحب چنبیلی کا عطریا تیل لگاتے ہوئے تھے؟“

”نہیں تو“

”عجیب بات ہے۔ مجھے برابر جنیسی کی خوشبو آیا کی۔ شام کو راج پر ٹہلنے نکلتا تب بھی اسی خوشبو نے پیچھا کیا لیجئے۔ اس وقت پھر۔۔۔ میرا داہمہ ہے۔“

”عین ممکن ہے۔“

”کجی یک خط مسطر چہ تو ہم چہ یقین؟“

”جی“

”آپکے مرشد سے ملنے کے بعد یہ خیال ستا رہا ہے کہ ہماری عقل و دانش علم اور تجربہ، علمیت، اور نظریات کس قدر منحنی اور ناکافی اور حقیر ہیں؟“

”جی ہاں یہ خیال تو ہمیں بھی برابر اتار رہتا ہے۔“

”اب کیا کیا جاتے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”مگر یہ تو اوزار پریشان کن بات ہے۔“ وہ ذرا بیچینی سے پایپ سلگا کر برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ انکے جانے کے بعد میں باغ میں جا بیٹھا اور بہت دھیان کیا آنکھیں میچیں تیسو ریشخ۔ ایک خیالی نقطے پر توجہ۔ سب ناکام۔ ایک بار پھر اس افسوسناک نتیجے پر پہنچا کہ اس حقیر پر تقصیر کے اندر روحانیت کی ذرا سی رمق موجود نہیں۔

اگلی صبح حضرت اپنا ٹریک سوٹ پہن کر جو گنگ کے لیے نکلے۔ ساتھ ساتھ دوڑنے کی سعی کر رہا تھا۔ میرے خیال سے انہوں نے رفتار دھیمی کر دی۔ قدرتیہ باغ کا چکر لگا یا بیلہ روڈ پہنچے۔ جتنا کہ مانند بہتا ذہن پھر کہیں اور نکل گیا۔ بیلے میں میلہ۔ غدر کی ماری شہزادیاں۔ ست و نئی۔ کم ٹو موٹ۔

فوٹو گرافک یادداشت کی بدولت وہ الماری سامنے آئی جس میں والدہ خیر النساء بیگم کی کتابیں رکھی رہتی تھیں اور جنکو وہ بڑے چاؤ سے پڑھا کرتی تھیں۔ نانی عشو۔ دلایسی ننھی۔ نظامی بنسری۔

بیلے میں میلہ۔ منازل آسائیرہ۔ شام زندگی۔

شام کو مرشد نے کہا چلیے کناٹ پلپس گھوم آدیں۔

”اگر اجازت دیجئے تو گھر پہ ہی رہوں۔ چند خط لکھنے ہیں“ انکے جانے کے بعد پھر بیلہ روڈ پر ہوا خوری کے لیے نکلا۔ کیا عجیب بات تھی۔ لڑکپن میں پڑھی کتابوں کے عنوان ایک بار پھر بیچھا کرنے لگے۔ مونا آنا۔ تین پیسے کی چھو کری۔ سیب کا درخت۔ کم ٹوٹ۔ اگر میاں میرے دل سے موت کا خوف نکال دیں تو بالآخر انکو مان جاؤں۔ سورہ یونان پر استہور ہا تھا۔ سن سیٹ اینڈ ایوننگ اسٹار۔ الفریڈ لارڈ ٹینی سن۔ ہو ہو ہو لامارٹ کا وہ بڈھا انگریزا سٹریجوئی ننت ڈکٹورن قسم کے گل مجھے رکھتا تھا اور اس معصوم بچپن میں ہمیں موت کا راگ سنا تا تھا۔ جو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سن سیٹ اینڈ ایوننگ اسٹار۔ معصوم — ہاتاش اور جو ابیہ فقیر کھیلتا تھا۔ ماں کے زیور بندہ چسراتا تھا۔ چھپ کر سگریٹ احقر نے پیے۔ میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی — مگر وہ تو ساری تاریخ انسانیت کی تعمیر میں مضمر ہے — صورت خرابی کی۔

دوسری جنگ عظیم جاری تھی، میڈنر ہوٹل کے سامنے سے گذرتے ہوئے خیال آیا، جب سینڈی اور میں ایڈونچر کی تلاش میں گھر والوں سے چھپ کر دئی بھاگ آئے۔ اس ہوٹل میں ٹھہرے۔ ارادہ یہ تھا کہ رائل انڈین ایر فورس میں بھرتی ہو جاویں اور ذرا ”ایکشن“ دیکھیں۔ مگر ہماری ”گمشدگی“ سے ہمارے گھروں میں کہرام مچ گیا تھا۔ بڑے ابا اور کنور کے باپ آنجنہانی راجہ صاحب نے آدمی دوڑائے۔ دونوں کو پکڑوا کر واپس بلوایا۔

اب میں مدتوں سے کھوچکا ہوں مجھے ڈھونڈنے کے لیے کارندے دوڑانے والا

کوئی نہیں۔

لیکن ان چند دنوں میں ہم نے یہاں کیا عیش کیے افوہ۔ دونوں لارڈ بنے کناٹ پلپس میں گھومنا کرتے۔ کوری اور سانولی ویک آئی چھو کریوں کو ڈسے وی کوڑے لے جاتے۔ انگلش فلم دیکھتے۔

سر جھکائے ایک بوڑھا جعل ساز انگریزی پکچروں کے نام یاد کرتا آہستہ

آہستہ چلتا بیلہ روڈ پہنچ جاتا ہے۔ ادھر خربوزے کے کھیت اور تیتی جہاں سنا ہے ایک زمانے میں دئی کے سیلانی جوڑے چاندنی راتوں میں سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ بیلے میں میلہ۔ کون کون سی فلمیں اُس بار دئی میں دیکھی تھیں؟ گیس لائٹ۔ اینا کرینا اور جان گریفٹن کی وہ کون سی فلم تھی بیٹی ڈیوس کے ساتھ۔؟

جان گریفٹن —؟ وہ تو ہالی ووڈ اسٹار نہیں کسی پرانی جان ڈرنک واٹر کی ایک نظم کا کردار تھا۔
جان گریفٹن —

میاں دلشاد علی تم گڑ بڑا چلے۔ نہیں وہ پوری نظم یاد کر کے چھوڑیں گے اسکے حاشیوں پر بل فلاور بنے تھے۔ اور اٹھارویں صدی کے لباس میں بوڑھا جان گریفٹن اور لندن ٹاؤن کا ہجوم اور — سب لوٹ آیا۔ ٹوٹل ری کال۔ جان گریفٹن سات دن اور سات رات انگلستان کی خاموش معطر ٹرکوں پر چلا گیا تاکہ لندن پہنچ کر جشن تاج پوشی میں شامل ہو سکے۔ ہمیشہ خواب دیکھنے والا جان گریفٹن ڈارک کے ہرے کنجوں سے نکل کر لندن ٹاؤن میں وارد ہوا۔ اسکے پاس داخلے کے لیے ایک سلور شلنگ تھا مگر لوگوں نے اسے ویسٹ منسٹر ایسے میں نہ جانے دیا۔ تب وہ ہنسنا اور اس نے سیٹی بجائی اور سنسان راستوں پر سے گذرنا دارک کے ہرے کنجوں میں واپس آیا۔ شفق کے رنگ وادیوں اور ٹیلیوں پر پھیل گئے۔ اسکا آوارہ گرد دل مضطر نہ تھا۔ ندیوں اور پہاڑیوں پر سے اتر کر قوس قزح میں بلبوس قہقہے لگاتی منور ہستیاں اسکے سامنے نمودار ہوئیں۔ بوڑھے جان نے انکو دیکھا اور پھر ہنسنا۔ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ درختوں اور بڑھڑاؤں اور پھولوں اور آبشاروں اور کوساروں اور پرچھائیوں اور سنہری دھوپ اور روپہلی بارش کے نورانی پیکر۔

وہ ان سب سے واقف تھا۔ انکے وجود میں نغمے چھپے ہوئے تھے۔ اور موسیقی۔ اور لونگ اور تپتیا گھاس کی خوشبو۔ ہمیشہ خواب دیکھنے والا بوڑھا جان گریفٹن اکیلا سفر

کر تا موسم گرما کی اس معطر شام واپس آ گیا اور اس نے سر پر اپنا تاج خود پہنا۔

میرے پاس بھی ایک سلور شلنگ تھا۔ جسے میں نے خود گنوا دیا۔ جوڑے میں ہار گیا۔ اب وہ مجھے شاید واپس مل گیا ہے اور شاید مجھے بھی ویسٹ منسٹر ایبے میں داخلے کی اجازت مل جاوے۔

میں ایک جذبات زدہ بوڑھی میم بنتا جا رہا ہوں جو روکنگ چیر پیٹھی کشیدہ کاری کے اڈے پہ بزنٹ روز اور سویٹ برائیر کاڑھتی ہے اور جان ڈرنک واٹر کی نظموں پر آپس بھرتی ہے۔

جاتے قیام پر واپس پہنچا۔ میاں اور انکے ساتھی میزبان سمیت ابھی نئی دہلی سے نہیں لوٹے تھے۔ ڈرائنگ روم میں جا کر میاں فرما رہے تھے سرمد شہید کے مزار پر بھی جاویں گے ایک روکنگ چیر پیٹھی گیا۔ بوڑھی مسز بیرل گرانت نانا ابا کی روکنگ چیر پیٹھی فخر آگوانگریزی پڑھاتی ملیں۔ کشیدہ کاری کا اڈا سنبھالے۔ نانا ابا کے جوانی کے زمانے کی روغنی تصویر کے نیچے بیٹھی فخر آگوانے مجھے دیکھ کر فوراً دوپٹے سے سر ڈھانپا اور کتاب پر جھک گئی۔ لوچیا کی ایسی دہائی۔ سلونی۔ لوچیا مجھے اسی لیے اتنی اچھی لگی کہ اسمیں فخر آگوانے جھلک مسز گرانت کے لیے سفتے میں دو بار ضلع ہیڈ کوارٹرز کے مشن اسکول نانا ابا کی پرانی شیو بھیجی جاتی ہے اور وہ دھان پورا کر فخر آگوانے، حساب، ولایتی دستکاری۔ اماں کتنا بوڑھا نام ہے فخر النساء بیگم بدل ڈالے۔ نہیں چند ایسا نہیں کہتے۔ یہ حضرت نبیؐ کا لقب ہے۔ رسول اللہؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسینؑ، بڑے پیر صاحبؑ جسکا نام آوے اماں فوراً مزید سلیقے سے بطور ادب سر ڈھانپ لیتی ہیں۔ ہمیشہ سے کرمید کی عادت۔ اور اماں حضرت فاطمہؑ کے نام کا مطلب کیا ہے؟ اماں کے بجائے عالم فاضل نانا ابا روکنگ چیر پیٹھی سے جواب دیتے ہیں۔ بھیا۔ خاتون جنت کے اسم مبارک

فاطمہ کے معنی ہیں امن لانے والی۔ دوزخ کی آگ بجھانے والی۔
آنسوؤں کی چند بوندیں انگلیوں کی پوروں پر گریں۔ چار ماہ سے مینی کیور ہی نہیں
کروا سکا۔

دقیانوسی مسز گرانٹ فخرًا کو لیزی ڈینزی کے ٹانگے میری خالہ کی لڑکی ٹھیکرے
کی مانگ نہایت تندہی اور بھولپن سے کشیدہ کاری میں مشغول

ٹینس کھیل کر جا پلنگ روڈ گھر واپس گیا تو بڑے ابا کو اپنے کمرے میں آنسو بہاتے
پایا۔ دل دھک سے۔ اب تلک اماں ابانا ابانا ابائینوں ختم ہو چکے۔ اب کس کی باری ہے۔
دھان پور سے سناؤنی آئی تھی۔ خالہ زادسترہ سالہ فخر النساء میری حسین منگیتر
بعارضہ ٹائیفائیڈ۔ اس رات اپنے ایک انگریز دوست کے ہاں جا کر غم غلط کرنے کیلئے
اسکے اصرار پر پہلی بار شراب

سول لائینز دہلی کی ایک پرسکون کوٹھی میں مرشد کے ایک معتقد کی روکنگ چیئر
پر بیٹھا دشا علی جذبات زدہ دقیانوسی انگریز مسز گرانٹ ہوں۔ جیسے ایک بارش
قوی ہیکل پیر مرد ”سدا سہاگن“۔ ایک اطالوی سینورینا قصباتی پابند صوم و صلوة
دوشیزہ سینک دشا علی، ہندوستانی مسلم، سابق زمیندار۔ پلے بوائے اف دی
ویسٹرن ورلڈ بیک وقت۔ یہاں سے لوٹ کر نورمن نے کہا تھا ڈیڈی۔ انڈیا جا کر
انکشاف ہوا۔ ہر شخصیت ہر شہر ہر نظارے کے کتنے پرت ہیں۔ پیاز کے چھلکوں جیسے۔
تری مورتی کے تین رخ ہیں۔ متعدد جلوے۔ دس ہاتھ۔ کثرت ہی کثرت۔ اور وہ
اردھناری بھی کہلاتا ہے۔

اٹھ کر دریچے سے باہر جھانکا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ پڑوسیوں کی روشن کھڑکی
میں دوسر نظر آئے۔ ایک خاتون۔ ایک کمن بڑکا۔

اماں اماں کیا کر رہی ہو؟
 بھیا ہم نے فجے میاں کی دہن کو رونمائی میں دینے کے لیے صندوقچے سے
 ایک اشرفی نکالی تھی۔ غائب ہو گئی۔ یا بی بی سیدہ۔ میری اشرفی کھجے پیدا۔ سلام
 کرونگی چودہ۔ یا بی بی سیدہ۔

اماں یہ رہی اشرفی۔ مسہری کے نیچے پڑی تھی۔

سراچی طرح ڈھانپ کر فوراً درود شریف پڑھنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ قبلے
 کے رُخ جھک جھک کر چودہ مرتبہ سلام۔ اب وہ سواتیرہ آنے کی شیرینی منگو کر
 بی بی کی نذر دلوائیں گی۔ میں اپنی فنکاری پر نازاں کھڑا مسکرا رہا ہوں۔ اس رات
 ان دونوں کے سردھانپور کی کوٹھی کے ایک روشن دریچے سے کس کو نظر آئے ہونگے؟
 ایک بھولی نیک سیرت دیندار ماں۔ اور ایک مستقبل کا نامی گرامی بد معاش۔

خاتون جنت امت کی شفاعت کی سفارش فرمادیں گی۔ بی بی فاطمہ امن لانے
 والی۔ دوزخ کی آگ بجھانے والی۔

دریچے میں کھڑا رومال سے اپنی نم آنکھیں خشک کر رہا ہوں۔ پھاٹک پر کاروں
 کی روشنیاں۔ فوراً برآمدے میں جاتا ہوں۔ میاں گاڑی سے اترتے ہوئے مسکرا کر
 فرماتے ہیں ”کہیے جناب۔ آپ بیلہ روڈ پر بہت دور تک ہو آئے؟“

آدھی رات کو جہنا پار کر کے ہمارا قافلہ گنگا گھاٹی جانے والی پرفضا شاہراہ پر
 آگیا۔ دورویہ کیکر کے جھنڈ اور یوکلپٹس کے سرسبز پلانٹیشن۔ اوپر تاروں بھرا آسمان۔
 میں پوربی ترانی کی سمت اس خوشی اور طمانیت کے ساتھ واپس جا رہا ہوں گویا وہیں
 میرا گھر ہے۔ میں جان کر لیٹا۔

(۴۴)

گلِ عجائب

یہ بیک سا نہاں چین کہ انوکھے گل کھلاتا ہے، لاطینی نام نامعلوم۔ لیکن اسکے گھڑی گھڑی رنگ بدلنے والے پھول اردو میں گلِ عجائب کہلاتے ہیں۔ پہلی بار ڈاکٹر عنبریں بیگ کے باغ میں دیکھا۔ اسکی ہری ٹہنی پر ایک مرغِ عشق چھپا رہا تھا جس سے تعارف عنبریں کی طور آشنا مادر محترم نے کرایا۔ میں کہو دیکھ خاص الخاص قسم کا ”برڈ و اچر“ رہا ہوں اسوقت یہ سوچ رہا تھا سینئر بیگ خاتون کے لب و لہجے انداز اور بشرے سے خیف سا مترشح ہے کہ ایک ماضی رکھتی ہیں۔ ان خاصی ما لدر مادام سے راہ دسم بڑھائی جاوے تو کس حد تک فائدہ رہے گا۔ نگار خانم کے معاملے میں مایوس ہو کر اور خواجہ سبزی پوش سے آخری ملاقات کے بعد ہٹل آیا تھا اور اپنے پرانے خدنگا حُصین بخش اور بیگ ماں بیٹیوں کو خدا حافظ کہنے ٹہلتا ہوا دربنگ روڈ چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر اس لب دریا مہمان سرائے کے ایوان پذیرانی میں سینڈی سے اتفاقاً ڈبھیڑ ہوئی۔ اسکے بعد سے آج تک کے احوال غریب رقم کر چکا ہوں۔ اور اب کہ طایروں، پھولوں، موسموں اور ندیوں سے روابط بڑھتے جا رہے ہیں۔ گلِ عجائب کو آج گلستانِ شیخ میں دیکھا اور پہچانا۔ اسکے نزدیک جو شجر کھڑا ہے اسے دن کا راجہ کہتے ہیں۔ پیچھے پیچیدہ شاخوں والا نخلستان۔ وہاں روز روشن میں بھی اندھیرا رہتا ہے۔

یہ اجالا کہاں سے آیا؟ کنج بالکل تاریک تھا چھوڑو اور پیڑوں کا اندھیرا۔ گھٹا ٹوپ بادل بگڑ فلم ڈیولپ کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج رہا تھا کہ مرشد مزار کے دروازے میں کھڑے نظر آئے۔ رول حتم کرنے کے لیے قریب جا کر کیمرا کلک کر دیا۔ نہ فلیش گن پاس تھی نہ آسمان

پہلے بچی چکی لیکن آج تصویریں بن کر آئی ہیں تو آخری فولوگراف میں بیک گراؤ نڈر روشن اور عیاں۔ صبح سے اسے بار بار دیکھ رہا ہوں پیکٹ سرکار کو پیش کیا انہوں نے سچوان پتے بھجئے سرسری نظر ڈال کر واپس کر دیا۔

”کیلی فورنیا میں ایک سائینداں ہے ڈاکٹر کرسنر“ سینڈی نے حسب عادت اپنے حوالے دینے شروع کیے۔

”بھائی میں اس تصویر کی بات کر رہا ہوں“
 ”ڈاکٹر کرسنر۔ اپنے دارالعمل میں اس نے ایک شخص کی انگلیوں کا عکس لیا ہے۔ پوروں میں سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اپنے اپنے AURA کی بات ہے۔ کیف یا لطف یا متور ہالے۔ اگلی صدی تک سائینداں شاید گذشتہ آوازیں بھی ریکارڈ کر لیں۔ اور اندرونی بھی۔“

”مگر اس اور ا کا عکس میرے کیمرے میں کیسے آ گیا۔؟“
 میں ہری دُوب پر حیران پریشان پلتھی مارے بیٹھا ہوں۔ سینڈی گویا سر یہ تیتوں کا غیر مرنی تاج پہنے درجل کی طرح استادہ۔ اوج فلک پہ چاند کی رقا صہ نغمہ سرا۔
 فرصت کشمکش مدہ ایس دل بقیقرا را
 ”سید عبداللہ دروئی کو مالوہ کے راجہ نے سارنگ بتایا۔ روشن۔ مرید ہندی کہہ رہا ہے۔“
 ”روم سے۔“

روم — کون سا؟ میں چونکتا ہوں۔ نورمن ڈریک والا۔ روم اولے سینٹ پیٹر کا۔
 روم ثانی قسطنطین کا۔ یا روم ثالث پیردی گریٹ کا۔ ماسکونی الحقیقت آج بھی روم سوم ہے ہمارے ان اہل کتاب کا جنکا پیشوا اینغمبر نہ تھا لیکن نعل میں کتاب رکھتا تھا۔ ہالہ نہ دارد۔

اور سپکنگ؟ روم چہارم!!
 باہا با۔ یک دو سکن زیادہ کن کیسوئے تاہا ررا

ردم روم سے حق حق حق —
 پلچھے پلچھے ہر پھریں کہت کبیر کبیر —
 ”یارسینڈی یہ تصویر —“
 ”ہر منظر ایک تصویر ہے۔ دھندلی یا منور گذشتہ رجب، سلطان الہند کے آستانے پر —
 رس کی ایک شام —“
 ”وہاں کیا ہوا؟“

”ہوا کچھ بھی نہیں۔ ہم ایک منظر یاد کر رہے ہیں۔ آستانے کے اندر شہنایاں بچ رہی تھیں
 نونوں گلاب کے انبار۔ قوال بچوں کی تانیں۔ جم غفیر بزمِ مخمیس چادروں کے رواں شاملیے
 زائیرین کے جلوس۔ تیز روشنیاں۔ رات بھگی اور ہجوم چھٹا ہم باہر آئے“
 ”پھر؟“

”پھر کچھ نہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کا عمل۔ تب ہم نے وہ منظر دیکھا۔ دلی ڈوانے
 کی ڈھال میرے پیرتین فقرار سے ہم سخن۔ اودھ کے دو عدد زرد پوش نوجوان وارثی درویش
 ننگے پاؤں۔ دونوں بالکل کرایسٹ کے ہم شکل۔ فلینی انکو دیکھ پاتا مسیح نصری کارول ان میں
 سے ایک کو دیتا۔ بھائی دتسا علی پیلے لباس والے موڈرن تعلیم یافتہ وارثی فقیروں کے کوماس
 کی تم شناخت رکھتے ہو؟“ وہ چپ ہو جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے ”تیسرے ان میں سے برون رنگ
 کا خرچہ پہنے ایک طویل القامت سجادہ نشین تھے برہان پور کے۔“
 ”برہان پور —؟“

”ہاں۔ وندھیا چل کے اس پار۔ برہان پور۔ بیجا پور۔ کرنول۔ گلبرگہ شریف۔ ورنگل۔ اہل
 معاملہ اور اہل مشاہدہ کی ایک اور دنیا آباد ہے۔ ساؤتھ ہیرو کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“
 ”اس سوجنا کے لیے دھنیہ داد“

”میرے شیخ ان سے بڑی مسرت آگئیں باتیں کر رہے تھے۔ انکو بلیس کیا اور وہ تینوں
 دلی دروازے کی سمت لوٹ گئے۔ ننگے پاؤں۔“
 ”ع مہارنا قہ کو پشت ناقہ پہ ڈال کر پایادہ ہو جا —!“

”بخارا سے روم — یعنی سلجوقیوں کا اناطولیہ۔ قونیہ سے ایران و ہندو سندھ۔ یہ لوگ کتنا سفر کرتے تھے۔ میاں کو دکھیو۔ ہر وقت پایہ موٹر کار۔ مسلسل دورے۔ ہٹری کا OVERKILL کہ مجھے گڈیوں میں سالاز مسودہ گئے گھوسی اور میاں کی ایمبیڈر میں مخدوم جہانیاں کا ناقہ نظر آئے۔ بے کیا کیا جائے۔ اپنی آنکھ ہی ایسی ہے۔“

”تیسری؟“

”نہیں بھئی۔ ہماری ایسی قسمت کہاں“

”یہ ڈاکٹر کرسپر کون ہے۔ نام سے یہودی لگتا ہے“

”سولہ آنے“

”قوم جہود کے افراد بھی چشم سوم رکھتے ہیں؛ مارکس اور اینگلز لو۔ فرائیڈ لو۔ آئین اسٹائن ا“

”تیسری آنکھ ہی جو ٹھہری۔ جس سمت بھی کھل جائے“

اب غنچوں کو نیند آرہی ہے۔ تالاب کے کنارے جگنو اڑ رہے ہیں۔ سندریشور زائن گویا ہے۔

”— پھر اس نے کہا اے مولے! تم نے میرا گھوڑا موڑ دیا۔ اب ہم ساتویں آسمان پر ہیں

اس مقام پر نہیں جہاں تم ملے تھے۔ ہمیں پتہ نہیں ہم نے تم سے کیا کہا تھا“

”کیا —؟ میں پھر چونک کر پوچھتا ہوں۔“

”کل شام سرکار حضرت مولے اور گڈریے کی حکایت بیان کر رہے تھے۔ وہ رمزا نصیحت فرماتے ہیں تم سمجھ ہی نہیں پاتے“

گلاب باڑی کے ادھر دونوں باجیاں مصروف گفتگو ہیں — اپنے ذہن کا انتشار بھلانے کے لیے انکی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

خوابیدہ پھولوں کے درمیان باجیوں کا مکالمہ :-

”— اجیر شریف جاتے ہوئے آدھی رات کو میاں نے جے پور میں ایک مسجد کے سامنے کار روکی۔ پھاٹک پر ایک کمن لڑکا تندی سے جھاڑو دے رہا تھا۔ نصف شب

اموش، روشن مسجد تھوڑے سے تہجد گزار۔ اور یہ نو عمر لڑکا اس انہماک سے جا رہا کہ کئی برس مشغول۔ میں بھی یہ منظر نہیں بھول سکتی۔

”اجیر شریف سے واپسی پر وہاں پہنچے تو پوچھنے والی تھی۔ شاہراہ کے کنارے شہر کی لمبائی فصیل پر سفید کبوتر آبیٹھے۔ سنگ سرخ کی مسجد کے اندر رنگ برنگی پگڑیوں والے نمازی۔ ہنگر۔ چند بگڑے۔ مینا کار۔ مینا توری مصور۔ گلابی دھندلکے میں لپٹے۔ صحرائی سہانی صبح۔“

خنک دم ہوا ہمالیہ سے ٹکر کر تریا پر سے بہتی آرہی ہے۔
 ”آہا جنت کی کھڑکی کھل گئی، باجیوں کی بات چیت جاری ہے۔
 ”باغ ارم کی خنکی کا تھوڑا سا آئیڈیا تو ہمیں ہو چکا ہے“
 ”رائی نکھیت ہکشمیر؟“

”ملک عنبر کی مسجد۔ اورنگ آباد۔ پن چکی سے ایرکنڈ ٹینڈ۔ ایسی ٹھنڈی۔ راحت انگیز۔ سایہ دار۔ فرش کے نیچے بہتی نہریں۔ تین سو سال سے وہ پن چکی متواتر چل رہی ہے۔ کوئی فرنگی انجینئر اسکا راز نہ جان سکا۔ اتنی دوڑھیل پہاڑوں سے نکال دہ پانی کس طرح لائے جو آجنگ جاری ہے۔“

وہ کیسے لوگ تھے بھئی۔ میں دل میں دہراتا ہوں۔

”پچھلے مہینے ایک سینار کے لیے پھر گئی تھی جے پور۔ یونیورسٹی۔ لوٹتے میں ٹڈے ہاؤس کے ایک پٹر کے نیچے مسٹر غنڈیب بیگ بھی نظر آئیں۔ دوسرے نیچے پون کمار مرہا۔“
 ”اوہ۔ پون مرہا۔ جرنلٹ۔“

”غنڈیب بیگ ڈاکٹر سالم علی کے چیلوں کے ہمراہ برڈ و اچنگ کے لیے پرنڈ آباد بھرت پڑا جا رہی تھیں۔ انکے ساتھی چڑیوں سے مشابہہ تھے۔ ایک سارس نما امریکن۔ ایک کاکا تووا ایسا پارسی۔ ایک شلوار پوش پاموز مرغابی۔“

”جس چیز میں انسان کو شدید دلچسپی ہو ویسا ہی لگنے لگتا ہے۔ ریس کے جو کی دیکھو۔ اور سارنگی نوار۔ خود گھوڑے اور سارنگی معلوم ہوتے ہیں۔“

”من تو شدم۔“

”غذیب بیگ نے اپنی ڈار کے ساتھ طاہرستان کا رخ کیا۔ پون مہرانے بتلایا کہ اسکے اخبار نے انہیں نواب بیگم کے متعلق کھوج لگانے سے پور بھیجا تھا۔ ناکام لوٹ رہی ہیں۔ اتنا بتلا کر پون بھی ہوا ہو گئیں۔ ان سے پوچھ نہ سکی کہ انکی طلاق کے مقدمے کا کیا ہوا۔ یا یہ کہ جھڑنا آجکل کہاں ہیں“

”تعجب ہے نواب بائی اف جے پور کی مٹری اب تک سو لو نہ ہو پاتی“

”مٹری کس کی سو لو ہوتی ہے۔ ہماری تمہاری اور سب کی ہو گئی؟“

”بارش آنے والی ہے“

”ابر کیا چیز ہے۔ ہوا کیا ہے“

”مرزا غالب جغرافیہ میں بالکل کورے تھے۔“

”یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں۔“

”پری چہرہ نواب بیگم کون تھیں۔ پری محل والوں کی دادی تھیں یا نہیں۔“

”ہم تم کون ہیں۔؟۔۔۔ تھے۔ ہیں۔ اور نہیں ہیں۔“

”اللہ کقدر میٹا فریکل گفتگو فرما رہی ہیں آپ“

”آداب عرض کرتی ہوں“

”پون کماری کی سنا ہے دونوں بہنوں کی طلاق ہو گئی“

”ابھی محض کائن کی ہوتی ہے۔ یہ پانچ بہنیں ہیں بجیا۔ کائن۔ کندن۔ چندرن۔ پون۔

پانچویں پیدا ہوئیں تو سنا ہے ایک بگڑے دل نے انکے باپ سے کہا انکا نام متو تا تھ بھن بجھن لکھ لیجے

انہوں نے جویرا جھڑنا“

”اب وہ بن گئیں ماتیشوری جھڑنا دیوی“

”بجیا جب یہ گرو جی کے پھر میں پڑیں۔۔۔ یہ بھبھنیشور سے گئے تھے شراگو۔ بزنس ٹینشن

پڑھے۔ پھر مڈ ویٹ میں ایک فاسٹ فوڈ چین اسٹور کے منیجر ہو گئے۔ جب یہ ”گودین“ بنے

جھڑنا بطور انکی گرو پی ساری دنیا میں گھومیں۔ باجی ہو مقبول فدا حسین تو کمپیوٹر کے ذریعے پیٹ

ہی کرنے لگے ہیں۔ ان گرو جی نے اپنی روحانیت کمپیوٹر ایئر کر ڈالی۔ پون میں انکا فیوچر شک اسٹرم

ہم نے دیکھا ہے۔ جھرناسکی منتظم تھیں۔ وہیں جرمنی میں انکے اوپر آکاش بانی آئی کہ گرو جی سے انکی روحانی شادی ہوگئی ہے۔ ایک دن مجھے بازار میں ملیں مانگ میں سندور۔ پاؤں میں کچھوے کرٹوا چوتھہ کابت رکھے۔ گرو جی قدامت پرست نیک اڑیہ آدمی۔ پکے برجھاری۔ بیجڑ خفا ہوئے چیلوں نے جھرنادی کو دوڑا دیا۔ آشرم میں روز بھگت سے رہنے لگے۔ گرو جی نے غصے میں آکر مینجر کے منصب کے لیے ایک عدر رو بوخر بدلیا۔ اب بہن جھرنارو زج اسکی آہنی پیشانی پر صندل کا قشقہ کھینچتیں وہ انہیں پر نام کر کے اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہوتا۔ ایک دن شاید انہوں نے اسے غلط پروگرام کر دیا تھا نمسکارم کے بجائے اس نے انکی پیشانی گرو دی کس کس کے فولادی جھانپڑیہ آشرم سے بھاگ کر فرانس پہنچیں وہاں خود ماجی بن گئیں۔ اب ایک فرنج کاؤنٹ انکا مینجر ہے۔ اسکانام انہوں نے بادل سوامی رکھا ہے۔ جھرنارو بادل۔ آدمی وہ بھی صورت دار ہے۔“

”خدا کی پناہ۔ آپ کستدر کی گوسپ کرتی ہیں؟ کنور پکارا۔“
 ”مردوں سے زیادہ نہیں۔ بہت سے دانشور۔ اہل قلم یونیورسٹی پروفیسر کو ہم نے سنا ہے۔ اپنے معاصرین خصوصاً لیڈرز کی غیبت کرتے۔ موقع پڑنے پر بھانجی وہ ماریں۔ شراب پی کر ایک دوسرے سے لپاؤگی وہ کریں۔ میری کتاب خواجگان چشت کے اودھی سلسلے پر چھپ جائے۔ میں بھی مصنفین کے زمرے میں شمار کی جاؤں گی۔ پھر دیکھے گا۔ منہ پر تعریفیں پٹیٹھ چھپے برائی اور تفحیک۔ گروہ منافقین۔!“

”یہاں اردو کی ادبی دنیا کا یہ حال۔“ میں کنور سے پوچھتا ہوں۔
 ”خال خال۔ ہے تو کچھ ایسا ہی۔“

”سادتھ ہیروے آگے جہاں اور بھی ہیں! میں چوٹ کرتا ہوں۔ وہ منہ لٹکا لیتا ہے پھر آہستہ سے کہتا ہے ”یار یہ کستی سینا والیاں بھی تو ہیں مہارنا قہ کو پشت ناقہ یہ ڈال کر بے مہار!“

ہرے کج حمد و نعت کی صداؤں سے گونج اٹھے۔ خدام چاؤ کی سینیاں اٹھائے روٹش پر

نمودار ہوتے۔ دور سڑک پر سے گذرتے کدویوں کے گلوں کی ٹٹنا ہٹ۔ پرندوں کی چوہکا رپھولوں کی مہک۔ پروائی کے جھونکے۔ عنقریب میں یہاں سے جانے والا ہوں۔ کہرے کے شہرواپس پچھلے تیس سال سے دس میں روزانہ اسیطرح سویرا ہونا ہے۔ اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

میرے غریب دل تجھے بھائی مسافرت کی شام

ایک وقت آئیہ کا ذکر نکلا۔ مرشد کہ عاشق حسین ہیں، ہال میں تشریف فرما، ایک صاحب سے ”آں امام عاشقاں پور بتول“ والے اشعار سن رہے تھے بعد ازاں ایک شخص نے حاضرین میں سے کہا ”خواجہ حسن بصری کا ارشاد ہے کہ اہل بیت اطہار معانی کی ایسی نازک کشتیاں ہیں جو گہرے پانیوں پر رواں ہیں؛ ملازمہ خیال کی بدولت ہمیں شب برات کی شام گومتی پر چلتے بارہویں امام کے نام کے وہ منور بحر سے یاد آئے جو لکھنؤ میں کچے پل سے روانہ ہوتے ہیں اور عوام پیرتے ہوئے ان تک پہنچ کر اپنے حصے حاصل کرتے ہیں۔ اسوقت ہم نے سوچا کچھ ابھاگے ایسے بھی ہیں جو ایک ناؤ کی طرف جاتے ہیں مگر اپنا بھاگ حاصل کرنے سے قبل ہی موجوں کا تھپڑاٹکو مخالف سمت بہا لے جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پھر اپنے بیوپار اور اپنی بزنس پارٹنر کی فکر ستا رہی ہے۔ ہم بہت بڑی بلا میں ڈالے گئے ہیں۔

ہال سے بیجاں نکلے۔ باہر گھاس پر بقول جرمن باجی وہ اتنا کیوٹ فلندر بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت شانت چہرہ۔ ہلکی چھدری داڑھی بے سڑک کوٹ۔ چند خدام اسکے قریب براجمان۔ وہ بڑے ہی شیریں لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھوں سے انکا نام پوچھت رہے۔ کہن لیلے۔“

یہ جملہ ٹوٹنکی یا تھپڑ کی سٹیج پر CORNY معلوم ہو۔ اسوقت معنویت سے بھر پور! سارا

فرق سینک پیدا کرتی ہے۔ ہم قلندر کی پرسکون شکل دیکھائیے۔

اے نفس مطمئنہ —!

اے نفس مطمئنہ —؟

کنور سینڈی یوکلپٹس کے جھنڈ میں سے نمودار ہوا۔ قریب آکر بیٹھ گیا۔ قلندر اب تالاب کی طرف نگاہ کیے رسائیت سے پڑھ رہا تھا۔ ”جب لگ تن جرت — اور من نہیں مرجات۔ تب لگ مورت شام کی وجہن کہاں دکھات۔ ساہن سے کچھ پر سچے نہیں اور چورن سے یو ہار —“

اد۔ کے۔ میاں کا طریقہ ہے جو کچھ خود نہیں کہنا چاہتے گویا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دوسروں سے کہلوادیتے ہیں اب یہ قلندر سناٹے جا رہا ہے اور ہم سن رہے ہیں۔ ”ساہن سے پر سچے نہیں — چورن سے یو ہار — وجہن جگ میں آئے کے۔ جا میں جو کچھ نیاں۔ نبی نام کی سمرن کیجئے اور علی پر رکھیے دھیان —“

”یہ کوئی پریم مارگی صوفی رہے ہونگے —“ میں نے کنور کو مخاطب کیا۔

”ہلو۔ تم تو بڑے ہوشمند ہوتے جا رہے ہو۔“

”یار۔ اب ایسے ہوش بھی نہیں ہیں۔ مروجہ بڑے باپ یہ سب ملک محمد جاسی، قطبن وطن نہیں پڑھا کرتے تھے؟“

قلندر: ”پیر نگر کو پہنچ کے نبی نگر کو جاتے۔ تب وجہن گھٹ ہی اندر سر کا گالوں پائے۔ بنت بنت بن جی ہے ایسا — کوئی دن منصور یا جیسا —“

”منصور یا جیسا — اہا ڈو ڈو ای ای ٹ — جرمن باجی نے پیچھے سے آکر داد دی۔“

”ملا مت می کند خلقے من بردار می رقص —“ کنور نے اپنا شروع کیا۔ قلندر نے دہرایا: ”تب وجہن گھٹ ہی اندر سر کا گالوں پائے۔“

(۴۵)

خطِ ستوم

اودھی زبان کے چشتیہ صوفی شاعر و جن کی پانچویں سپیٹری کے دو جواں سال بھائیوں نے اپنے پھانک پر میاں کا خیر مقدم کیا۔ وہ دونوں بھائی لامارٹینیئر کالج کے تعلیم یافتہ تھے لیکن ان کا مکان بہت قدیم تھا۔ اور جس قصبے میں وہ رہتے تھے وہ اور بھی زیادہ پرانا تھا اور ایک وقت مدینۃ الاولیاء کہلاتا تھا۔ خیر آبادی کے لحاظ سے اب بھی بہت بارونق تھا مگر جگہ جگہ ان مشہور مدارس اور ٹولٹیوں کے کھنڈر نظر آتے تھے جن میں سے بہت سی انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کھڈوا ڈالی تھیں۔

جس وقت ہم وہاں پہنچے ہیں وسیع مردانے مکان کے سرے پر نبی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی اندر جماعت کھڑی ہوئی اور ہمارے ساتھ آئی ہوئی مسلم خواتین نے بیرونی چوڑے پر مصلے بھاتے۔

نماز کے بعد میں مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی نسل کے ایک بزرگ کا مکان شہر لاہور میں اس جگہ پر تھا جسے شاہجہاں نے جامع مسجد کی تعمیر کے لیے منتخب کیا۔ ان صاحب سے کہا گیا آپ بطور معاوضہ سلطنت میں جہاں چاہیے جا کر آباد ہو جاتیے۔ انہوں نے ایک دور دراز مقام کا نام لیا۔ کہ انکا ایک دوست وہاں رہتا تھا۔ چنانچہ وہ پنجاب سے چل کر اودھ میں آنے لے۔ حضرت وجہن شاہ مجذوبؒ کے جد امجد۔ یہ قصہ بھی سینڈھی نے یہاں آتے ہوئے گوش گزار کیا تھا۔

لکھنؤری انٹیوں کی سیڑھی پر بیٹھے بیٹھے میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ برطانیہ میں

خالی گرجا گھر مساجد میں تبدیل کیے جا چکے ہیں۔ یعنی یورپ کے کلیساؤں میں دوبارہ اذانیں۔ تو کیا تیسویں صدی مغرب میں اردو پریس اس قسم کے اعلانات شایع کریگا۔

عرس حضرت برمنگھم پیئر

تین سو سال قبل حضرت کے جدا کر ۱۹۵۵ء میں راولپنڈی سے برمنگھم۔

صندل مبارک حضرت — شاہ خطب ٹورانٹومی حضرت کے بزرگ ۱۹۶۲ء
میں حیدرآباد دکن سے تشریف لائے تھے اور —

والٹر مٹی کا تخیل پھر کارفرما ہو چلا تھا کہ ایک آہٹ نے چونکایا۔
ایک صاحب، سر پہ آسٹرن ہیٹ جس میں نیلا پر لہرا رہا تھا، بڑھیا دلائی برساتی
سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہیٹ اتار کر آداب عرض کیا۔ اجازت چاہ کر سیڑھی پر بیٹھ
گئے۔ سامنے کا منظر بغور ملاحظہ کرنے لگے۔

احاطے میں ایک کوچ کھڑی تھی۔ چند کاریں، رکشائیں، سائیکلیں، پوچھت رہی
تھی اور گرد و نواح سے ایک ہجوم میاں سے ملنے کے لیے آن پہنچا تھا۔ امیر غریب ہندوؤں
کا ایک گروہ مردانے مکان کی سمت جاتا نظر آیا۔

”یہ سب مرد بننے کے لیے آتے ہیں۔ عجیب فونمن ہے۔ یا بھگتی۔ یا بیعت۔ جناب
بخوبی واقف ہونگے۔ غیر مسلمین کو مرید کرنا چشتیہ مسلک ہے — محبت۔ جمال۔ نغمہ۔
جولی گڈ۔ ڈوٹ۔“

سگار سلگا کر چند منٹ خاموش رہنے کے بعد اچانک وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب
ہوتے: ”جناب آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ نظام کائنات کے سارے سیارے اور آفتاب پہلے
محض گیس اور میلیم کے روشن بادل تھے۔“

”جی ہاں۔“

ایک اور سنگی۔

”اور کراہے ارض پر پہلے لاکھوں برس تک موسلا دھار بارش ہو اگی۔“

”جی۔“

”اور پٹن کے آخری دھماکے کے بعد آئندہ لاکھوں برسوں تک پھر جھڑی لگو

رہے گی۔“

”عین ممکن ہے۔“

”تو اس کرڈوں اربوں برس کے گیس اور بادلوں اور بارشوں کے سلسلے کے

درمیانی وقفے میں فقط دس بارہ ہزار سال کی انسانی تہذیب اور اسکے تخلیق کرد

معبود اور ادیان اور فلسفے اور روحانیت وغیرہ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جبکہ طرہ یہ کہ سا

کائنات مسلسل پیچھے کھسک رہی ہے۔ آپ وہ سامنے والی سرخ کوٹھی دیکھتے ہیں

”سرخ — وہ مجھے تو زرد رنگ کی نظر آ رہی ہے۔“

”جی نہیں۔ سرخ۔ وہ پھانگ کے دائیں جانب۔“

”وہاں ایک جنگل کھڑا ہے۔“

”وہی پہلے آپ کے ان میزبانوں کی وسیع کوٹھی تھی۔ گذشتہ تیس برس کی برساتوں

میں درود یوار پر سبزہ آگ آیا تو یہ اپنی دوسری سالم کوٹھی میں اٹھ آئے۔ اسم شریف

”دھان پور۔“

”ادہ — ان لوگوں کے — ہم لوگوں کے مانند سابق بیڑن ایکوں صاحب۔“

دھان پور کو کتنا ثبات رہا؟

ہم نے یہ سنکر تہمت سم کیا۔

”اسی طرح سارے کراہے ارض کو بارش اور جنگل بڑھ کر لیں گے آپ ہیں کس

خیال میں؟ جناب والا۔ اربوں برس کی متحرک گیس اور چٹختے ہوئے آتشیں سیار

درگھٹا ٹوپ برف اور لگاتار برسات اور جب ذرا کی ذرا مطلع صاف ہوا تو آپکا یہ انٹرویو۔
 درلا محدود کائنات کے مقابلے میں گویا بحر الکابل پر تیرتے مٹر کے دانے جیسی حقیر دنیا
 — ایسی سچویشن میں روحانیت اور الہیات اور مابعد الطبیعات کی کوئی حقیقت ہے؟
 ”مزید برآں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھیے کہ
 نہرت عام اور بقائے دوام کی تمنا میں بلکان ہوتے جاتے ہیں؟ انہوں نے برساتی
 لی جیب سے ایک پلندہ نکالا۔

”ملاحظہ ہو۔ ایک بے انتہا نامور شاعر لوئی بوریسٹی میں میرے استاد تھے۔ وقتاً فوقتاً
 بنی تعریف میں خود مضامین لکھ کر بھیجتے رہتے ہیں کہ میں انکو اپنے نام سے چھپوا دوں۔“
 ”اور آپ چھپواتے ہیں؟“

”جی استاد کا حکم۔“
 ”آپ صبح صبح یہ فائیل لیکر گھر سے نکلے؟“

”سرکار کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں۔ انکو اپنا تازہ کلام سنانے۔ سرکار
 بہت شفقت فرماتے ہیں۔“
 اپنی تجربیدی نظم سنانے لگے۔

جمع بڑھتا گیا۔

ایک مسکین سا ادارہ کتا پھاٹک پر کھڑا تھا۔ کسی بچے نے اسے کھینچ کر پتھر مارا۔
 تپا چیں چیں کرتا بھاگا۔

”کیوں مارتے ہو۔ وہ بھی خدا کی مخلوق ہے۔“ مسجد کی سیڑھیاں اترتے ہوئے
 نے نے تنبیہ کی۔ اور کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

پر لگی ہیٹ والے شاعر میری طرف متوجہ ہوتے ”جناب کو تو علم ہوگا صوفیاء کے
 کتابھی ایک مقام رکھتا ہے۔“
 ”جی“

”میاں کا ارشاد ہے کہ بقول خواجہ حسن بصری ”مخلصین، صادقین، متوکلین، راضئین اور شاکرین کی ایکس صفات ایسی ہیں جو کتے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ شب زندہ دار ہے صابر۔ محبت شعار۔ یہ تمام خصوصیات ایک عام انسان میں ہوں تو وہ دلی ہو جائے۔ محبت توکل۔ عجز۔“

بات ادھوری چھوڑ کر وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔
دیدمی چاء کی کشتی اٹھائے نزدیک آئیں۔

”چاچا ہو۔ چا۔“ اہوں نے پیالیاں پوتے سے پر رکھ کر مجھ سے کہا۔

اسٹریٹ ٹیوپی والے صاحب ”ایلس ان ونڈر لینڈ“ کے MAD HATTER کی طرح چائے کی پیالی ہاتھ میں سنبھالے، میاں کے تعاقب میں چل دیے۔

زرد رنگ کی کوٹھی میں ناشتے کے بعد کنور بولا۔ ”میاں کا فیورٹ اخبار ابھی نہیں پہنچا۔ چلو لپک کر شہر سے لے آویں؟“

راستے بھر وہ سُر داس کا ایک دلاؤیز پیکنگنا تا آیا۔ کو ہے جنگ، جینی کو کہینے کوناری۔ کو داسی۔ کیسورن۔ ہمیش سے کیسو۔ کسے ہی رس میں ابھیلاشی۔ شہر پہنچ کر اس نے اپنی مرمت طلب گاڑی و رکشاپ میں چھوڑی۔ سائیکل رکشاپر کتب فروش ہاں پہنچے۔ چند منٹ بعد ایک اسٹیشن وگن آکر رکی۔ ایک نسوانی آواز نے چونکا یا ”کیوں صاحب آپکے پاس نازہ ہڈی ہے؟“

”جی۔۔؟“

”ہڈی۔ ہڈی۔ وہ ریلی جس میگزین دلی سے نکلتا ہے شاید“

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ”اسٹڈی این بلو“ نیلے سلیکس کا بیش قیمت جوڑا۔ چوہی ایٹری کے بڑھیا جوتے۔ طویل رو پہلی زنجیر سے آویزاں اطالوی پرس۔ لطیف و نفیس میک اپ مصنوعی طور پر سنہرے کیے ہوئے بال۔ گورارنگ۔ سبحان اللہ۔ غالباً بیلیج آباد کی ایک صبح بٹھان زادی باغات انبہ کی آمدنی سے مالامال۔ خدا کی پناہ۔ دولت کا خیال کسی طرح دل سے نکلتا ہی نہیں۔

”یو مین ٹو سے ہڈی میڈم۔“ انکی وضع قطع دیکھ کر دوکاندار انگریزی پہ اترا۔
 ”ہاں۔ ہاں۔ وہی۔“

”آخری پرچہ بچا تھا میڈم وہ ان صاحبان نے خرید لیا۔“
 ”اوہ۔۔۔ میرے ماموں جان نے تاکید کی تھی تازہ پرچہ لیتی آؤں۔ شاہجہاں پور میں بھی نہیں ملا۔“

”اگر مناسب سمجھیں تو پتہ بتلا دیجئے چند روز بعد اسے پوسٹ کر دیں گے۔“ کنور نے اخبار پلندہ اٹھاتے ہوئے عرض کی۔ ”یہ پرچہ اپنے مرشد کے لیے خریدا ہے۔“

”مرشد؟ وچ کلٹ؟“
 ”نوکلٹ۔“

”انڈونیزیا کا ایک صوفی سنٹر بھی کور کر چکی ہوں۔ اسکا ایڈریس بتائیے۔“

”نوسنٹر۔ نو آفس۔ نور جسٹرز۔“

”آپ تو نو نو ہی کیے جا رہے ہیں۔“

”ابھی نفی کے مقام پہ ہیں۔“ کتب فروش نے مسکرا کر کہا۔

”جی۔۔۔ ہنسیے حضرات۔ میں فری لانس جرنلسٹ ہوں۔ ویسٹ کے ایک سے ایک

اسٹریم لائینڈ لوگا آسٹروں سے واقف۔ آپ کی کون سی ایسی انوکھی جماعت ہے؟“

”نو جماعت!“

”آپکے گرو کا اسٹوڈیو کرنے چلتی ہوں۔“

”اسٹوڈیو۔۔۔ ہا ہا۔“

انہوں نے بڑی شان سے اپنا سنہرہ کارڈ پیرس میں سے نکالا۔ اسٹاک ہوم کا پتہ او۔ لا۔ لا۔ لا۔ میں نے دل ہی دل میں سیٹی بجائی۔ اس نوع کے خوش آئند این کاؤنٹر تو ہم بھول ہی چلے تھے۔

”جوہ میں نے اپنا تعارف مختصر رکھا۔ علی اینڈ سنگھ۔“
”گویا اینٹھ اینڈ اسمتھ۔“ وہ مسکرائیں۔ مغربی یورپ کی ایک گھاگ اخبار نویس۔ اب چونکہ رہنا چاہیے۔

”اپنی بہن سے ملنے شاہجہاں پور آئی ہوئی ہوں۔ کل معلوم ہوا اس شہر میں ایک عدد برائڈ بزننگ ہوگئی ہے۔ صبح صبح موقع واردات پر پہنچی۔ پتہ چلا اطلاع غلط تھی یا معاملہ ہش آپ کر دیا گیا۔ مگر جیسے باؤ لے گاؤں میں اونٹ۔ پل کی پل میں پھر لگ گئی میں ہڑ بڑا کر کار کی طرف بڑھی۔ ایک اچکا میرا کیمرو چھین کر بھاگا۔ چلیے سے مسلمان لگتا تھا۔ شکر ہے کیمرو خالی تھا۔“
”افسوس۔ تمھانے میں ریٹ درج نہ کی؟“

”نیورما اینڈ میر سے پاس ان گنت کیمرو ہیں۔ ایک سے ایک بڑھیا۔ چلیے اس مفلس ملک کے ایک مفلس مسلمان کو اسی بہانے ایک جرمن کیمرو تول گیا۔“
کنور نے سراٹھا کر چھت کو دیکھا۔ کتب فروش مسکرایا۔ وہ کہتی رہیں: ”صبح آپا جان کے گھر سے چلتے وقت جلدی میں ناشتہ بھی نہیں کیا۔ یہاں قریب کوئی سلا دبار ہوگی؟“

”سلا دبار۔۔۔؟ بیگم صاحبہ۔ یہ امریکہ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ کتب فروش کے مشورے پر ان کو نزدیک کے شان اسلام محمدی ہوٹل لے گئے۔ ایک وسطی میسنر پر جا بیٹھے۔ چھوکر سے نے لپک کر جھاڑن سے پھولدار پلاسٹک کا میز پوش صاف کیا۔ سامنے تنور پر مرغن کھانے تیار ہو رہے تھے۔ ایک تہمد پوش نوجوان نہایت فن کاری سے رومالی چپاتیاں ہوا میں اچھالنے میں مصروف تھا۔

”اسی قسم کے ریٹورانوں کے چھوکر سے ہمارے لڑکین میں وہ فلسفیانہ آواز لگایا کرتے تھے کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا چار آنے۔“ کنور بولا۔

ٹیل ڈیشن پر کرکٹ میچ دکھلایا جا رہا تھا۔ آبی اور سفید ٹائیوں والی دیواروں پر

سنہرے فریم میں آیات قرآنی، گنبدِ خضرا۔ طغرے۔ مالک طعام خانہ کا قوٹو خراف دو پہلو انوں کی تصویریں بڑے بڑے آئینوں پر منقش اشعار۔ گنڈا اولد مسلم سوسائٹی۔ لذیذ کھانے اور اردو شاعری —

چند حضرات اردو اور ہندی اخباروں میں منہمک تھے کبے شریف اور مسجد نبویٰ کی تصاویر والے بڑے بڑے کیلنڈروں پر انکی مسلمان کمپنیوں کے نام ہندی رسم الخط میں۔ نیا ہندوستانی مسلم معاشرہ۔

صحافی خاتون نے طعام خانے کا جائزہ لیکر آہستہ سے کہا — ”کلچر شوک پیکلچر شوک“ ”بیشک۔ بیشک“ کنور نے متانت سے سر بلایا۔ اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ ”میرے شوہر شینگ میں ہیں۔ ہم سوئیڈن میں رہتے ہیں۔ پہلے نورتھ امریکا میں تھے۔ جرنلزم میں نے یونیورسٹی آف سسکاچون سے کی“

”خاکسار نے سنسنائی سے“ بہت دنوں بعد اپنے قوم پہ تھا۔ ”خوب! تو گویا آپ میرے کولیگ ہیں۔ مسٹر استھ۔ آئی مین — مسٹر علی۔ تھر ڈورلڈ میں آپ بھی کسی پروجیکٹ پر آتے ہوئے ہیں۔؟“ ”جی نہیں یوں ہی“

”آپ کو یہ ملک بیک درڈ نہیں لگتا۔؟“ ”کیا کیا جاتے مائیں بھی تو دنیا نویں ہوتی ہیں اور اکثر ایئر ڈ۔۔۔“ ”سنٹی مثل مش۔ یہاں منسٹروں سے لیکر دانشوروں تک سب کلیشے رٹ ہے ہیں“ ”حتیٰ کہ کلیشے کی شکایت بھی کلیشے بن چکی ہے۔ مہم!“

”سکنڈریٹ لٹریچر۔ تھر ڈریٹ ٹی۔ وی۔ نورتھ ریٹ، سوومر — ڈیم — میں اپنی بھانجی کی شادی ائنڈ کرنے آرہی تھی۔ ایک سویڈش میگزین نے فوٹو فیچر کا اسائن منٹ بھی دیدیا۔ کیونل رائیٹس۔ برائیڈ برنگ۔ قحط۔ بھکاری — یونو اول دیٹ۔ بے شمار رول تو میں نے ٹرینوں کی چھتوں پر لد سے مسافروں پر ہی ختم کر دیے۔ ایسٹرن یو پی۔ بہار — ناقابل یقین“

کنور واپس آیا۔ ساتھ ساتھ پٹرکلف ناشتہ اور چاء۔

”بس یہی ایک چیز یہاں دل کو گرماتی ہے۔ لوگوں کی مہمان نوازی اور خلوص۔“
وہ ہنسنے لگا۔ ”آپ تو واقعی بہت ہی زیادہ مشفق فوئرز کی طرح بات کر رہی ہیں۔ آپ

خود کہاں کی رہنے والی ہیں۔ بلیا۔۔ بستی؟“

”شاہجہاں پور۔“ ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ ”لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں

بیاہ ہوا۔ اسکے چند سال بعد ہم لوگ باہر چلے گئے۔ پچیس سال سے وہیں ہیں۔ بیچ میں

محض ایک مرتبہ آئی تھی جب۔۔ جب۔ میرے ابو کا انتقال ہوا تھا۔“

چندر دز کے لیے وطن آنے والے ”غیر ملکوں“ کا وہی پامال منظر نامہ گھسے پٹے نکالے

وہی مانوس رد عمل اور ترمیم آمیز سرپرستانہ انداز۔

”آپ لوگ اسی شہر میں رہتے ہیں؟“

”لکھنؤ۔“ کنور نے جواب دیا۔

وہ چونک پڑیں۔ ”کرامت حیئن کی پرنسپل سے واقف ہیں؟“

”ہماری بی بی جانتی ہیں شاید۔“

”میں اپنی لڑکیوں کا داخلہ کروانا چاہتی ہوں۔ مسز سنگھ سفارش کر دینگے؟ سنا ہے

انڈیا میں داخلے بڑی مشکل سے۔“

”لڑکیوں کا داخلہ۔۔ مگر آپ تو سویڈن۔۔“

”کرامت حیئن۔ ورنہ علیگڈھ۔ جب ہم یہاں تھے ہماری شدید تمنا تھی کہ اس قابل

ہوں کہ اولاد کو ویسٹ میں پڑھا سکیں۔ اب وہیں کے دو تہند باشندے ہیں اور چاہتے

ہیں کہ۔۔ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟“

”بالکل نہیں مادام۔“

”آج سے دس سال قبل، جس روز ہمارے سادہ آٹھ انڈین اور تھوڈو کس برہمن

پڑوسیوں کی مٹی کمر تک لیے سرخ بالوں والا ایک فوناک، تھوڈو ریٹ پوپ سنگر اپنے

ماں باپ کے ہاں سے آئی یہ فیصلہ ہمیں جمعہ کر لینا چاہیے تھا۔ مگر جب ہماری بڑی مٹی بھی

فریک آؤٹ کر گئی تب ہمیں ہوش آیا چلو خیر لڑکا جو چاہے کرے مرد ذات مگر بنیاں بڑی لڑکی یہاں سے پانچ سال کی گئی تھی چھوٹی دونوں وہیں پیدا ہوئیں۔ انہیں یہاں بھیج دے گی۔
”یہاں وہ بس فٹ نہ ہوگی؟“

ظاہر ہے۔۔۔ بچہ۔۔۔ لیکن آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے؟ میں اتنی پریشان ہوں کہ انالس میں بھی جا چکی ہوں۔۔۔ خایدہ ہوا خاک دھول۔۔۔ جب ہم دونوں یہاں سے مائیکریٹ کر رہے تھے اس پر دلہم کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ فیوچر اسوقت بہت دور تھا۔ لوم صاحب پلک چھپکتے میں وہ سامنے آگیا۔

”فیوچر شوک۔۔۔ انور بولا! مادام۔ ہم اور ہمارے دوست۔۔۔ مسٹر علی، ہم دونوں کی جزیں تو سمجھے حد سے حد ستل سال اور کھینچ لے جائیگی لہذا۔۔۔ یہ خود غرضی کی بات ہے۔۔۔ لیکن ہم کو اتنی فکر ہے نہیں۔ آپکی مدل جزیں کو البتہ ابھی کو اور سچری اور زندہ رہنا ہے۔۔۔“

”اماں کیوں ایسی ہولانے والی بات کرتے ہو؟ میں نے اعتراض کیا۔
’لہذا مسز خان۔ آپ لوگوں کو ابھی بہت کچھ اور دیکھنا باقی ہے اسکے لیے ابھی سے جی کمر اکر لیجئے“

”ہماری بڑی لڑکی نے جولائی اسٹائل اختیار کیا ہے۔۔۔ وہ فیشن ڈیزائزر ہے۔ الگ فلیٹ لیکر رہتی ہے۔ اب کم از کم چھوٹی دونوں۔۔۔“
کنورا بہتہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”سیارے سیاروں سے ٹکرا رہے ہیں۔۔۔ پہاڑوں کے گالے کے مانند اڑیں گے۔ اور۔۔۔“

”جی۔۔۔ ہٹنیے۔ آپ کا کیا پروگرام ہے۔؟ اسوقت لکھنؤ جا رہے ہیں۔۔۔؟“
”بیگم صاحبہ۔ ہم کارخانے سے کار لے آویں اس کا رخیر کے لیے آپ کو فوراً لکھنؤ لے چلیں گے اور اپنی بی بی سے آپ کو ملو اگر فوراً لوٹ آویں گے۔ آپ کہاں مقیم ہیں؟“

”بتلایا تو۔ شاہجہاں پور۔ اپنی بڑی بہن کے ہاں۔ فوٹو فیکر کا کام مکمل ہو گیا مائیس برائیڈ برنگ جسکا افسوس ہے۔ اب کالجوں کے متعلق معلوم کر کے اتوار کو یورپ واپس۔“

ہم تینوں ہوٹل سے نکلے۔

کارخانے کے مالک حاجی صاحب نے کہا گاڑی تیسرے پہر تک —
 ”مجال ہے جو اس ملک میں کوئی کام وقت پر ہو جائے“ مسٹر خان بڑبڑاتی ہوئی اسٹیشن
 دگن سے اتریں۔

”بیگم صاحبہ ہم ابھی آتے ہیں پانچ منٹ میں۔“ انکے ڈرائیور نے کہا اور غایب ہو گیا۔
 ”سینے۔ ایسا کرتے ہیں“ کنور سرگھجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے شو فر کو پتہ بتلائے دیتے ہیں۔
 غریب خانے پہ تشریف لے جائیے۔ پرتیبھا گھر پہ ہونگی انکو یہاں سے بھی فون کیے دیتے ہیں۔
 ہم لوگ بس پکڑ کر حضرت کی خدمت میں واپس جائیں۔ بہت دیر ہو گئی۔“
 ”مجھے شک آؤں مت کیجئے۔“ انہوں نے نردس انداز میں سگریٹ جلایا: ”میں بھی فکر مند
 ہوں۔ چلیے آپکو آپکے صوفی سٹر پہنچائے دیتی ہوں مجن خاں۔“

”کھا نصاب شاید چاء پینے چلے گئے۔“ ایک سٹری نے جواب دیا۔

”میرے رشتے داروں کی کار ہے۔ میرا شو فر ہوتا اس وقت نکال باہر کرتی“ وہ جھنجھلا کر
 ایک کرسی پر ٹپک گئیں۔ سینڈی اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ حاجی صاحب چاء اور ناشتے کی
 کشتی اٹھواتے پہنچے۔ انہوں نے اصرار کیا ”غیر ملکی“، ہمان نے انکار۔ انکے جانے کے بعد
 بولیں: ”یہاں لوگ خاطرہوں کے مارے بھی ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ ایسی بھی کیا گر جوشی۔“
 اب ایک ملازم دیسی کوکٹ لیکر حاضر ہوا۔ انہوں نے پھر ناک بھوں چڑھانی میں
 نجل ہو کر سٹرک کی طرف دیکھنے لگا۔ جوہری کی دوکان کے سامنے ایک کارا گر رکی۔ نفیس
 غراروں میں بلبوس بیگمات اتر کر اندر گئیں۔ پھر ایک جنرل اسٹور کے سین نے متوجہ کیا۔
 شیردانی میں بلبوس ایک بارش نوجوان صاحب خریدنے میں مصروف تھا۔ مٹا سا سرخ غرارہ
 پہنے ایک بچی نے ہاتھ اونچا کر کے کاؤنٹر سے پلاسٹک کا کوئی کھلونہ اٹھایا اسٹ پلٹ کر
 اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسکے ہاتھ سے گر گیا: ”ابو“ اس نے چہرہ اٹھا کر باپ
 کو ہلتی نظروں سے دیکھا۔

”کیا قیمت ہے؟“ نوجوان نے دریافت کیا۔

”چھ روپے“ دوکاندار نے جواب دیا۔

”بیٹا۔۔۔“ شخص مذکور نے جھک کر بڑی نرمی سے کہا ”اس مہینے ہم نے تمہارے

لیے نیا فراک بنا دیا ہے یہ کھلونہ اگلے مہینے خرید دینگے“

وہ بہت چھوٹی بچی تھی پانچ یا چھ برس کی۔ لیکن اس نے ضد نہیں کی۔ چپ رہی دو دن

سنبھالتی باپ کی انگلی تھامے آگے چلی گئی۔ رضا و تسلیم۔ وہ باپ سے۔

”سوئیڈش“ لیڈی بھی محویت کے عالم میں یہ دل دوز منظر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنی طنز

متوجہ پا کر مسکرا سے آلودہ نم پلکوں پر پھٹکلیا پھیری۔ کچھ توقف کے بعد بولیں: ”میرے ابو۔

ایسی طرح میں انکی انگلی تھامے بازار جاتی تھی۔ لہجائی نظروں سے کھلونے دیکھتی۔

وہ خرید نہیں پاتے تھے۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھے۔ میں بھی بالک ہٹ نہیں کرتی تھی۔ اماں

نے اس کمسنی میں سمجھا رکھا تھا۔ پتہ مارنا سیکھو۔ بیٹیوں کے لیے پتہ مارنا بہت ضروری ہے۔

”اب میرے پاس برن آؤٹ یوں کی اتنی دولت ہے کہ مجھے کسی چیز کے لیے پتہ مارنے

کی ضرورت نہیں۔ میری لڑکیاں تو اس تصور ہی سے نا آشنا ہیں۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی

سانس بھری۔

”میرے شوہر اچو منٹ کی اس اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں کہ اب اپنی بورڈم کو صبح سے شام

تک شراب میں غرق کرتے رہتے ہیں۔ ہماری بڑی بچی شروع شروع میں بالکل فریک آؤٹ

کر گئی تھی۔ میرے شوہر اس حد سے تقریباً الکحلک ہو گئے۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے ہیں

میں نے دن رات جدوجہد کر کے یہ دولت اسیلے کمائی تھی کہ میری بیٹی۔۔۔ اوہ۔۔۔

گوڈ۔۔۔ مسٹر علی ابھی مسٹر سنگھ نے وہ کیا بتایا تھا۔ ہکھایا یا کچھ نہیں گلاس توڑا چار آنے

۔۔۔ مسٹر علی ہم واقعی اپنے ہر سے جاہرات، ہنگ کوٹ، سوئس اکاؤنٹ چبا کر نگل تو نہیں

سکتے۔ اور ہماری بچی گلاس کی طرح ریزہ۔ ریزہ۔۔۔“

”آپ اس جملے کی ذرا زیادہ ہی فلسفیانہ تاویل کر رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے حالات

اتنے نہیں بگڑے۔“

”آپ حیران ہونگے کہ — سرراہے، اتفاقاً پہلی ملاقات میں ذاتی مسائل بیان کرنے بیٹھ گئی۔ لیکن شاید اس ایٹھنگ کلپٹر کا اثر ہے فیملی اور ٹیڈ سوسائٹی جہاں لوگ چھوٹے ہی ایک دوسرے کو باجی دیدی بھیا، چچا پکارنے لگتے ہیں“

بالکل حیران نہیں۔ عاصی اس قسم کی متمول پریشان حال میکڈاپ بیویوں کے اچانک کنفیشنر کا عادی رہا ہے۔

”یا آپ کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو کوئی ڈنس اسپائر کرتی ہے؟“

بندہ اسی کو اٹی کی وجہ سے ہمیشہ کا مران رہا۔

”میں ابھی اپنی ایکس ٹنڈ ڈیملی کے خلوص کا تجربہ کر کے آرہی ہوں۔“

”جبکہ آپ کو اپنی نیوکلیر فیملی کی عادت ہو چکی ہے“

”نیوکلیر — کا کیا ذکر تھا بھئی —؟“ کنور نے واپس آتے ہوئے پوچھا ”جب پہاڑ روٹی کے گالوں کی طرح اڑیں گے —؟ اور —“

”میں آپ دو اجنبیوں سے خود کو ریلیٹ کرتے پارہی ہوں۔ مسٹر سنگھ میں آپ کو ہر سال یورپ سے راکھی بھیجا کر دوںگی۔ آپکی چال ڈھال اور نوکیلی مونچھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ راجپوت ہیں۔ ایم آئی رائٹ ہ راجپوت بھائی کی پٹھان بہن — داد —! رکشا بندھن کا تہوار کس مہینے میں پڑتا ہے؟ انہوں نے پرس سے نوٹ بک نکالی۔

مسز خان اب ہندوستان کے روٹینک ٹریپ پر چلی گئی تھیں۔

راگہروں کے ہجوم میں سے انکا ڈرائیور نمودار ہوا۔

قصے کی طرف واپسی کے دوران وہ بالکل خاموش رہیں۔ کنور نے پھر سورا س گنگنا نا شروع کیا — کو ہے جنک، جنسن کو کہیت۔ کوناری کو داسی — کیسو ورن — ہمیش ہے کیسو — کے ہی رس میں ابھیلاشی — کون دیس کے باسی رے ادوہو ایٹشن دیگن میزبانوں کے پھانگ میں داخل ہوئی۔

تیسرے پہر ایک درگاہ پر گئے۔

”اسکا کچھ بیک گراؤ نڈر دیکھتے۔“
 ”شاہ مینا صاحب کے خلیفہ۔ کیلف نہیں۔ بیگم صاحبہ۔ لکھیے۔ خلیفہ۔“ کنور بولا۔
 ”او۔ کے۔ نیور مائینڈ: انہوں نے نوٹ بک بند کر دی۔
 خواص و عوام نے میاں کو گھیر رکھا تھا۔ دد پٹی ٹوٹیوں اور نرم چہروں والے ثقہ عمر
 رسیدہ شرفائے قصبہ کو دیکھ کر میرے حلق میں کوئی چیز آن آئی۔
 ”کلچر شوک۔“ کنور نے مجھے اداس پا کر آہستہ سے دریافت کیا۔
 ”بلکومت۔ بڑے آبایا دا گئے۔“

”بھائی۔ جس اوڈیسی پر تم نکلے ہو اسمیں بڑے بڑے مقام آدینگے۔ جان لیوا،
 ”اوڈیسی۔“ ڈانس۔“ آپ ڈانس بھی ہیں؟“ غیر ملکی، مہمان۔ قوالی کے شور
 کی وجہ سے بات صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔

”ہم ہیں وابستگان زلف دراز۔ دور تک سلسلہ تمہارا ہے۔ دور تک۔“
 ”یہ مقبرہ فیضی نے آگرے سے معمار بھیج کر بنوایا تھا۔“ کنور سینڈی۔
 ”آگرے سے؟ سنا ہے وہ خود تو بیرت میں رہتے ہیں۔“
 ”شو۔ شو۔“ قوالی سننے دیکھے بھی، بیچھے سے ایک خاتون۔ انکے گردہ میں

کھسک پٹیر ”یہ کون بی بی ہیں؟“
 ”انگرو ڈبرگماں از سویڈن“
 ”ڈونٹ بی کینی ٹکھت۔“
 ”شو۔ شو۔“

”ایسے بلوم کی دھوم مچی ہے۔ لاگی ہے پریم بچریا۔ مورے بانکے انوکھے سانواریا۔ مورے
 گئیٹاں۔ ہم ہیں وابستگان زلف دراز۔ لاگی ہے پریم بچریا۔“
 مسز خان نے درگاہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مایوس ٹورسٹ کی آواز میں کہا۔
 ”کسی کو حال تو آیا ہی نہیں۔“
 ”میاں کارو جانی کنٹرول۔“

”آپ لوگ س دنیا میں رہتے ہیں؟“

کنورا کے ڈرائیور محنت خاں سے مخاطب ہوا ”دیکھو بھئی ایسا کرو کر اب سیدھے لکھنؤ جاؤ اور علی گنج پہنچ کر۔“

”سب ہندوستانی شتر مرغ ہیں۔ سنیے میں کل تک یہاں ٹھہر سکتی ہوں؟“
دوسری شام۔ میزبانوں کا مردانہ مکان۔ محمود آباد کے قوال۔ مسزخان کنور سے:

”دہی سنو اتیے۔ لاگی ہے پریم نریریا۔“

رات۔ ایک قدیم درگاہ سے ملتی ایک خوش منظر قریہ۔ میزبان ایک نوجوان حاجی۔
میاں کے آئینے رو پہلی برو کیڈ کی صدری پہنے۔ دوسری منزل پر ٹی ڈی چل رہا تھا۔ ایک
لڑکے نے جاپانی کیمرو نکال کر تصاویر لینی شروع کیں۔ کنور نے ذرا گینے پن سے مسکرا کر
مسزخان کو دکھایا۔ وہ ہاتھی کی یادداشت رکھتا ہے۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ انہوں نے ذرا جھپ کر پوچھا۔

”نئے KULAK —“

میاں بی بی سی کی خبریں سننے میں منہمک تھے۔ سارے مہمان انہیں تکے جا رہے
تھے۔ ہم لوگ ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ برو کیڈ کے غرار سے پہنے چارپانچ عورتیں کمرے
میں آئیں۔ بعد دست بوسی فوراً واپس گئیں۔

”قبضوں میں پردے کی بڑی شدت ہو کر تھی؟“ مسزخان۔

”اب بھی ہے مگر پردہ لیڈیز کو میاں کی زیارت کے لیے مجمع عام میں آنے کا رول سینکشن

حاصل ہے۔ یہ قدامت پسند معاشرہ اپنے دلی پہچانتا ہے۔“

”کیا وہ ہجوم کی ذہنیت کو پیوری فائی کر دیتے ہیں؟“

”حقیقت تو یہی ہے۔“

”یونوسم بھنگ مسٹر علی! آپ مجھے ایک سید کلر فیل آدمی معلوم ہوئے۔ نجائے یہاں کیا

کر رہے ہیں؟“

”میاں نے میرے ذہن کو بھی پیوری فائی کر دیا ہے۔“

”اِن ڈیڈے!“
 ”اُسی ابھی خبر آئی ہے کہ فیض آباد کی خاتون ڈاکو ماراوتی پکڑ لی گئیں۔ تترت جا کر انکی گرفتاری کو رکھیجئے اپنے فولو پمچر کے لیے“ جرمن باجی کا مشورہ۔
 ”آپ مجھے یہاں سے بھگانا چاہتی ہیں؟ کیونکہ شاید پہلی مرتبہ آپ کے اس چارڈسٹرکل میں ایک فرد ایسا آیا ہے جو۔“
 ”مہاراج کی خلافت بہت جسے کرتے ہیں۔“
 ”خلافت؟“

”سر لا دیدی کا مطلب ہے مخالفت۔ کل آپ جن بزرگ کے روضے پر گئی تھیں انکو اکبر نے آگرے بلایا۔ فیضی نے بطور آزمائش ملی اور جیل کا قورمہ ستر تون پر پیش کیا۔ آپ نے فرمایا جہاں سے آتی ہو وہیں چلی جاؤ۔ ملی قاب سے نکل کر بھاگ گئی چیل آر گئی۔ فیضی آپ کے قدوں پر گر پڑا۔ آپ نے فرمایا ہم پانی کا حکم رکھتے ہیں جو ہم پر پڑا گذر گیا ہمیں کدورت سے مطلب نہیں“
 ”تھوک اینڈ بل کے بجائے کیٹ اینڈ کائیٹ اسٹوری۔“ مسز خان نے کہا۔
 ”ادب سے بات کیجئے“ کنور غز آیا۔

تیسرے روز۔ ایک خان صاحب کے اونچی دیواروں والے تری قسم کے خانہ باغ میں چار۔ چمن کے ایک گوشے میں ایک صاحب قہہ سنا رہے تھے۔ ”تو جناب والا حضرت امام حسین علیہ السلام نے تو کر دیا منع۔ مگر آپ کی شہادت کے بعد زعفران کا لشکر تاقیامت نوہ گر رہنے کے لیے دشت کر بلا میں خیمہ زن ہو گیا اب تک وہیں موجود ہے اور روز حشر تک گریہ کرتا رہے گا۔“

”ہاؤ سوئیٹ۔ آڈ ٹومی ای ہیٹ۔“ جرمن باجی۔

”دشت کر بلا میں تو اب بازار ہیں اور ایک عدد فائیو اسٹار ہوٹل۔“ مسز خان ہنس پڑیں۔
 ”روش پراگے بڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔“ مگر تعجب ہے اتنے اور تھوڈ وکس ماحول میں ایسی ری ایکسڈ قسم کی ایکسڈ سوسائٹی۔ شاید اسوجہ سے کہ سب کی توجہ فرد واحد پر مرکوز۔“

”درست۔“

”گویہ جرمن باجی کافی Low I.Q. رکھتی ہیں بے چاری“
جرمن باجی کی انکے متعلق یہی رائے تھی۔

چوتھی رات۔ بعد نماز عشاء، مسر خان بوکھلائی ہوئی چبوترے پر آئیں۔ ”مسٹر علی۔ ابھی ایک صاحب کسی شخص سے سرگوشی کر رہے تھے میں میاں کے پاس ایک پروہلم بیکر آیا تھا۔ جاننا دے کے مقدمے کے متعلق چند نکات کا محض میرے والد مرحوم کو علم تھا وہ موجود نہیں۔ سرکار نے فرمایا تو ان سے پوچھ کیوں نہیں لیتے میں نے عرض کی حضور! کچھ تو معلوم ہے والد کی وفات کو چھ مہینے گزر چکے۔ آپ نے میری آنکھوں پہ ہاتھ رکھا۔ ہٹایا تو اباجان سامنے موجود ہیں ہڑ بڑا گیا۔ ان سے مقدمے کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ آپ نے دوبارہ میری آنکھوں پر دست مبارک رکھا۔ ہٹایا تو گھر سے میں کوئی نہیں۔“
”صاحب میں اس فیشی سے رمی لیٹ نہیں کر سکتی افسوس کہ میرا فیڈ بیک آپ کو مایوس کر گیا۔ میرا ڈیلمیا ہر موڈرن مائینڈ کا ڈیلمیا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
”پھر انالس میں جاتیے۔“

پانچویں رات۔ وہ کارواں میں شامل ہونے کے لیے گیٹ ہاؤس کی محراب میں کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں: ”آل راؤنڈ کمیونٹی کیشن گیٹ۔ ابھی جب میں نے دہلی سے لکھنؤ کے لیے ٹیک اؤٹ کیا ایر ہوٹس کی آواز آئی یا تریوں سے نویدن ہے کر پیہ ڈھوم پان نہ کرس۔ میں سمجھی وہ کہہ رہی ہے۔ مسافر پان کھا کر دھوم نہ مچائیں۔“
”آپ بھی کر پیہ۔“ جرمن باجی۔

”کیوں۔؟ اور یہ مسٹر راجا علی جو ہر وقت چینی کی طرح۔“
”لیکن تو اتین مشرق۔“

”ڈیم تو اتین مشرق۔ آپ کبھی بڈل ایسٹ گئی ہیں؟“
”جی اور سال میں چھ مہینے ویسٹ جرمنی میں رہتی ہوں۔“

”آپ ویسٹ جزئی میں رہتی ہیں اس سے مجھ پر کس طرح لازم آیا کہ میں دھوم مچان نہ کروں
 مسٹر علی۔ میاں اسقدر دلچسپ کن ٹم پر بری گفتگو کرتے کرتے — کوئی پوائنٹ نکال کر
 اچانک کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جسکے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ شام فرما رہے تھے۔ ہم
 نے ایسے دیوانوں کو دیکھا صحرا میں گھومتے ہوئے انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے
 رکھی تھیں۔ اسکا کیا مطلب ہے — اور فرمایا مکاں اور لامکاں میں ڈھونڈا دگر انہوں
 نے اپنا پتہ بتلا رکھا ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتے ہیں۔ مگر میں پوچھتی ہوں یہ اچھی دل
 لگی ہے کہ پہلے خود ہی ایسے اسباب پیدا کرو کہ دل ٹوٹے پھر اس میں آکر رہنے لگو۔
 ”میں نے پوچھا۔ سیلاب۔ زلزلے۔ جنگیں۔ فساد۔ لاکھوں بے گناہ مارے جاتے
 ہیں — یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میاں نے فرمایا۔ آپ کے پاس باغ ہے؟ جب آپکا
 جی چاہتا ہے اسکے درخت کو ڈالتی ہیں — مسٹر علی اسکا کیا جواب ہے؟“

شہر۔ ایک اور معتقد کا ”ادین ہاؤس“ ہم صحن میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے
 تھے۔ اہل ہنود کی آمد و رفت جاری تھی۔

”یہ بھگتی کا چکر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا دوا ایسے مذہب جنکے درمیان — جنکے درمیان“
 ”بعد القبطین ہے“ عربی حاجی نے مسزخان کی بات پوری کی ”لیکن ایک قطب —“
 ”آسان اردو پلیر“

”او۔ کے۔ سینے۔ داتا گنج بخش فرماتے ہیں — شیخ ابوطاہر جزینی ایک روز اپنے مرید
 کے ساتھ بازار میں سے گندھے تھے ایک شخص نے ان پر زبان ملامت دراز کی۔ مرید اور
 بازار کے لوگ جوش میں آگئے۔ مرید نے اس شخص کی ٹھکانی کر دی اور خود زخمی ہوا۔ شیخ
 نے اس سے کہا اگر توجپ رہے تو تجھے ایک ایسی بات بتاؤں گا کہ تیرا رنج جاتا رہے گا جب
 اپنے مکان پر پہنچے شیخ نے صندوق کھولا جس میں خط بھرے ہوئے تھے۔ فرمایا۔ دیکھ۔ کسی
 نے مجھے شیخ الاسلام لکھا ہے۔ کسی نے شیخ زکی۔ کسی نے شیخ زاہد۔ کسی نے شیخ الحرمین۔ اسی

طرح کے القاب ہیں نام کسی نے نہیں لکھا۔ ہر ایک نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے ایک لقب دیدیا تو کیا ہوا۔ یہ جھگڑا کیوں اٹھاتا ہے؟“

”گرووی سین۔ لیکن میں کوپ نہیں کر سکتی۔ دوسری صبح شاہجہاں پور لوٹ گئیں۔ اسی مکان میں تیسری شام ایک بیرونی کمرے میں دیوار پر آویزاں کعبہ شریف کے بڑے کٹ آؤٹ کے نیچے ٹیلی ویژن چل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پانچ ٹیو کیٹلز پاؤ کا بلب روشن دونوں کمروں کی چاندنیوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اچانک بجلی سیدمدم پڑ گئی۔ میاں نے لیٹ کر دلانی ادرھلی۔

”پاور کٹ“ میں نے کہا۔

”عام طور پر ہوتا نہیں۔“ میزبان بولے۔

”میاں۔ اے میاں۔ ہمرے لڑکے کو نیک ہدایت۔ اے میاں۔“ ایک برقعے والی عورت بار بار کہے جا رہی تھی۔

”آرام کرنے دو اماں“ لڑکی نے کہا۔

”ہمرے لڑکے کو۔“

زیادہ تر ہندوستانی مسلمان مائیں شاکی ملیں کہ لڑکے پڑھائی کے شوقین نہیں لڑکیاں کالجوں میں پہنچ گئیں۔ ہم یہ سب باتیں نوٹ کرتے جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے بیٹے کی طرح اخبار نویس ہونا چاہیے تھا۔ اے کاش زندگی از سر نو شروع کر سکتے۔

شور مچ رہا ہے۔ ٹی وی اسکرین پر روشنی کی لکیر باقی رہ گئی ہے۔

ٹھیک نو بجے روشنی تیز ہوئی۔ میاں دلانی چہرے سے ہٹا کر اٹھ بیٹھے۔ سچوآن تازہ کیا گیا۔ دسترخوان بچھا۔ صبح ساڑھے تین بجے لکھنؤ روانہ ہوئے۔

کترین نے بے آواز روتن زائیس پر بھی سواری کی ہے مگر میاں کی ایبسیڈینز آدا و جنٹلمن اس طرح رواں تھی محسوس ہوا طیارے میں بیٹھا ہوں۔ دو گھنٹے کا راستہ تین تین منٹ میں طے کر کے داخل حضرت گنج ہوئے۔ مقتدین کی کوٹھی پر پہنچے۔ دن نکلا۔ انگلستا

واپس جانے کی اجازت لی۔ کلاس اُدھ گئے۔ ڈاک طلب کی۔ افسوس کہ نورمن یا نورما کا ایک بھی خط موجود نہ تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں انہیں ہماری یاد نہ آئی۔ افسوس۔ پھانک پر نکلے جستو پھان گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ "عیش باغ لے چلو بھائی جستو پھان پھلی بار دو ماہ نگار خانم کے چکر میں رہے ایک روز وہاں جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ارادہ تھا چلتے وقت فاتحہ۔" راستے میں گلاب اور اگر تباہیاں دو لاتے چلنا۔ "عربی باجی نے بتلایا تھا وہیں جستو پسند کرتی ہیں۔"

قبرستان کے نزدیک گنجان سستی آباد ہو چکی۔ ایک مکان کے آگے چند انصاری صاحبان کرگھے لگائے بیٹھے تھے جھیننی جھیننی مینی چدریا۔ ایک طرف ایک کھڈے پر سرخ رنگ کی ریشمی ساری تھی ہوئی تھی ایک نوجوان نہایت چابکدستی سے زردوزی میں منہمک تھا۔ رکشا سے اتر کر ہم دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ پل کی پل میں اس نے چند گل بوٹے بنائے۔ نفی میں سر ہلایا۔ ایک طرف سے سنہرا تانا کھینچ کر سب اُدھیر ڈالے۔ دوسری سیل شروع کر دی۔

ڈھال پر اتر کر سنے پھانک کے اندر گئے۔ تعجب ہوا۔ چمن خاص اتنا پر فضا بنا دیا گیا۔ شاداب درخت پھولوں کی جھاڑیاں۔ سبزہ طویل پختہ روش پر چلتے اس طرف پہنچے جہاں بڑے آبا کو پیر و خاک کیا گیا تھا۔ تلاش کرتے پھرے۔ حد نظر تک پرانی اور نئی قبریں بالآخر ایک ہرے بھرے درخت کے نیچے انکا مز اظر آیا۔ دوڑے۔ کتبے پر حجبی گرد و مال سے صاف کی۔ راجہ جو ادلی خان مرحوم مغفور ۱۶ ستمبر ۱۹۴۹ء۔

تیس سال سے یہ مزار بے چراغ پڑا ہے۔ اپنے پیاروں کی تربتوں پر آنے والے تمام اہل القبور کے لیے جو جہل فاتحہ پڑھتے ہیں بے چارے بڑے آبا اسی میں شامل ہے جب کہ نالائق مرد و دھیتجا سارے کرۂ ارض پر بد معاشیاں اور بے ایمانیاں کرتا پھر رہا تھا گلاب کے پھول بکھرے اگر تباہیاں سلگائیں۔ فاتحہ پڑھی۔ قلب گداز ہو چکا ہے۔ زار و قطار روئے کوئی گورکن پاس سے گذرا ایک سن رسیدہ صاحب بہادر کو بچوں کی طرح بلکتے

دیکھ کر ٹھٹھا کا۔ آگے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا آدمی پانی کی بالٹی اٹھائے آیا۔

”بھیا۔ سلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔ ہمیں پہچانتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔ آپ پاکستان جاتے وقت آخری بار یہاں تشریف لائے تھے۔“

ہڑ ہڑا کر بالٹی اسکے ہاتھ سے لی۔ ہر دھوئی۔ اسکے ساتھ ملکر بھاڑ بھنکاڑ صاف کیے۔

سٹوٹ پر گوکھرو چیک گئے۔ ہاتھوں میں کانٹے چھبے۔ میں دلشاد علی کہ ابلیس سے معاملہ نکھتا

تھا۔ خوفِ الہی سے تھر تھر کا پنا۔ کہ اب خود میرے اور گورگڑھے کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا

ہے۔ میاں ایک روز ادھی کے چند اشعار پڑھ رہے تھے وہ یاد آئے۔ احمد سنگ جو

چاروں یارا۔ چاروں سدھ میت کرتارا۔ پہلے ابو بکرؓ جو سانچے۔ پہلے پریم نپتھ وہ راجے۔

دوسرے عمرؓ دین کی کھامبا۔ کین عدل جگت تین تھا مابا۔ تیسرے عثمانؓ پنڈت بلہاری۔

لکھ سو پران دین سناری۔ چوتھے علیؓ سورجگ بھانا۔ کفر بھنج سب لوگ بکھانا۔ انت گھڑی

اوسے جیسی کون باندھے دھیر۔ احمد چاروں یار سنگ، کھیں نگاویں تیر۔

روش پروا پس آئے۔ ایک بار پلٹ کر دور سے بڑے ابا کو خدا حافظ کہا۔

بڑے ابا جو بھید میں بلا لیتے گئے۔

دھوپ ہوا میں اڑ رہی تھی۔ ویسے قبرستان پر آخری نظر ڈالی۔ پیڑ سرسرائے۔

بھید کا آپ بن۔

باہر مرجاں مرنج بختور کشا پر نیم دراز اس ٹھاٹھ سے آرام فرما تھے گویا صوفے پر

لیٹے ہوں۔ ایک نابینا پیر مرلاٹھی ٹیکنے، دھوپ میں حکمتی سفید مسجد کے سامنے سے گذرے

خیال آیا شاید یہ ان حافظ جی کو جانتے ہوں جنکو ہم نے بڑے باپ کے مزار پر قرآن خوانی

کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوڑ کر انکے نزدیک پہنچے۔ ”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔ بھائی“

”حضرت یہاں ایک حافظ جی۔ سنہ انچاس میں ہم نے انکو اپنے بڑے باپ۔

”آپ کے بڑے باپ — راجہ صاحب دھانپور —“
 ”آپ کیسے پہچانے —؟“
 ”آپ کی آواز سے پہچان گئے — ہمیں آوازیں یاد رہتی ہیں۔ آپ عبد القیوم کو پوچھتے ہیں؟“
 ”جی — شاید یہی نام تھا۔ لڑکے سے تھے۔“
 ”ہم ہی ہیں۔“
 ”آپ —؟“ دل کٹ کے رہ گیا۔
 ”جب سے یہیں ہیں۔“

ہم دنیا بھر کے عیب کرنے کے بعد ویسے ہی ٹانٹے، پھیلا بنے گھوم رہے ہیں۔ وہ ذوقِ نادار حافظ جی اس وقت ایک بوڑھے نادار حافظ جی۔ یہ سارا عرصہ انہوں نے اسی عیشِ باغ میں گزارا۔ وہی مسجد۔ وہی جنازے۔ وہی قبریں۔ قرآن خوانی — اور وہی پرسکون صلیتِ قناعت، رضا و تسلیم کی تصویر۔
 ہدیہ پیش کیا کہ بڑے آبا کے مزار پر تلاوتِ کلام مجید پھر شروع کر دیں۔
 لاوڈ اسپیکر پر اذان ہوئی۔ بخٹو بھاگے ہوئے آئے۔ ہم تینوں اوپر گئے۔ وضو کیا۔
 بخٹو ہمارے برابر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف حافظ عبد القیوم۔ ہم نے نیت باندھی۔

جمعہ پڑھ کر واپس چلے۔ جی تھا کہ امنڈا رہا تھا۔ قلب کچھ زیادہ ہی گداز ہو چلا ہے۔ رکشا شائع عام پر آگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بیچ منزلہ، نئی نویلی، چمکتی دکھتی پچی کاری سے مزین گلابی رنگ کی بلڈنگ دکھلائی پڑی۔ اسکی پیشانی پر لکھا تھا ہذا من فضل ربی۔

اہلِ پرسی محل کو فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کنور کے گھر جا کر لٹخ کھایا۔ انڈین ایرلائنرز کے دفتر سے ٹکٹ بنا کر شام کے چھ بجے حضرت گنج والی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں میلہ سالگاتھا۔ ایک کار قریب آ کر رکی، فرخندہ بیگم اور انکے شوہر برآمد ہوئے ان دونوں سے پہلے کئی بار مل چکے تھے۔

”میاں کل سے لکھنؤ میں ہیں ہم اب تک حاضر نہ ہو سکے۔“ بیگم صاحبہ نے کہا۔
 ”ہم لوگ تو آج صبح چار بجے یہاں پہنچے۔ کل تو میاں سینٹا پور میں تھے۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آٹھ سے نو بجے رات تک تو وہ کل شاہ مینا صاحبہ میں موجود تھے
 بہت سے لوگوں نے انہیں وہاں دیکھا اور ان سے ملے۔“

”انہوں نے ہم پر بڑا کرم فرمایا۔ ہم آج تیسرے پہر کے میلاد شریف کے لیے بلائے
 بھیج چکے تھے عین وقت پر معلوم ہوا جن مولوی صاحب کو مدعو کیا تھا وہ نہیں آسکتے دیکھا
 ایک مولانا چلے آ رہے ہیں کہنے لگے میاں کل شام شاہ مینا صاحبہ میں ملے انہوں نے فرمایا
 کل میلاد شریف پڑھنے فرخندہ بیگم کے ہاں ضرور چلے جائیے گا۔“

”نہیں صاحب۔ ناممکن کل شام تو۔۔۔۔۔ میں نے دہرا نا چاہا۔ دفعتاً زبان گنگ
 سی ہو گئی۔ کل رات آٹھ سے نو بجے رات تک سینٹا پور کے ان کمروں میں بجلی مدہم پڑ گئی تھی اور
 میاں دلانی میں منہ ڈھانپ کر استراحت فرما رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر زینے پر چڑھا۔ عربی باجی
 دروازے میں مل گئیں۔ ان سے کہا: ”لوگ کل شام شاہ مینا صاحبہ میں۔۔۔۔۔“
 ”اجانک آنا پڑا ہوگا۔“

وہ کسی کام میں مصروف آگے چلیں گئیں۔ میاں ڈرائنگ روم میں مسجد نبوی کے رنگین
 فوٹو گراف کے نیچے دیوان پر تشریف رکھتے تھے۔ لکھنؤی لباس جب معمول سر پہ مانگ۔ کہ
 یہ خواجگان حشت کا مسلک ہے۔ ہاتھ میں بیچوان کی نے۔ ہم بوکھلائے ہوئے جا کر ایک کونے
 میں بیٹھ گئے۔ رنج دروازے میں نمودار ہوا۔ یہ سوچ کر فوراً اٹھے کہ اسکو یہ جیترناک واقعہ بتا دیں
 میاں نے ذرا ڈانٹ کر کہا: ”بیٹھے رہیے۔ کہاں جا رہے ہیں۔“

کچھ دیر بعد کھانے کمرے میں پہنچے۔ عربی باجی میزبان بہنوں کا ہاتھ بٹانے میں مشغول
 تھیں۔ انکو بتلایا۔ وہ سلا د بنا تے بنا تے بولیں: ”حضرت دانا گنج بخش علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے
 کہ امت کی کرامتیں جناب رسالت پناہ کا معجزہ ہیں آپ کیوں حیران ہوتے ہیں؟“

”حیران؟ ارے صاحب اکیسویں صدی آیا ہی چاہتی ہے؟“

”تو کیا اکیسویں صدی میں ہمارے نبی کی دلیلین نعوذ باللہ معدوم ہو جائیں گی؟ آپ

اب تک تشلیک کی دادی میں سرگرداں ہیں“

”میرا ڈیلیما ہر موڈرن مائینڈ کا ڈیلیما ہے۔“ میں نے بیاختہ ”سوئیڈش“ لیڈی کے الفاظ دہرائے۔ دیوار پر لگے گھڑیاں پر نگاہ گئی۔ میں اب تک، اتنے مافوق العادت واقعات کچھم خود دیکھنے کے باوجود اس پنڈولم کی طرح یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا ہوں، کیونکہ واقعی میرا موڈرن مائینڈ اپنی بار کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ جتنا ہے ردی ہارا ہے رازی۔ وغیرہ۔ ۹

دوسرے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک ضیف العمر کشمیری پنڈت تشریف فرما تھے۔ ملک کے مقتدر سیاسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن سیاست سے بیگانہ اور رمز آشنائے روم و تبریز معلوم ہوتے تھے۔ وہ میاں کے فضائل و مناقب بالکل ملفوظات کی زبان میں بیان کر رہے تھے۔ ”ہمارے شیخ کو ترک و قناعت و فراغت تینوں چیزیں حاصل ہیں جو اولیائے کرام نے مردِ کامل کے لیے ضروری بتائی ہیں۔ دنیا کے اندر رہ کر بے غلٹی۔

”عارفوں کے چاند خواجہ معین الدین جتبیؒ کا ارشاد ہے کہ ولی کی شناخت یہ ہے آسمیں آفتاب جیسی شفقت ہو۔ زمین جیسی نرمی۔ اور دریا جیسی فیاضی جمع نہ کرے نہ طمع نہ کرے۔ قطب صاحبؒ سے خواجہ غریب نوازؒ نے نصیحت فرمائی تھی کہ ایسی درویشی کرو جس سے تو نگرہی ظاہر ہو“

میں درکچے میں جا گھڑا ہوا۔ میں خود کون ہوں۔ روح کی تاریکی میں اپنے آپ سے جنگ کرتا ہوا ایک جدید انسان۔ ہو ہو ہو۔ کس قدر پابال جملہ۔

میں فیفتی بحرِ پیمیا۔ میں ثانی رے سیس۔ میں منسیر ل گرانٹ۔

کمرے میں اسٹائلس بیگمات کی آمدورفت جاری ہے۔ گودہ مائیکل اینجلو کا تذکرہ نہیں کر رہی تھی رداں کے سین سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہونے والے خود میاں ہیں۔ سارے اتھاہ ماضی سے جانے کس قسم کا گہرا پراسرار رابطہ رکھتے ہیں اور حال میں پوری طرح سے شامل۔ ایک موڈرن مائینڈ رکھتے ہیں۔ اور قدرت نے ان کو ناقابل یقین

روحانی طاقتیں عطا کر رکھی ہیں۔ ”نا قابل یقین —“ میں نے با آواز بلند دہرایا۔ کنوڑیچے میں آکر بولا — ”یار تم ایک شدید قسم کے ذہنی اور روحانی کرائس سے گذر رہے ہو۔“
 ”اس اطلاع کا شکریہ“
 ”تم ہوم سیک ہو۔ گھر جاؤ۔“

ہم دونوں باغ میں اتر گئے۔

”ایک بات بتاؤ۔ تم اور رنجن اور وہ کشمیری پنڈت جی اور وہ ٹاٹ پوش وغیرہ اس قسم کے لوگ اس دس میں کتنے ہونگے؟“
 ”تھوڑے سے۔ لیکن ہیں تو سہی۔“

“ DYING BREED ”

”شاید یہ روایت —“ کنوڑی نے ایک برڈ ہاتھ کے نزدیک بیچ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا،
 ”ختم ہونے والی نہیں۔ ان گنت غیر مسلم میاں کے حلقہ ذکر میں شامل ہوتے ہیں۔“
 ہم اپنی بات پر اڑے رہے۔ ”ایک ہزار سال تو یہاں صوفیوں اور سنتوں نے اپنی سی کر ڈالی لیکن آسام میں آج بھی قتل عام ہوتا ہے۔“

”جیزس کرائسٹ کی امت دو ہزار سال سے ساری دنیا میں خون کی ندیاں بہا رہی ہے۔
 پڑھتے چینی جاپانی زبردست مارکاٹ میں ہمیشہ سے جٹا ہوا ہے۔ گو تم کی اہنسا کا اس پر کوئی اثر تو ہوا نہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہاں بھی بے شمار صوفی ایڈیٹ آشتی کا پرچار کرتا رہے۔ لیکن تشدد اور منافرت ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا اہل اللہ کو چاہیے کہ اپنی کوششیں ترک کر دیں۔“
 ”اس قدر کریشن۔ تم خود ہی بتا رہے تھے اس روز —“

”گردار کا کرائسٹ ساری تھرڈ ورلڈ کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ — اگر میاں کے ایسے نیک بندوں کے اثر سے فرداً فرداً لوگ بہتر انسان بن جائیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بہت سے ضمیر فروش میاں کے ہاں پہنچ کر سدھر گئے۔ ارے ہم خود دیکھتے ہیں اکثر نیا لوگ اگر میاں سے درخواست کرتے ہیں دعا فرمائیے کہ ہم منیٹر ہو جائیں۔ یا کاروبار میں ایک کروڑ کا

فائدہ ہو جائے۔ میاں انکو بہتر خیالات کو اطراف مائل کر دیتے ہیں۔ تمہاری بولندن میں ایکسپورٹ امپورٹ کی بزنس ہے۔ اگر اس میں کچھ گھلے بازی نہیں کرتے صحیح قسم کا بیوپار ہے میاں کے فیض سے ضرورتاً کو فائدہ ہوگا تم اس روز بتلا رہے تھے کہ سہا پوری فرتیچر برطانیہ میں امپورٹ کرنا چاہتے ہو۔۔۔“

ہم خاموش رہے۔ ایکسپورٹ امپورٹ۔ گوری پیلی سانولی کالی چھو کر یوں کی درآمد برآمد۔ نہایت اسٹریٹ لائینڈ مہذب بردہ فروشی۔ ان لڑکیوں کی رضامندی کے ساتھ بچپن میں ہم دھانپوڑ میں دیکھا کرتے تھے ہماری فائدہ کش کسان عورتیں اپنی بچیوں کو سواریہ اور ڈلیا بھر کو دوں کے بدلے عمر بھر کی غلامی کے لئے بیچ جاتی تھیں۔ انکو کلمہ پڑھا کر شاعرانہ فارسی نام رکھے جاتے تھے۔

ساری عمر وہ ہمارے ہاں چکیاں پیستی تھیں گرمیوں کی طویل دوپہروں میں تینے برآمدوں میں بیٹھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچتی تھیں جب ننھی نو تہا رہا بھر ڈور کھینچتے اونگھنے لگتی پنکھے کی رفتار دھیمی پڑ جاتی تھی ہمیں اچھی طرح یاد ہے ہم اپنے چھپر کھٹ پر لیٹے لیٹے ڈور کو پاؤں کے انگوٹھے میں پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتے۔ پنکھے کی جنبش فوراً تیز ہو جاتی۔ سواریہ اور ڈلیا بھر کو دوں۔

اب ہم لوگ فینش ایبل، چاتر، بھولی بھالی، قسم کی لڑکیوں کی خرید فروخت ٹوکروں پٹرو ڈالرز اور مارک اور فرینک اور قسم کے مکہ راجیج الوقت کے ذریعے کر رہے ہیں۔ بوٹن میں ایک بار ڈاکٹر منصور کا شغری نے بتلایا تھا کہ بمبئی کے جنرل وارڈز میں کوئی مرنے والا ہوتا ہے وارڈ بوائے ڈاکٹر کو جا کر اطلاع دیتے ہیں ۱۴ نمبر خلاص ہونا مانگتا۔ ہم لوگ سوئیس بنکوں کے گننام اکاؤنٹس کے خفیہ نمبروں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور شاید اب ہم بھی خلاص ہونا مانگتے ہیں۔

تیسری منزل کی کھلی چھت پر یہاں بھی رت جگا۔ سامنے کچھ فاصلے پر حضرت گنج میں وضع جدید کارون کیتھولک کیتھڈرل استادہ تھا۔ اسکے فلک بوس مخروطی SPIRE پر

سرخ صلیب جنگ گاتی رہتی بسیاہ نمل پر چمکتا یا قوت —

امشب ایک جمبو جٹ فراز کلیسا پر سے پرواز کرتا جہاں اول کی سمت نکل گیا۔ تاریکی میں اسکی جلتی بجھتی سرخ بتیاں کچھ دیزنگ نظر آئیں۔ اہل تثلیث، آل موسیٰ، اشتراکی ملاحظہ ہی جدید سائنس کے بانی اور ماہر۔ اب آنکھیں میری باقی انکا نہیں۔ میری آنکھیں بھی انہیں کی ہیں جن سے ہم ساری زندگی کو دیکھ رہے ہیں۔ جدید اہل ایمان کی یہ تہی دامن کی بنیاد پرست عنبر کو بھی برائے علاج ادھر ہی جانا ہے۔ ان ہی کے ایجا کردہ طیارے پر۔

حب عادت اپنے آپ سے مباحثہ کرتے ہوئے وہیں مہتابی پر بیٹھے بیٹھے ایک در نکتہ سوچا۔ سائنس میں بھی ایک فیکٹر ایکس ہوتا ہے۔ مخدوم کی دعا سے اپنے معذور لا علاج بچے کی حالیہ صحیبتابی کا تذکرہ تو ایک خاتون کل ہی کر رہی تھیں۔ لہذا اپنے ذہنی تحفظات کے باوجود پچلی منزل میں جا کر کاشغری کو فون کیا۔

”منصور عنبر کی حالت کیسی ہے —؟“

”بُرمی“

”تم ایسا کرو — کہ انہیں لیکر فوراً یہاں آ جاؤ، کوٹھی کا پتہ بتایا۔“

”کیا کوئی امریکن سائیکسٹرسٹ وہاں آیا ہوا ہے؟“

”نہیں ایک بہت پائے کے صاحب تصہرن چینیہ بزرگ —“

”وٹ —؟“ منصور دوسرے سر سے پردہاڑا! حضور والا پہلے یہ بتائیے آپ اتنے دنوں

سے کہاں غائب تھے؟ ہوٹل میں اچکوڈھونڈا انکار خاتم بنگلور سے آگئی ہیں ان سے پوچھا۔

”بس۔ ذرا ادھر ادھر گھوم رہے تھے عنبر کو لے کر فوراً پہنچو یہ ایک بہت بڑے دلی ہیں۔“

”بھائی دشا دعلی۔ آپ کے دماغ پر بھی اس CRAZY ملک کا اثر ہو گیا؟ آپ کو کس نے

HYPNOTISE کیا؟“

”سنو تو —“

”ہوکس پوکس - مہوجمبو - دودو - چھو منتر، مجھے تو اب آپکے دماغی توازن کے متعلق بھی فکر ہوگئی۔“

“WITCH DOCTORS اور FAITH HEALERS

محموس کیا کہ میں اور وہ دو بالکل متضاد زبانوں میں گفتگو کر رہے ہیں۔
”آپکے مزاج میں شدت تو ہمیشہ سے تھی۔ جولاین پکڑی اس میں غلو فرمایا۔ اب اس لائین میں اگر کچھ سکون مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ لگے رہیے۔ مگر خان صاحب۔ شرک اور بدعت سے بچئیے“

تھل کے ساتھ جواب دیا ”واقعی؟ لیکن بھائی ڈاکٹر اس روز پری محل میں تو تم شہوار کے سامنے لکھنؤ کے محرم کی مدح سرائی کر رہے تھے“

”محض اسکی تہذیبی اور تاریخی اہمیت کی حد تک۔ باقی یہ کہ ہوسن جوبسن ہوکس پوکس — اچھا خیر۔ ایک بات بتائیے۔ میں عنبر کو باہر لے جا رہا ہوں۔ آپ ہی نے روزین باؤم کا ذکر کیا تھا۔ انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں؟“

”بچوں کے ذریعے۔ انکی لڑکی اخبار میں نورمن کے ساتھ کام کرتی ہے۔“

برطانوی سائیکلر سٹ کا پتہ نوٹ کروا کے فون بند کیا۔
انکی قسمت میں نہیں ہے۔

آج شام تخت والے کمرے میں ”سوئیڈش“ لیڈی نظر آگئیں، غرارہ پہنے فرینے سے سر ڈھانپے عورتوں کے ایک گروہ میں قالین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

”ارے آپ ابھی سوئیڈن نہیں گئیں؟“

”چلے جائیں گے۔“

”کابجوں کے متعلق کیا ہوا؟“

”وہ بھی ہو جائے گا۔ میں تو یہاں روز حاضر ہوتی ہوں۔ آپ نے بھیڑ میں دیکھا نہیں۔“

ماموں جان بھی آئے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ ہڈی ہوا لے ماموں۔؟“

بھینپ گئیں۔ ہم لوگ ٹبلر گنج میں پھیرے ہیں۔ آپ؟ علی گنج؟ اچھا ایک بات بتائیے مجھے حیرت اس چیز پر ہے کہ اتنا اونٹننگ جینوئن صوفی اور ویسٹ اس سے ناواقف۔“

”آپ کو تو ویسٹ کا سودا ہے۔ ایسٹ کے محض ایک خطے کے لوگ جان گئے ہیں تو انکو پل بھر آرام نہیں۔“

کنور رانی پر تھیکا دیوی کمرے میں آئیں۔ ہمیں دیکھ کر ہلکا سا گونگھٹ کاڑھا۔ کہ ”جینٹھ“ سے کا نا پر وہ انکی سوسائٹی میں واجب ہے۔ بولیں: ”میاں وزیر گنج گئے ہوئے ہیں وہاں سے سیدھے شاہ مینا“ صاحب آئیں گے۔ یہ کہہ رہے ہیں وہیں چلے چلیے۔ باجی آپ بھی“

یہ دونوں پھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ مسز خان نے کہا ”کل ایک جگہ ڈنر پر ایک ننگ چوٹی بی بی سے ملاقات ہوئی۔ وہ نکلیں۔ آل انڈیا فیم کی ناولسٹ۔ نگار خانم۔“

کنور رانی بولیں۔ ”اوہ نگار خانم۔! نواب بانی جے پور والی کی۔“

”نواب بانی؟“ مسز خان نے سبھری سے بات کاٹی: ”کون تھیں؟ اور بتائیے۔ اور۔“

”تھیں ایک پرانے زمانے کی گراموفون سنگر۔ پی۔ یو نوڈوٹ آئی مین“

”اوہ۔ پی۔ پی۔!“

دونوں خوب ہنسیں کنور نے ڈرائیو کرتے کرتے مڑ کر اپنی دھرم پتی کو ڈانٹا۔

”تم عورتوں کی یہ کتنی بُری عادت ہے۔“

”ہم کوئی اپنی طرف سے تھوڑا ہی بوڑھے ہیں۔ سارا لکھنؤ جانتا ہے۔ پیپرزمیں نکل چکا ہے۔“

”اڈل رائٹ۔ شٹ اپ۔“

”پیپرزمیں۔ کب؟“ مسز خان نے کہا: ”جیہی۔ جیسے ہی وہ گئیں انکی ایک سہلی نے بتایا آجکل بے چاری بہت دکھی ہیں۔ انکا منگیتر اڑنچھو ہو گیا۔ بھتیجی بھاگ گئی۔ گنتے کی آنکھیں کمزور ہو گئیں۔!“

”گتے کی آنکھیں کمزور ہو گئیں — ہجیبھی منگیتر اور جیبھی بھاگ نکلے اپنی بیبا دیوی نے شگفتگی سے کہا۔

وہ دونوں اب کھکھلا کر بنس رہی تھیں۔ ہم دم بخود اور تب، اس لمحے دل ہی دل میں میاں سے التجا کی — آپ نے اب تک میری عیب پوشی کی ہے اب عین میری روانگی کے وقت سینڈی کے آگے میرا بھانڈا نہ پھوٹے — ہم اس نیک نفس آدمی سے آنکھیں کس طرح چا کر سکیں گے۔ میاں — پلیز — اب آنکھوں کی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں — پلیز —

یاد آیا، نورمن نے یہاں سے واپس جا کر بنا یا تھا۔ ایک رات پرسی محل میں اتفاقاً میرا ذکر نکل آیا تھا اور وہ تھر تھر کانپا تھا کہیں اسکا راز فاش نہ ہو جائے کہ وہ خالص انگریز نہیں۔ بازی گریباپ بیٹے اپنی اپنی جگہ دونوں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے۔ گو اسی اتفاقاً تذکرے کی بدولت ہم دلالت سے لکھنؤ لگا رہا نام کو بلیک میل کرنے پہنچے۔ محض چھ ماہ قبل آج وہ کسی اور زمانے کسی اور دنیا کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اب ہ

مسرخان کی گفتگو جاری تھی۔ ”نگار خانم نے جڑاؤ ساؤن جھڑی گلے میں پہن رکھی تھی۔ انکے جانے کے بعد انکی عزیز بہیلی نے یہ بھی بتایا کہ ایک خستہ حال وثیقہ دار بیگم سے کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔ ایسی خوبصورت ساؤن جھڑی رانی صاحب کہ کیا بتاؤں میری ممانی جان اور آپا دونوں انکے ناول بہت پڑھتی ہیں اسی وجہ سے میں ان سے خصوصیت سے ملی۔ بلکہ میں تو سوچ رہی تھی اپنے فوٹو فیچر کے لیے بطور ایک پاپولر انڈین دو من ناولٹ انکی ایک آدھ تصویر بھی لے لوں — ان سے کہا۔ ایک دم بھڑک گئیں کیسی تصویر — ہ آپ کون ہوتی ہیں میری تصویر کھینچنے والی۔ سوری۔ نو فوٹو۔ نو کمٹ — باپ رے اتنی بددماغی — اور میں دراصل ایک پی کی اولاد — تو بہ —“

”مسرخان —! کون نے اب انہیں ڈانٹا — وہ واقعی سا دھو آدمی بن چکا ہے۔“

شاہ میناروڈ پہنچے تو معلوم ہوا پاپے نالے پر ”سیسنی“ ہو گیا۔ راستے بھر ہم دیواروں

پرچسپاں نفاق بین المسلمین کے جلسوں کے بڑے بڑے اردو پوسٹر دیکھتے آرہے نھاب جالی دار ڈھالیں سنبھالے، بلوہ کنٹرول کرنے والی پولیس کے دستے مارچ کرتے نظر آتے رہے۔
”خدا خیر کرے“ کنور نے درگاہ کے پھانگ پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ مجھے بڑی شرم

میڈیکل کالج کمپاؤنڈ میں کہا گیا کہ سلاطین شرفیہ کے لکھنؤ میں مدفون شامینا صاحب کے مزار پر عرض۔ اسی گومتی کے کنارے آباد ”شیراز ہند“ جو نیور کو دتی کے بہلول لودھی نے اجاڑا تھا۔ زوال لکھنؤ کے مرثیہ خواں ہر گلی کوچے میں موجود ہیں۔ سقوط جو نیور کے نوہ گروں کو ناپید ہوئے بھی پانچ سو برس گذر گئے۔

میٹل کی بھیڑ چیرتے مخدوم کے شامیانے کا رخ کیا۔ وہ دور ہی سے دکھلائی دے گئے۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ ناپید۔ درمیانی گذرگاہ پر چلتے انکے نزدیک پہنچے۔ ایک کھیسے کے پاس منجوا صاحب مل گئے۔ طبیعت سے ”ٹریفک“ کنٹرول کرنے میں مشغول۔ بوئے۔ سیدھے ہال میں چلے جائیے۔

ہال کی بیرونی دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا ایک سلاخوں دار بند کھڑکی کے نیچے مسند پر سرکار شریف فرما۔ سلام عرض کرتا چار قدم آگے بڑھا۔ ہم چاروں صحن میں داخل ہوئے۔ ہال کے پہلے دروازے پر شہر کی برقعہ پوش عورتوں کا جگمگٹ۔ سب اندر جھانکنے کی کوشش میں مصروف۔ میاں تو ابھی باہر تشریف رکھتے ہیں ممکن ہے اس دریچے میں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اسکے پٹ بھی بند ہیں۔ بدقت تمام اسی دوانے سے اندر پہنچے۔ تو میں ہیبت زدہ رہ گیا۔

میاں ہال میں اپنے تخت پر متمکن تھے۔

”سینڈی۔ سینڈی۔ میاں تو ابھی، ابھی چند سکند قبل باہر شامیانے میں۔“
”باہر۔“ میں نے تو نہیں دیکھا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا۔ کہ انکی خالی مسند کے پاس سے گذرتے ہوئے تم نے اتنے ادب سے سلام علیکم کسے کہا تھا۔“

او ڈپکل بوٹن؟ پرسوں رات کاشغری ٹیلی فون پر ہی پہچان گیا تھا۔ عنبر کی طرح میرا بھی کریک اپ ہوتا جا رہا ہے۔ میں بھی ہیلو سٹی مینشن کاشکار ہو چکا ہوں۔ اب کس کے پاس جاؤں؟ اب میں بالکل تنہا ہوں۔

”آریو آل ریٹ۔ تمہارے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ تمہارا رنگ فق ہے۔ اور تم لرز رہے ہو۔ تم ایسے دہشت زدہ نظر آتے ہو جیسے ارجن جب مہا بھارت کے میدان میں انکے الوہی رتھ بان نے انکو اپنی لیلاد کھلائی تھی۔ اپنا سروپ“

”سینڈی۔ سینڈی۔ دراصل یہ کون ہیں؟“

”قطب الاقطاب۔ تم اب تک نہ پہچانے۔ ری لیکس۔ ٹیک اٹ ایزی یار“

چاروں طرف طایفہ مجبان کے مانوس چہرے۔ باجیاں۔ دیریاں۔ رانی صاحب فرخندہ بیگم۔ رجن۔ لوجیا۔ فنو منولوجی کے پروفیسر۔ مسز خان۔ پرتیبھا۔ خانوادوں کی پی۔ ایچ۔ ڈی لڑکیاں۔ حضرت گنج کے میزبان۔ تہجد گدار بی بی۔ بوڑھا سنیا سی۔

نجانے کون کون۔

کیا یہ سب لوگ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں؟ یا محض اندھی عقیدت سے سرشار؟ وکٹورین انگلش بولنے والا یہ برہمن سادھو بہت دور سے پیدل چل کر حضرت گنج والی کوٹھی پر بھی آتا ہے کہ سواری استعمال کرنا شاید اسکے مسلک میں ممنوع ہے۔ اور چپ چاپ بیٹھا شیخ کو تکا کرتا ہے۔

انہوں نے اسے بلا کر اپنے پاس تخت پر بٹھالا۔ آنچور سے مین دودھ منگوا یا۔ تالیف قلوب۔ مروت۔ خوش خلقی۔ مہمان نوازی۔ کامل بے نفسی۔ حکایت و تمثیل کے ذریعے پند و نصائح کہ اہل طریقت اعلانیہ نصیحت کو ملامت گردانتے ہیں۔ دوسروں کی دل شکنی سے استرازا۔ صوفیائے کرام کے طریق۔ مروجہ ذہنی رویوں فیصلوں اور اصولوں پر کار بند رہتے ہوئے اچانک ایسے طرز عمل سے واسطہ پڑے جو گذشتہ ادوار سے تعلق رکھتا ہے۔ عشق کی تقویم میں اور زمانے حاضرین اس تقویم

سے بھی منسلک ہیں۔ اس لیے سکون سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ کچھ دیر قبل میں نے مخا کو سبک وقت دو جگہ دکھا اور یقیناً صبح الدماغ بھی ہوں۔ وہ پنڈتا میں دیوار لگی بیٹھی تھیں جو آرتی اتارے بغیر اپنے برت نہیں توڑتی تھیں۔

”سندھیا کا وقت تو ہو گیا“ میں نے نازل بات چیت کی غرض سے انکو یاد دلا

”اب ہم انکی آرتی نہیں اتارتے“

”منع کر دیا؟“

”منع وہ کسی چیز کو نہیں کرتے۔ ہم نے خود بخود چھوڑ دی“

طویل القامت ”سدا سہاگن“ چھم چھم کرتی آن کر ایک دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ ایک قصباتی مسلمان گویا ڈفلی لیے اندر آیا۔ دیوہ شریف میں اس نے ایک چیز سنا لی تھی اسکے چند بول مجھ یا درہ گئے تھے۔ بھاگ جاؤ۔ گھوم جاؤ۔ ویدراج لوٹ جاؤ۔ دید میں ہزاری لال تم ہواناڑی۔ اب اس نے تخت کے سامنے جا کر ایک کبیر بانی چھڑی مکڈنی نگوڑی اندھریا میں ناچے۔

میں نے اس سے ویدراج والے گیت کی فرمائش کی۔ کہ وہ کاشغری اور رزین باؤ دونوں کو کس اطنان اور سادگی سے چلتا کر چکا تھا۔ اس نے دف اٹھا کر اپنا شروع کیا بھاگ جاؤ۔ گھوم جاؤ۔ میاں کو مخاطب کیا ”تم ہو اودھ بہاری۔ قاسم ہیر اناڑی۔“

پچھلی بار یہ گانا سنکر سینڈی سے ہم نے کہا تھا برج اور اودھیا کی تلمیحات ایسے زمانوں میں نظم کی گئیں جب ان شاعروں کو اپنی شناخت اور شخص کھودینے کا خدشہ نہ تھا۔ اور زندگی اتنی گجھلک نہیں ہوئی تھی۔ اسی ہال میں ایک غریب دستقان سلم۔ اکڑوں بیٹھی نیچی آوازیں اودھی کے کبت دہرائے جا رہی تھی جن میں سالار مسوودو اولیاء اور آخر میں میاں کے نام آتے تھے۔ وہ ان بقراطی سیناروں سے نا آشنا تھی اس کے بارے میں منعقد ہوتے ہیں اور جن کی موٹنگائیوں کے فوائد اس تک نہیں پہنچے۔

ڈفالی کے بعد ایک جوان سال مسلمان سابق راجہ صاحب نے پیر کے سامنے
دست بستہ کھڑے ہو کر ترنم میں اپنی حقانی غزلیں پیش کی۔
اَہ—! ازود تہذیب!!— اعلیٰ تمدن جتنے وسیع ہوتے ہیں اسی قدر دیرپا
کیوں نہیں ہو پاتے۔ گومتی کے ساحل پر پانچ سو سال قبل شیراز ہند بھی توجہ لگاتا تھا۔

باہر بیخ کا لنگر تیار ہو رہا تھا۔ قلعے سے آئے ہوئے کیڑیٹ قلندر نے صحن میں نعرہ
جدریٰ بلند کیا— لافتی اِلا علیٰ لاسیف الاذوالفقار۔ دولف بوائے زور سے چلایا—
حق حق — آل محمد آل محمد آل محمد—

اس احاطے سے چند فرلانگ پر مسلم انتراق کا پیشین پلے بھی جا رہی ہے۔
لڑکے نے اندر آ کر اپنی بے ربط تقریر شروع کر دی۔
ٹھیک ہے بھائی دولف آتے۔ تمہاری طرح میں بھی بیڑیوں کے بھٹ سے
نکلا۔ اور اب ایک مخفی زبان سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہمارا ایک مہرج کا تعلیم یافتہ بیٹا بہراد نورمن BEATIFIC VISION کی بات

کرتا ہے۔ اس سے پچھلی نسل کے نوجوان اسی جیکر میں BEAT GENERATION
کہلانے لگے تھے۔ وہ ایل۔ ایس۔ ڈی کھا کر ہیڈوسی نیشن دیکھتے تھے۔ چنانچہ امریکہ میں ہم خفیہ
فروشنوں کی چاندی ہو گئی۔ گو ہم نے کسی قسم کا فیشن ایل نٹ، بھنگ، چرس، ایل، ایس، ڈی
وغیرہ کبھی نہ چکھا۔ کہ یہ نوجوانوں کی لت ہے۔

ہماری نوٹ بک اب قریب الختم ہے۔ چند صفحات باقی رہ گئے ہیں۔ اعمال نامہ۔
اگر یہ انٹرنیٹوں کے ہاتھ لگ جائے؟
میاں جج کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ انکو رخصت کرنے کے لیے آنے والوں
کا ہجوم بڑھتا گیا۔ وسیع باغ میں خیمے نصب کیے گئے۔
کمرے مہانوں سے بھر گئے۔ رات کو فرش پر بستہ بچائے جاتے ہیں۔ دوسرے شہروں

سے قافلے آ کر اتر رہے ہیں۔ احاطے میں دلیغیں گاڑ دی گئیں۔ درگاہ شاہ مینا صاحبہ باورچی آئے۔ لنگر جاری ہو گیا۔ ادھر کمروں میں خوبصورت امام ضامنوں اور گلاب کے بھاری ہاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔ میاں کے رشتے دار اور لواحقین گاؤں سے لکھنؤ پہنچ چکے ہیں۔ صبح سویرے باغ میں وہ سرخپوش برہمن فقیر بالنسری، جاتا ہے ماہر فن نے نوازہ تروتازہ گھاس میں لچکتی بارش کی ننھی مٹی جھیلوں کے کنارے لوگ کر سیاں ڈالے گھنٹوں منتظر رہتے ہیں۔

اس آخری شام ہم نے اپنا BEATIFIC VISION دیکھا۔

دوسری منزل کے صحن میں حسب معمول بیجاہوم تھا۔ میاں کے ایک مرید کا آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ اسے دیکھنے ہسپتال جا رہے تھے۔ نہانے کے بعد اپنے کمرے میں دروازے بند کیے عبادت میں مصروف تھے۔ پھر دروازہ کھلا وہ سفید براق کپڑے پہنے کمر میں سُرخ ٹپکا باندھے دوپٹی لٹپی اوڑھے شہزادے ایسے تیزی کے ساتھ کمرے سے نمودار ہوئے۔ ہم سامنے کھڑے تھے۔ ایک اچھتی سی نگاہ ہم پر ڈالی۔

اس لمحے ہم نے BEATIFIC VISION دیکھا۔

میاں بسرعت زمین اتر کر نیچے گئے۔ کار میں بیٹھے۔ ہاتھ باہر نکال کر دو انگلیوں سے "وکٹری" کا نشان بنایا اور مسکراتے ہوئے پھاٹک سے نکل گئے۔

کل صبح حج کے لئے روانہ ہوئے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر روئے اجتماعی ہسٹریا۔ اموسی جانے والوں کے لئے اسپیشل بسیں چلائی گئیں۔ ایرپورٹ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ چند آدمی سیہوش ہو گئے۔ عورتیں زار و قطار آنسو بہا رہی تھیں۔ حیرت انگیز۔ مُمّاری جب بند لاپن سے جاتے تھے گویاں اسبطرح روتی تھیں۔ میاں کی دلینو بھگنتوں کو دیکھ کر ہم نے سوچا۔

آج صبح بالآخر اموسی کے لیے تیاری پکڑ رہا تھا کیسٹ روم کے دریکچے سے

بخٹو دکھلائی دیے گئے، ہینڈی کی مرسیڈیز کے نزدیک اپنی چرخ چوں رکشا کھڑی کیے صبر سے منتظر تھے۔ فوراً باہر گیا۔

”سلام حضور، کوری مارکین میں لپٹے دو عدد امام ضامن حبیب سے نکالے۔ کل دوپہر ہم حضرت گنج گئے تھے۔ معلوم ہوا آپ آج سدھارنے والے ہیں۔ حضور جانے سے چند روز قبل بھائی حسین بخش نے ہماری بی بی سے کہا تھا بھیا ولایت لوٹ رہے ہیں انکے لیے امام ضامن سی دیجئے۔ ایک چمکتا روپیہ گومتی میں غوطہ دیکر پاک کر لائے تھے دیہ دوسرا امام ضامن ہماری طرف سے باندھ لیجئے“

”شکریہ بخٹو۔ آپ لوگوں نے بڑی زحمت کی۔ حینی کہاں چل دیے؟“

انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ کو نہیں معلوم؟ اسی امام ضامن کیلئے زرد روزی کا سامان خریدنے شہر گئے۔ جمعرات کی شام۔ پائے نالے پر شیعہ سنی شروع ہو گیا۔ بھگتدڑ مچی۔ جان بچانے کے لیے یہ بھی دوڑے۔ بوڑھے آدمی۔ دھان پان۔ گر پڑے۔ سر میں چوٹ آئی۔“

”پھر۔۔۔؟“

”رات کا وقت۔ کرنیو۔ خود ہی گرتے پڑتے رکشا کر کے ماشا پہنچے۔ سسٹرنے منصور بھیا کے گھر ٹیلی فون کیا۔ وہ پری محل گئے ہوئے تھے۔ دعوت میں۔ وہاں کا نمبر ملا۔ ان بے پرواہ لوگوں نے بہت دیر بعد ڈاکٹر صاحب کو خبر دی۔ وہ فوراً دواخانے پہنچے۔ خانساں جی کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ مگر انکا ایم آچکا تھا۔ کل انکا تیجا بھی ہو گیا۔“

میں سناٹے میں کھڑا امام ضامنوں کا نفیس کار چوب دیکھا کیا۔

اب بخٹو نے سفید رومال میں بندھا کٹوراں رکشائیں سے برآمد کیا۔

”ابھی ایک روز اللہ بہشت میں جگہ دے وہ مرحوم ہم سے کہنے لگے جو آپکے من بھاتے کھانے وہ جا پانگ روڈ پر پکا یا کرتے تھے آپکے تشریف لے جانے سے قبل وہی خاص تیار کریں گے۔ کہنے لگے۔ غنبر بیٹا۔ ہمارا بیگم صاحب پریشان۔ ورنہ بھیا کو کوٹھی پر بلاتے اب

ٹفن باسکٹ سینڈی بھیا کے بنگلے پر پہنچا دینگے۔ ہمیں انکی یہ بات یاد رہی۔ سرکار ہماری گھر والی نے وہی چیزیں پکا دی ہیں راستے کے لیے۔“ چند سکند بعد ذرا جھینپ کر بولے: ”ارے ہمیں پتہ ہے ہوائی جہاز میں ولایتی کھانا ملتا ہے مگر تھوڑا سا یہ بھی چکھ لیجئے گا۔ جیسنی بھائی مرحوم کی روح خوش ہو جاوے گی۔“ پھر سوچ کر کہا: ”مگر ولایت میں تو ہم نے سنا ہے بھکاری ہوتے ہی نہیں۔ امام ضامن کے روپے کس کو دیکھے گا؟“

سب سے زیادہ حاجتمند بھکاری ہم خود ہیں۔ بھائی، بخشو۔ یہ دو مقدس سکے ہم اپنے آپ کو دینگے۔ جان گرتیشن کو اب تک کسی سلور شینگل چلے ہیں۔

مبتلا تے بحث کو راز خدا کی کیا خبر۔ معنی بے لفظ و لفظ بے صدا کی کیا خبر (اکبر الہ آبادی) مگر راز خدا سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ بخشو کے جانے کے بعد سن سا اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ واہ صاحب واہ۔ کیا راز خدا ہے اور کیا قدرت کا انصاف۔ ممبرنگ سے آخری ملاقات کے لیے جب گیا تھا وہ تازہ اخبار میں کسی ضمنی ایکشن کی رپورٹ پڑھ رہی تھیں فرمایا۔ ایک مرتبہ حسین بخش کہہ رہے تھے بیگم صاحب ہماری کیا اوقات کان معاملوں میں زبان کھولیں۔ مگر ووٹ بھی تو ہمیں سے مانگنے آتے ہیں۔ ہم کس کو ووٹ دیں؟ ان لڑنے لڑوانے والوں کو ۹ دنگوں میں غریب ہی مارے جاتے ہیں۔ پھر پولیس۔ لیکن ٹھا کر صاحب اگر آپ نے ہندوستان کو خیر باد نہ کہا ہوتا۔“

انکی بات کاٹی: ”یہ کوئی اہم یا تاریخی واقعہ نہیں مگر شک میں اپنی پرانی جگہ سے حسین بخش کو میرے ہاں آنا پڑا۔ میں بھی اپنے متوسلین کو بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا۔“ جی اگر نہ جاتے اور سیاسی اکھاڑے میں آپ بھی بقول منصور کو وی مارتے تو یقیناً اپنے سابق علاقے اور ضلع کے بیشتر ووٹ آپ ہی کو ملتے۔ سابق والیان ریاست عام طور پر انتخاب جیت جاتے ہیں۔“

”شاید اسوجہ سے کہ اکثر نئے حکمراں بہتر ثابت نہیں ہوتے۔“
 ”مائی باپ سنڈروم! لہذا ثابت ہوا کہ وہ پرانا نظام بہتر تھا کیونکہ کبھی کبھی آپ لوگ

پنی رعیت کے ساتھ پدرانہ شفقت بھی برتتے تھے! مینر ہاؤس اور کالج والا غنوار آقا وروفادار عایا کا رشتہ! یوں تو اب آپ اگر چاہیں تو ایک انگلش کنٹری اسکوائر بھی نظر سکتے ہیں۔“

۵۶ء میں وکٹوریہ جہاز پر وہ میرے نئے بہروپی ”کریر“ سے واقف ہو چکی تھیں۔ ٹری کہہ گئیں۔ بات ہمیشہ کٹروی کرتی ہیں۔ لیکن اکثر صحیح۔ جنوری میں جب حسین بخش مرحوم پہلی بار دوڑے دوڑے مجھ سے ملنے ہوٹل پہنچے دیر تک باہر کھڑے رہے۔ مجھے دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ آنکھوں میں آنسو۔ میں بھی ان سے اسی ”پدرانہ سرپرستی“ سے ملا تھا۔ مسز بیگ حسب معمول بحث کے موڈ میں تھیں۔ چنانچہ عرض کیا ”اپنی تمام خرابیوں کے باوجود کردار سازی فیوڈلزم کا ایک وصف تھا۔ آج کردار کی تباہی۔ ہم اپنے نہیںال کے پرانے خدمتگاروں کو ماموں پکارتے تھے“

”آں۔ ہاں۔ انکل ٹام۔!“

”سن رسیدہ نوکروں اور ہندو مسلمان اہل محلہ اہل قریہ بڑے بوڑھوں کی عزت۔ لونی دادا۔ کوئی نانا۔ کوئی چاچا۔ مذہبی تعصبات مفقود۔ کردار کی پختگی۔ ادب لحاظ۔ تمیز حفظ مراتب۔“

”حفظ مراتب! آج جمہوری عوام خصوصاً ہریجنوں کی نئی خودداری اور سیاسی شعور لو آپ جیسے صاحبان انکی بدتمیزی اور اکرٹ سمجھتے ہیں!“

معلوم ہوتا ہے عندلیب بیگ پیدائشی طور پر حزب مخالف سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بے پناہ ریڈیکل۔ مگر حسین باورچی انکے سامنے بھی موڈب کھڑا رہتا تھا۔ انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو نہ کہا۔

اچھا صاحب۔ جنتی حسین بخش اور بھولے بھالے میاں بخٹو جو سائیکل رکشا لیے ہنوز دم کھینچ رہے ہیں۔ الوداع!

پالم انٹرنیشنل ایرپورٹ۔ ٹینو اس ریگال کے بجائے میلی المونیم کا چھوٹا سا

نانتے دان جو میرے بڑھیا اسباب کے ساتھ رکھا عجیب لگ رہا ہے۔ ہمسفر اچھی نظروں سے کبھی مجھے دیکھ لیتے ہیں کبھی اسے۔ ذرا رزاں ہاتھوں سے ڈھکن کھولتا ہوں میری پسندیدہ چیزیں۔ جو جینی، تختہ کو بتلا گئے تھے۔ کروندہ قیمہ۔ کمرخ آلو۔ ترگی کوفتے۔ نہایت رغبت سے بطور تبرک کھانا شروع کرتا ہوں۔ اچھی کیس سے ضخیم نوٹ بک نکال کر ورق گردانی کرتا جاتا ہوں۔————— تعجب ہوا عہد وسطیٰ کے صوفیائے کرام کے ملفوظات انکے مریدوں نے اسی تفصیل سے قلمبند کئے تھے۔ وہ حکایات اور فوق العادہ واقعات ناقابل یقین اور مریدوں کی والہانہ عقیدت کا کرشمہ اور میڈیول ذہن کی کارفرمائی معلوم ہوتے ہیں اس نوع کی متعدد تصانیف بڑے ابا مرحوم کی الماریوں میں موجود تھیں۔ — ترک وطن کرتے وقت مرحوم کا کتب خانہ ایک کباڑی کے ہاتھ بیچتے گئے تھے۔

اس دنیا میں ہمارے ایسے شاطر بھی موجود ہیں اور بابا بسز پویش کے ایسے بد قسمت بھی۔ وہ میاں کے ٹوٹی پھوٹی موٹروں کے کارخانے میں کیوں نہ پہنچ سکے؟ ڈاکٹر عسبریں بیگ جیسی نیک لڑکی تینکے چنے لگی۔ اور ہمارا پرانی نو فری کا ساتھی مندریش نرائن سنگھ تیس سال بعد ہمارے لیے خضر راہ ثابت ہوا۔ کیا مقصوم ازل نے ہم سب کے لئے یہ سب پہلے سے طے کر رکھا تھا؟ ہم نائیٹ کلب اور CASINO سے نکلے تو ایک خانقاہ میں جا پہنچے کیا یہ بھی پہلے سے طے تھا؟

پھر میں نے سینڈی کو الوداعی خط لکھنا شروع کیا مگر اپنے الفاظ کے بجائے قلم سے بیخاتہ چارلس لیب — کھیل کود کے ساتھی، مسرور پچین کے ہمدرد اور ندیم، سب گئے۔ غایب ہوئے وہ مانوس چہرے۔ آسب کے مانند میں ان مقامات میں گھومتا پھر جہاں لڑکپن گزارا تھا۔ زمین مجھے ایسا صحرا معلوم ہوتی مانوس شکلوں کی تلاش میں جسے عبور کرنا میرا مقدر تھا۔ میرے مونس، میرے بھائی۔ کاش ————— تم نے میرے باپ کے گھر میں جنم لیا ہوتا تاکہ ان ہستیوں کا ذکر کرتے۔ کیسے کچھ معدود

ہوئے۔ کچھ نے مجھے چھوڑ دیا۔ کچھ مجھ سے چھن گئے۔ سب رخصت ہوئے پرانے مانوس۔
ماں۔ بابا۔ نانا۔ میاں۔ جو انمرگ فخر النسا۔ بڑے باپ۔ حسین بخش۔

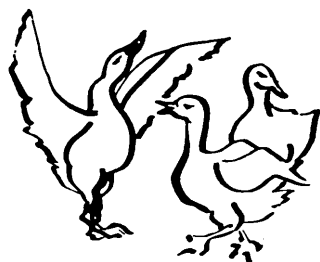
فرسٹ کلاس، اکونومی، ہر قوم اور ہر رنگت کے مسافروں کا تخت رواں سامنے
سے گذر گیا۔ چہار سمت جانے والے ہو پیمیا۔ دنیا کے ہر بڑے ایرپورٹ کی یکساں
گہا گہی سے اتنی آنکھیں پل بھر کے لیے بند کیں۔ پھر بلک جھپکی —
معاشرہ کی جھلک — کشمیری ڈریسنگ گاؤں۔ سرودھ۔ تبسم، روشن چہرہ۔
گاؤں کے آستانے پر اس پہلی شام ننھا تو الہ پچھو معرفتی چیز لاپتا تھا۔ اسکا استعارہ
بالآخر روشن ہوا۔ جھومت آدیں نند کے لالہ گلین میں۔ لکھ پرائے نور براجت۔ چنچل ہیں
چتوت چال رے۔ جھومت آدیں نند کے لالہ گلین میں۔
گلے موہین کا ہار رے۔

نور نور نور نور نور
لکھ پرائے نور براجت۔
نور نور نور نور نور۔ آگے مرشد۔ پیچھے مرشد۔ دائیں مرشد۔ بائیں مرشد۔ اندر
مرشد۔ باہر مرشد۔ اللہ
باہر تاریکی میں منتظر منور طیارے کی سمت کھلنے والے دروازے کے حردن
ردشن ہو چکے —

(راجہ دلشاد علی خاں کی نوٹ بک یہاں تمام ہوئی)

EXIT





(۴۶)۰

جنگلی بطخ

”گڈ ایوننگ مسز بیگ — راجہ دلتاد علیاں پھر غائب۔ مفقود البحر — آپ اسوقت اندھیرے اسٹوڈیو میں کیا کر رہی ہیں؟ روشنی جلا لیجئے۔“
”ہوں۔ ہوں۔“ معز بیگ کے سر اور ہاتھوں میں منصور نے نوٹس کیا خفیف سارے اٹ گیا تھا۔ انھوں نے شراب کی الماری کے پٹ بھیڑے۔

تمہارے لیے ایک بلڈی میری بنا دوں؟ میرے پاس وڈ کا بھی موجود ہے۔
”جی نہیں۔ شکریہ۔“ انکے لرزاں ہاتھوں پر نظر ڈالی۔ انہوں نے دیکھ لیا۔
”مڈورپ میں چند کیتھولک راہب اور راہبات کی ہتھیلیوں میں زخم نمودار ہو جاتے ہیں
STIGMATA میری بلڈی ہونی مما میں گڑی میخیں میری ہتھیلیوں میں۔ بابا“

”عسبر کہاں ہے؟“

”سورہی ہے۔ ماتا سے گھر آئے ایک ہفتہ ہونے آیا۔ زیادہ تر سویا ہی کرتی ہے۔
— شام سے بجلی غائب — ٹیلی فون خراب پڑا ہے۔ نیا باورچی بھی رفقہ چکر بطخیں
تک تو خاموش ہیں۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ چڑیوں کو بھی لگتا ہے سانپ سو گھگھ گیا۔
— ہاں وہ دلتاد علی کی کیا خبر سنا رہے تھے؟“

”مسز بیگ — راجہ صاحب نے لندن کو خیر باد کہا۔“

”بہرہ پیسے ہیں۔ کوئی اور سوانگ رچایا ہوگا۔“

”نورمن کا خط آیا ہے وہ لکھتا ہے سعودی عرب تشریف لے گئے ہیں۔“

”کوئی شیخ پھانس لیا ہوگا۔ ٹھہرو۔ میں ذرا موم بتیاں جلا لوں۔ تم چپ چپاتے آگے۔
موٹر سائیکل کی آواز تک نہ سنی۔ میں ڈرگتی۔ بڑا ڈپرینگ وقت ہے۔ تو نہ موم بتیوں کا بندل۔“

”میں ٹیکسی یہ آیا تھا۔ موٹر بائیک بھی خراب ہو گئی، ڈاکٹر علی کہاں ہیں؟“
 ”آج دسویں محرم ہے۔ مجلس۔۔۔“
 ”ارے ہاں۔ آج شام غزبیاں کی مجلس ہوگی۔ امام بارگاہ غفراں مآب۔“
 ”جی ہمارے اپنی ہی شام غزبیاں ہو رہی ہے۔ وہ کسی تاریک گوتھک قلعے میں
 ڈولتے آسب کی طرح کھانے کمرے میں گئیں۔۔۔ شمعداں اٹھا کر ٹولی ٹولتی
 واپس آئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے شمعیں روشن کیں۔ ان کی لرزدار روشنی میں سن سیدٹ بولوار
 کی گلو ریا سوان سن۔“

اچھا۔ راجہ دشا دت نے اب کس کو بر باد کیا؟ بیٹھ جاؤ۔
 JOHN NY WALKER STILL GOING STRONG — چلے گا —؟“

”جی نہیں شکریہ۔۔۔“

”DONT BE VAGUE ASK FOR HAGUE“

”نو تھینکس“

منصور تردد سے انہیں دیکھتا رہا۔

”راجہ دشا دت علی خاں کا جام صحت۔۔۔ ہاں اب بتاؤ۔ کیا ہوا۔ لندن کو خیر باد کہا؟“
 ”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ نگار خانم کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد نجانے یہاں کن
 چکر دوں میں پڑ گئے تھے۔ چار ماہ لکھنؤ سے غائب رہے۔ پھر ایک روز مجھے فون کر
 کے کسی HOLY MAN کا تذکرہ کرنے لگے چلتے وقت ان دونوں بہنوں کو فون
 تک نہیں کیا۔“

”نورمن لکھتا ہے ڈیڈی جب لکھنؤ سے لندن لوٹے تو کچھ بدلے بدلے سے تھے۔
 تین چار دن تک دروازے بند کیے اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ کھانے اور چائے کیلئے
 باہر آتے۔ تب بھی خاموش۔ یہ تینوں پارٹنر فورٹما سلی اور دشا دت علی اپنے اپنے کام سے
 کام رکھنے کے نظریے کے پابند ہیں۔ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں

دیتے۔ ہم تینوں پارٹنرز شازادہ، عنبر نس اور خاکسار کے برعکس! ”
 ”تھینک یو۔“ عندلیب نے طعنے کو محسوس کر جواب دیا۔ ”اگر تمہاری ایک پارٹنر

اس طرح بیمار پڑ جائے تو تمہیں اسکا خیال نہیں کرنا چاہیے؟“
 ”میں آپکے دہیال کی بات کر رہا ہوں۔ مائینڈ یوراؤن بزنس والا یورپین روٹیہ
 بہر حال۔ تو نورمن لکھتا ہے کہ نور ماڈریک نے مسٹر دشا دعلی کی بدلی ہوئی کیفیت کا
 زیادہ نوٹس نہ لیا۔ اسبطرح کمرے بند کیے بیٹھے رہے۔

”— ایک شام کھانے کی میز پر کچھ محبت رعقول واقعات کا تذکرہ کرنے لگے۔
 سامعین کو مسکراتے دیکھ کر پھر چپ سادھ لی۔ ایک دن نور ما سے کہا اپنے کاروبار سے
 دستبردار ہو جائیں۔ مسجد میں چل کر ان سے نکاح پڑھوا لیں۔ نور ما اور سیلی کو یقین
 ہو گیا کہ انکا دفاع خراب ہو چلا ہے انکو ایک منیٹل ہوم میں داخل کرنے کی فکر کی۔
 اسی طرح مسز بیگ جیسے بابا سبز پوش کی نصیحتیں سن کر انکے بھائیوں نے انکو پاگل
 منسوب کر دیا ہے۔ تب راجہ صاحب نے اپنی ساری جائیداد منقولہ وغیر منقولہ
 نور ما کے نام منتقل کر دی۔ یہ پندرہ دن کے اندر کے واقعات ہیں۔ ایک روز
 بنک جا کر فانیل کاروائی سے فارغ ہوتے ہی تھے اور کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب
 کیا کریں گے آئندہ گذر اوقات کا کوئی ذریعہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ نور ما کے ہاں رہنے کو
 تیار نہ تھے۔ اتنے میں ایک عرب شیخ نفع نفع کرتا کاؤنٹر پر پہنچا۔“
 ”نورمن نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نفع نفع کرتا۔“

”وہ انگریزی سے ناواقف تھا۔ انہوں نے فوراً اسکی ترجمانی شروع کی۔“

”موصوف عربی بھی جانتے ہیں؟“

”عربی؟ ایٹلین۔ اینیش۔ سو آعلیٰ تک تو انکو آتی ہے۔ گورے چٹے آدمی۔ امریکہ میں
 تب تھے انٹرنیٹ سے بچنے کے لیے کبھی گریک بن جاتے تھے۔ کبھی میکیزین یا اسپینرڈ
 بہاں مسٹر ڈی۔ اے۔ چودھری بن کر وارد ہوتے تھے۔ چودھری دھیان سنگھ آرزو
 برطانوی مندوب۔! یاد ہے؟ بعد میں نگار خانم پر اصلیت ظاہر کر دی۔

گوتمی کی جل بہار۔ ایک مقامی بنجارن ایک اسپینش جیسی ڈانس سبیلی گارڈ کے کھنڈر
ایک تارک کو نے میں عندلیب بانو کا وہ فوٹو گراف رکھا ہوا تھا جسے وہ پورٹریٹ
ان اے ناچ گرل II ” کہتی تھیں۔ اسکے آگے نواب فاطمہ کی سرخ پٹاری ایک اسٹول
پر موجود تھی۔ شاید ڈرائیگ روم کی صفائی کرتے ہوئے لاکر یہاں رکھ دی ہوگی یہ پٹاری
PANDORA'S BOX ثابت ہوئی تھی۔ اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے دو تصویریں
اٹھائیں جو کینوس اور برشوں کے ڈھیر میں فرش پر اوندھی پڑی تھی کٹورین گاؤں میں
ایک ایسی میم پری پیکر نیچے نام — ملکہ جان والدہ گوسہر جان۔ پشت پر :

GARRICK'S STUDIO, 3, WATERLOO STREET,

CALCUTTA 1874

مزید اطلاع نیچے مرقوم تھی کہ مسز گرگ ہندو اور مسلم لیڈیز کے فوٹو انکے مکانوں پر
پینے کے لئے دو گنی رقم چارج کرے گی۔ گلاس اور فریم سمیت پورٹریٹ ۱۴ روپیہ۔
آئیل کا فوٹو پچاس روپیہ۔ دوسرا فوٹو گراف۔ ایک خوش شکل تیز طرار سائورڈین لوجوان
نیچے اسٹوڈیو کا نام — JACQUES CORBIN, CHANDRGORE, 1909.

منصور چند لمحوں تک موسیو آندرے رینال کو ملاحظہ کرتا رہا — پھر ملکہ جان
ارمنی اور آندرے رینال بلجین دونوں کو رنگوں اور کاغذوں کے انبار میں واپس
دفن کر دیا۔ اور دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ رام کلی کے ہاں تلسی میں دیا جل رہا تھا۔
تالاب کے کنارے بطخیں پردوں میں چونچیں چھپاتے محو خواب تھیں قریب کی کوٹھی
سے مجلس کی آواز آرہی تھی۔ کہیں بانوسیس نواؤں کہاں موراٹیاں تو موہے بسا گیو۔
میں تو دو دھن دھار سے نہائے رہی۔ میں تو پوتن بھاگ سہائے رہی۔ میں تو لاکھ
سنگھار بنائے رہی موراٹیاں سنگار بگاڑ گیو۔ مورا اکبر لال جوان گیو۔ مورا اصغر بالک ندان
گیو۔ مورے لال سکھی انمول ہتے۔ آج شام نگر کی بجار گیو۔

منصور دروازہ کھول کر باغ میں اتر گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر نوحہ سننے لگا —
میں تو ہاتھ پا کے بھیکھ لے۔ موری پونجی جنم کی دیوندمی۔ میں تو جنگل جنگل ڈھونڈ پھری

مورے لال کا پتہ نہ نشان ملو ————— مسز بیگ جانے کہاں رہ گئیں۔ عجبز جانے کے بعد شاید با تھر روم میں ہو ————— والدہ کچن کی طرف جاتی نظر آئیں۔ اس نے سوچا پکار کر کہے کہ کافی وغیرہ کا تکلف نہ کریں لیکن پڑوس میں ایک اور دلدوز نوحہ شروع ہو گیا ————— آج تین اکیلے ہیں لٹ گئی جو مایا تھی ————— سنان کر بلا سے آواز آرہی ہے۔

کر بلا کی دھرتی پہ تھک کے سو گئے ساتھی ————— لیکن یہ رن سے کیسی ————— ایک چیخ سنائی دی ————— ”منصور ————— منصور ————— عجبز بھر نکل بھاگی“ وہ لپک کر اندر گیا۔ ”میں سر شام سے اسٹوڈیو کے دروازے سے بند کیے بیٹھی تھی۔ جانے کس وقت فرار ہو گئی۔ کچن۔ باغ سب دیکھ لیا ————— موٹر خانہ کھلا پڑا ہے۔“ مسز بیگ پنٹیری میں تو اس باختہ کھڑی تھیں ”میٹر دیکھو۔ میٹر۔“

”کیسا میٹر؟“

”ارے بجلی کا میٹر اور کیسا میٹر ————— سامنے کے برآمدے میں میں نے کار کی کنجیاں اسیں چھپا رکھی تھیں۔“

منصور باہر بھاگا۔ موٹر گیراج خالی پڑا تھا۔

وہ مالی کو آواز دیتا پھاٹک کی طرف دوڑا۔ عندلیب بیگ ہانپتی کانپتی اس کے پیچھے۔

رام سر وہ مالی باغ کے نل پر بیٹھا انگوچھا چھانٹ رہا تھا۔ وہ تینوں روربنگ روڈ پر پہنچے۔ ”اس کینجٹ شہر میں ٹکیسی بھی تو نہیں ملتی“ عندلیب بانو نے جھڑ جھری آواز میں فریاد کی بٹرک پر ٹریفک کم ہو چلا تھا۔ روشنیاں مضمحل۔ راگہیر سیاہ پوش۔ برابر والی کوٹھی میں نوحہ خوانی جاری تھی۔ منصور نے مالی کو دوسری سمت دوڑایا خود بولووار پر سے گذرتی موٹروں کو دیکھتے لگا۔ ہر سبز ایمبیسیڈر کو تاکتا مگر وہ زن سے آگے نکل جاتی۔ پندرہ منٹ گذر گئے۔ ”میں شاردا کے ہاں جاتا ہوں ————— ذرا کوئی خالی رکشا روکیے۔“ سب بھری ہوئی جا رہی تھیں۔ چند منٹ بعد رات کی دُھند میں ایک رکشا نمودار ہوئی ایک خاتون شال سے سیاہ سر ڈھانپے اس پر بیٹھی تھیں تجھو کی صورت نظر آئی۔ اسکے بعد عجبز۔

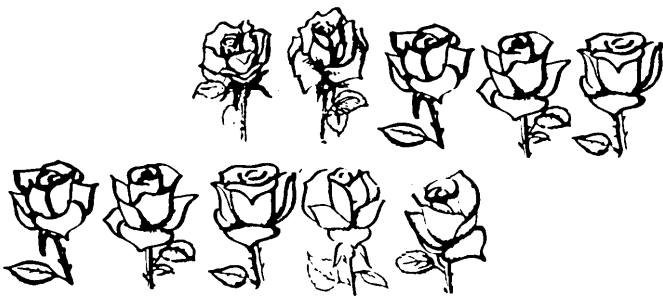
راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہم ترنت پہنچے۔ بیٹا چلائے جا رہی تھیں یہ پھاٹک یہاں فرٹ نہیں بیٹھتا میں اسکو تہس نہس کر ڈالوں گی۔ تیسری بار دھکا مارا تو پھاٹک کیا ٹوٹا گاڑی کے لمب چکنا چور۔ کھڑکی کا کانسج بھی ٹوٹ گیا بیٹا کو زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ ہاتھوں میں شیشے چھ گئے۔

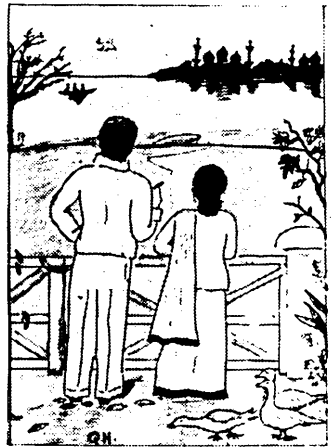
عندلیب بانور کشا کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ اور وحشت زدہ نکا ہوں سے کبھی ڈاکٹر کو دیکھتی تھیں کبھی بیٹی کو۔ انکا سر ملنے لگا تھا جیسے وہ — سفید بالوں والی ایک گڑیا ہوتی ہے ذرا سا ٹھوکا لگا دیا پھونک مارا تو دیر تک اسکی مُنڈیا ہلتی رہتی ہے۔ — یک بیک وہ ایک سو سالہ ضعیفہ معلوم ہو رہی تھیں تنہا۔ لاچار۔ سحر زائیل ہونے کے بعد رائیڈر بیگس ڈکی SHE — منصور بھاگ کر گیلری میں سے فرسٹ ایڈ کا بکس اٹھا لایا ناخات اماں اور رام سر وہ پھاٹک میں داخل ہوئے۔ رام کلی رکشا کے پاس کھڑی عنبر کو اترنے کیلئے پچکار رہی تھی پھر اسنے کہا: ”دیارے۔ بیٹا تو جانو پتھر کی مورتی ہوئے گین۔“

”منصور! منسریگ نے فریاد کی ”یہ تو ماشا سے بھلی جنگی ہو کر لونی تھی۔ نہیں ہا اب یہ کبھی اچھی نہیں ہوگی؟“

”نیم — ہم لوگ فوراً سے پیشتر لندن جا رہے ہیں نا۔ آپ سب ملکر اسے رکشا سے اتارنے کی ترکیب کیجئے۔ مجھے تو اس نے ابھی بڑے زور کا دھکا دیا۔“ منصور نے ذراتا سف سے اپنے بڑھیا امریکن کوٹ کی آستین پر رنگا ہ ڈالی جس پر عنبریں کے خون آلود نیچے کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔

اکبر علی اور رام سر وہ پگھرائے ہوئے پہنچے۔ رام کلی پانی کا جگ اور چلمی لیکر حاضر ہوئی۔ عنبرین نے اپنے چاروں طرف لگے مجمع کو گھور کر دیکھا۔ پھر ریڈیڈنسٹی نظریں جمائیں اور اپنی پوری طاقت سے چیخی — ”ہے ہے“





دریائے نما

سنہرا اکتوبر گلِ عجائب کھلنے کا موسم ہے۔ اسکے شوگنے صبح سویرے گلانی، دوپہر کو سپید، شام کو ارغوانی ہو جاتے ہیں۔ گلِ عجائب۔

وہ دونوں پھانگ پر کھنیاں ٹیکے ندی کی سیر کر رہے تھے۔ آبی رنگ کی ساری میں ملبوس ایک خاتون بہت دور ڈھال پر سے آتی دکھلائی دیں۔

”سنر جوڑن — ایوننگ واک کے لئے آج دیر میں نکلیں“

”سنر جوڑن کا انتقال ہو گیا منصور۔ یہ تو امی ہیں۔ سہلی گارڈ گئی ہوگی۔ ہاتھ کا پنے لگا ہے مگر ایسیج بنانے میں جٹی رہتی ہیں“

وہ ان کے نزدیک پہنچیں۔ منہ اٹھا کر مسکرائیں۔ جس طرح آسمان پر سے گزرتے پرندوں کو دیکھ کر مسرور ہوتی تھیں۔ آنکھیں چندھیا کر بولیں ”ادھو — لون رنجیر اور گرل فرنیڈ — گھوڑے کھونٹے سے باندھ کر ڈوبتے سورج کا نظارہ — آخری سین“

”جی ہاں آخری سین۔ لون رنجیر — گٹار بجاتے ہوئے شفق میں غائب —“ منصور نے سگفتگی سے جواب دیا۔

عندلیب بانو چند قدم آگے جا کر آم کے درخت کے نیچے رک گئیں۔ ڈالی پر ایک زرد رنگ کی چڑیا بیٹھی تھی۔ سنہری رنجیر والی عینک لگا کر اسے دیکھا۔ ”لو برڈ۔ انگریزی میں — فارسی میں اسے سرخ عشق کہتے ہیں۔ جب خوش ہوتا ہے خوب چھپاتا ہے ورنہ چپ رہتا ہے“ وہ سفید قمیص سر جھکاتے تیز تیز قدم اٹھاتی تو ٹھکی کی طرف چلی گئیں۔

”امی نے اس مرتبہ لندن میں بے شمار فلم دیکھے کا ڈولوائے پکچرز تک نہیں چھوڑیں۔ پب

سے نکلتیں تو سنیما ہال میں جا بیٹھتیں۔ وہاں سے واپس آ کر پھر پ میں — منصور امی اکلک ہوتی جا رہی ہیں۔“

”معلوم ہے۔ آؤ کچھ خوشگوار باتیں کریں۔ اس مکان کا نام سوچو۔ اب تک بے نام پڑا ہے۔“

”امبیکا بھون“

”خدا کی پناہ۔ پھر وہی وظیفہ شروع ہو گیا“

”اکلک ماں۔ اور نیورونک بیٹی۔ کہاں تک جھیلو گے۔ عاجز آ کر بھاگ جانا چاہتے ہو۔

لیکن اب تمہارا فرار بہادری سے برداشت کر لوں گی“

”نام تو سوچو یا جب بھاگوں گا دیکھا جائے گا۔ دریا نما ہی رکھ لو۔ پہلے بھی کہا تھا“

”دریا نما۔ قطب نما — نہیں بھتی۔ چولبے نا“

”اچھا — اور سوچتے ہیں“

”لندن برج از فالنگ ڈاؤن۔ فالنگ ڈاؤن فالنگ ڈاؤن مائی فیر لیڈی —“

”یکوں یاد آیا؟“

”ایک بار کہا نہیں تھا جھلکیاں بہت سی ہیں آدمی ایک۔ جھانکیاں۔ تخت رواں۔ روشن

چوکیاں۔ جل بہار کے بحرے۔ سب پانگ شو۔ سب ایک دوسرے میں مدغم — جیسے —“

”یوجین پیٹرسن اور انڈا دیوی —!“

”ہاں۔ مرزا دلدار علی برلاس اور نواب فاطمہ اور آندرے رینال اور غنڈیب بانو —“

ار سے پتہ ہے — شمو کی بیٹی یعنی مہر و خالہ کی نواسی چھوٹا سنا ہے بمبئی میں موجود ہیں۔ بوڑھی پوٹو

سینا یل ہو گئی ہیں۔ اور بہری پٹ ایک پڑ پوتے کے ساتھ رہتی ہیں جو چار ٹرڈاکاؤنٹ ہے۔“

”زیو الونگ اسٹیج — اچھا یا ناٹک!!“

”ٹھا کر ہیشورنگھ۔ امبا پر شاؤسکو حرمین۔ فلو مینا۔ بابا سبزویش۔!“

”راجہ دلشا دعلی خان آف دھان پور“

”جولاروند سے اتر کر نکل بھاگے!“

”کوئی شخص کھیتا برا نہیں“

”ہاں۔ بطور ایفیس بھی تو کہا جاتا ہے ہارٹ آف گولڈ کی مالک ہوتی ہیں۔ نور ماڈریک کو دیکھو۔
 سال بھر ہم لوگوں کی کیسی مہمانداری کی۔“

”دبا کر پیسے بھی تو وصول کیے تم سے۔ بطور لینڈ لیڈی۔“

”چلو خیر۔ امی نے ایک مرتبہ کہا تھا نا فیصلوں میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا پتہ
 نگار خانم کے اندر بھی کوئی پوشیدہ خوبیاں موجود ہوں؟“

”ہم ان خوبیوں کے نمود کا صبر سے انتظار کریں گے۔“

”وہ بیچ اینڈ جوڈی شو یا د ہے انگلینڈ کے دیہاتی میلے والا۔ اور ڈاربی اور جون۔“

”ہاں۔ گلا پوشتا بو۔“

”مسٹر ہری مایا بھٹناگر۔“

”تم جن چیزوں کو بھولنا چاہتی ہو ڈٹ کر انکا مقابلہ کرو۔“

”دس مہینے تک روزین باؤم بھی یہی رٹا کیا۔ کوئی نیا نسخہ باندھو یا۔“

”نہیں کچھ بھی یاد۔ یوں ہی بامراد۔ یوں ہی شاد شاد۔ گویا رہے گی برسوں
 پھولی ہوئی ہے برسوں۔ گویا رہے گی برسوں۔“

”یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ گویا رہے گی برسوں۔ کہاں ہے پچھلے برسوں کی برون۔“

”اور پچھلی بنت کی برسوں؟“

”عبدالرحمن کابلی۔ شیخ افتخار الرسول۔ گوہر جان اف کلکتہ۔“

”حسین جمیل اینڈ ریٹیل۔ مصنوعی دانتوں والی ایک رعشہ زدہ مضحکہ خیز سی اینگلو انڈین
 بڑھیا۔ امی بہت لڑیں زندگی سے۔ اب تھک ہا گئیں۔“

”اسوقت تم بہت سیڈھو رہی ہو!“

”کیا۔“

”ایک روز میں نگار خانم کے ہاں گیا۔ ایسے ہی، گودھولے کے وقت۔ وہ دریچے میں بڑا
 رومینگ پوز بنا تے کھڑی تھیں کہنے لگیں اسوقت ہم بہت سیڈھو رہے ہیں۔“

”نگاروشہوارکا بار بار ڈکر کر کے میرا نفسیاتی علاج جاری رکھنا چاہتے ہو۔“

منصور۔ ایک بات سنو۔ مردہ خانوں میں رکھی لاشیں جیسے دھرنا دیدیں“

”لاشوں کا یہاں کیا ذکر ہے؟“

”منوں وزنی ہو جائیں۔ تاکہ انکو اٹھایا نہ جاسکے۔ یا سب کھڑے ہو کر زندگی کا مطالبہ کریں۔ کیوں میں حسین بخش سب سے آگے نواب فاطمہ۔ چہرہ گینسر سے مسخ او کیسجن ٹنٹ کا گھونٹ۔ ناک میں کیسجن کی نلیوں کا بلاق۔ پانی پانی ہوتی بے نور آنکھیں۔ بیہوشی میں بار بار امی کو پکارتی تھیں۔ یا ابا۔ ابا۔ چلاتی تھیں۔ لیکن امی کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں۔ فلومینا نے کہا اینڈی بابا۔ ماما کے پاس جاؤ۔ تب گئیں۔ آہستہ سے کہا ماما۔ تب نانی کی بے نور تیلیوں میں اچانک جنبش آگئی تھی۔ پھر آنکھیں پتھر گئیں۔ اتنے میں مولوی صاحب نازل ہوئے۔ امی انکے پیچھے دوڑیں۔ اور گری ختم۔“

”غیر۔ اتنی پرانی بات ہے۔ رو کیوں رہی ہو۔ اب تو سب ٹھیک ہے“

”کیا ٹھیک ہے؟ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ منصور“

”عمبر۔ چیراپ۔ اسطرح دونوں وقت ملتے رویا نہیں کرتے۔ ہنسو۔ ہنسو بھی رشا باش اپنے باغ کو دیکھو اور آسمان کا نظارہ کرو۔ موج گل۔ موج صبا۔ موج شفق۔“

”موج شراب۔“

”مام جہلمین۔ بھاگو۔ مجھے امی کے ساتھ ایک اہم مشن پر جانا ہے۔“

”کہاں۔؟“

”کل بتاؤں گی۔ کلنگ میں۔“

”کچھ اتہ پتہ۔“

”اس مشن کی وضاحت کے لیے لفظ معلوم نہیں۔ وہ کیا نظم تم نے ایک بار سنا تی تھی؟“

”اوہ۔۔۔ میں مشرقی جنگلے پر کھڑا کاہلی سے گل داؤدی توڑتا ہوں۔؟“

امن سے جنوبی پہاڑوں کو نکلتا ہوں۔

ڈوبتی روشنی میں ہوا خوشگوار ہے۔

آوارہ پرندوں کے جوڑے اڑتے جا رہے ہیں۔

منصور خاموش رہا۔ افسردگی کے ساتھ سٹرک کی طرف دیکھنے لگا۔
”تم نے جب وہ نظم سنائی تھی میں نے امی کی کتابوں میں سے ٹینیسن نکال کر ساری پڑھ
ڈالی۔“

”اوہ۔“

”اسے پڑھ کر مجھے کلکتے کے کسی اداس گارڈن ہاؤس میں تقاؤں کے نیچے بیٹھی بھالہ بردار
بلاڈز اور وکٹوریہن سایہ پہنے کسی اداس تنہا لڑکی کا خیال آیا۔ یونو واٹ آئی برین۔
منصور۔ کیا میں اپنے آپ کو تمہیں سمجھا پائی ہوں۔“
”یس مائی ڈیر۔“

”اچھا۔ اس نے یکلخت بڑی طہایت اور خوشی کے ساتھ کہا۔ اب تم اپنی موبائیک پر
بیٹھو۔ اور آگے آگے جاؤ بطور پائیلٹ۔“
”کہاں تلک۔“
”چھتر منزل۔“

مسٹر عنایب بیگ باہر آکر پھر کار میں بیٹھ گئیں۔ ہارن بجایا۔

”مشن خفیہ ہے۔ میں اور امی ایک ایسی جگہ کا قصد رکھتے ہیں جہاں جانے کو تم منع
کرد گے۔“

”اچھا تو میں کلب کی طرف نکل جاؤں گا۔“

”شیور۔ HAVE FUN۔ گڈ نایت۔“

”گڈ نایت عنبر۔ بیوا سے نائیس ٹائم۔“

(۴۸)

پانیوں پہ بہتی موسیقی

ہلکے سبز غرارے کے جوڑا، زمرہ کے گوشوارے شہوار خانم حسب معمول نہایت پرکشش اور گلیمس معلوم ہو رہی تھیں۔ سیٹر ڈے نارٹ — کلب جانے کے لئے برآمدے میں تیار کھڑی تھیں۔ برساتی میں بیگ ماں بیٹیوں کی کار آن کر رکی — فوراً ٹوٹس کیا کہ دونوں نے پیرس کے تازہ ترین فیشن کے کوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ انہیں اپنے یہاں آنا دیکھ کر متعجب ہوئیں۔ لیکن خواتین کی ایک دوسرے کے خلاف کولڈ وار کے اصولوں کے تحت آگے بڑھ کر بڑے ہی خلیق لہجے میں بولیں: ”اوہ — ہلو — آداب عرض۔ آپ کہاں آئیے۔ آئیے مزاج شریف۔“

عندلیب بانو اور عنبر اسی منافقانہ انداز سے مسکراتی برآمدے کی مرمریں سیڑھیاں چڑھیں۔ شہوار نے انکو اندرے جاتے ہوئے کہا: ”سانٹھا آپ لوگ باہر گئی ہوتی تھیں۔ آپکی ڈاکٹر صاحب طبیعت ناساز تھی مجھے تو معلوم کر کر کے بڑی فکر ہوئی۔ باجی سے کہا بھی آپکی عبادت کرائیں۔ پتہ چلا آپ لندن جا چکی ہیں۔ ہم لوگ بھی اس سال زیادہ تر باہر ہی رہے۔ کچھ عرصہ یورپ میں گزارا باقی بنگلور۔ اب آپکی طبیعت کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟“

”بہتر ہوں۔ شکر یہ۔ ڈاکٹر لوگ زیادہ عرصے تک صاحب فرمائش نہیں رہ پاتے۔ اپنے مریضوں کی خاطر انہیں دیر یا سویرا چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ تین ماہ کے لئے گئی تھی وہاں علاج معالجے میں پورے دس مہینے لگ گئے۔“

”جی — جی — شہوار نے سر ہلایا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر قبلائی بہاؤ بھونکا۔“
 ”فرنیڈز کو بلانی گھان — فرنیڈز — کیپ کو ایٹ — آئیے۔ باجی نیچے ہی ہیں۔ انکی طبیعت بھی خراب چلی جاتی ہے۔ منصور نے نئی دوائیں شروع کر دوائی ہیں۔ گیلبری کے سرے

پر پہنچیں۔ لکھنؤ میں تو ابھی سردی نہیں پڑی آپ نے کوٹ پہن رکھے ہیں! یہ پیر کا ڈین تو نہیں ہیں۔ سنٹی اندر جا کر دروازہ کھولو۔ پیر کا ڈین تو علیحدہ پہچان لیے جاتے ہیں۔ میرے پاس تو ایو سینٹ لارنٹ کے بھی بے شمار کوٹ ہیں۔ اس سال بیرس سے کچھ نہیں خریدا۔ ایڑ پوزر لاسٹ میں اور بجیا چند سینٹ لارنٹ اور کارڈین لے آئے تھے۔“

”ایسیس تو ریں اور پیخ کا غدیس۔“ عنبر نے فوراً نہایت اخلاق سے تلفظ کی تصحیح کی۔ ”یہ لائٹ کوٹ ہم نے اس لیے پہن رکھے ہیں کہ لکھنؤ میں گلابی جاڑے تو شروع ہو چکے اور ہم دونوں زکام میں مبتلا ہیں۔“

مہری نے دروازہ کھولا۔ وہ تینوں آبشار والے کمرے میں داخل ہوئیں۔ یکسر ہیکٹاں بیٹیوں نے پہلی بار دیکھا اور متحیر نظر آئیں۔ شہوار نے اتنے استعجاب کو رشک و تحسین پر محمول کیا۔

زگار خانم مصنوعی بھرنے کے سامنے بلوڑیں صوفے پر نیم دراز نئے ناول کے پروف دیکھ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھائی۔ نو واردوں کو دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئیں۔

”آئیے۔ آئیے۔ آداب عرض کیسے آنا ہوا۔ سنا ہے آپ کا تو۔“

”جی ہاں۔ دماغ چل گیا تھا۔ انگلستان گئی تھی۔ پچھلے سال اکتوبر میں۔ بغرض علاج ابھی واپس آئی ہوں۔ چند روز قبل بہتر ہوں۔“

”نشریف رکھیے۔ کیا پیسے کی؟ کافی۔ چاء۔ سنٹی۔“

وہ دونوں دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ سوشل گفتگو شروع ہوئی۔ نگار خانم نے عنبر کا ناقدانہ جائزہ لیکر بڑی رس بھری آواز میں کہا: ”انگلستان کی آب و ہوائ نے آپ کی صحت پر بہت اچھا اثر کیا۔ ماشا اللہ۔ اپنی عمر سے دس سال کم لگ رہی ہیں۔ ہیرا سٹائل بدلوا لیجئے۔“

شہوار اکی بار وہاں میرے پیچھے پڑی کہ بال کٹوالوں میں نے کہا بھیا اپنا اولڈ فیشن جوڑا ہی بھلا۔ مگر آپ۔۔۔ اکی بار آپ لندن جائیں تو ایک پتہ دوں گی۔

”ایک ہیر ڈریسر ہے۔ ایسا ہنگامہ بھی نہیں ہے مگر ایسے ہیرا سٹائل بناتا ہے کہ ہر طرح کے چہرے کو سوٹ کرتے ہیں۔ اور ڈانی کے بجائے مہندی بہتر رہتی ہے۔“

”ضرور۔۔۔ ضرور“۔۔۔ عنبر نے جواب دیا اب اسکی باری تھی۔ نہایت گرجوشی سے دریافت کیا: ”یہ آپ کا کون سا ناول ہے؟“

”چھٹی سوال“۔۔۔

”ماشا اللہ۔ عنوان کیا رکھا ہے؟“

”ابھی کچھ سوچا نہیں“

”منزل کہاں ہے تیری“۔۔۔ رکھ لیجئے یا۔۔۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ“

”ہم لوگ آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں“۔۔۔ عندلیب بانو نے دند و سیدٹ پر جا کر بیٹھتے ہوئے بات شروع کی۔ ”حالانکہ آپ ہم جیسوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔ لیکن مجبوری“

”بھگلو بھگلو کے۔۔۔ بھگلو بھگلو کے۔۔۔“ درپچے کے باہر سے ایک باریک سی آواز آئی۔ حسب معمول خواجہ سبز پوش گملوں میں چھپے کن سوتیاں لے رہے تھے۔ منصور نے سال گذشتہ شاگرد پیشے میں اس عجیب و غریب ملاقات کے بعد عندلیب بیگ کو ان بے چارے کی اس المناک عادت کے متعلق بتایا تھا۔ آواز سے دھیان ہٹا کر عندلیب بانو نے ایوان نشست کا جائزہ لیا جسکا تذکرہ منصور سے انٹائن رکھا تھا۔

نینگلوں مصنوعی آبا رکے اوپر پہاڑی ٹیما نیٹل میس پر صندل اور تانبے کی چندورتیاں رکھی تھیں جو ظاہر تھا کہ اس بار دونوں بہنیں میسور سے خرید لائی تھیں۔ سب سے اونچی چوٹی خالی پڑی تھی جن پر منصور نے بتایا تھا کہ نواب بیگم کا کیمبو سجا رہتا تھا

خالی جگہ دیکھ کر عندلیب بانو دھک سے رہ گئیں۔ نگار خانم کو مخاطب کیا۔ ”دیکھئے وہ۔۔۔ ایسا ہے کہ۔۔۔ وہ مختصر تصویر جکی وجہ سے پچھلے سال وہ سارا غدر مچا اسے واپس کر دیں تو ممنون ہونگی۔“

”اس تصویر سے آپکا کیا تعلق تھا؟“

”آپکا تجاہل عارفانہ قابل داد ہے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ وہ کیمبو چرایا گیا تھا اور آپ مال مسروقہ کی خریدار تھیں۔ گو آپ لاعلم تھیں۔ ہم دنیا کے بہت سے معاملات کے متعلق غلط باتیں کرتے ہیں غلط ایجنج غلط نظریے قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم بیخبر ہیں۔“

اب تو آپ جان گئی ہیں۔ وہ تصویر واپس کر دیجئے۔ اور وہ بڑا پورٹریٹ بھی جو مارواڑی اپنے ساتھ جے پور سے لاکر آپکی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور تفصیل بتاؤں۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

PORTRAIT OF A NAUTCH GIRL

—BY ANDRE RENAL—

CHANDRANA GORE—

1911

”ادہو— آپکو خوب ازبر ہے۔ وہ کس طرح؟ تو عرض یہ ہے کہ وہ کمیوٹو مینجے بھیانے اسی رات کوڑے میں ڈال دیا تھا۔ اور وہ بڑا فوٹو بلیک میلر مارواڑی لائے تھے اسکے تو بڑے بھیانے پر نیچے اڑادیے بکڑے بکڑے کر کے باہر سڑک پر پھینکوا دیا۔ بلیک میلنگ کی بہی سزا ہے۔“

عندلیب بانو ششدر رہ گئیں۔ ”میری ماں کی تصویریں رڈی میں پھینکنے کا حق آپکو کس نے دیا۔۔۔؟“

”لاعلیٰ نے۔۔۔“

”ڈھونڈیے۔ شاید وہ کمیوٹو مل جائے۔“

”اب کہاں ملے گا۔ ڈیڑھ سال پرانی بات ہے۔ ہمارے ہاں صبح شام صفائی ہوتی ہے۔ وکیوم کلیئر سے الگ اور جھاڑو سے الگ۔“

اتنے جوتے کھا کر بھی نگار خانم کے دماغ کا خناس نہیں گیا۔ بہت ہی بدعورت ہے۔۔۔ عندلیب بانو نے کھولتے ہوئے سوچا۔ ترشی سے بولیں۔ ”مجھے معلوم ہے جمہادوں کی پلٹن آپکے گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرتی ہے۔ اسکے علاوہ آپکے ہاں کا ڈرنیٹن بھی سپلک میں ڈھلتا ہے۔“

”شاباش۔۔۔“ دریچے کے نیچے سے آواز آئی۔

”شاید آپکو یاد ہو۔ آپکے مینٹل میں پر وہ کمیوٹو سجا دیکھ کر اسوقت تو ڈاکٹر منصور چپ رہے۔“

لیکن جب رسالے کے خاص نمبر میں اسکا بلاک چھپا تو انہوں نے آپ دونوں بہنوں سے کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر ٹریگ کے ہاں کی تصویر ہے۔ انکے نیپالی ملازم نے چڑا کر نتاس میں فروخت کی اور وہاں سے آپ خرید لائیں۔ آپ نے بیڑتی سے دوبارہ وہی جواب دیا کہ یہ آپکی دادی حضرت کی شبیہ مبارک ہے۔ بطور ثبوت آپ نے اسکی نشت پر لکھے فرضی خطابات وغیرہ بھی دکھائے۔

— اے چند روز بعد ہی آپکے ہاں وہ ہنگامہ خیز تقریب منعقد ہوئی۔

”اسوقت آپ نے ایٹج پراگ کر کیوں نہ ثابت کیا کہ یہ آپکی ماں کی تصویر ہے؟“

”کیا ضرورت تھی؟ آپکے شاہی نوابی سبوروں کے سلسلے میں ہم بولنے والے کون؟ ہم نے سوچا کیا پتہ نواب بیگم نے کچھ عرصے کے لئے کسی رئیس پر دھان پور سے نکاح یا متہ کر لیا ہو یا یونہی انکے حرم میں داخل ہو گئی ہوں لیکن کوئے بکتی نہ بننا چاہتی ہوں اور آپکے ابا جان کی ولادت کے بعد پھر بازار میں جا بیٹھی ہوں۔“

بنگار و شہوار کے چہرے سرخ ہو گئے بیچ دنا ب کھایا کیں۔ مگر بولنے کی گنجائش نہ تھی چپ رہیں۔ سبنتی جگگاتی ٹرائی دھکیلتی داخل ہوئی۔

”وہ تاریخی تصویر آپ لوگوں نے غائب کر دی۔ یہ بڑی زیادتی اور بے انصافی کی بات ہے۔ اس کی ملکیت کی اصل حقدار یہ خاکار ہے۔“

”اگر حقداروں کو انکی چیزیں واپس کرنی شروع کی جائیں تو دنیا میں بہت کم لوگ ایسے رہ پائیں گے جنکے پاس کچھ باقی بچے گا۔“ نگار خانم نے بے نیازی سے بات کی۔

”آپ اس گھر سے ہی اس کا رخیر کا آغاز کیجئے“ عندلیب بانو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اب بیلکھت شہوار پر حق گوئی و میبا کی کا دورہ پڑ گیا۔ قہوے کی نقشتیں MIESSEN پیالی ہاتھ میں لیے لیے اٹھیں اور قوار سے کی طرف جاتے ہوئے خطباناہ انداز میں گویا ہوئیں۔ ”یہ گھر اور کارخیر۔۔۔ اصل حقداروں کی فہرست تو بہت طویل ہے، ٹبل بانی۔ اس ڈولنگ سے کو تعمیر کرنے والے فاتح کش مزدور۔ ہمارے بھائیوں کے فیکٹریوں کا بھاری لیبر ہمارے کتب خانے کے اصل مالک وہ وثیقہ دار نواب صاحب جنکا لڑکا ایرٹیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ بلرام پور ہسپتال کے خیراتی دارڈ میں۔ کیونکہ باجی نے کتابوں کی بقیہ قیمت۔ وہ حقیر رقم ادا نہ کی

بروقت۔ محض بوجہ کاہلی و بے پروائی۔ اور۔ اور وہ مغلس نوجوان مر گیا کیونکہ اسکے لیے کوفتہ۔ سواری۔ نہ گُردہ اسکا نہ کبھی۔۔۔
 ”شہوار۔۔۔“ نگار نے گرج کر ڈانٹا: ”بڑکتو کی طرح باوے پن کے راستے پر نہ چلو۔

اِس۔ دیوانی ہی ہوئی جا رہی ہیں۔

”اُمّی۔ اٹھے۔ چلیں۔“ عنبر میں نے کہا۔

”ذری میرا بلڈ پریشر دکھتی جائیے۔“

”میں آلہ نہیں لانی ہوں۔“

”میں نے آپکی کار میں رکھا دیکھا ہے۔ پھلی سیٹ پر شہوار بولیں۔“ شیا م سنگھ ڈاکٹر صاحب سے جانی لے جاؤ اور انکا آلہ نکال لاؤ گاڑی سے ”نگار خانم نے حکمانہ انداز میں آواز دی۔

ڈاکٹر کا فرض ہے۔ ڈگری لیتے وقت قسم کھاتا ہے کہ کسی قسم کے ذاتی غصے ذاتی توہین کی پرواہ کیے بغیر مرین کا علاج کرے گا۔ عنبر نے طیش ضبط کر کے پرس میں سے کارکی کنبیاں نکالیں اور لحظ بھر کے لیے انہیں نکلتی رہی۔ یہ کنبیاں پچھلے سال کہاں کہاں چھپائی جاتی تھیں۔
 شیا م سنگھ دربان اسی وقت اندر آیا تھا اور کنگ ایڈورڈ سولور پلٹ میں شام کی ڈاک لیے کھڑا تھا۔ جو بھائیوں کے دفتر سے بھجوائی گئی تھی۔

عجیب گھر تھا۔ یہ لوگ ولایت سے MIESSEN پیالیاں بھی خرید لائے تھے۔ اور بیش قیمت کنگ ایڈورڈ سولور بھی۔ ساتھ ہی اس کمرے کو پلاسٹک کے اتم غلم سے سجا رکھا تھا عنبر برفروختہ اور حیرت زدہ بیٹھی رہی۔

شہوار نے چونک کر شیا م سنگھ کو دیکھا۔ اور فارن ایرمیل کا لفافہ پلیٹ سے اٹھا کر مسکرائیں۔

”میرے نام کا خط ہے؟“ نگار خانم نے پُر امید آواز میں دریافت کیا۔

شہوار خانم کے دل میں اسوقت انقلابی خیالات موجزن تھے۔ حاجی سے فرسٹ ہو رہی تھیں کینے پن سے جواب دیا ”جی نہیں۔ ایک رسالہ ہے اور حسب معمول چند چہرے قنات اوپنوں کے

لفانے۔ آپ سے افسانے منگوائے ہونگے اور کیا۔۔۔

”اردو والوں کو ہمیشہ چیز فٹات کیوں کہتی ہو؟ تمہاری مادری زبان فرنج ہے؟ نگار نے جھلا کر پوچھا۔

”خیر مادری زبان فرنج ہونہ ہواب تو فرنج ہی ہونے جا رہی ہے۔ انشا اللہ۔ یہ ملاحظہ کیجئے موسیٰ القونس دو وال کا مراسلہ“

”ایسے کتنے ہی موسیوز کے لیٹر میں نے پھاڑ کر پھینک دیے۔“ نگار نے ہونٹ پچکا کر کہا۔

”اچھا۔۔۔ کب۔۔۔؟ شہوار نے چونک کر سوال کیا۔

دونوں بہنوں کی سرد جنگ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ دونوں کو غنیم کا خیال نہیں رہا تھا یا ماں بیٹیوں کی موجودگی غیر اہم ہسیتاں سمجھ کر نظر انداز کر دی تھی۔

”اے وہ بھول گئیں مرانڈا ہاؤس میں فرانسس پر و فیسیر کمیسٹری پڑھاتا تھا“

”فرانسس نہیں کچھ اور۔ پانڈیچری کا یونیورسٹی تھا“

”اچھا خیر۔ ہوگا“

”اب صاحبزادہ دلشاد علی خاں خط نہیں لکھتے؟“ عندلیب بانو نے وار کیا۔

”وہ آپ کی لائن سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو لکھتے ہونگے“

”اب تو آپ بھی بفضل خدا اسی طبقے میں شامل ہو چکی ہیں“ عندلیب بانو نے بڑی مٹھاں

سے جواب دیا۔ ”نواب بانی کو تو آپ نے فرضی دادی ہی بنایا تھا۔ نور ماہ خانم اور جیراگم پیشہ

دلشاد علی آپ کے سچ مچ کے سمدھن سمدھی بن گئے۔ اور انکا حراہی بیٹا آپکا داماد“

نگار شہوار تہلکا کر رہ گئیں۔ عین زور سے منہ ہی۔

”آپ کی اس خوفناک منہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوں کا اثر ابھی باقی ہے“ شہوار نے جوابی حملہ کیا۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔ اے بہن سنئے ہی گھر بستے ہیں۔ مبارک ہو بھتیجی کی کتنی امانی۔ ہمیشہ دہر

سبحان مبارک باشد۔ آپ کے گھر میں خدا خدا کر کے کسی عورت ذات کی شادی تو ہوئی عندلیب

بانو نے ہاتھ نیچا کر کہا۔ ”عبرت نے حیرت سے انکو نکا۔ اتنی میڈب نصف یورپین ماں میں کوئی

ڈونٹی حلواں کر گئی تھی یا اتنے قالب میں لواب سگیم بول رہی تھیں۔

”ہمارے ہاں تو لڑکے لڑکیاں دونوں بیاہے جاتے ہیں آپکے گھرانے میں البتہ لڑکیوں کی شادی کا رواج نہیں“ نگار خانم نے سرد آواز میں جواب دیا۔
 ”میں تو اپنی نواسی بھی دیکھ آئی، عندلیب بانو بولیں۔“
 ”میری نواسی —“ نگار خانم نے چپیں بچیں ہو کر دہرایا۔
 ”اپنی بھتیجی کی لڑکی آپکی نواسی ہی تو ہوئی، بڑی خوبصورت ہے ماشا اللہ۔ اسکی دادی نے چرچ میں پتسمہ دلو اکرا سکا نام بھی بڑا پیارا رکھا ہے نوراً — نوراً ڈریک — بروزن نوراً ڈریک —“

دارکاری تھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد شہوار بیگم بولیں — ”انکا کیا ہوا — ڈاکٹر قندھاری — تا چاری — کچھ عجیب سا نام ہے —“
 ”کاشغری —“ عنبرین نے شیریں لہجے میں جواب دیا۔
 ”ہاں۔ ہاں — وہی۔ سنا ہے وہی آپکو علاج کے لیے برطانیہ لے گئے تھے۔“
 ”آپ نے صحیح سنا۔ انھوں نے وہاں بڑی دوڑ بھاگ کی میرے علاج معالجے کے سلسلے میں۔ سال بھر —“

”سال بھر تو وہ وہاں نہیں رہے۔ اکثر یہاں ہمارے ہاں آئیے۔ حسب سابق۔“
 ”انکا نام کیسے بھول گئیں؟ اور وہ برابر کیسے رہ سکتے تھے۔ یہاں ماشا کون چلاتا؟“ عنبر نے اب ذرا لگنت سے جواب دیا۔

”باجی جان — موسیو ڈو وال کا خط آیا ہے۔ معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب ذرا میں یہ خط پڑھ لوں، شہوار نے ایرمیل کا طویل نیلا لفاظہ چاک کرتے ہوئے کہا۔ ایک رنگین تصویر برآمد ہوئی۔ خط پڑھ کر بولیں، ”لکھتے ہیں اپنے دائیں یا رڈ میں چاٹو — نئی چاٹو بنو رہے ہیں۔“
 ”وہ یا رڈ میں شاطو —“ عندلیب بانو نے نرمی سے صحیح کی۔

”ابھی جو ہم لوگ یورپ گئے تھے وہیں ملاقات ہوئی۔ بھیا سے کچھ انکا بزنس کنکشن ہے۔ بے چارے نے سید خاطر مدارات کی پیرس میں۔ شپ اور میں بہت بڑے۔ چھوٹے بھیا

نے انکو دکھایا تھا کہ یورپ میں ہماری LOOK AFTERY کریں۔“

”کب آفری — ؟“ عندلیب بانو نے دہرایا۔

”جی ہاں۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ شادی کر لو — کیوں باجی۔ کتنے مصرتھے؟“

باجی چپ رہیں۔ ”میں نے شرط رکھی مسلمان ہو جاؤ۔ کہا چند مجبوریاں ہیں۔ جا یاد اور کاروبار وغیرہ کی۔ جنگی وجہ سے مذہب تبدیل کرنا ذرا مشکل ہے فی الحال ہمارے ساتھ لندن بھی گئے تھے۔ یہ تصویر ملا خط کیجئے۔ اسلامک کلچر سنٹر میں کھینچی تھی۔ بروز عید الفطر یہ بالکل میسے پیچھے تیسری قطار میں کھڑے ہیں۔“

عسبر نے دلچسپی سے دیکھا۔ شہوار نے گروپ فوٹو میں ایک چھوٹے سے گول مٹول گلابی چہرے پر انگلی رکھی۔ ”بہت مہینڈ سم ہیں۔“ شہوار نے کہا۔

”جی ہاں ضرور ہونگے۔ مگر تصویر اتنی چھوٹی ہے کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا،“ عسبر بولی۔

”کرٹینا آدنا س بھی ان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر انکو اور نٹیل لڑکیاں پسند ہیں۔ کہتے

ہیں وہ بہت اچھی بیویاں ثابت ہوتی تیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میرے چکر میں مسلمان بھی ہو جائیں گے۔ لندن میں برابر اسلامک کلچر سنٹر جایا کرتے تھے۔ مگر میں نے گھاس نہیں ڈالی۔“

تصویر دکھاتے ہوئے شہوار نے موسیو الفونس دو وال کا خط تپائی پڑ ڈال دیا تھا۔ عسبر

نے اس ٹائپ شدہ مختصر نوٹ پر زردیدہ نظر ڈالی۔ ”ڈیر شہوار خانم۔ متوقع ہوں کہ آپ

بجیر ہونگی۔ وہ تصویر جو آپکے فیملیوں کے روز لندن میں کھینچی گئی تھی حب وعدہ ارسال کر رہا ہوں۔ اب

ہے آپ اپنے یورپ کے سفر سے لطف اندوز ہونی ہونگی۔ مخلص الفونس دو وال

شیام سنگھ بیگ لے کر حاضر ہوا۔

”ڈاکٹر بیگ کا بیگ —“ انگار خانم مصنوعی شگفتگی سے بولیں۔ بلڈ پریشر چیک کروا لے

صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تقابست سے اپنا بازو پیش کیا۔

دربان نے باہر جانے سے قبل سارے سٹوئج اؤن کر دیے۔ وسطی نوآرہ ابلنے لگے

نقرنی قطب مینار، سوپ اسٹون کا تاج محل اور پلاسٹک کی ٹکلیوں والے گلوب روشن ہو گئے

آبشار جاری ہوا اور مصنوعی درخت پر بیٹھی مینکل چڑیاں چوہپانے لگیں۔ شہوار خانم نے

ہاتھ بڑھا کر میوزیکل مگرٹ باکس کھول دیا "اولڈ ٹینگ زائین" کی دھن بجنے لگی۔ نگار خانم نے
دائیں ہاتھ سے ٹام کی ڈاک میں آیا ہوا ایک ادبی رسالہ کھولا اور اس میں چھاپا اپنا تازہ افسانہ پڑھنے
میں منہمک ہو گئیں۔ منٹ بھر بعد اسے رکھ کر نئے ناول کے پروف اٹھالیے۔

نگار خانم اپنے چھتیسویں ناول کی پروف ریڈنگ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر عنبریں بیگ انکا بلڈ پریشر
چیک کرنے میں مصروف تھی۔ شہوار کسی یورپین شپ اور کاخط دوبارہ پڑھتے ہوئے اپنی نئی نئی
کی تخلیق میں مگن ہو چکی تھیں۔

دریچے کی نشست پر بیٹھے بیٹھے عنذیب بانو نے باہر اندھیرے آسمان کا جائزہ لیا۔ پرندے
بیسرا لینے کیلئے اڑتے جا رہے تھے۔

گویا وہ سب اپنے اپنے رول پر واپس موجود تھیں۔

"بنیک ٹودی پولیٹین۔" دریچے کے نیچے چھپے خواجہ سبز پوش نے اُچک کر کمرے کے منظر پر
نگاہ ڈالی اور گویا رداں تبصرہ کیا۔ انکو بالکل اپنے قریب موجود پار عنذیب بانو گھبرا گئیں۔ اور دِنڈو
سیٹ سے اٹھیں۔ جھاڑ بھنگا رسرنے فوراً اندھیرے میں ڈبکی لگائی۔

ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہو چکی تھیں قبلائی ہمدرد کاہلی سے چلتا اندر آ کر ایڈیٹ بکس
کے مقابل میں بیٹھ گیا۔ اسے سجھائی کم دیتا تھا۔

عنبریں نے مریضہ کو انکابی۔ پی بتایا اور اٹھی۔

"کھانا کھا کر جانیے" شہوار نے اخلاق سے کہا۔

"جی نہیں۔ شکریہ۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ بھی تو کہیں جانے والی تھیں۔ افسوس
ہے کہ آپکا راستہ کھوٹا گیا۔"

"پھر ضرور آئیے گا۔"

"ضرور" مسز بیگ نے چلتے چلتے ایک آخری گولہ داغنا مناسب جانا: نگار خانم سے
مخاطب ہوئیں۔ بریسیل تذکرہ۔ آپکے سمدھی دلشاد علی خاں۔ انکے متعلق تو آپکو علم ہوگا۔

تایب ہو کر حج کرنے چلے گئے۔ مکے میں مثل ہو گئے ہیں۔ وہاں اسکول میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔
”میں نے سنا ہے آپ پھر لندن جانے والی ہیں“ نگار خانم نے اپنی مشین گن کا رخ عنبر
کی طرف کیا۔

”درست۔“ عنبریں بولی۔ ”مجھے ہر تین ماہ بعد وہاں جانا ہے برائے چیک اپ۔ کیونکہ میرا مرض
ایسا ہے آپکو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی۔ کہ برطانیہ کے مشہور ماہر امراض دماغی روزین باؤم
نے کہا ہے کوئی گائری نہیں کہ دوبارہ عود نہ کر آئے عین ممکن ہے میری یہ تندرستی عارضی ثابت
ہو بحیثیت ڈاکٹر میں اس صورت حال کو بخوبی سمجھتی ہوں۔“

”خدا نہ کرے۔ بہری کے دیدوں میں رائی نوؤن۔ بیماری عود کرے تمہارے دشمنوں
کی۔“ عنذلیب بانو نے چمک کر بالکل اپنی ماں نواب بیگم کے انداز میں کہا۔ نانی کی یہ آواز مدتوں
قبل کسن عنبریں کلکتے میں سنا کرتی تھی۔

ہمیں اپنی پرچھائیوں سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ دلشاد علی خاں نجانی نے کس طرح بھاگ
نکلے۔ اگر میں ان پرچھائیوں کو قطعاً قبول کر لوں تو شاید اچھی ہو جاؤں۔ عنبر نے اپنی ماں پر نگاہ
کی۔ بہت دنوں بعد پہلی مرتبہ۔ محبت اور درمندی کے ساتھ۔ انکے کندھے پر ہاتھ
رکھ کر اپنے پرانے دوستانہ لہجے میں بولی ”COME ON OLD GIRL, LET'S GO.“

دونوں بہنیں انکو خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھیں۔ عنبر انکی طرف مڑی۔ ”سمجھیں آپ
خواہران عزیز۔ میں دوبارہ پاگل ہو سکتی ہوں۔ کسی لمحے بھی کسی انسان کے دماغ
کا پرزہ اچانک ٹوٹ سکتا ہے۔ آپکے صحیح الدماغ برادر معظم کے برعکس میں چند ماہ تک واقعی
مخبوط الحواس رہ چکی ہوں۔ مطلب یہ کہ۔ منفر کسی صورت میں نہیں۔ نہ مجھے۔ نہ آپ کو۔
نہ دنیا کے کسی اور انسان کو۔ کوئی محفوظ نہیں۔ چاہے وہ بھیانک واقعہ ایک بے ضرر سے
گناہم گمیوں نے تخلیق کیا ہو۔ یا کسی جذباتی صدمے نے۔ کوئی حادثہ ہو۔ یا علالت۔

”یا آخری مہلک بیماری۔ یا کوئی اور ناگہانی مصیبت۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا
کے ہسپتال اور تیم خانے جیل خانے اور پاگل خانے اور قحبہ خانے سبکس دمجبور مخلوق سے

نہ بھرے ہوتے — اور دلی آگرے کی ایک نجیب الطرفین خاتون گلرخ بانو بیگم عرف نواب فاطمہ کو اس رہن نامے میں — جو پون صدی بعد اس خوفناک رات آپکے اسی خوفناک کمرے میں اس بلوڑیں میز پر کھولایا گیا تھا — اس رہن نامے میں آج سے ستر برس قبل وہ اعلیٰ نسب منغل زادی خود کو ”قوم مخمنی“ لکھوانے پر مجبور نہ ہوتی ہوتی۔

”امی جان — آپ کو پتہ ہے — مارواڑیوں والے واقعے کے دوسرے روز جب منصور نے مجھے رہن نامے کی یہ عبارت سنائی اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اشکبار نہ دیکھا تھا۔ مرد آسانی سے نہیں روتے“

آبشار والے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں بعد ذرا الجھ کر شہوار نے میوزیکل باکس کو دوبارہ کھولا۔ ”اولڈ ٹینگ زائین“ بجنے لگا — وہ محبوب جان لیوا اسکاٹس نغمہ —

SHOULD OLD ACQUAINTANCE BE FORGOT

AND NEVER BROUGHT TO MIND

عندلیب بانو ٹھٹھک کر اسے سننے میں محو ہو گئیں۔

”امی چلیے،“ عنبریں نے پکارا۔ اسوقت میوزیکل سگریٹ باکس کے قریب ایک اور مانوس چمکیلی شے پر اس کی نظر پڑی۔ منصور کا تقرنی سگریٹ کیس۔ لاچوردی مینا کاری کے موٹو گرام MK سے مزین۔ ہفتہ بھر قبل ان ماں بیٹیوں کی برطانیہ سے واپسی پر جب وہ انکے استقبال کے لیے اموسی ایروپورٹ آیا تھا یہ سگریٹ کیس اسکے ہاتھ میں تھا۔

ٹیلی ویژن کی خبریں سنتے سنتے قبلانی بخارا کارپٹ پر سوچا تھا۔

منصور شاید پچھلی بار جب نگار خانم کو دیکھنے آیا ہوگا تو یہاں بھول گیا ہوگا۔ عندلیب بانو نے دل کڑا کر کے سوچا۔ وہ بھی اس سگریٹ کیس کو دیکھ رہی تھیں۔

SHOULD OLD ACQUAINTANCE BE FORGOT—

انہوں نے جھک کر نغمہ سرا ڈبے کا پٹ بند کر دیا۔

”آپ منصور سے شادی کب کر رہی ہیں؟“ فوارے کے پاس کھڑی شہوار نے شکر گھولتی آواز میں عنبر سے دریافت کیا۔

”آپ کب کر رہی ہیں۔“ عنبریں نے سکون کے ساتھ بہہ بہہ ”امی! اچھے بھئی۔“
”بہنستی۔ ڈاکٹر صاحب کا بیگ اٹھاؤ۔“ نگار خانم نے حکم دیا۔

رنگ بڑنگی مچھلیوں کے ٹینک کے پاس رک کر عنبر نے میزبان خواتین کو پھر مخاطب کیا
”چنانچہ۔ میری پیاری بہنو۔ ہرناگہانی مصیبت سے ڈرتی رہیے۔ کوئی آزاد نہیں۔ کوئی
مختار نہیں۔ سارا معاملہ اندھا دھند ہے۔ پانیوں پر بہتی موسیقی کے اس سُر پہ آپ دونوں سے
اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ ہیلی۔“

مرمت شدہ ہری ایمینڈر فرائٹے کے ساتھ پورٹیکو سے نکلی۔ ڈرائیو پر سے گذرتی نبند
پھانک سے جا نکل آئی۔ ایک ہیڈ لیمپ چھین سے ٹوٹا۔ کار دھچکے سے پیچھے ہٹی۔ ایک پچھلا پہرہ
پام کے گلے پر چڑھ گیا۔
عنبریں نے سہر جھنک کر سامنے دیکھا اور پوری طاقت سے جھنجھی۔ ”باسٹرڈ۔“

چوکیدار سڑک پر سے بھاگتا ہوا آیا۔ پھانک کھول کر حادثے کا جائزہ لیا۔ جھلا کر بولا
”سیگ صاحب۔ گالی کیوں دیتی ہیں؟ آپ تو گیٹ توڑے ڈال رہی ہیں۔ ہم
سامنے گٹی پر چلے گئے۔ تھے۔ بیٹری لینے۔ ہارن بجا دیا ہونا۔ اوپر سے ہم کو باس ٹرولر تھی ہیں چینی
کا گملہ چھوڑ ڈالا۔ سویرے ہماری چھٹی بڑی بیٹا دس جوتے لگا کر نکال باہر کر سکی۔“
شیام سنگھ لپکا۔ ”داگدر صاحب کیا ہوا۔ چوٹ تو نہیں آئی۔ ہاتھوڑا سا

بیک کر لیجئے۔ ادھر۔ اور ادھر۔ اب ٹھیک۔“

”تھینک یو شیام سنگھ۔“

”داگدر صاحب سامنے کی ایک بتی ٹوٹ گئی۔“

”ٹھیک ہے۔“

کار چینی کے شکستہ گلے اور پام کے پودے کو روندتی سڑک پر نکل آئی۔

مسٹر بیگ نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ مٹھیاں بھیچے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ انہوں نے چہرے سے ٹھنڈا پسینہ پونچھا۔

”سوری اتنی جان“ منسان سڑک پر کچھ دور جا کر گیر بدلتے ہوئے عنبرین نے کہا: اب میں بہت احتیاط سے چلایا کروں گی گاڑی۔“
عذیب بیگ خاموش رہیں۔

”اتنی پان کھائیں گی؟ ایک کھوکھے کے سامنے کار روکی۔ بانکی تینولن نے مسکرا کر پوچھا
”بیگم صاحب، لکھتی بناویں؟“
”ہاں۔ دو۔ سادے۔“

دکان میں ٹرانز سٹرنج رہا تھا۔ میرے اگنے میں تمہارا کیا کام ہے۔ عنبرین چوٹی دیوار پر سجے پرنٹ بے دھیانی سے دیکھا کی۔ امیتا بھ بچن۔ پروین بابی۔ ریکھا۔ شہو اور چندنی کی تصاویر پر صبح کے ڈالے ہوئے چنبیلی کے ہار مر جھاگئے تھے۔ نیچے مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ سڑک پر خاموشی طاری تھی۔ اسٹریٹ لیمپ کی زرد روشنی میں بیٹھے ایک سیاہ کتے نے منہ اوپر اٹھا کر دانت نکوسے۔ بھیڑ کی سواری جیسا رنگ تیرہ۔
”لوش کیجئے۔“ تینولن نے گلو ریاں پیش کیں۔

عنبرین نے پیسے دے کر کار آگے بڑھائی۔
حضرت کبج کے ایک سینما ہال سے تماشائی باہر آرہے تھے۔
عذیب بانو نے پان منہ میں رکھا۔ گہری سانس بھر کر کہا ”چلو کوئی کچر دیکھ لیں سیکنڈ ہنڈو“
عنبرین نے گاڑی چھتر منزل کی سمت موڑتے جواب دیا۔ ”نہیں۔ اب سیدھے گھر چلتے ہیں۔“ دریا ٹمنا۔“

آبشار والے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے اٹھ کر ”خواجہ سبز پوش“ نے کپڑوں سے مہٹی جھاڑی۔ سرد، بھیگی زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سُن ہو چکی تھیں۔ ایک چندول پھر سے اڑا۔ احاطے کے باہر آوارہ کتا مسلسل رو رہا تھا۔ ایک گرگٹ رات کی رانی کی ٹہنی پر سے

اچھل کر عشق پیچاں کی گھسی بیل میں غایب ہو گیا۔ اکیلا جگنو گلاب کی شبنم آلود جھاڑی میں دیکے جا رہا تھا۔ چاروں طرف تاکتے جھکے جھکے، شاگرد پیشے کی سمت بڑھے۔ اپنی اندھیری کوٹھڑی میں پہنچ کر بجلی کا سوئیچ ادن کیا۔ بلب کا فیوز پھراڑ گیا۔ موم سٹی تلاش کی کوڑ بند کر کے چٹنی لگائی۔ اپنی ”چاہ بابل“ کی سلاخوں والی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ آسمان پر زہرہ اور مشتری تیزی سے چمک رہی تھیں۔ قطب ستارہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ ہوا چلی۔ مینہ برسنے لگا۔

کھڑکی سے ہٹ کر خواجہ سبز پوش کونے میں ٹکٹے ”علیؑ“ کے دھونے کے قریب جا بیٹھے۔ گھٹنوں میں سر دے لیا۔

دھویں کے باریک مرغولے طرح طرح کی شکلیں اور ہیولے بنایا کیے۔ تھوڑی سی خاک اٹھا کر ہتھیلی پر رکھی۔ اسے دھیان سے دیکھتے رہے۔ باہر بارش کا زور بڑھ گیا۔ کھڑکی کے پٹ کھڑکھڑانے لگے۔ خواجہ سبز پوش نے چمکی بھرا کھ اپنے جھاڑ جھنکار کھڑکی باؤں پر ڈالی۔ اور ایک فلک شگاف تہقہہ لگایا۔ جیسے کھوپڑیوں کی مالا پہنے، انگ بھوت لگائے شمشان میں بیٹھا کال بھیر رہے۔

کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز پر وہ چونکے۔ انگلیوں سے پلکیں رگڑا کیے۔ باجس تلاش کر کے بھی ہوئی موم سٹی جلائی چہرے پہ ہاتھ پھرا۔ ہتھیلی پہ لگی راکھ آستین سے پونجھی پاؤں کی بیڑیاں کھینٹے۔ کھسکتے کھڑکی تک پہنچے اسکے ایک ٹکستہ پائے کے نیچے رکھی اینٹ نکالی۔ گھڑے کا پانی چھلک گیا۔ دوسرا دھکا لگا کھڑا نیچے آ رہا۔ پانی سے شرابور ہو گئے۔ لیکن انھوں نے پردا نہیں کی۔ اینٹ اٹھا کر اسے ہاتھ میں تو لاپھر پوری طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں مہمک ہو گئے۔



اختتامیہ

www.urduchannel.in

اس نیم دستاویزی ناول کے مندرجہ ذیل کردار قلمی فرضی ہیں۔
 ڈاکٹر عنبرین بیگم۔ عنذلیب بانو۔ نواب فاطمہ عرف نواب بیگم۔
 نلو مینا۔ منور سی کشمیرن۔ دنواز عرف جتن بی۔ مہرو۔ شمو۔ چھتو۔
 راحت بانی۔ گجر بانی۔ نگار خانم۔ شہوار خانم۔ پری بیگم۔ نورادریک عرف
 نورماہ خانم۔ شیلی ڈریک عرف سرینادوی۔ ڈاکٹر نثار داکھنہ۔
 کرن بھائیہ۔ ہری مایا بھٹناگر۔ پون کمار سی مصر۔ جھرنادیوی۔
 پری بھادیوی ”سوئیڈش لیڈی“ مسزخان۔
 ڈاکٹر منصور کاشغری۔ گننام نواب صاحب۔ مرزا عثمان بیگ۔
 چودھری فتح محمد۔ شدو خاں۔ دلدار علی برلاس۔ مرزا سبط احمد۔
 شیخ عبدالباسط گوٹے والے۔ نواب سہراب نگر۔ راجہ نیلم گڈھ۔
 پرانی دلی کے بیری والے شاہ جی۔

کیلاش نرائین ماتھر۔ خان بہادر برکت اللہ۔ کاٹھیا واٹری دربار صاحب۔
 ٹھاکر مہیشور سنگھ جی۔ کرنل ڈالٹن۔ آندرے رینال۔ چارلس کورپین۔
 راتے بہادر امبارشاہ حقیر۔ سید شکور حسین۔ ٹھاکر جوادی علی آف دھانپور۔
 راجہ دشا علی خان۔ سندریشور نرائین سنگھ عرف کنور سینڈی۔
 جارج ڈریک۔ نورمن ڈریک۔ خواجہ سبز پوش اورانکے بھائی۔ نواب نجو صاحب
 بطیموس۔ پینا توئس۔ زاع دہلوی۔ جے پور کا کنوڑیا گھرانہ۔
 شرف الدین۔ جرمنی کے آرٹھ گروچی۔ آسٹریں ہیٹ والے شاعر۔
 پری محل اور تعلقہ دھان پور بھی فرضی ہیں۔
 جرمن اور عربی باجی لوجیا حسین بخش مرتب کردار ہیں۔